شعاعِ حسینیت

زیر نگرانی حجۃ الاسلام والمسلمین آقائی مہدی مہدوی پور

نمائندۂ رہبر معظم آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہٗ العالی

مرتبۂ

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی مدیر ماہنامہ شعاع عمل لکھنؤ

فہرست شعاعِ حسینیت

پیش لفظ

علم وادب کی دنیا میں 'ماہنامہ' کی اپنی ابلاغی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ 'جلد بازی کے ادب' صحافت میں ایک حد تک استقامت کا رنگ بھر کر اسے علمی وادبی متانت کا قابل توجہ بنا دیتا ہے اور 'کتابی' انداز کی پذیرائی اور یادگاری کے قریب تر کر دیتا ہے۔ کچھ یہی وجہ ہے کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں علمی وسائنسی تحقیقی مجلوں میں ماہنامہ کا غلبہ قائم ہے۔ ایسے مجلّے عموماً اختصاصی ہو گئے ہیں اور اپنے معیار ومقدار کے لحاظ سے بڑے معتبر وموقر ہو چکے ہیں۔

دینی وملی ماہنامہ جو بنیادی طور پر اختصاصی ہوتے ہیں، ان کی بھی اپنی روایت رہی ہے اور اپنا خاص مقام۔ اردو زبان میں برصغیر ہند میں ایسے ماہناموں کی تاریخ قدیم بھی ہے اور درخشاں بھی۔

ماہنامہ 'شعاع عمل' ایسے ماہناموں کی صف میں شامل ہونے والا نسبتاً تازہ اضافہ ہے۔ پھر بھی یہ اپنی اشاعت کی 'صدی' مکمل کر چکا ہے اور 'عشرہ' کی تکمیل کی طرف اپنے استقلال کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ اس 'کم عمری' میں اپنے نمو اور بلوغ نظر کے جھنڈے گاڑ چکا ہے۔ ساتھ ہی کئی جہات سے اپنے امتیازات اور خصوصیات ثبت کر چکا ہے۔ 'شعاع عمل' میں ابتدا سے معیاری علمی و تحقیقی مشمولات کے ساتھ 'یادگاری' کا عنصر نمایاں رہا ہے۔ علم وقلم کی نوابغ روزگار ہستیوں کے یادگار زمانہ مضامین کے ساتھ اس کا ہر شمارہ یادگار اور قابل قدر ہوا اور مقبول عوام وخواص بھی۔ اسی یادگاری کے عنصر کے پیش نظر اس کے مطبوعہ ومطبوع عام معیاری مضامین کو موضوعاتی تقسیم سے ترتیب دے کر کتابی شکل میں علیحدہ علیحدہ پھر سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

زیر نظر پیشکش مذکورہ بالا سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو 'سید الشہداء امام حسینؑ کی پاکیزہ شخصیت'

مقدس کردار اور تاریخ ساز کارناموں کی نذر ہے۔

حضرت سید الشہداؑء کی شخصیت وہ ہے جو اقوام وملل، مذاہب ومسالک، عقائد ونظریات، رنگ و نسل کی اور علاقائی تفریق سے بالاتر پورے عالم انسانیت کو اپیل کرتی ہے اور مرکز عقیدت رہی ہے۔ اس منزل میں دور دور تک کوئی آپ کا شریک نظر نہیں آتا۔ آپ کی عصمت کردار اور نزہتِ اخلاق پر خون کے پیاسے دشمنوں تک کی غیر متنازع اور متفقہ گواہی ثبت ہے۔ ایک طرف آپ کی شخصیت مظلومیت کی مترادف ہے تو آپ کا اقدام انقلاب کا مرادف۔ ایک جانب آپ امن وصلح پسندی کے پیامی رہے تو دوسری جانب عزم وحوصلہ کی قابل تقلید اور لائق ہزار رشک و ناز مثال۔ آپ نے ملوکیت کے کثیف اور کریہہ ناپاک پنجوں سے اسلام کو نجات دلائی تو وہیں انسانیت کی ڈوبتی کشتی کو طوفان ظلم وستم سے بچایا۔ آپ کے بروقت اور منصوبہ بند اقدام نے فوری، دیرپا، دور رس اور ہمہ گیر اثرات مرتب کئے۔ ان اور اس کے علاوہ دیگر پہلوؤں پر ہمارے مضامین میں سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہماری موجودہ پیش کش کی ترتیب واشاعت عظیم المرتبت حجۃ الاسلام آقائی مہدی مہدوی پور، نمائندہ رہبر معظم آیۃ اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہما العالی کی گراں قدر تحریک وترغیب ومعاونت و سرپرستی کی رہین منت ہے جس کے لئے ہم صمیم قلب سے ان گرامی وسامی حضرات کے انتہائی ممنون ومتشکر ہیں۔ ہم بارگاہ احدیت میں دست بدعا ہیں کہ ان حضرات کا بابرکت سایہ تادیر قائم رہے اور ان کے دنیوی واخروی اقبال وشان میں مسلسل ترقی ہوتی رہے۔

امید ہے، ہمارے اہل ذوق ونظر قارئین کرام ہماری اس پیش کش کو بھی شرف قبولیت اور ہمیں اپنے مفید آرا سے سے نوازیں گے۔

۳۰ ربیع الاول ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱ فروری ۲۰۱۴ء

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

❀❀❀

حضرت سید الشہداء ابو عبداللہ الحسینؑ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

نام ونسب: حسینؑ نام اور ابو عبداللہ کنیت ہے پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھوٹے نواسے اور علیؑ وفاطمہؑ کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔

ولادت: ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن امام حسینؑ کی ولادت ہوئی اس خوش خبری کو سُن کر جناب رسالت مآبؐ تشریف لائے۔ بیٹے کو گود میں لیا پیار کیا داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منھ میں دے دی۔ پیغمبرؐ کا مقدس لعاب دہن حسینؑ کی غذا بنا۔ ساتویں دن عقیقہ کیا گیا آپ کی پیدائش سے تمام خاندان میں خوشی اور مسرت محسوس کی جاتی تھی مگر آنے والے حالات کا علم پیغمبرؐ کی آنکھوں سے آنسو برساتا تھا۔ اور اسی وقت سے حسینؑ کے مصائب کا چرچا اہلبیتؑ رسولؐ کی زبانوں پر آنے لگا۔

نشوونما: پیغمبر اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی۔ اب ان دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی۔ ایک حسنؑ دوسرے حسینؑ۔ اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا ایک ہی گہوارہ تھا۔ جس میں دونوں پروان چڑھ رہے تھے۔ ایک طرف پیغمبر اسلام جن کی زندگی کا مقصد ہی اخلاق انسانی کی تکمیل تھی اور دوسری طرف حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب جو اپنے عمل سے خدا کی مرضی کے خریدار بن چکے تھے۔ تیسری طرف حضرت فاطمہ زہراؑ جو خواتین کے طبقہ میں پیغمبرؐ کی رسالت کو عملی طور پر پہونچانے ہی کے لئے قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نورانی ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔

رسولؐ کی محبت: حضرت محمد مصطفیٰؐ اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ انتہائی محبت فرماتے تھے۔ سینہ

پر بٹھاتے تھے، کاندھوں پر چڑھاتے تھے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان سے محبت رکھو مگر چھوٹے نواسے کے ساتھ آپ کی محبت کے انداز کچھ امتیاز خاص رکھتے تھے۔ ایسا ہوا ہے کہ نماز میں سجدہ کی حالت میں حسینؑ پشت مبارک پر آگئے تو سجدہ میں طول دیا۔ یہاں تک کہ بچہ خود سے بہ خوشی پشت پر سے علاحدہ ہو گیا اس وقت سر سجدے سے اٹھایا۔ کبھی خطبہ پڑھتے ہوئے اور حسینؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے تو رسولؐ نے اپنا خطبہ قطع کر دیا اور منبر سے اتر کر بچے کو زمین سے اُٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "دیکھو یہ حسینؑ ہے اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو۔" رسولؐ نے حسینؑ کے لئے یہ الفاظ بھی خاص طور پر فرمائے تھے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔" مستقبل نے بتا دیا کہ رسولؐ کا مطلب یہ تھا کہ میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا۔

رسولؐ کی وفات کے بعد: امام حسینؑ کی عمر ابھی ۶ رسال کی تھی جب انتہائی محبت کرنے والے نانا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اب پچیس برس تک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی خانہ نشینی کا دور ہے اس زمانہ کے طرح طرح کے ناگوار حالات امام حسینؑ دیکھتے رہے اور اپنے والد بزرگوار کی سیرت کا بھی مطالعہ فرماتے رہے۔ یہ ہی وہ دور تھا جس میں آپ نے جوانی کی حدود میں قدم رکھا اور بھرپور شباب کی منزلوں کو طے کیا۔ ۳۵ھ میں جب حسینؑ کی عمر ۳۱ر برس کی تھی عام مسلمانوں نے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کو بحیثیت خلیفۂ اسلام تسلیم کیا۔ یہ امیر المومنینؑ کی زندگی کے آخری پانچ سال تھے۔ جن میں جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور امام حسینؑ ان میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی نصرت اور حمایت میں شریک ہوئے اور شجاعت کے جوہر بھی دکھائے۔ ۴۰ھ میں جناب امیرؑ مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور اب امامت وخلافت کی ذمہ داریاں امام حسن۔ کے سپرد ہوئیں جو حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ حسینؑ نے ایک باوفا اور اطاعت شعار بھائی کی طرح حسنؑ کا ساتھ دیا اور جب امام حسنؑ نے ایسے شرائط کے ماتحت جن سے اسلامی مفاد محفوظ رہ سکے

معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو امام حسینؑ بھی اس مصالحت پر راضی ہو گئے اور خاموشی کی زندگی گذارنے لگے دس برس تک امام حسنؑ کی زندگی میں اور دس برس تک امام حسنؑ کے بعد آپ خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت اور شریعت کی تعلیم واشاعت میں مصروف رہے مگر معاویہ نے ان شرائط کو جو امام حسنؑ کے ساتھ ہوئے تھے بالکل پورا نہ کیا۔ خود امام حسنؑ کو امیر شام کی سازش ہی سے زہر دیا گیا حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے شیعوں کو چن چن کر قید کیا گیا۔ سر قلم کئے گئے اور سولی پر چڑھایا گیا اور سب سے آخر میں اس شرط کے بالکل خلاف کہ ''معاویہ کو اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا'' معاویہ نے یزید کو اپنے بعد کے لئے ولی عہد بنا دیا اور تمام مسلمانوں سے اس کی بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور زور وزر دونوں طاقتوں کو کام میں لا کر دنیائے اسلام کے بڑے حصے کا سر جھکوا دیا گیا۔

اخلاق واوصاف: امام حسینؑ سلسلۂ امامت کی تیسری فرد تھے۔ عصمت وطہارت کا مجسمہ تھے آپ کی عبادت، آپ کے زہد، آپ کی سخاوت، آپ کے کمالِ اخلاق کے دوست ودشمن سب ہی قائل تھے۔ رات دن میں ایک ہزار رکعت نماز پڑھتے تھے۔ اور اکثر روزے رکھتے تھے۔ ۲۵ رحج آپ نے پا پیادہ کئے آپ میں سخاوت وشجاعت کی صفت کو خود رسولؐ اللہ نے بچپنے میں ایسا نمایاں پایا کہ فرمایا: ''حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے۔'' چنانچہ آپ کے دروازے پر مسافروں اور حاجت مندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا تھا اور کوئی سائل محروم واپس نہیں ہوتا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا لقب ''ابوالمساکین'' ہو گیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اُٹھا کر لے جاتے تھے۔ اور غریب، محتاج، بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے۔ جن کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے۔ حضرت ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ: ''جب کسی صاحب ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لئے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو۔''

غلاموں اور کنیزون کے ساتھ آپ عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے ذرا ذرا سی بات پر آپ انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات کے سامنے دنیا کا سر جھکا ہوا تھا۔ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ صحیفۂ حسینیہ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے آپ رحم دل ایسے تھے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔ ان تمام بلند صفات کے ساتھ متواضع اور منکسر ایسے تھے کہ راستے میں چند مساکین بیٹھے ہوئے اپنے بھیک کے ٹکڑے کھا رہے تھے اور آپ کو پکار کر کھانے میں شرکت کی دعوت دی تو حضرت فوراً زمین پر بیٹھ گئے اگر چہ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی۔ اس بنا پر کہ صدقہ آل محمدؐ پر حرام ہے۔ مگر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی عذر نہیں ہوا۔

اس خاکساری کے باوجود آپ کی بلندی مرتبہ کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوتے تھے لوگ نگاہ اُٹھا کر بات نہیں کرتے تھے جو لوگ آپ کے خاندان کے مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ کے قائل تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام حسینؑ نے امیر شام معاویہ کو ایک سخت خط لکھا جس میں ان کے اعمال وافعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی اس خط کو پڑھ کر معاویہ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدیوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا ہی سخت خط لکھئے۔ معاویہ نے کہا میں جو کچھ لکھوں وہ اگر غلط ہو تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسینؑ میں مجھے ڈھونڈھے سے کوئی عیب نہیں ملتا۔

آپ کی اخلاقی جرات، راست بازی اور راست کرداری، قوت اقدام، جوش عمل اور ثبات واستقلال، صبر وبرداشت کی تصویریں کربلا کے مرقع میں محفوظ ہیں۔ اس سب کے ساتھ آپ کی امن پسندی یہ تھی کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر عزم وہ تھا کہ جان دے دی جو صحیح راستہ پہلے دن اختیار کر لیا تھا اس سے ایک انچ نہ ہٹے انھوں نے بحیثیت ایک فرزند

کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ اپنے وقت میں وہ اطاعت بھی بے مثل اور دوسرے وقت میں یہ قیادت بھی لاجواب تھی۔

واقعۂ کربلا: حضرت امام حسنؑ سے اور امیر شام معاویہ ابن ابی سفیان سے جو صلح ہوئی تھی اس کی ایک خاص اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا مگر سب شرطوں کو عملی طور پر پائمال کرتے ہوئے معاویہ نے اس شرط کی بھی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد کے لئے نامزد کرنا کیسا بلکہ اپنی زندگی ہی میں ممالک اسلامیہ کا دورہ کرکے بحیثیت آئندہ خلیفہ کے یزید کی بیعت حاصل کرلی۔ اس وقت حضرت امام حسینؑ نے بیعت سے انکار فرمادیا۔ امیر شام نے آپ کو موافق بنانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکامیابی ہوئی۔ یزید نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اس کی خلافت ناجائز تھی بلکہ اپنے اخلاق، اوصاف اور کردار کے لحاظ سے اتنا پست تھا کہ تخت سلطنت پر اس کا برقرار ہونا اسلامی شریعت کے لئے سخت خطرے کا باعث تھا۔ وہ شراب خوار، بدکار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا ذکر بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے، اس پر طرّہ یہ کہ وہ حضرت امام حسینؑ سے بیعت لینے پر مصر تھا، گویا وہ اپنے خلاف شریعت افعال کی صحت کے لئے پیغمبر اسلامؐ کے نواسے سے سند حاصل کرنا چاہتا تھا۔

معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلی فکر اس کو یہ ہی ہوئی کہ حضرت امام حسینؑ سے بیعت حاصل کی جائے اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا معاویہ کی خبر انتقال کے ساتھ بیعت کے لئے بھی لکھا۔ ولید نے جو مدینہ کا گورنر تھا امام حسینؑ کو بلاکر یزید کا پیغام پہنچایا۔ آپ پہلے ہی سے یہ طے کئے ہوئے تھے کہ یزید کی بیعت آپ کے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے۔ بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو نتائج ہوں گے انھیں بھی خوب جانتے تھے مگر دین خدا کی حفاظت اور شریعت اسلام کی خاطر آپ کو سب گوارا تھا آپ ولید کو مناسب جواب دے کر اپنے مکان پر

واپس آئے۔ مدینہ میں قیام اس کے بعد نامناسب خیال فرماکر ہجرت کا مضبوط ارادہ کرلیا۔

۶۰ھ رجب کا مہینہ ۲۸/تاریخ تھی جب حضرت اپنے نانا کے جوار کو چھوڑ کر ظالموں کے جور وستم سے سفر غربت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظّمہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلامی تعلیمات کی رو سے جائے پناہ اور امن وامان کی جگہ تھی آپ نے مکہ میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام فرمایا۔ آپ کے ساتھ آپ کے قریبی اعزہ تھے جن میں خاندان رسولؐ کی محترم بی بیاں اور کم سن بچے بھی تھے۔ آپ اپنی طرف سے کسی خوں ریزی اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ حج کا زمانہ بھی قریب تھا اور حضرت کی دلی تمنا تھی کہ اس سال خانۂ کعبہ کا حج ضرور فرمائیں جب کہ آپ مکہ ہی میں موجود ہیں مگر اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ وہ بزرگوار جو اس کے پہلے ۲۵/حج خانۂ کعبہ کے اپنے وطن مدینہ سے آکر پا پیادہ بجالا چکا تھا اس وقت مکہ میں موجود ہونے پر بھی حج کرنے سے مجبور ہوگیا۔ ظالم حکومت شام کی طرف سے کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ جس حالت میں بھی موقع ملے حضرت امام حسینؑ کو خانۂ کعبہ کے پاس ہی قتل کرڈالیں۔

حضرت نہ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے مکہ کے اندر خونریزی ہو اور خانۂ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔ دوروز حج کو باقی تھے جب آپ تمام اہل وعیال اور اعزہ کے ساتھ مکہ معظّمہ سے روانہ ہوگئے اب آپ کہاں جاتے۔ کوفہ کے لوگ برابر خطوط بھیج رہے تھے کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور ہماری مذہبی رہنمائی فرمائیں جب کہ آپ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہوچکے تھے تو اب کوفہ ہی وہ مقام ہوسکتا تھا جس کی طرف آپ رُخ کرتے۔ یہاں کے حالات کو دیکھنے کے لئے آپ اپنے چچازاد بھائی جناب مسلم بن عقیل کو بھیج چکے تھے۔ ۸/ذی الحجہ کو حضرت مکہ معظّمہ سے کوفہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر یہ ہی وہ وقت تھا جب کوفہ میں انقلاب ہوچکا تھا۔ شروع میں تو کوفہ کے لوگوں نے حضرت مسلم کا خیر مقدم کیا اور اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی مگر جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی اس نے حاکم کوفہ نعمان ابن بشیر کو معزول کیا اور ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔

یہ شخص بڑا ہی ظالم اور تشدد پسند تھا اس نے کوفہ میں آ کر بڑے سخت احکام نافذ کئے اور تمام اہل کوفہ پر خوف و دہشت طاری ہوگئی۔ سب نے جناب مسلمؑ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اور آخر تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد بڑی مظلومی اور بے کسی کے ساتھ ۹/ذی الحجہ کو وہ شہید کر ڈالے گئے۔ حضرت امام حسینؑ عراق کے راستے میں منزل زبالہ پر تھے جب حضرت کو مسلمؑ کی خبر شہادت معلوم ہوئی۔ اس کا حضرت پر بڑا اثر پڑا مگر عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا۔ واپسی کا بھی کوئی موقع نہ تھا۔ سفر جاری رہا۔ یہاں تک کہ ذوحسم کی منزل میں ابن زیاد کی فوج میں سے ایک ہزار کا لشکر حُر ابن یزید ریاحی کی سرداری میں آپ کا راستہ روکنے کے لئے پہنچ گیا۔ یہ دشمن کی فوج تھی مگر حضرت امام حسینؑ نے ان کے ساتھ رحم و کرم کا وہ مظاہرہ فرمایا جو دنیائے انسانیت میں یادگار رہے گا۔ تمام فوج کو پیاسا دیکھ کر جتنا پانی ساتھ تھا سب پلا دیا اور ان بے آب راستوں میں اپنے اہل حرم اور بچوں کی پیاس کے لحاظ سے پانی کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہ رکھا۔ اس کے بعد بھی یزیدی فوج نے اپنے حاکم کی ہدایت کے موافق آپ کے ساتھ تشدد اختیار کیا آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روک دیا اب ۶۱ھ کا پہلا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ دوسری محرم کو حضرت کربلا کی زمین پر پہنچے اور یہیں اترنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن سے یزید کا ٹڈی دَل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا، اور تمام راستے بند کر دئے گئے۔ امام حسینؑ کے ساتھ صرف بہتر جاں باز تھے اور اُدھر ہزاروں کا لشکر۔

سات دن تک امن قائم رکھنے کے لئے صلح کی کوشش ہوتی رہی۔ حضرت یہاں تک تیار ہوئے کہ عرب کا ملک چھوڑ دیں، کسی دور دراز سرزمین پر چلے جائیں اور اس طرح اپنے کو بیعت یزید سے الگ رکھتے ہوئے بھی ایسی صورت پیدا کر دیں کہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مگر نویں محرم کی سہ پہر کو صلح کے امکانات ختم ہو گئے۔ ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا، اس میں لکھا تھا کہ ''یا حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت قبول کریں یا ان سے جنگ کی جائے''، اس خط کے پہنچتے ہی فوج یزیدی نے حملہ کر دیا۔

باوجودیکہ ساتویں سے پانی بند ہو چکا تھا، امام حسینؑ کے سامنے ان کے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کی بے تابی کے مناظر، العطش کی صدائیں اور مستقبل کے حالات سب ہی کچھ تھے۔ مگر یزید کی بیعت اب بھی اسی طرح غیر ممکن تھی جس طرح اس کے پہلے۔ بے شک آپ نے یہ چاہا کہ ایک رات کی مہلت مل جائے، آپ چاہتے تھے کہ یہ پوری رات آخری طور پر عبادت خدا میں بسر کریں۔ اس کے علاوہ دوست و دشمن دونوں کو جنگ کا قطعی فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنے اپنے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع مل جائے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے تقریر فرمائی آپ نے فرمایا: ''کل قربانی کا دن ہے ان ظالموں کو مجھ سے دشمنی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ تم لوگ بھی اپنی زندگی کو میرے ساتھ خطرے میں ڈالو۔ میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ اس رات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ۔'' مگر ان جانبازوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ''ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے۔''

عاشور کی رات ختم ہوئی۔ دسویں محرم کو صبح سے عصر تک کی مدت میں ان بہادروں نے جو کچھ کہا تھا اسے کر کے دکھا دیا۔ اس وفاداری، استقلال اور بہادری کے ساتھ حضرت امام حسینؑ کی نصرت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان میں حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ، سوید ابن عمر، انس ابن حارث اور عبدالرحمن ابن عبدرب ایسے ساٹھ ستر اور اسی برس کے بوڑھے تھے اور متعدد اصحاب رسول بھی تھے۔ بریر ہمدانی، کنانہ ابن عتیق تغلبی، نافع ابن ہلال، حنظلہ ابن اسعد ایسے حفاظ قرآن تھے اور بہت سے علماء اور راویان حدیث، بہت سے عابد اور شب زندہ دار اور بہت سے ایسے شجاعان روزگار تھے جن کی شجاعت کے کارنامے لوگوں کی زبان پر تھے۔

جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی۔ سب سے پہلے حضرت نے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو جو شبیہ پیغمبرؐ بھی تھے مرنے کے لئے بھیج دیا علی اکبرؑ نے جہاد کر کے اپنی جان دین خدا پر نثار کی امام حسینؑ کو شبیہِ رسولؐ کی جدائی کا صدمہ تو بہت ہوا مگر عمل کے راستے میں آپ کی

ہمت کے حوصلے اور ولولے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ عقیلؑ کی اولاد عبداللہ ابن جعفر کے فرزند ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امام حسنؑ کے یتیم قاسمؑ کی جدائی آپ کو بہت شاق ہوئی۔ مگر اپنے بزرگ مرتبہ بھائی کی وصیت کو پورا کرتے ہوئے قاسمؑ کو بھی رخصت کر دیا۔

سب کے آخر میں فرزندان امیر المومنینؑ میدان جہاد میں گئے جب کوئی نہ رہا تو علمدارؑ کی باری آ گئی۔ قمر بنیہاشم ابوالفضل العباسؑ کو حضرت کسی طرح اجازت جہاد نہ دیتے تھے۔ کیوں کہ ان کے کاندھوں پر اسلام کا علم لہرا رہا تھا۔ مگر آخر ایک طرف بچوں کی پیاس دوسری طرف جوش جہاد۔ عباسؑ پانی لینے کے لئے ایک مشک اپنے ساتھ لے کر فرات کی جانب متوجہ ہوئے انھوں نے علم کی حفاظت بھی کی۔ دشمنوں سے مقابلہ بھی کیا۔ فوج کو ہٹا کر نہر کا راستہ بھی صاف کیا اور مشک میں پانی بھی بھر لیا۔ مگر افسوس کہ یہ پانی خیام حسینی تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ بہادر علمدار کے شانے قلم ہوئے۔ مشک تیر سے چھدی اور پانی زمین پر بہا عباسؑ کی قوت ختم ہوگئی۔ گُرز کے صدمہ سے زمین کی طرف جھکے اور علم عباسؑ کے ساتھ زمین پر آ گیا۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہوگئی۔ پشت جھک گئی مگر ہمت پھر بھی نہیں ٹوٹی، اب جہاد کے میدان میں حسینؑ کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا مگر فہرست شہداء میں ابھی ایک بے مثال مجاہد کا نام باقی تھا۔ جس کا جواب قربانی کی تاریخ میں نہ پہلے نظر آیا نہ بعد میں نظر آ سکتا ہے۔ یہ چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا جو گہوارے میں پیاس سے جاں بلب تھا۔ حسینؑ در خیمہ پر تشریف لائے اور اس بچہ کو طلب فرمایا۔ بچے کی عطش اور اس کی حالت کا مشاہدہ فرمایا۔ یقیناً یہ منظر ہر حساس انسان کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا۔ مگر کیسے بے رحم تھے وہ سختِ دل فوج شام کے سپاہی جنھوں نے حسین کے ہاتھوں پر اس معصوم بچے کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ رحم کھاتے، بچے کو ایک قطرۂ آب سے سیراب کرتے، ظلم اور شقاوت کا مظاہرہ انتہائی حد تک پہنچا دیا۔ سخت دل حرملہ کا تیر اور بچہ کا نازک گلا۔

امام حسینؑ نے یہ آخری ہدیہ بھی بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیا تو خود بہ نفس نفیس میدان جہاد میں قدم

رکھا اور باوجود اس بے کسی اور شکستگی کے جب کہ یقینا تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے دن بھر اصحاب واعزا کی لاشیں اُٹھائی تھیں اور بہتر داغ سینہ پر کھا چکے تھے۔ بھائی کے غم سے کمر شکستہ تھی اور اولاد کے داغ سے کلیجہ زخمی ہو گیا تھا۔ مگر جب نصرت اسلام کے لئے تلوار نیام سے نکالی تو دنیا کو حمزہؑ اور جعفرؑ کی شان اور حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلا دی۔ آخر قربانی کی منزل سامنے آ گئی۔ دشمنوں کی تلواریں، نیزے اور تیر اور وہ مقدس جسم، زخموں کی کثرت، خون کے بہنے سے گھوڑے پر سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ دشمنوں نے ایذا رسانی کی کوئی حسرت باقی نہ رکھی۔ شمر کا خنجر فرزند رسولؐ کے گلے پر کیا پھرا گویا رسولؐ کا سر قلم ہوا۔ اور نام نہاد کلمۂ اسلام پڑھنے والوں نے پیغمبر اسلام کے نواسے کا سر نیزہ پر بلند کیا اتنا ہی نہیں بلکہ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ خانوادۂ عصمت کی مقدس بی بیوں کے سروں سے چادریں اتاری گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں کے سُموں سے پامال کی گئیں۔

امام حسینؑ کے بعد مردوں میں صرف ایک بیمار فرزند سید سجادؑ باقی تھے، جنھیں طوق وزنجیر پہنایا گیا اور بیبیوں اور بچوں کے ساتھ قید کر کے شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام قیدیوں کی صورت سے لے جائے گئے اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں کھڑے کئے گئے۔

ان نام کے مسلمانوں نے تو پیغمبر اسلامؐ کے فرزند کو دفن وکفن سے بھی محروم رکھا تھا مگر آس پاس کے رہنے والے قبیلۂ بنی اسد کے لوگوں نے فوج ظلم کے چلے جانے کے بعد ۱۲ محرم کو یعنی شہادت سے تیسرے دن دفن کیا۔

آج کربلائے معلّٰی میں حسینؑ کا روضہ انتہائی شان وشوکت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور حسینؑ کے نام کا تعزیہ اور ضریح اور عَلم اور مختلف مظاہرات دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں۔ حسینؑ دنیا میں قائم ہیں اور حسینؑ کی بدولت اسلام باقی ہے اور صداقت واستقلال اور حق پرستی کے لئے امام حسینؑ کا اسوۂ حسنہ تاریخ انسانیت میں بے مثال حیثیت سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اگر واقعۂ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرے۔ اور سید الشہداء نے کربلا میں جو بے نظیر نمونہ

پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی جاری رہے تو زندگی کے آثار نمایاں ہوجائیں۔

ہم میں کیا کمی ہے۔ یہی ہے کہ ہم بلند مقاصد کے سامنے اپنے وقتی مفاد، اپنے راحت وآرام، اپنی زندگی، اپنی قرابتوں اور اپنے اہل وعیال اور اولاد اور نہ جانے کتنی روپہلی سنہری مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہیں۔

امام حسینؑ نے یہ مثال پیش کی ہے کہ تم بلند مقاصد کے لئے اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار رہو۔ مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے تئیں عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

حسینؑ: معراجِ انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جس طرح حضرت امام حسنؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۲ھ ۳ھ اسی اعتبار سے امام حسینؑ کی ولادت کے متعلق دو قول ہیں ۳ھ اور ۴ھ اگر ان کی ولادت ۲ھ میں ہوئی ہے تو ان کی ۳ھ میں ہے اور اگر ان کی ولادت ۳ھ میں ہے تو ان کی ۴ھ میں ولادت ہوئی ہے۔ اس طرح وفات رسولؐ کے وقت ان کا چھٹا یا ساتواں برس تھا۔

اس دور اور اس کے بعد جنابِ امیرؑ کے دور میں جو کچھ حسن مجتبیٰؑ کے ساتھ رہا وہ حسینؑ کی سیرت کے ساتھ بالکل متحد ہے اس لئے کہ ایک سال کے فرق سے کوئی فرق احساسات، تأثرات اور ان کے مقتضیات میں نہیں ہوتا۔ جن واقعات سے جتنا وہ متأثر ہو سکتے تھے اتنا ہی یہ اثر لے سکتے تھے۔ وفات رسولؐ کے بعد سے پچیس برس کا دور جو امیر المومنینؑ نے گوشہ نشینی میں گذارا وہ جس طرح ان کے لئے ایک دور ابتلاء تھا ان کے لئے بھی تھا۔ جو جو مناظر ان کے سامنے آرہے تھے وہ ان کے سامنے بھی بلکہ امام حسنؑ کو تو دنیا نے صرف بحیثیت صلح پسند اور حلیم کے پہچانا ہے اس لئے وہ اس دور میں ان کے امتحان کی عظمت کو بآسانی شاید محسوس نہ کرے مگر حسینؑ کو تو دنیا نے روز عاشور کی روشنی میں دیکھا ہے اور بڑا صاحب غیرت وحمیت، خوددار گرم مزاج اور اقدام پسند محسوس کیا ہے اس روشنی میں پچیس برس کے دور خاموشی پر نظر ڈالئے ظاہر ہے کہ ان کے شباب کی منزلیں وہی تھیں جو حضرت امام حسنؑ کی تھیں۔ ۲۵ / سال کی مدت کے اختتام پر وہ تینتیس برس کے تھے تو یہ بتیس برس کے گویا عمر کے لحاظ سے حسینؑ اس وقت عباسؑ تھے کربلا میں جو ابوالفضل العباس کے شباب کی منزل تھی وہ ۲۵ سال کی گوشہ نشینی کے اختتام پر حسینؑ کے شباب کی منزل تھی۔ اس عمر تک وہ تمام

واقعات سامنے آتے ہیں جو اس دور میں پیش آتے رہے اور امام حسینؑ خاموش رہے۔ مصائب و حوادث کے وہ تمام جھونکے آئے اور ان کے سکوت کے سمندر میں تموج پیدا نہ کر سکے۔

ان کے ۲۵ برس حضرت علیؑ کی مکہ کی زندگی کے ۱۳ برس کے موازی ہیں وہ پیغمبرؐ کی خاموشی کے رفیق۔ یہ حضرت علیؑ کی خاموشی کے ہمدم۔ وہ حضرت رسولؐ پر مظالم دیکھ رہے تھے جوان کے مجازی حیثیت سے باپ کی حیثیت رکھتے تھے اور یہ حضرت علیؑ پر مظالم دیکھ رہے تھے جو ان کے حقیقی حیثیت سے باپ تھے جس طرح وہاں کوئی تاریخ نہیں بتائی کہ کسی ایک دفعہ بھی علیؑ کو جوش آ گیا ہو اور رسولؐ کو علیؑ کے روکنے کی ضرورت پڑی ہو۔ اسی طرح کوئی روایت نہیں بتاتی کہ اس ۲۵ برس کی طویل مدت میں کبھی حسینؑ کو جوش آ گیا ہو اور حضرت علیؑ نے بیٹے کو روکنے کی ضرورت محسوس فرمائی ہو یا سمجھانے کی کہ یہ نہ کرو۔ اس سے ہمارے مقصد یا اصول کو نقصان پہنچے گا۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ جب حضرت علیؑ نے میدان جہاد میں قدم رکھا تو اب جہاں حسنؑ تھے وہیں حسینؑ بھی تھے وہ باپ کے داہنی طرف تو یہ بائیں طرف۔ ہر معرکہ میں عملی حیثیت سے شریک ہیں۔ اس کے بعد جب صلحنامہ لکھا گیا تو جہاں بڑے بھائی کے دستخط ہیں وہیں چھوٹے بھائی کے دستخط۔ جناب امیرؑ کی شہادت کے بعد اسی طرح یہ حضرت امام حسنؑ کے ساتھ ہیں جہاد میں بھی اور صلح میں بھی۔ ابوحنیفہ دینوری نے الاخبار الطوال میں لکھا ہے کہ صلح کے بعد دو شخص امام حسنؑ کے پاس آئے۔ یہ جذباتی قسم کے دوست تھے صحیح معرفت نہ رکھتے تھے انھوں نے سلام کیا:

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا مُذِلَّ الْمُؤْمِنِیْنَ: ''اے مومنوں کو ذلیل کرنے والے آپ پر سلام ہو''

یہ بخیال خود مومنین ہیں جن کا یہ اخلاق ہے اور یہ ان کا بلند اخلاق ہے کہ ایسے الفاظ کے ساتھ جو سلام ہو اس کا بھی جواب دینا لازم سمجھتے ہیں اور نرمی کے ساتھ فرماتے ہیں۔

لَسْتُ مُذِلَّهُمْ بَلْ مُعِزُّهُمْ میں نے مومنین کو ذلیل نہیں کیا بلکہ ان کی عزت رکھ لی اس کے بعد مختصر طور پر انہیں صلح کے مصالح سمجھائے جس پر وہ خاموش سے ہو گئے اور اب وہ اٹھ کر امام

حسینؑ کے پاس آئے اور خود ہی یہ واقعہ پیش کیا کہ ہم سے امام حسنؑ سے گفتگو یہ ہوئی ہے۔ آپ نے امام حسنؑ کا جواب سننے کے بعد فرمایا:

صَدَقَ اَبُوْ مُحَمَّدٍ یعنی حضرت امام حسنؑ نے بالکل سچ فرمایا۔ صورت حال یہی تھی اور اس کا تقاضا اسی طرح تھا۔

بعض سورما قسم کے آدمی آئے اور انھوں نے کہا: آپ حسن مجتبیٰؑ کو چھوڑ یئے، وہ صلح کے اصول پر برقرار ہیں مگر آپ اٹھئے ہم آپ کے ساتھ ہیں اچانک حکومت شام پر ہلّہ بول دیں۔ امام حسینؑ نے فرمایا: غلط بالکل غلط۔ ہم نے ایک معاہدہ کر لیا ہے اور اب ہم پر اس کا احترام لازم ہے۔ ہاں اسی وقت حضرت نے یہ کہہ دیا کہ تم میں سے ہر ایک کو اس وقت تک باکل چپ چاپ بیٹھا رہنا چاہئے جب تک یہ شخص یعنی معاویہ زندہ ہے۔ یہ آپ کا تدبر تھا۔ آپ جانتے تھے کہ معاویہ کی طرف سے آخر میں اور شرائط کے ساتھ اس شرط کی خلاف ورزی ہوگی۔ کہ انہیں اپنے بعد کسی کو نامزد نہ کرنا چاہئے۔ اس وقت ہمیں اٹھنے کا موقع ہوگا۔

اب کون کہہ سکتا ہے کہ حسنؑ کی صلح کے بعد حسینؑ کی جنگ کسی پالیسی کی تبدیلی، ندامت و پشیمانی یا اختلاف رائے و مسلک کا نتیجہ تھی؟ ۲۰ سال پہلے کہا جا رہا ہے کہ ہمیں اس وقت تک خاموش رہنا چاہئے جب تک معاویہ زندہ ہے اس سے ظاہر ہے کہ ۲۰ برس کی طویل راہ کے تمام سنگ میل نظر کے سامنے ہیں اور پورا لائحہ عمل پہلے سے بنا ہوا مرتب ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ طویل سکوت بھی اسی معاہدہ کے ماتحت ضروری ہے اور اس وقت کے اقدام کا بھی اسی معاہدہ کے ماتحت حق ہوگا۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شک ہے کہ حسن مجتبیٰؑ کی صلح حسینؑ بن علیؑ کی جنگ کی ایک تمہیدی تھی۔ اور کچھ نہیں۔

۴۱ھ میں یہ صلح ہوئی اور ۶۰ھ میں معاویہ نے انتقال کیا اس بیس سال کی طولانی مدت میں کیا کیا ناسازگار حالات پیش آئے اور عمال حکومت نے کیا کیا تکلیفیں پہنچائیں مگر ان تمام حالات کے

باوجود جس طرح رسولؐ کے ساتھ علیؑ مکہ کی تیرہ برس کی زندگی میں جس طرح حضرت علیؑ کے ساتھ حسن مجتبیٰؑ اور خود حسینؑ ۲۵ برس کی گوشہ نشینی کے دور میں، اسی طرح حضرت امام حسنؑ کے ساتھ امام حسینؑ دس برس کے ان کے دورِ حیات میں جو صلح کے بعد تھا حالانکہ اس زمانہ کے حالات کو وہ کن عمیق قلبی تأثرات کے ساتھ دیکھتے تھے ان کا اندازہ خود ان کے اس فقرے سے ہوتا ہے جو انہوں نے حضرت امام حسنؑ کے جنازے پر مروان سے کہا تھا۔

جب مروان نے وفاتِ حسنؑ پر اظہار افسوس کیا تو امام حسینؑ نے فرمایا، کہ اب رنج و افسوس کر رہے ہو اور زندگی میں ان کو غم و غصہ کے گھونٹ تم پلاتے تھے جو کہ یاد ہیں مروان نے جواب دیا بیشک! وہ ایسے کے ساتھ تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ متحمل اور پُرسکون تھا۔

یہ تعریف اس وقت مروان امام حسنؑ کی کر رہا تھا جب دنیا سے اٹھ چکے تھے۔ مگر کیا اس تعریف میں خود حسینؑ بھی حصہ نہ رکھتے تھے؟ کیا اس طویل مدت میں انہوں نے کوئی جنبش کی جو حسن مجتبیٰؑ کے سکون کے مسلک کے خلاف ہوتی؟ پھر امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ جو ناگوار صورت پیش آئی وہ روضۂ رسولؐ پر دفن سے روکا جانا۔ وہ تیروں کا برسایا جانا۔ یہاں تک کچھ تیروں کا جسدِ امام حسنؑ تک پہونچنا۔ یہ صبر آزما حالات اور ان سب کو امام حسینؑ کا برداشت کرنا۔

کوئی شاید کہے کہ حسینؑ کیا کرتے؟ بے بس تھے مگر کیا کربلا میں حسینؑ کو دیکھنے کے بعد وہ یہ کہنے کا حق رکھتا ہے؟ کربلا میں تو سامنے کم از کم ۳۰ ہزار تھے اور جنازہ حسنؑ پر سدّ راہ ہونے والی جماعت زیادہ سے زیادہ کئی سو ہوگی۔ حسینؑ کے ساتھ عباسؑ بھی موجود ہیں جو اس وقت ۲۲ برس کے مکمل جوان تھے جناب محمد حنفیہ بھی موجود تھے جن کی شجاعت کا تجربہ دنیا کو حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ جمل اور صفین میں ہو چکا تھا۔ مسلم بن عقیل بھی موجود تھے جنہیں بعد میں پورے کوفہ کے مقابلہ میں تن تنہا حسینؑ نے بھیج دیا اور انہوں نے اکیلے وہ بے نظیر شجاعت دکھائی جو تاریخ میں یادگار رہے۔

علی اکبرؑ بھی بنا برقول قوی اس وقت ۱۵ برس کے تھے جو کربلا کے قاسمؑ سے زیادہ عمر رکھتے تھے اور تمام بنی ہاشم موجود تھے۔ پھر کچھ تو آل رسولؐ کے وفادار غلام اور دوسرے اعوان و انصار بھی موجود ہی تھے اس صورت حال میں حضرت امام حسینؑ کے عمل کو بے بسی کا نتیجہ سمجھنا کہاں درست ہوسکتا ہے۔

مگر حسینؑ خاموش رہتے ہیں اور ان سب کو خاموشی پر مجبور رکھتے ہیں امام حسنؑ کا جنازہ واپس لے جاتے ہیں جنت البقیع میں دفن کر دیتے ہیں اور اس کے بعد دس برس حسنی صلح کے مسلک پر خاموشی کے ساتھ گزار دیتے ہیں اور اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے بھائی کا دباؤ یا مروت اور احترام کا تقاضا نہ تھا بلکہ مفاد اسلامی کا لحاظ تھا جس کے وہ بھی محافظ تھے اور اب یہ اس کے محافظ ہیں۔

اور ادھر حکومت شام کی طرف سے اس تمام مدت میں ہر ہر شرط کی خلاف ورزی ہو رہی تھی۔

چُن چُن کے دوستانِ علیؑ کو قتل کیا جا رہا تھا اور جلا وطن کیا جا رہا تھا۔ کیسے کیسے افراد؟ حجر بن عدی اور ان کے ۱۶ ساتھی۔

یہ دمشق کے باہر مرج عذراء میں سولی چڑھا دیئے جاتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہ حجر بن عدی فضلائے صحابہ میں سے تھے۔ مسائل فقہیہ میں ان کے فتاویٰ جمع کئے جائیں تو ایک جزو کا رسالہ ہو جائے۔ مگر علیؑ کے دوست تھے اس لئے ان کی صحابیت بھی کام نہ آسکی۔ کوفہ سے قید کر کے دمشق بلوائے گئے۔ حاکم شام نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے پوچھ گچھ یا صفائی پیش کرنے کا موقع بھی دینا پسند نہ کیا۔ حکم ہو گیا کہ بیرونِ شہر ہی روک دیئے جائیں اور وہیں سولی دے دی جائے۔ ان کی شہادت اتنی دردناک تھی کہ عبداللہ بن عمر نے اس کا ذکر سنا تو چیخیں مار کر رونے لگے۔ ام المومنین عائشہ کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے کہا۔

آخر معاویہ خدا کو کیا جواب دے گا، کہ ایسے ایسے نیکوکار مسلمانوں کا خون کر رہا ہے۔

عمرو بن الحمق الخزاعی وہ بزرگوار تھے جنہیں پیغمبرؐ خدا نے غائبانہ طور پر اپنے سلام سے سرفراز کیا تھا ان کا سر کاٹ کر نوک نیزہ پر بلند کیا گیا۔ یہ سب سے پہلا سر تھا جو اسلام میں نیزہ پر بلند ہوا۔

ان حوادث سے عبداللہ بن عمر اور عائشہ بنت ابی بکر ایسے لوگ اس قدر متاثر تھے تو حسینؑ بن علیؑ جن کے والد بزرگوار کی محبت کی پاداش ہی میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا جتنا بھی متاثر ہوتے کم تھا۔

پھر حضرت امام حسنؑ کے دس سال تک سکوت اور عدم تعرض کی جو قیمت ان کو ملی یعنی زہر قاتل اور کلیجے کے بہتر ٹکڑے اور پھر ان کی وفات پر دمشق کے قصر سے اظہارِ مسرت میں اللہ اکبر کی بلند آواز۔ ان سب باتوں کے بعد حضرت امام حسینؑ کی خاموشی۔ کیا کسی میں ہمت ہے جو اس وقت کے حسینؑ پر جنگجوئی کا الزام عائد کر سکے؟

اب اس کے بعد وہ ہنگام آیا جسے امام حسینؑ کی آنکھیں بیس برس پہلے دیکھ رہی تھیں یعنی حاکم شام نے اپنے بیٹے یزید کی خلافت کی داغ بیل ڈال دی اور اس کے لئے عالم اسلام کا دورہ کیا۔

اب امام حسینؑ کے لئے وہ شاہراہ سامنے آ گئی جو انکارِ بیعت سے شروع ہوئی اور آخر تک انکارِ بیعت ہی کی شکل میں قائم رہی۔

پھر اس انکارِ بیعت کو کیا کوئی وقتی، جذباتی فیصلہ یا ہنگامی جوش کا نتیجہ سمجھا جا سکتا ہے؟

یاد رکھنا چاہئے کہ انکارِ بیعت تو ابھی تک کبھی قانونی جرم قرار بھی نہ پایا تھا۔ خلافتِ ثلٰثہ میں بہت سوں نے بیعت نہیں کی۔

حضرت علیؑ کے دور میں عبداللہ بن عمر نے بیعت نہیں کی اسامہ بن زید نے بیعت نہیں کی سعد بن ابی وقاص نے بیعت نہیں کی۔ حسان بن ثابت نے بیعت نہیں کی۔ مگر ان بیعت نہ کرنے والوں کو واجب القتل نہیں سمجھا گیا۔

امام حسینؑ نے بیعت نہ کر کے اپنے کو حمایت باطل سے الگ کیا بس۔ اس کے علاوہ کوئی اقدام نہیں کیا۔ مگر معاویہ کے بعد جب یزید برسر اقتدار آیا تو اس نے پہلا ہی حکم اپنے گورنر ولید کو یہ بھیجا کہ حسینؑ سے بیعت لو اور بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دو۔ یہ تشدد کا آغاز کدھر سے ہو رہا ہے؟ حاکم مدینہ کو اس حکم کی تعمیل کی ہمت نہ ہوئی تو اسے معزول کیا گیا۔ امام حسینؑ کو اگر تشدد

سے کام لینا ہوتا تو آپ ہلاکت معاویہ کی خبر ملتے ہی مدینہ کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیتے جو اس وقت ان کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ اس کے بعد کم از کم عالم اسلام تقسیم تو ہو ہی جاتا مگر آپ ایسا نہیں کرتے بلکہ جا کر مکہ میں پناہ لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں کسی کی جان لینا نہیں ہے اپنی جان بچانا منظور ہے۔ یہ ''ہم وجودی'' کا عملی پیغام ہے۔

بظاہر اسباب اگر یہاں قیام کا ارادہ مستقل نہ ہوتا تو احرام حج کیوں باندھتے؟ احرام باندھنا خود نیت حج کی دلیل ہے اور نیت کے بعد بلا وجہ حج توڑنا جائز نہیں۔ حضرت امام حسینؑ سے بڑھ کر مسائل شریعت سے کون واقف ہوگا اور یہ ان کا مخالف بھی خیال نہیں کر سکتا کہ وہ جان بوجھ کر حکم شریعت کی معاذ اللہ مخالفت کریں گے اور وہ بھی کب جبکہ حج کو صرف ایک دن باقی ہے۔

وہ جن کا ذوق حج یہ تھا کہ مدینہ سے آ آ کر ۲۵ حج پا پیادہ کر چکے ہیں اب مکہ میں موجود ہوتے ہوئے حج کو عمرہ سے تبدیل فرما دیتے اور مکہ سے روانہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرز عمل سے خود ظاہر ہے کہ اس کا سبب غیر معمولی اور ہنگامی ہے۔ چنانچہ ہر ایک پوچھ رہا تھا اور بڑی وحشت اور پریشانی کے ساتھ۔ آئیں! آپ اس وقت مکہ چھوڑ رہے ہیں؟

یہ ہر سوال امامؑ کے دل پر ایک نشتر تھا ہر ایک سے کہاں تک بتلاتے۔ کسی کسی سے کہہ دیا کہ نہ نکلتا تو وہیں قتل کر دیا جاتا اور میری وجہ سے حرمت خانۂ کعبہ ضائع ہو جاتی۔

مکہ میں آنا بھی خطرہ کو حتی الامکان ٹالنا تھا اور اب مکہ سے جانا بھی یہی ہے اب آپ کوفہ تشریف لے جا رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں نے آپ کو اپنی ہدایت دینی اور اصلاح اخلاقی کے لئے دعوت دی ہے مگر بیچ میں فوج حُر آ کر سدّ راہ ہوتی ہے اب آپ پہلا کام یہ کرتے ہیں کہ اس پوری فوج کو جو پیاسی ہے سیراب کر دیتے ہیں۔ یہ فیاضی بھی جنگجویانہ انداز سے بالکل الگ ہے اس کے بعد وہ موقع آیا کہ نہر پر خیموں کے برپا کرنے کو روکا گیا اس وقت اصحاب کی تیوریوں پر بل تھے مگر امامؑ نے فرمایا کہ مجھے جنگ میں ابتداء کرنا نہیں ہے۔ ریتی ہی پر خیمے برپا کر دو یہ نفس پر جبر اور حلم و تحمل وہ

کر رہا ہے جسے بالآخر جان پر کھیل جانا اور اپنا پورا گھر قربان کر دینا ہے مگر وہ اس وقت ہوگا جب اس کا وقت آئے گا اور یہ اس وقت ہے جب اس کا وقت ہے۔

پھر عمر سعد کربلا میں پہونچتا ہے تو آپ خود اس کے پاس گفتگوئے صلح کے لئے ملاقات کا پیغام بھیجتے ہیں۔ ملاقات ہوتی ہے تو شرطیں ایسی پیش فرماتے ہیں کہ ابن سعد خود اپنے حاکم عبیداللہ بن زیاد کو لکھتا ہے کہ فتنہ وافتراق کی آگ فرو ہوگئی ہے۔ اور امن وسکون میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ حسینؑ ملک چھوڑنے تک کے لئے تیار ہیں اس کے بعد خونریزی کی کوئی وجہ نہیں۔

اب یہ تو فریق مخالف کا عمل ہے کہ اس نے ایسے صلح پسندانہ رویہ کی قدر نہ کی اور صلح کے لئے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹک کر پیچھے ہٹا دیا لیکن اس شرط پر حکومت مخالف راضی ہوگئی ہوتی۔ پھر حضرت امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی افتادِ طبع میں کسی اختلاف کا تصور کرنے والوں کے تصورات کی کیا بنیاد باقی رہ سکتی تھی اور صورت حال کے سمجھنے کے بعد اب بھی یہ تصورات تو غلط ثابت ہو ہی گئے مگر وہ ابن زیاد کی تنگ ظرفی فرعونیت اور یزید کے منشاء کی تکمیل تھی کہ اس نے حضرت امام حسینؑ پر صلح وامن کے سب راستوں کو بند کر دیا۔

پھر بھی جب نویں تاریخ کی سہ پہر کو حملہ ہوگیا تو حضرت نے ایک رات کی مہلت لے لی جسے جنگ کرنا ہی مطلوب تھا وہ التوائے جنگ کی درخواست کیوں کرتا مگر اس ایک رات کی مہلت کو حاصل کر کے بھی آپ نے اپنی امن پسندی کا ثبوت دیا اور دکھلا دیا کہ جنگ تو مجھ پر خواہ مخواہ عائد کی جا رہی ہے میں جنگ کا اپنی طرف سے شوق نہیں رکھتا ہوں

پھر صبح عاشور کوئی دقیقہ موعظہ ونصیحت اور اتمام حجت کا اٹھا نہیں رکھا۔ خطبہ جو پڑھا وہ اونٹ پر سوار ہو کر اس لئے کہ وہ ہنگامِ امن کی سواری ہے گھوڑے پر نہیں سوار ہوئے جو جنگ کے ہنگام کا مرکب ہوتا ہے۔

باوجودیکہ خطبہ کے جو جواب ملے وہ دل شکن تھے مگر اس کے بعد بھی آپ نے اس کا انتظار کیا

کہ فوج دشمن کی طرف سے ابتدا ہو اور جب پہلا تیر عمر سعد نے چلۂ کمان میں جوڑ کر اپنی فوج سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ کہہ کے لگایا کہ۔ گواہ رہنا پہلا تیر فوج حسینی کی طرف میں رہا کر رہا ہوں ۔ اور اس کے بعد چار ہزار تیر کمانوں سے روانہ ہو گئے اور جماعتِ حسینی کی طرف آ گئے۔ اس وقت مجبور ہو کر امامؑ نے اذن جہاد دیا۔ اور اس کے بعد بھی خود اس وقت تک جہاد کے لئے تلوار نیام سے نہیں نکالی جب تک آپ کی ذات میں انحصار نہیں ہو گیا۔ جب تک ایک بھی باقی رہا آپ نے شمشیر زنی نہیں کی۔ اور اس طرح پیغمبرؐ کے کردار کی تفسیر کر دی۔ جب کوئی نہ رہا اس وقت تلوار کھینچی اور یہ ایسا وقت تھا جب کسی دوسرے میں دم نہ ہوتا کہ وہ جنبش بھی کر سکتا تین دن کی بھوک پیاس اور اس پر صبح سے سہ پہر تک کی تمازت آفتاب میں شہداء کے لاشوں پر جانا اور پھر خیمہ گاہ تک پلٹنا اور پھر بہتر کے داغ، عزیزوں کے صدمے اور ان کی لاشوں کا اٹھانا۔

جوان بیٹے کا بصارت لے جانا اور بھائی کا کمر توڑ جانا اور اپنے ہاتھوں پر ایک بے شیر کو دم توڑتے میں سنبھالنا۔ اور نوک شمشیر سے ابھی ابھی اسکی قبر بنا کر اٹھنا۔ اب اس عالم میں جذبات نفس کا تقاضا تو یہ ہیکہ آدمی خاموشی سے تلواروں کے سامنے اپنا سر بڑھا دے اور خنجر کے آگے گلا رکھ دے مگر حسینؑ اسلامی تعلیم کے محافظ تھے ظلم کے سامنے سپردگی آئین شریعت کے خلاف ہے حسینؑ نے اب فریضۂ وفا کی انجام دہی اور دشمنان خدا کے مقابلہ کے لئے تلوار اٹھائی اور وہ جہاد کیا جس نے بھولی ہوئی دنیا کو حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلا دی اور اس طرح دکھا دیا کہ ہمارے اعمال و افعال جذبات نفس اور طبیعت کے تقاضوں کے ماتحت نہیں بلکہ فرائض وواجبات کی تکمیل اور احکام ربانی کی انجام دہی کے ماتحت ہوتے ہیں۔ چاہے طبعی تقاضے اس کے کتنے ہی خلاف ہوں۔

یہی انسانیت کی وہ معراج ہے جس کی نشاندہی حضرت امام حسینؑ کے اسلاف کرتے رہے اور وہی آج حسینؑ کے کردار میں انتہائی تابانی کے ساتھ نمایاں ہیں۔

حسینؑ ہر قوم کی پیشوائی کے قابل ہیں

علامۂ ہندی آیۃ اللہ سید احمد طاب ثراہ

دنیا آزاد و مختار ہے جس کو چاہے پیشوائی کے واسطے منتخب کر لے ہم کو اعتراض کا کیا حق ہے؟ لیکن صحیح فیصلہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ اس نے جو فلسفۂ زندگی بتایا ہے وہ عام انسانوں کی زندگی پر مکمل طور سے اثر انداز ہے اور انسان کی بے چینی میں روح کو تسکین واطمینان دلانے کے قابل ہے۔ اس میں انسانی دبے ہوئے جذبات ابھارنے کی پوری قوت ہے۔ تمام انسانوں کو یکساں طاقتور بنا سکتا ہے۔ تہذیب وشرافت پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت ہے۔ انسان کو ہر کمزوری سے بچا سکتا ہے۔ ہر موقع ومحل پر ہمیشہ اس کی تعلیم انسان کو مدد دے سکتی ہے وہ حقیر شکایات کے سامنے اور وسیع النظری پیدا کرنے میں معین ہو۔ صبر واستقلال اور ایثار وقربانی کی مکمل تعلیم دے۔

دیکھ لو امام حسینؑ نے یزیدی بہیمانہ مطالبات کو ٹھکرا کر اقوام عالم کو جو سبق دیئے وہ غیر فانی ہیں یا نہیں! فلسفۂ شہادت امام حسینؑ پر اگر غور سے نظر کرو گے تو تم کو زندگی کے ہر شعبہ میں مدد ملے گی۔ جن لوگوں نے اس فلسفہ کو سمجھا وہ بے شک حسینی رنگ میں رنگ گئے۔ کربلا کے بوڑھے بچے جوان آزاد اور غلام حتیٰ کہ عورتیں حسینی سیرت اختیار کر کے مظہر ذات حسینی بن گئیں تھیں، جو دوست دشمن سب کے خراج تحسین آج تک وصول کر رہی ہیں۔ اور ہر ایک کی عملی زندگی آنے والی نسلوں کے لئے سرچشمۂ ہدایت ہو گئیں۔ امام کی عملی زندگی نے انسان کے مردہ جذبات میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

۱۔ اموی قید خانے کے دروازے توڑ توڑ کر قیدیوں نے حریت وآزادی حاصل کرنے کے لئے اموی تخت وتاج الٹ دیا۔ جس کی ابتدا سلیمان ومختار نے کی اور ہمیشہ اس بھولے ہوئے سبق کو جب رعایا یاد کرے گی کیسی ہی ضعیف اور کمزور ہو اپنی عملی طاقت سے کایا پلٹ دے گی۔

۲۔ جو ادیب وشاعر جنگ وپیکار اور ظلم واستبداد پر قصیدہ خواں تھے اور ادبیت کا انحصار خونخواری کی مدح پر ہو گیا تھا۔ شہادت حسینؑ نے انسانیت کی ذہنیت بدل کر مظلومیت و بےکسی کی مدح شروع کرا دی اور نوحہ ومرثیہ جان ادب بن گیا۔

۳۔ ظالم وجابر اپنے جبر وتشدد پر فخر ومباہات کرتے اور خدائی اختیارات کا خود کو مالک سمجھتے تھے اور کسی ظلم واستبداد پر شرمندہ نہ ہوتے تھے، لیکن آج وہی ظالم ظلم کی سو تاویلیں کرتے اور مظلومانہ اور معصومانہ لہجہ میں اپنے مظالم حق بجانب ہونے کو پیش کرتے ہیں۔ ظالم کہے جانے کو گوارا نہیں کرتے ہیں۔

۴۔ قانون سیاست میں رعایا کی کوئی آواز نہ تھی۔ صرف آمریت وحکومت کو خدائی اختیار سمجھتے تھے، اور خدائی اولوالامر قرار دیتے تھے۔ تنہا امام حسینؑ کے بعد مردہ دل رعایا کو زندگی ملی۔ اب حکومت مجبور ہے کہ حیلہ اور دھوکا دہی کے واسطے ایسے قوانین بنا دے جس سے رائے عامہ کو موافق رکھے اور ہر خونخواری کو قومی مطالبہ کے نام سے پیش کرے۔ نفسیاتی تغیرات کی یہ کھلی ہوئی مثالیں ہیں۔ غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ظالمانہ کارروائیوں میں بھی مظلومیت کی فتحمندی کارفرما ہے اور ظلم و تشدد کی مطلق العنانی کی شکست کا اعتراف ہے جو حسینی مظلومیت کا صدقہ ہے۔ دیکھ لو آج بھی حسینی پیغام مظلومیت کہ ہندوستان میں محرم کے زمانہ میں لوگ پیک بنتے ہیں جن کو احمق قاصد صغریٰ کا نام دے کر بے اعتنائی برتتے ہیں۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ والیان ملک نہایت خلوص سے حسینی فقیر بن کر مطلق العنانہ سرمایہ داری سے اظہار نفرت کرتے ہیں اس پیاسے امام کا سقہ بن کر عقیدت و محبت کا اعلان کرتے ہیں جن کو بے فکرے مصلحین نظر انداز کر کے بے اعتنائی برتتے اور ان کی تنظیم سے کوئی اخلاقی فائدہ نہیں اٹھاتے نہ اس حسینیت کے لگاؤ کی قدر ومنزلت کرتے ہیں۔

۵۔ پیشوا کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ قوم کی جہالت دور کرے جو آزادی وحریت وترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ امام نے کربلا کے میدان میں چند گھنٹوں میں اخلاقی، سیاسی

،تمدنی، مذہبی، معاشرتی وہ سبق دیئے جس سے جاہل عربوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اقوام عالم کے لئے ہر شعبۂ زندگی کا راستہ بنادیا۔

۶۔خدا کا پرستار اپنی موت وزندگی کو خدائی مرضی پرڈھال چکا تھا اور پکار پکار کر بتا رہا تھا کہ اس کی قربانی محض خدا کے لئے ہے۔اس کے سوا کوئی جذبہ قربانی میں ہونا نہ وہ قربانی کہے جانے کی مستحق ہے جو خدا کی راہ پر نہ ہو۔دشمن کا تیر آنے پر بِسْمِ اللّٰهِ وَبِاللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ کے نعرے مارتے تھے (خدا کا نام اور خدا ہی کے لئے اور اس کے دین کی حفاظت کے لئے دشمن کا یہ تیر قبول کرتا ہوں) عاشور کی تمام رات عبادت خدا میں بسر کرتے ہیں۔ظہر کی نماز دشمن کے تیروں کی بوچھار میں اور نماز عصر خنجر قاتل کے نیچے ادا کر کے قیامت تک کے واسطے خدائی راز و نیاز کے سبق پڑھاتے ہیں۔

۷۔خدمت خلق، انسانی محبت واخلاق کا محیر العقول سبق پڑھاتے ہیں جس کو قیامت تک تاریخ نہیں بھلاسکتی۔گوتم رشی تمام حیوانوں کی جان بچانے کے واسطے ایک بے زبان جانور کے عوض اپنی گردن کٹانے پر تیار ہوجاتے ہیں۔لیکن اس بے آب وگیاہ جنگل میں حسینؑ اپنی اور اپنے اقربا، بال بچوں کی پیاس سے مرجانے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دشمن (حر) کی فوج اور گھوڑوں کی پیاس کی شدت سے زبانیں نکلی ہوئی نہیں دیکھ سکتے اور سب پانی پلا دیتے ہیں۔

۸۔یزید کی ٹڈی دل فوج حسینؑ کو چاروں طرف سے گھیرے ہے اور قتل کی دھمکی دے رہی ہے۔جان نثاران حسینؑ بپھرے ہوئے ہیں کہ فوج یزید پر ٹوٹ پڑیں لیکن حسینؑ ساتھیوں کے مشتعل جذبات پر اس طرح قابو کئے ہوئے ہیں کہ جب تک دشمن حملہ میں پیش قدمی نہ کرے اس طرف سے آغاز جنگ نہ ہو اور مظلومیت وحق دفاع کے حاصل کرتے ہوئے رسولی جنگ کی تشریح و توضیح کرتے ہوئے انسانی معاشرت کو پرزور سبق دے رہے ہیں کہ معاشرتی انسانی زندگی جنگ و پیکار سے حیوانی زندگی بن جاتی ہے۔

۹۔اقتصادی زندگی کا بہترین حل امام حسینؑ نے یہ بتایا کہ انسان میں قوت برداشت وتحمل وصبر بڑھ جائے۔اور دنیاوی نعمتوں کے فانی وزوال پذیری، بے حقیقی وکم قیمتی سمجھ میں آجائے۔دنیا جن چیزوں کو نعمت سمجھے ہوئے ہے اور مرمٹنے پر تلی ہوئی ہے اور اسی کو زندگی کا ماحصل سمجھتی ہے اس کو روحانی وعملی قوت سے بے حقیقت و بے قیمت بنادے جیسا کہ امامؑ نے کربلا کے میدان میں تمام مادی نعمتوں کو ٹھکرا کے خود دکھادیا۔

۱۰۔بین الاقوامی مساوات و برادری کا رنگ اور چھوت چھات، ذات پات کی تفریق کو امام حسینؑ نے اس طرح مٹایا کہ جناب فضہ کنیز کو اسی عزت واحترام سے آخر وقت رخصت کیا جس طرح سے اپنی بیٹیوں، بھاوجوں کو رخصت فرمایا۔غلام حبشی کا بوقت آخر اسی طرح سرزانو پر رکھا جیسا کہ نوجواں فرزند علی اکبر وجناب عباس کا سر زانو پر لیا۔ایک ہی قبر میں پہلو بہ پہلو آزاد وغلام سب دفن ہوئے اور ایک ہی طرح سے سب کی قبریں زیارت گاہ اسلام بنیں۔قوم، قبیلہ، غلام و آزاد کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔

۱۱۔کیا کہنا حسینی سیاست کا جس کی ہر گتھی کو اپنی قربانی سے سلجھادیا۔ہمیشہ سیاسی اوزار و آلات یہی رہے ہیں: جھوٹا پروپیگنڈہ، قوت وعسکریت کے مظاہرے، مال وزر کی بارش، رشوتیں، مکاری و حیلہ بازی، دھوکادہی، چاپلوسی وخوش آمد، ملکی ومعاشرتی ومجلسی زندگی میں شریک کار بنانا، سیاسین عالم کی یہی وہ چالیں ہیں جو ہمیشہ جاہل قوموں کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔اور رعایا کی جان کو قربانی کی چتا پر جھونکا جاتا ہے۔عرب کی حکومتیں یہی کھیل کھیل رہی ہیں۔اسلام کی صحیح تاریخیں بتاتی ہیں کہ عرب میں بنی ہاشم وقریش کا وہ سلسلۂ نسب تھا جس کی سرداری جملہ قبائل عرب کو تسلیم تھی۔تیم وعدی وامیہ کو اس سلسلۂ نسب سے کوئی تعلق نہ تھا۔مستند تاریخیں اور نسب نامے شاہد ہیں کہ سیاسی یہ چال چلی گئی کہ مذکورہ قبائل نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر قریشی سلسلہ میں خود کو شامل کرلیا جس کو بنی ہاشم نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔یہ سب اس لئے ہوا کہ ان جلیل منصبوں کا خود کو بھی حقدار بنائیں جو بنی

ہاشم کے لیے مخصوص تھے۔ اس کے بعد نہایت ہوشیاری سے علیؑ و آل علیؑ کو جو رسولؐ کے واقعی و حقیقی قرابتدار اور قریبی رشتہ دار تھے اقوام عرب سے بے گانہ بنا کر ایسا پرزور دھوکا دیا کہ وہ علیؑ اور آل علیؑ سے بے گانہ ہو گئے اور ان چال بازوں کو رسولؐ کا قریبی رشتہ دار سمجھنے لگے۔ مستند تاریخوں کی کثیر شہادتوں میں سے ایک شہادت یہ ہے کہ ایک شامی گروہ علیؑ مرتضیٰ کی بابت گفتگو کر رہا تھا اور اپنے خیالات کا اظہار ہو رہا تھا۔ سامنے سے ایک بوڑھا شامی نمودار ہوا۔ سب نے اس کو بلا کر علیؑ کی شخصیت کے بابت سوال کیا۔ بوڑھے نے کہا میں علیؑ سے خوب واقف ہوں۔ علیؑ فاطمہؑ کا باپ، عائشہ کا بیٹا تھا، مکہ کے اونٹ چرا کر مدینہ میں بیچتا تھا، رسول کے ساتھ جنگ احد میں مارا گیا۔

(مروج الذہب، مسعودی)

خاندان رسالت کی شخصیت کو اس طرح سے مٹایا جا رہا تھا، صرف اس لئے کہ قانون وراثت عرب کی بنا پر علیؑ و آل علیؑ کو بے حق کر دیں اور رسولؐ کے وارث بن جائیں۔ اسی جھوٹے پروپیگنڈے سے بے تعلق لوگ رسولؐ کے قرابت دار اور وارث بن کر سالہا سال علیؑ و آل علیؑ کو منبروں پر، مسجدوں میں گالیاں دینا فرض سمجھتے تھے۔ قتل عثمان خلیفہ کا سازشی الزام علیؑ و آل علیؑ پر رکھ کر جاہل عربوں کو مشتعل کیا گیا اور دشمنان علیؑ و آل علیؑ کے واسطے خزانوں کے منہ کھول دئے زر پاشیوں سے مالا مال کر دیا (دیکھو ہماری کتاب تاریخ کا خونی ورق) اور علیؑ و آل علیؑ کو افلاس و تنگدستی میں مبتلا کر دیا، بنی امیہ کی فوج وقوت کا کیا پوچھنا، جس کا مقابلہ قیصر وکسریٰ کے بس سے باہر ہو گیا تھا۔ اب اس مذکورہ خلفشار و پیچیدہ سیاست کے جملہ اسلحہ کو بے کار کر دیں اور تمام سیاستوں کے قلعہ کو ڈھا دیں۔ جو حسینؑ نے کربلا کے میدان میں تین روز کی بھوک پیاس میں سوکھے گلے کٹوا کر چند گھنٹوں میں دشمنوں کی سیاست کا تار و پود بکھرا دیا اور دشمن قاتل سے بھرے دربار میں یزید کے اعلان کرا دیا کہ

''مخلوق الٰہی میں بہترین ماں باپ کے فرزند کو ہم نے قتل کر دیا۔''

امام نے عالم بھر کو سبق دے دیا جب کوئی قوم ایسے دور سے گزرے جس دور سے امام حسینؑ کو گزرنا پڑا تو چاہئے کہ حسینی سبق کو دہرائے۔ حسینؑ بے شک اسلام کے حقیقی پیشوا تھے لیکن ان میں پوری قابلیت تھی کہ ہر قوم کے پیشوا بنائے جائیں۔

۱۲۔ امام حسینؑ نے بتایا کہ اگر قومی افلاس مٹانا چاہتے ہو تو لوٹ مار چھوڑو، لٹیروں، غاصبوں کو اپنی سچی قربانی سے بے دخل کر دو اور قومی ناداروں کو خودداری و امن و راحت کی زندگی میں خود اختیاری کا سبق دو۔ مزدوری سے بہرہ مند ہونے دو، جن کی کمائی حکومت کی عیش پرستیوں کے لئے نہ رہے۔

۱۳۔ قومی آزادی کے واسطے بتایا کہ تن من دھن ہر شے کو آزادی کے واسطے نچھاور کر دو۔

۱۴۔ قومی تنظیم کے واسطے بتایا کہ ان کی طرح قوم کا دماغی توازن و فکری یکسوئی کو ایک مرکز پر جمع کر دو جو بلا تشدد و تحکم ہو۔

۱۵۔ اگر قومی زندگی چاہتے ہو تو حسینؑ کی تعلیم کو سمجھو۔ حسینؑ بے اصولی زندگی کے ساتھ کچھ دنوں زندہ رہنا اس کو زندگی نہ سمجھتے تھے بلکہ ان کی نظر میں اپنا مرٹنا اور اصول کا زندہ رہنا حقیقی اور دائمی زندگی تھی جس اصول کی بقا سے قوموں اور نسلوں کی زندگی اور بقا ہوتی ہے۔

۱۶۔ اگر قومی عزت و وقار چاہتے ہو تو حسینؑ سے عزت و وقار سیکھو جس نے ہر دنیاوی شے پر لات مار کر انسانیت کے تمام عزو شرف کو حاصل کیا اور دنیا کو ایسا ذلیل کیا جس کی نظیر نہ ملے گی۔

۱۷۔ اصلاح معاشرت چاہتے ہو تو حسینیت سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہے مذہب کے نام پر اصلاح غیر مذاہب والوں و لا مذہبوں سے تصادم کا باعث ہوگی۔ قوانین ملکی، جمہوریت، فسطائیت، نازیت، کمیونزم، اشتراکیت، انارکزم میں کشمکش حیات و تصادم ناگزیر ہے۔ حسینؑ نے مظلومیت کا وہ سبق پڑھایا جو دنیا کے ساتھ ساتھ آیا اور قیام دنیا تک قائم رہے گا۔ لہٰذا اپنے معاشرتی ہر شعبہ کو اگر مظلومیت پر ڈھال لوگے تو سمجھ لو کہ دنیاوی ہر تصادم سے محفوظ ہو۔

❀❀❀

حسینؑ تمدنِ اسلام کا اساس ہیں

حکیم الامت علامہ ہندی آیۃ اللہ سید احمد نقوی طاب ثراہ

ماہرین علم النفس جانتے ہیں کہ ہر تمدن کی بنیاد تین اصولوں پر قائم ہے، مذہب، فنون لطیفہ، سیاست ۔جس میں مذہب کی طاقت، باقی دو اصولوں سے مسلم طور پر بہت زائد ہوتی ہے۔

اسلام تمدن کے بانی نے تثلیث مٹا کر یہ چاہا کہ فنون لطیفہ اور سیاست کی جگہ بھی مذہب ہی کو حاصل ہو اور دیگر مذاہب وسیاسیات وفنون لطیفہ کے محاذوں کے مقابل میں صرف مذہب ہی کا ایک محاذ اسلام کے نام سے قائم ہو جائے، تاکہ قوت میں انتشار نہ ہو اور دین و دنیا ایک ہو کر باہم تصادم کی خلش مٹ جائے۔

شک میں خواہش ہر تمدن کے بانی کی ہوتی ہے کہ وہ محکم اصولوں کی تلاش وجستجو کرے۔ بانیٔ اسلام نے بھی اگر ایسا ہی کیا تو کوئی نئی بات نہیں کی۔ لیکن قابل ستائش وخراج تحسین وہی موسس و قائد حاصل کرتا ہے جو:

(۱) اپنے اصولوں کو ہموار سطح پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

(۲) جو بیشتر سہولتیں عملی راستوں میں پیدا کردے۔

(۳) جو تمام انقلابات کے مقابلے کے واسطے غیر متزلزل اصول بنادے۔

(۴) جو تمام طبائع اور فطرت کے اقتضا کے مناسب اصول وضع کردے۔

(۵) جو دوسروں کی مخالفتوں اور مزاحمتوں کو کم سے کم گنجائش دے۔

(۶) جو دوسروں سے بھی خود بھی تصادم ومزاحمت کم کرے۔

(۷) جو کسی فرد یا افراد سے مخصوص نہ ہو عام مخلوق کی احتیاجوں کو ہر زمانے میں پورا کردے۔

(۸) جس میں دنیا و دین میں ایک دوسرے سے مزاحمت نہ ہو۔

اسلام کو انہیں خصوصیات کے ساتھ نظر کرو۔ جس مذہب کا نام اسلام رکھا گیا ہے، اس میں فنون لطیفہ یا دوسرے الفاظ میں دین و دنیا علیحدہ نہیں ہیں بلکہ ایک شئے ہیں۔

مذہب اسلام نے سیاست اور فنون لطیفہ کے صرف ان شعبوں کو روکا ہے جو امور ہشت گانہ کے خلاف ہیں، نہ کہ عام امور مثالاً ہم چند چیزیں پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا دعویٰ سہولت سے ثابت ہو۔

فنون لطیفہ:

(۱) گانا بجانا، آلات لہو کا استعمال، اوران کا بنانا بیچنا اسلام نے حرام قرار دیا ہے، محض اس لئے کہ دنیا سعی وکوشش، جدوجہد، عمل ومحنت، مشقت، جفاکشی کے لئے بنائی گئی ہے۔ مذہب اسلام کا پہلا سبق: "لیس الانسان الا ما سعی" سستی، کاہلی، لہو ولعب، بیکاری قوای بہیمہ کی (امیج) اسلام میں بدترین شئے ہے۔ کیا تاریخ عالم بتاتی ہے کہ دنیا کا کوئی بڑا سیاسی مدبر تمدن کا حافظ یا انقلاب رحم کا بانی کوئی ایسا شخص گذرا ہے جو رنگ رلیاں مناتا ہو۔

(۲) بت تراشی کو اسلام نے حرام کردیا صرف اس لئے کہ عام رجحانات تمدن اسلام سے پیشتر یہ تھے کہ بزرگوں کے بت بنا کر پوجا کی جائے اور آئندہ بھی رجحانات مٹنے والے نہ تھے جو انسانی شرافت وخودداری اور وقار کے فطرتاً مخالف ہے لہٰذا بت پرستی کی روک تھام کے واسطے صورت سازی کو روک دیا تاکہ انسان اپنی تعظیم اور اپنی بزرگ داشت سیکھے "پدرم سلطان بود" کے بے جا فخر کو ترک کرے۔ بزرگوں نے جو کچھ اچھا کیا ہے اس یاد کو تازہ رکھنے کے واسطے اور اخلاف کی اچھی سیرتوں پر چلنے کے لئے، قصص، حکایات، تاریخ وسیرت بہترین ذریعہ ہے۔ جس کو سب سے پہلے قرآن مجید نے اختیار کیا۔ رسولؐ اور ان کے جانشینوں نے اپنے بیانات کے مجموعے چھوڑے۔ کسی کا بت تراشنا مشرکوں کی اندھی تقلید ہے، اوراس کی کمزوریوں کو پوشیدہ کرکے تصویر کا صرف اچھا رخ لاتا ہے۔

اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف انھیں دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ ان سے بہتر اور مفید شعبوں کا اسلام نے خیر مقدم ہی نہیں کیا بلکہ بہت سے اسرار غیر منکشفہ اور عیب کی باتوں کو بتا کر بنی نوع انسان کو اس طرف متوجہ کیا گیا ہے، تا کہ ان کو اختیار کر کے انسان ضروریات کے دسترس کو محدود فضا سے باہر لایا جاوے۔ "**وسخر لکم الشمس والقمر**" سورج اور چاند کو تمہارے واسطے مسخر کیا ہے۔ اس کے آثار طبیعیہ و کیمیاویہ سے فائدہ اٹھا کر طرح طرح کے میکانیکی، برقی، کیمیاوی چیزیں ایجاد کرو اور مصرف میں لاؤ۔ "**سخر لکم الهواء والقضاء**" کرۂ ہوا اور اس پر کے کیمیاوی و طبعی اجزاء وقوع سے فائدہ حاصل کرو۔ "**سخر لکم الارض**" زمین کے معدنیات اس کے طبعی اور کیمیاوی قوے اور اجزا سے طرح طرح کی خدمتیں لو، اور فائدہ حاصل کرو "سخر لکم البحر" دریا اور ان کے خزائن و دفائن اور اجزاء کیمیاوی و قوائے طبعی سے فائدہ اٹھانا سیکھو تا کہ افضل المخلوقات ہونے کی وجہ سے اپنے حقیقی منصب پر قائم ہو سکو اور "**فضلناکم علی کثیر ممن خلقناہ**" کے مصداق قرار پاؤ۔

سیاسیات

مذہبی عبادات سے لے کر معاملات تک ہر شئے کی بنیاد سیاسیات پر ہے، اسلام کا کوئی اصول بھی سیاست سے خالی نہیں مثلاً چند نظیریں پیش ہیں:

(۱) جو چیزیں حرام کی گئیں ہیں، مثلاً فنون لطیفہ وہ وہی ہیں جو اصول ہشت گانہ میں سے کسی ایک کے مخالف ہیں۔ سودخواری، حرام اشیاء کی تجارت، ظلم نا انصافی سے محکوم بنانا اور سرمایہ جمع کرنا، کسی کا مال و دولت اور کسی کے سرمایہ کو قبضۂ غاصبانہ میں لانا، مکر و حیلہ سے کاربرآری کرنا۔ مذکورہ باتیں اسلام میں سخت ترین مذمت کی گئی ہیں۔

دیکھو موجودہ علمداراں تہذیب وتمدن کی بنیادیں کس طرح ہل رہی ہیں، اس لئے کہ ان کی سرمایہ داری کی طمع نے مخلوق کی جان، مال، عزت سب کچھ برباد کر دیا ہے، اور اپنی چالاکیوں اور مکاریوں

سے ایسے قانون حکومتی بنائے ہیں جس سے امن عامہ کی زنجیریں تھرا رہی ہیں۔

لیکن ہونا کیا ہے ہر ایسے موقع پر جس طرح سے رعایا ظالم افسروں کو رشوت دے کر راضی کرتے ہیں، اسی طرح سے اور بالکل اسی طرح سے جب رعایا حکام کو مطالبات سے مجبور کر دیتی ہے، تو حکام بھی رشوت دینے پر تیار ہو جاتے ہیں، اور بڑھتی ہوئی بغاوت کو دبانے کے لئے باغیوں کو اپنا شریک حیات بنا کر، یا یوں کہو کہ اپنے جرموں میں ان کو شامل کر کے مجرمین کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ آج کل ہندوستان کے سوراج میں لندن گول میز کانفرنس کی کارروائی کھلی ہوئی مثال ہے، ''فیڈریشن'' کا سوانگ اسی لئے بنایا گیا ہے اور جس طرح اب تک ہمارے ملک میں تجارت حکومت ایک ہاتھ میں تھی۔ یہ ہونے والا ہے کہ ہندوستانی تاجر و ساہوکار، زمیندار، والیان ریاست باہم مل کر غریبوں اور کسانوں کی قسمت کا فیصلہ کریں گے، دیکھ لینا اس کے بعد ایک زمانہ آئے گا جب اس دستور حکومت سے بھی فریاد و فغاں برپا ہوگا۔

اسلام میں ہرگز ہرگز اس سیاست کو کوئی جگہ نہیں مل سکتی جہاں خود غرضی ہو، چالاکی ہو، حیلہ سازی ہو، سرمایہ داری ہو، مزاحمت فی العقاد ہو۔

معاملات میں یہ ایک بڑی نظیر ہم نے پیش کی، اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اب عبادات کو دیکھو۔

(۲) نماز ہر جگہ حال صحت میں، بیماری میں، لیٹ کر، بیٹھ کر چلتے ہوئے، سفر میں، مکان پر، تنہا، جمعیت کے ساتھ پڑھنا ہر بالغ و عاقل پر واجب ہے، اور بے پڑھے مر جائے تو اجرت دے کر پڑھوانا فرض ہے، یا اولاد اکبر ہو تو اس پر ادائی قرض ہوتی ہے۔

اس میں کس قدر سیاست اور مذہبیت ہے۔ مذہبی شغف، روح مذہبی کی بیداری، ماسوائے اللہ کو چھوڑ کر صرف ایک سب سے بڑی ہستی کے آگے اور ایک بھولنے والی ہستی کو اپنے افعال و اعمال کا ناظر و محاسب بنا لینا، دوسروں سے میل جول و ملاقات تبادلۂ خیالات، مصالح عامہ میں مشورت،

اپنی قوت و جمعیت کا اندازہ اور اپنے افراد میں تنظیم اور اپنے قلعوں اور مورچوں (مساجد) کی حفاظت ونگہداشت کالجوں، مکتبوں، یونیورسٹیوں (مساجد) میں تعلیم وتربیت کا انتظام قائم رکھنا ہے، اور اسلامی ''لیگ آف نیشن'' ہے۔

(۳) روزہ مسلمانوں کی ہر فرد کو جفاکشی، اقتصاد، نفس کشی، بھوک، پیاس کا عادی بنانا اور بھوکوں سے عملی ہمدردی ومساوات ہے۔

(۴) حج، دور دراز ممالک کا سفر کرنا، فوائد سیر وسیاحت، معلومات، تجارت سے فائدہ حاصل کرنا۔ اور تمام نقاط سے آنے والے حاجیوں کی ''ہول ورلڈ کانفرنس'' سال بسال قائم کرتے رہنا اور ان تمام نمائندوں کا اپنے وطن میں واپسی پر طے شدہ مسائل کی تبلیغ واشاعت کرنا۔

(۵) خمس وزکوٰۃ قومی وملکی فنڈ قائم کرنا اور ہر مالدار کو یہ ذہن نشین کرانا کہ ان کا سرمایہ ملک وطن وقوم کے لئے ہے، نہ ان کی عیش پرستیوں کے لئے۔ سرمایہ داری کی لعنت کا بہترین علاج ہے۔

(۶) جہاد اسلام کا ہر بالغ و عاقل آزاد ملکی اور قومی سپاہی ہے اور مرکز اسلام و بیضہ اسلام کی حفاظت کے وقت بوڑھے، بچے، زن، مرد، لنگڑے، لولے، سب پر بقدر امکان قربانی فرض ہے۔

یہ چند مثالیں تھیں جن پر سرسری نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذہب اسلام عین سیاست اور عین فنون لطیفہ ہے اور دین ودنیا اسلام کا ایک ہی ہے، کوئی جدا شئے نہیں ہے۔ یہی محاسن تھے جن سے اسلام میں چار چاند لگ گئے تھے، اور شرق وغرب جنوب وشمال کے مالک مسلمان ہی تھے۔

پس جس تمدن کی بنیاد اس کا مذہب ہو وہ تمدن اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے اور اتنا ہی ترقی کرسکتا ہے جتنا مذہب میں انہماک ہو، اس کی صحیح تصویر کو بگاڑا نہ جائے۔

اسلامی تنزل کی تاریخ اسی روز سے شروع ہوتی ہے جس دن دین ودنیا علٰیحدہ کردیئے گئے۔ اس کی حقیقی تصویر مٹا کر ظاہری جامہ پہنا دیا گیا۔ للّٰہیت مٹ گئی نشریت پر مرنے لگے۔ صورت ظاہری بھی اسلام پر پابندی سے جان چراتے ہیں۔ اسلام کی تباہی کا باعث خود اسلام کے راہبر مصلح ولیڈر رہیں۔

اسی لئے اسلام کو ایک ایسے قائد کی ضرورت ہے جو اسلام کو اصلی معنوں میں سمجھے اور دوسروں کو سمجھا سکے استخراج احکام میں قرآن وحدیث وعقل سے سب سے زائد استاد ہو اور یہی اصول مذہب شیعہ میں تقلید اعلم کے واجب ہونے کا ہے اور غیر اعلم کی تقلید اسی لئے حرام ہے۔ تمام بلاد شیعہ اس تقلید غیر اعلم کی لعنت سے جتنا محفوظ ہیں۔ اسی قدر ترقی کررہے ہیں بجز ہندوستان کے، جہاں ہر شخص کا قبلہ وکعبہ جدا ہے۔ اگر مجتہد اعلم اور مبسوط الید معین کردیا جائے تو آج ملک پر نعمت وبرکت سے مالا مال ہوجائے بشرطیکہ وہ اعلم ضروریات زمانہ سے بھی بے خبر نہ ہو۔

بہرحال اسلامی تمدن کا سنگ بنیاد مذہب ہے۔ اس کی مضبوطی وحفاظت سے ترقی کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام تمدن اسلام کا اساس ہیں

حضرت سرور کائناتؐ نے جن اصولوں کی تعلیم دی تھی ان کی آنکھ بند ہوتے ہی ان کے منشاء کو بگاڑ دیا گیا۔ خود مسلمانوں میں خودغرضی، حب جاہ، بغض وعداوت، سرمایہ پرستی، عیش وراحت، سستی و کاہلی آگئی، اسلامی تاریخیں اور سیاہ کاریوں کا خزانہ پیش کررہی ہیں، کون ان کو جھٹلا سکتا ہے۔

اسلامی فتوحات ہوئے تو ان میں عام ملکی اور فوجی مظاہروں اور استعمال قوت سے کون سا فرق ہے جس سے کوئی فاتح کریڈٹ کا مستحق نہیں ہے۔ نپولین، ہلاکو، بخت نصر، قیصر ولیم وغیرہ وغیرہ سبھی جنگجو تھے۔ اسلامی دور کے شمشیر زنوں فاتحوں میں کون سی امتیازی شان تھی۔ فارس، بابل، شام، مصر، یمن، قسطنطنیہ، اندلس، سب ہی اسی طرح فتح ہوئے، جس طرح کہ عالم کے تیغ زنوں نے فتوحات کئے۔ مزاحمت فی البقا اور سرمایہ داری کی ذہن کو سچی اسلامی تعلیم سے دور کا بھی رشتہ نہیں ہے۔ سیاسی جنگوں کو مذہب سے کیا لگاؤ۔

جب کہ اسلام مالا مال ہوچکا تھا۔ ہمارا راہبر وحسینؑ شہید **(بابی انت و امی یابن رسول اللہ)** ایسے نازک وقت میں اٹھا اور اسلام کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لیا ـــــ

فدا ہوں آپ پر سے اے حسینؑ آپ نے صرف اپنی شہادت سے پیشوایان مذہب کو اپنے آگے جھکا دیا۔ اور جہاں کے متمدنین کو حیرت میں ڈال دیا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاسی انگشت بدنداں ہیں، اور عالم بھر کے عقلا وحکماء آپ کی حکمت کے آگے سرنگوں ہیں۔

معنوں کی طوالت ہم کو اجازت نہیں دیتی کہ مفصل تبصرہ آپ کی شہادت پر کریں لیکن مختصر یہ ہے کہ آپ کی شہادت میں قیامت تک کے لئے ہر تمدن وسیاست کی کامیابی کا راز ہے۔ اسلامی اصول سے بے بہرہ اور اصول اسلامی کی مخالفت کرنے والے آج بھی جب تک حسینیت نہ اختیار کریں کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ حسینی فتح میں مزاحمت فی البقاء کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہ فتح ردعمل کا نتیجہ ہے۔ جتنی چالیں حسینیت کے مقابلے میں چلو، جتنی قوت وتشدد کا مظاہرہ کرو، تم خود اس کا خمیازہ بھگتو گے، ردعمل تم کو جلا کر سیاہ کردے گا۔

مظلومیت وعدم تشدد وجبر وصبر واستقلال وہمت کا اعلان امام حسینؑ نے ہول (ورلڈ) کانفرنس میں خانہ کعبہ کی کر دیا تھا۔ تمام حاجیوں کو اپنے اصول سے خبردار کر کے حج کو عمرے سے بدل ڈالا اور عالم کو بتا دیا کہ حج چند ارکان بجالانے ہی کا نام نہیں بلکہ نشر وتبلیغ ومصالح عامہ کا بہترین موقعہ ہے۔

روزہ: کربلا کے میدان میں رکھا گیا، اور روزہ داروں کو ہمیشہ کے لئے تعلیم دی کہ تین روز کی بھوک پیاس میں کتنا ہی کھانے کا سوال خودداری وحیات وغیرت وحمیت کے خلاف ہے۔ کھانا نہ مانگنا، سوال سے پرہیز کرنا جیسا کہ حسینؑ کے بچوں تک نے بھوک کی شکایت زبان پر نہ آنے دی اور پیاس کا احتجاجاً اظہار کرتے رہے، جن کے لئے مفت کا پانی نہر فرات کا دشمنوں نے روک رکھا تھا۔

جہاد: انتہائی کوشش کی کہ لڑائی نہ ہو لیکن یزیدیت کے غرور نے مجبور کیا حسینؑ کو بہادرانہ موت پر، بہتر تنوں سے ہزاروں کا مقابلہ، عورتوں اور بچوں کی حفاظت، جس حسن وخوبی سے یہ جہاد ہوا اس کی نظیر عالم میں نہیں ہے۔

نماز: ظہر کی نماز جماعت تیروں کی بوچھار میں اور عصر کی نماز زیر خنجر شمر۔ کیا اس عبادت کی نظیر

عالم میں ہے؟ سولی پر چڑھنے والے ضید سے اس کے ساتھ چھوڑ دینے کی شکایت کریں اور حسینؑ خنجر کو ذریعہ تقرب جناب مادی قرار دیں ے

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجاست

یہ ہے زندہ مثال تمدن اسلام وصحیح تربیت وتعلیم رسولؐ کی، اور یہ ہیں اعمال اساس اسلام کے اور یہ ہے حسینیت، جس کے قدموں سے سیاست لگی ہوئی ہے۔

اب دیکھو اس جہاد سے حسینؑ نے عام انسانیت کو کیا سبق دیا۔

(۱) کوئی جنگ مزاحمت للبقاء کے اصول پر نہ ہو جس میں انتقامی اسپرٹ دوسروں کی ہمیشہ ہمیشہ کارفرما رہ سکتی ہے اور آئندہ نسلیں موقع کی جویا رہتی ہیں۔ دیکھو حسینی جنگ کا انتقام لینے والا عالم میں نہ نکلا۔ لیکن یزیدی جنگ کے لئے ابد الآباد تک قومیں تیار رہیں گی۔

(۲) اقلیت کو آئندہ اکثریت میں منتقل کر دینا۔ یا اس اقلیت کو ایسا منظم اور قوی بنانا جو اکثریت کے برابر ہو جائے۔ یہ حسینی قربانی کا اثر تھا۔

(۳) اقلیت کا حقیقی تحفظ اکثریت کے رحم وکرم سے نہیں ہوتا ہے کسی سمجھوتے سے۔ ایسے ایسے سمجھوتے قوت کے مقابلے میں بے حقیقت ہوتے ہیں، بلکہ حقیقی تحفظ خود اپنی قوت، ہمت، استقلال وقربانی پر موقوف ہے۔

(۴) کمزوروں اور ضعیفوں کا کسی قوت سے ٹکرانا بغاوت وتشدد پر اترنا، مجرموں میں داخل ہو کر استیصال کلی کا باعث ہوتا ہے اور کسی ہمدردی کا مستحق نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر جس قوت سے جبر وتشدد وظلم ہو، اس سے زاید قوت سے طرف مقابل میں مظلومیت ضبط وتحمل اور عدم تشدد ہونا چاہئے تا کہ عام ہمدردی پیدا ہو کر ایک ظالم وتشدد کو مغلوبیت وشکست ہو۔

(۵) ظلم وتشدد سے ترک تعاون، ترک موالات اس استقلال سے ہو کہ کوئی ظلم وتشدد اس رجحان کو نہ دبا سکے۔

(۶) ضعیف و کمزور اکثریت اور قوت سے مساوات کا برتاؤ اسی وقت کرا سکتے ہیں کہ جب کمزور توانا ہو جائیں، پسماندہ جماعتیں اپنا معیار بلند کرلیں جن سے اعلیٰ جماعتوں کو جھکنا پڑے، جیسا کہ حسینی انتخاب نے چند انصار کو چن کر بتا دیا۔

(۷) غلامی وننگ و عار کی زندگی پر ہمیشہ موت کو ترجیح ہو۔

(۸) سرمایہ داری قوم کو نامرد بنا دیتی ہے جیسا کہ مشہور آفاق غیرت وحمیت وشجاعت عرب کی یزیدیت نے خاک میں ملا دی تھی۔ اور کسی کو جرأت یزیدیت شکنی کی باقی نہ رہی تھی۔ امام حسینؑ کی شہادت نے قیدیوں تک میں حمیت وغیرت وجوش اور بہادری پیدا کردی جنھوں نے بنی امیہ کے مضبوط تخت وتاج کو برباد کر دیا۔

(۹) امام حسینؑ نے خود غرضی کی لعنت سے چھڑانے کے لئے اخلاص کا سبق دیا۔ اور خدا کی مرضی پر جان وعزت تصدق کر دینے کی عملی تعلیم دی۔

(۱۰) امام حسین علیہ السلام کی شہادت بیشک یزید کے ہاتھوں ہوئی لیکن دراصل مقابلہ یزیدیت وامویت کا تھا مادہ پرستی کا مقابلہ تھا، سرمایہ داری کا مقابلہ تھا۔ امام حسین علیہ السلام شہید تو ہو گئے لیکن سب سے پہلے انھوں نے یہ بتا دیا کہ مادہ پرستی اور سرمایہ داری ختم کر دینے والی لعنتیں ہیں، خواہ کتنی ہی قربانی کی ضرورت ہو۔۔۔ امام حسین علیہ السلام نے ان لعنتوں سے چھٹکارا اور نجات حاصل کرنے کا عملی پروگرام ہمیشہ کے واسطے پیش فرمایا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کو بتا دیا ہے کہ ہر ایسی جدوجہد (میں) ان کا طریقہ کار کیا ہونا چاہئے۔

حسینی مشن میں سادات کا حصہ

امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد جو اختلافات ہوئے وہ طبعی نتیجہ اس قربانی کا تھے، ان جلد جلد ہونے والے انقلابات کو نہایت بے رحمی اور قوت وتشدد کے ساتھ دبائے جانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن بنی ہاشم اور سادات نے حسینی مشن کو آگے بڑھایا اور ظلم وتشدد کے مقابلہ میں وہ

فداکاریاں کیں جو تاریخ عالم کے صفحات پر مثل آفتاب روشن رہیں گی، قید ہوئے، ذبح کئے گئے، جلاوطن ہوئے، زندہ دیواروں میں چنے گئے، زہروں سے ہلاک کئے گئے، لیکن حسینی روح ان میں روز بروز قوت پکڑتی رہی۔ چند ہی روز بعد وہ ایران و بغداد جو مذبح سادات تھا زیارت گاہ خاص وعام بن گیا۔

حسینی شہادت کے برکات ایران میں

ایران جو کہ مصر، سوریا، بابل ایشیائے کوچک اور یونان، سے صنائع سیکھ کر چاردانگ عالم میں تمدن کا ڈنکا بجا رہا تھا، وہ ایران جو چار سو سال دور حکومت کو ساسانیوں کی پیش کر کے دوسرے ممالک کو تہذیب وتمدن کی دعوت دے رہا تھا، عربوں کے ناگہانی حملہ سے تباہ وبرباد ہو گیا۔ اس کی صنعت وحرفت کا یک لخت خاتمہ ہو گیا تھا، اس کی قومیت، تجارت، تمدن کی کل شاخیں پامال ہو چکی تھیں، دسویں صدی تک گویا آدھا ایران عرب بن چکا تھا۔ لیکن حسینیت نے ان میں پورا کام کیا اور حسینی مشن (یعنی امام زادے اور سادات) نے اپنے خون سے زمین خشک ایران کی آب پاشی کی، جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایران میں دسویں صدی میں متحدہ قومیت کی تمام خصوصیت پیدا ہو گئیں۔ انہوں نے عربی چولا اپنی گردنوں سے اتار پھینکا بلکہ ممالک عرب پر بھی اپنا وقار قائم کر دیا اور زمین بابل جس پر حسینی خون بہا تھا، اور سادات بے دریغ تہہ تیغ ہوئے تھے، اسی بابل کو آج تک کے لئے اپنا اخلاقی، تمدنی، علمی، یا گلزار (باجگزار) بنالیا۔ آج عراق کے جنگلوں میں وحشی عربوں میں ایرانی تمدن نمایاں طور پر ظاہر ہے۔

حسینیت نے ایران کو فتح کر کے بابل کا فاتح بنا دیا۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ہندوستانی دروازے کھول دیئے۔ اور باوجود سخت ترین مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تمام ہندوستان حسینیت کو ایرانی لباس میں لئے حفاظت کر رہا ہے، اس لئے کہ ایران ہی حسینیت کا علمبردار بن کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ اور حسینی تصدق میں اپنا تمدن، زبان، اخلاق، ہندوستان کی غیر اقوام کو

سپرد کر کے مضبوط رشتۂ اتحاد قائم کر لیا۔ اور آج بھی حسینی جھنڈے کے نیچے مختلف اقوام کو جمع کرنے کی بہت کچھ قابلیت ایران میں موجود ہے بشرطیکہ وہ ہوش میں آئیں اور پچھلی تاریخ کو دہراتے ہوئے فکر و تدبر سے کام لیں۔

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

(ماخوذ از ''حسینی پیغام''، بمبئی، ۲۲ مئی ۱۹۴۲ء)

حسینؑ میدانِ سیاست میں

حکیم الامت علامۂ ہندی آیۃ اللہ سید احمد نقویؒ

تمام تمدنی شاخوں کا مبدأ اصلی قوم کا وہ مزاج عقلی ہوتا ہے جو مدتوں کے موروثی اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب تک یہ مزاج نہ بدل جاوے، تمام تمدنی شاخوں میں کسی قسم کا تغیر نہیں پیدا کیا جا سکتا۔ لیکن مزاج عقلی کو صرف زمانہ ہی بدل سکتا ہے، فاتح قومیں بھی اس میں کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتیں۔ ہر پست درجہ قوم کو تمدنی مدارج کے طے کرنے میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جن وحشی قوموں نے یونانی تمدن کو پامال کر دیا ان کے حالات سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے۔ اس بناء پر جو لوگ تعلیم و تربیت کے ذریعہ ان مراحل کو پھاندنا چاہتے ہیں وہ اس قوم کے اخلاق کو پراگندہ اور اس کے دماغ کو پریشان کرتے ہیں، اور اس کو ایک ایسی سطح کی طرف لے جانا چاہتے ہیں جو پہلے سے بھی زائد پست ہے۔

اسی طرح سے متمدن قومیں بھی اپنے تمدن میں دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکتیں بلکہ ان کو اس تمدنی انقلاب میں بتدریج مختلف مرحلوں اور مختلف دوروں سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاریخ بظاہر اس کی مخالفت کرتی ہے اور بہت سے نظائر اس کے ملتے ہیں کہ قوموں نے اپنے تمدنی عناصر بدل دیئے ہیں۔ اور اپنے قدیم مذہب، قدیم سیاست و قدیم زبان اور قدیم فنون لطیفہ کے بجائے جدید مذہب، جدید سیاست، جدید زبان، جدید فنون لطیفہ کو اختیار کر لیا ہے۔ بعض قومیں اپنے آباء واجداد کے مذہب کو چھوڑ کر عیسائی مذہب، بدھ مذہب یا اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئی ہیں، بعض قوموں نے اپنی زبان بالکل بدل دی ہے اور بعض قوموں نے اپنے نظام سیاست اور فنون لطیفہ کو بالکل دوسرے قالب میں ڈھال لیا۔ دور جدید میں بھی اسلامی مدبرین یورپ کی ترقی سے گھبرا کر

اپنا چولا اتار کر مغربی رنگ کو اختیار کر رہے ہیں۔ اصول مذہبی میں کاٹ چھانٹ، زبان میں ترمیم، لباس و معاشرت میں تبدیلی، فنون لطیفہ میں دست درازی وغیرہ وغیرہ مزاج عقلی سے کھلی جنگ ہے جو مفید ہونے کے بجائے سخت ضرر رساں اور پستی کی طرف دوڑنا ہے۔ درحقیقت تاریخ ان انقلابات کی روایت میں اپنی قدیم فطری غلطی کی تائید کر رہی ہے ورنہ ہم اگر ان انقلابات و تغیرات کو دقیق نگاہ سے دیکھیں تو ہمیں نظر آوے گا کہ ان تمام چیزوں کے صرف نام بدل گئے ہیں، حقیقت نہیں بدلی۔ الفاظ کی تہہ میں جو معنی تھے وہ اب تک زندہ ہیں اور اس میں بہت دنوں بعد تغیر پیدا ہوا۔ ہم اپنی تائید میں اگر عناصر تمدنی کا ذکر کریں تو بہت طویل ہوگا، اس لئے ہم صرف تمدن کے سب سے بڑے عنصر مذہب کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت ہو جاوے کہ جو نظریہ تمدن کے ایک عنصر پر صادق آتا ہے وہ اس کے دوسرے عناصر پر نہیں صادق آسکتا ہے۔

عام خیال یہ ہے کہ مذہبی انقلابات کی تاریخ اس نظریہ کے بالکل مخالف ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صرف مذہبی تاریخ ہی میں اس نظریہ کی صحت کی یقینی مثالیں ملتی ہیں اور اس میں اس قسم کے دلائل پائے جاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان اپنے قد و قامت میں خط و خال، رنگ و روپ کے بدلنے کی قدرت نہیں رکھتا اسی طرح کوئی قوم اپنے تمدنی عناصر میں بھی تغیر نہیں پیدا کرسکتی۔

اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ تمام بڑے بڑے مذاہب مثلاً بودھ مذہب، ہندومت، عیسائیت اور اسلام کے حلقۂ اثر میں دفعتاً بڑی بڑی قومیں داخل ہوگئی ہیں۔ اور ان مذاہب نے ان کے اصل مذہب کو دفعتاً بدل دیا ہے، لیکن غور و فکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان قوموں نے اپنے اپنے قدیم مذہب کی حقیقت کو نہیں بدلا ہے صرف ان کے نام کو بدل دیا ہے اور ان جدید مذاہب نے ان کے قدیم مذہب میں کوئی تغیر نہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ وہ خود ان کے قدیم عقائد کے قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ اس بناء پر اس جدید مذہب کی حقیقت اس قدیم مذہب کے پھیلاؤ اور وسعت سے زائد نہیں بلکہ ان مذاہب میں جو ایک قوم سے منتقل ہو کر دوسری قوم میں آتے ہیں اس قدر تغیر پیدا ہو

جاتا ہے کہ صرف ان کا نام ہی نام باقی رہ جاتا ہے۔

بودھ مذہب اس کی نمایاں مثال ہے چنانچہ جب وہ چین میں داخل ہوا تو اس کی تمام خصوصیات اس طرح مٹ گئیں کہ اول اول علماء نے اس کو ایک مستقل مذہب خیال کیا اور ان کو ایک مدت کے بعد معلوم ہوا کہ یہ بودھ مذہب ہے جس میں چینیوں نے اس قدر تغیرات پیدا کر دئے ہیں۔ یہ مذہب ہندوستان، چین، نیپال، سیلون میں بھی قائم ہے لیکن اس کی حقیقت ہر جگہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ وہ ہندوستان قدیم برہمنی یا ہندو مذہب کی ایک شاخ ہے اور ان دونوں میں بہت کم فرق پایا جاتا ہے لیکن چین میں وہ اسی مذہب سے گہرا تعلق رکھتا ہے جو اس کے پہلے وہاں عام طور پر موجود تھا۔ قدیم ہندو مذہب کی بھی یہی حالت ہے ہندوستان مختلف ذاتوں کا مرکز ہے اور اگرچہ ان سب کا ایک مذہب ہے تاہم ان مختلف گروہوں کے عقائد میں نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اگر ہم وید میں ہندوستان کے حقیقی مذہب کی تحقیقات کرنا چاہیں تو ہم کو ان تمام معبودوں سے جو یہاں پوجے جاتے ہیں اور ان تمام عقائد میں سے جو یہاں کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں صرف معدودے چند کا پتہ لگے گا۔ اس لحاظ سے اگرچہ برہمنی مت وید مقدس کی عزت کرتا ہے لیکن اس کتاب نے جس مذہب کی تلقین کی ہے اُس کا کوئی جزء محفوظ نہیں ہے۔ یورپ میں بھی عیسائیت اختلاف اقوام کی بناء پر ان تغیرات سے محفوظ نہیں۔ مذہبی کتابوں کی تفسیر و تشریح ہر قوم نے اپنے مذاق پر کر کے مختلف مذہب بنا لئے۔

عیسائیوں میں بعض قومیں خالص بت پرست ہیں جیسا کہ برطانیہ زیریں کے باشندے، اسپین کے عیسائی مخلوقات کو خدا قرار دیتے ہیں۔ اٹلی کے دہقانی جناب مریمؑ کے مجسمہ کو خدا مانتے ہیں۔

اسلام بھی اپنے عقیدے کی سادگی کے باوجود اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ چنانچہ ایران، عرب اور ہندوستان کے اسلام میں عظیم الشان فرق ہے۔ ہندوستان میں شرک کا اعتقاد نہایت پختہ طور پر قائم تھا۔ اس لئے ہندوستانیوں نے سخت سے سخت مواخذانہ مذہب میں بھی آسانی کے ساتھ بہت

سے خدا پیدا کر لئے پھر دوئی کو خدائی صفات دے کر اپنے ہزاروں معبودوں کے ساتھ ان کا بھی اضافہ کرلیا۔

مشرقی بنگال، دکن، مدراس اور سندھ کے بعض اضلاع وقصبات میں اسلام کی صورت اس قدر مسخ ہے کہ اس میں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔ مسلمانان الجیریا کی حالت دیکھو، ان میں دو مختلف قبیلے ہیں۔ عرب، بربر اور دونوں مسلمان ہیں لیکن دونوں کے اسلام میں بڑا فرق ہے۔ بربریوں کے اسلام میں اس بت پرستی کی بھی آمیزش پائی جاتی ہے، جس کے وہ ''کارتج'' دورحکومت سے خوگر ہوگئے تھے، عرب کی جاہلیت کے رواسم ومعتقدات آج تک ان کے اسلامی رواسم میں مخلوط ہیں اور ایران کے قدیم مذہبی روایات سے ان کا اسلام خالی نہیں۔

یہ سب شواہد ونظائر اس بات کے ہیں کہ قوم کا مزاج عقلی کسی انقلاب انگیز تحریک سے بھی نہیں بدلتا، نہ عناصر تمدنی میں کوئی تغیر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سرزمین حجاز میں آکر ایک انقلابی روح کو پھونکا اور ان کی جہالت وبہیمانہ خصائل کو تھوڑی مدت کے لئے اس انقلاب انگیز تحریک کے ذریعہ کچل دیا۔

لیکن درحقیقت ان کے مزاج عقلی میں سرمو تغیر نہ ہوا اور بانیٔ اسلام کی آنکھ بند ہوتے ہی تمام خصوصیات کو لے کر قوم عرب پھر کھڑی ہوگئی۔ نام کا اسلام تھا لیکن اس کے ہر چھوٹے سے چھوٹے نظریہ میں وہی خصائص قومی کارفرما تھے جو قدیم سے ان میں پائے جاتے تھے۔ جناب امیرؑ نے اس اسلامی مشن کو اسی طرح چلایا جس طرح سے رسولؐ اپنے مشن کو آخری دم تک چلاتے رہے لیکن علوی مشن کو کچھ دشواریاں زائد ہوگئی تھیں۔ اس لئے کہ دائرۂ اسلام حجاز سے نکل کر روم وشام وعراق وعمان وایران ومصر ویمن تک پہنچ چکا تھا۔

اور وہ بھی تبلیغی حیثیت سے نہیں بلکہ قہر وغلبہ، جنگ وجدل کے ذریعہ سے۔ لہٰذا اقوام مذکورہ کے تاریخی وتمدنی خصائص کا مقابلہ ایک طرف، ان کی منتقمانہ اسپرٹ ایک طرف، یہ مقابلے اس

صورت میں جبکہ خود مرکزی اسلام میں اس کی بنیاد مضبوط نہ تھیں۔

خصوصاً وفات رسولؐ سے جو دھچکا اسلامی مشن کو پہنچا تھا اس کی اصلاح کچھ نہ ہوسکی تھی۔ اس لئے دبی ہوئی چنگاریاں خاندانی عداوتوں اور خودغرضیوں کی بھی بہت کچھ سدراہ تھیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیہم خانہ جنگیوں کے ساتھ علوی مشن کا مسجد کوفہ میں شہادت کے ساتھ خاتمہ کر دیا گیا۔ امام حسنؑ کے لئے موقع ہی نہ رہا کہ وہ اپنے نانا کے مشن کی علانیہ سرپرستی کرتے، لیکن محمدؐ ثانی حسینؑ مظلوم نے اس مفلوج مشن کو کامیابی اور ہنگامی انقلاب کے ساتھ ساتھ حالات وواقعات کی بناء پر نظر رکھتے ہوئے اپنی سیاسی بنیاد اس سنگلاخ زمین پر رکھی جو ابدالآباد تک کے لئے غیر متبدل ہے، اور یہی طرۂ امتیاز حسینی مشن کا ہے۔ ''حسین منی وانا من الحسین'' کا یہی فلسفہ ہے۔ انہوں نے اقوام عالم کی روح مشترک کو سمجھا۔ اور اپنے تدبر وذہانت سے استقراء تام کرکے اس حد مشترک کو ڈھونڈ نکالا جو ہمیشہ ہمیشہ اقوام عالم کے مزاج عقلی میں باوجود تباین واختلاف کارفرما ہے اور اس تلاش وجستجو والہامی ذہانت پر وہ تاریخ عالم میں ابدالآباد تک کے لئے مبارک باد کے مستحق ہوگئے۔ اسی حد مشترک کو لے کر روح قومی کی تعمیر تین دن کی بھوک پیاس میں اپنے خون سے کردی۔ جس کو رجز میں آپ نے دشمنوں کے بھرے مجمع میں اعلان کرکے تاریخ کے نہ بھولنے والے اوراق کا سرمایہ بنادیا اور فرمایا:

اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰی مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

عزت وناموس پر جان نثار کردینا چاہئے اور جان وعزت کو خدا کی راہ میں دے دینا چاہئے۔

اسی اصول پر انتہائی مظلومیت کے ساتھ تمام قہر واستیلا، ہر قسم کے تشدد وظلم کا مقابلہ کرکے حق کی طرف داری میں جان ومال واولاد وعزت نثار کردی اور اپنے متبعین کو عمل سے صرف اسی کی تعلیم دی۔ یہ ایک ایسا نظام سیاسی تھا جس پر عامل ہونے سے تمام عناصر تمدنی میں کسی قسم کا بھی تمدن ہو

عام انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ مزاج عقلی اقوام مختلفہ کا کیسا ہی متضاد ہو، مظلومیت کا جتنا شدید مظاہرہ ہوگا اتنا ہی شدید انقلاب مزاج عقلی میں پیدا ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس تعلیم میں اتنی قوت ہے کہ آج تمام سیاسی فرقوں میں باوجود سخت مغائرت کے اور خیالات کے شدید تناقض کے سب کی ایک ہی حقیقت ہے اور ان کے اندر سے حسینیؑ روح علانیہ جھلک رہی ہے انتہا پسند، شخصیت پرست، سوشلسٹ غرض کہ تمام فرقے، مختلف رنگ کی جھنڈیوں کے نیچے ایک ہی منزل مقصود کی طرف جا رہے ہیں۔ اور سب کا نصب العین صرف یہ ہے کہ افراد کو تمام اقوام کی حکومت حسینیؑ کے اندر فنا ہو جانا چاہئے ہر فرقہ یہ چاہتا ہے کہ قوت ونفوذ حکومت حسینی کے دامن میں اس طرح سمٹ کر آجاویں کہ ہر چیز کی باگ حسینؑ کے ہاتھ میں آجاوے، حکومت حسینؑ ہر چیز کی ترتیب دے اور انہیں کی طرف تمام چیزیں سمٹ آویں۔ معمولی سے معمولی جزئیات کے متعلق بھی وہ افراد کی زندگی کو قانون حسینیؑ کے شکنجہ میں جکڑ دیوے اور مخلوق کو دنیا کے جھگڑے بکھیڑے سے نجات دلا دے۔

بادشاہ ''امپراطور'' پریسیڈنٹ غرضکہ حکومت کسی کے ہاتھ میں بھی ہو، افراد کا صرف مقصد یہ ہے کہ امن وامان، راحت واطمینان حاصل ہو اور عوام اشتداد کے ساتھ ہمیشہ ناحق کا مقابلہ کریں۔ یہی مقصد تمام قوم میں روح حسینؑ کی ترجمانی کرتا ہے۔ امام حسینؑ کے سچے متبعین اس اصول کو چھوڑ کر کسی دوسری طرف نہیں جا سکتے اور قوم شیعہ ہر مذہب وملت پر سلطنت وحکومت میں اس کے ساتھ خود بھی زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی امن وراحت وسلامتی کا پیغام پہنچانے میں کامیاب ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ لیڈروں کی غلط کارروائی سے اس قوم کا تصادم دوسروں سے ہو جاوے لیکن یہ خاموش مشن جنگی اسپرٹ کھو کر امن وامان کے گہوارے میں ہر قسم کی جدوجہد میں مشغول رہ سکتا ہے۔

ایک طرف ہمارے نظام عصبی کا تموج اور آسانی کے ساتھ بدلنے والا مذاق ہم سے کیا کہتا ہے کہ ''کاش'' اس نظام مظلومیت کے بجائے جو ہر وقت ہم کو سہنے اور تشدد کے مقابلے میں خاموش

رہنے کی تلقین کرتا رہتا ہے۔ رونے رلانے سے بزدلی پر تیار کیا جاتا ہے کوئی دوسرا نظام ہوتا تو ہماری حالت بہتر ہو جاتی لیکن دوسری طرف شہیدوں کی آوازیں ان کے مزاروں سے آتی ہیں۔ ہماری مظلومیت نے ہمیشہ ظالموں کو رحم پر آمادہ کیا، ہماری مظلومیت نے بڑی بڑی جبار قوتوں کو مسخر کیا، ہماری مظلومیت نے دکھا دیا کہ حق کی حمایت میں غیر متزلزل صبر واستقلال سے خونی اسلحہ ہمیشہ کے لئے بیکار ہو گئے، ہماری مظلومیت نے دکھا دیا کہ بہترین تمدنوں اور مہذب ترین اقوام میں ہم سرتاج ہو کر چمک سکتے ہیں۔ ہماری مظلومیت نے ہر قسم کی ترقیوں کے دروازے ہمیشہ کے لئے کھلے رکھے ہیں۔ ہمارے جذبہ مظلومیت نے ہماری تعداد نفوس میں روز افزوں افزائش کی اور ہر دلعزیزی اختیار کی، مالی تفوق، علمی تفوق، سیاسی تفوق حاصل کیا۔ پھر آج کیا ہے جو ہم صدیوں کے تجربہ کے بعد اس نظام سیاسی کو بدلیں۔

دنیاوی ہر ترقی، عالمگیر حکومت جو چاہے حاصل کرو لیکن ناحق کوشی نہ ہو، تشدد نہ ہو بلکہ صبر واستقلال ہمت وایثار، قربانی ومظلومیت کے ساتھ۔

یہ وہ نظام ہے کہ جو وجود عالم سے آج تک یکساں کامیاب رہ سکتا ہے اور آج سے قیامت تک صفحات تاریخ کو الٹ ڈالو، میدان رزم کی ہر خون آشام داستان ہنگامی اور وقتی کامیابیوں کے ساتھ کوئی ثبات ودوام اپنے دامن میں نہیں رکھتیں **لا ینال عھدی الظالمین** خدائی عہد ظالموں سے پورا نہیں ہوتا انتہائی تشدد اور سخت ترین مادی اور جنگی کارگزاریوں کا آخری نتیجہ صلح وآشتی ومحبت ہوتا ہے۔ بڑی سے بڑی قوت چند روزہ اشتداد کے بعد ایک چھوٹی اور کمزور قوم کے آگے جھکنے پر مجبور ہوتی اور اتحاد عمل واشتراکت حکومت کی دعوت دے کر سکون وامن پیدا کر سکتی ہے۔

دنیا کی اشتدادی طاقتوں کا خاتمہ ہو گیا اور جتنے بھی اشتدادی مظاہرے تھے نئے نئے لباس میں ظاہر ہو کر سب ہی چل بسے اور اپنے کئے کی پاداش اٹھانا پڑی۔

وسیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون کسی نے کبھی ظالموں سے ہمدردی

نہیں کی نہ ان کے ظلم وتشدد کو سراہا فما للظالمین من نصیر لیکن مظلومیت کا دائمی بول بالا رہا اور ہمیشہ ہمیشہ کی فتح مظلومیت ہی کو ہوئی۔ آخری جیت مقتول ہی کی ہے **فلا یسرف فی القتل انه کان منصورا** جس قدر دل کھول کر قتل و غارت کیا جائے گا۔ مادہ پرست نہ سمجھیں اور مادی قوتوں کے ظاہری اور فوری نتائج کے پوجاری رہیں، لیکن وہ حقیقت و واقعیت کو نہیں جھٹلا سکتے۔ پولیس، فوج، آیروپلین، مشین گن، سبمیرین، زہریلی گیس، اور طرح طرح کی مہلک چیزیں انسانی خون آشامی کے لئے ایجاد ہوئیں اور برابر ان ایجادات کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ان اقوام کا نہایت بیچینی سے عام مطالبہ ہے، کہ قوائے حربیہ کی تخفیف ہو، برابر کانفرنسیں ہو رہی ہیں۔ تا کہ جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ تاریخ اس زمانے کی زشت کاری و وحشت و بربریت کے ملعون افسانے آئندہ نسلوں کے لئے نفرت وحقارت کے لئے چھوڑنے والی ہے۔

حسینی مشن نے کیا کیا۔ بنی امیہ کے جبر وتشدد کے مقابلہ پر مقاومت مجہول کی اور کبھی یزیدی ظلم سے تعاون نہ کیا یزید کا بیعت کے لئے جب شدید تقاضہ ہوا اور قانون حکومت کی پابندی کا ''ولید'' کے ذریعہ سے شدید مطالبہ ہوا تو امام حسینؑ نے قانون یزید کو ٹھکرا دیا۔ اور ''سول نافرمانی میں'' ہر جبر واشتداد کو برداشت کر لیا۔

یزید نے امام حسینؑ کو مدینہ میں امن اور راحت کی زندگی بسر کرنے سے روکا۔ تو امام حسینؑ نے خاص اسی مقام پر منتخب کیا جہاں ان کے پدر بزرگوار کا خون بہایا گیا تھا۔ یزید نے خون حسینؑ کا مطالبہ کیا تو اس حق کے پرستار نے عزیز و اقارب اور بچوں تک کے خون دینے میں دریغ نہ کی۔ یزید نے ہر قوت وطاقت کا مظاہرہ کیا تو حسینؑ نے مظلومیت کے پیکر میں خود کو پیش کیا۔ یزید نے مردوں کی قربانی کی دعوت دی تو حسینؑ نے عورتوں تک کو اسیری کے لئے پیش کر دیا۔ یزید نے زندگانی دنیا چھوڑنے پر دعوت دی تھی تو حسینؑ نے نعشوں کو بھی کربلا کے ویران سنسان جنگل میں بے گور وکفن پڑا رہنا گوارا کیا، مگر یزید سے

نہ تعاون کرنا تھا نہ کیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ سرخیل شہداء ہمیشہ کی فتح مندی حاصل کر کے کربلا کے جنگل میں سو رہا اور بنی امیہ ابدالآباد کے لئے نظروں میں دنیا کی ذلیل و رسوا ہو کر تخت و تاج سے محروم ہو گئے۔

پولیس، قلعہ وفوج، ڈاکوؤں، رہزنوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی تادیب وسرزنش کے لئے موزوں ہے۔ اس وقت جب کہ اخلاق ونصیحت، تعلیم وتربیت سب بیکار ہوں یا ہنگامی تہیجات ہوں۔ لیکن ملکی آزادی اور سیاسی ومذہبی انقلابات میں صرف مظلومیت وعدم تشدد ہی کامیاب ہوتا ہے۔ دنیا کے مبلغین وواعظین نے مذہبی انقلابات مظلوم بن کر پیدا کئے، محبت وآشتی ورواداری کر کے۔ قوم کیسی ہی بے رحم وظالم کیوں نہ ہو لیکن اشتدادی مظاہرے کے تحت میں محبت وترحم کا تقاضہ رہتا ہے۔ خود یزید اور اس کے ساتھی باوجود اس سفاکی و بے رحمی کے عین موقعوں پر ظلم واشتداد سے ندامت وخجالت کا اعتراف کرنے پر مجبور تھے۔ بہرحال جبر، شدت، قہر وغلبہ، قتل وغارت گری، قید وبند، جلاوطنی، زدوکوب وغیرہ اگر قوت ہیں تو ان کی ضد بیشک صبر وتحمل، مظلومیت، خاموشی، برداشت واستقلال، ایثار، قربانی، رضا بھی بڑی قوت وطاقت ہے جس میں فتح وغلبہ یقینی ہے۔ اور سابق الذکر قوت میں مشکوک ومظنون یہی روح حسینیؑ ہے جس کے فقدان یا غلط استعمال سے آج ظلمتوں پر شیعہ پست ترین اقوام میں داخل ہو کر بربریت، جہالت بے تمدنی کا مظہر بن گئی ہے۔ شہادت امام حسینؑ پکار پکار کر دعوت دے رہی ہے کہ حق وآزادی کی طلب میں انتہائی مصیبت جھیل کر مرجاؤ حق وآزادی کی حمایت میں بڑی سے بڑی قوت سے مقاومت مجہولہ کر کے اس کی تمام ظالمانہ اسکیموں کو باطل کر دو۔

حق وآزادی کے حصول میں بڑی سے بڑی لالچ ورشوت وخوف وظلم سے نڈر ہو کر بے جگری سے عدم تعاون کرو۔ حق وآزادی کی غرض سے سب سے زیادہ قانونی احترام کرنے والی حکومت کو سول نافرمانی کر کے بے کار کر دو۔ امام حسینؑ نے یہی کیا اور نانا کے دین کو ہمیشہ کے لئے بچا لیا۔

”سرداد ونداد دست در دست یزید

حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ“

قوم شیعہ کے رہبروں اور مصلحوں کا فرض اولین ہے کہ فلسفہ شہادت امام حسینؑ کا بغور مطالعہ کریں۔شہادت کے تکالیف ومصائب بیان کر کے رونے رلانے کے ساتھ قوم شیعہ کی تعمیر حسینی تعلیم پر کریں،جس قوم میں جذبہ شہادت وایثار وقربانی،مظلومیت وصبر واستقلال،حق پرستی وآزادی کے لئے پیدا ہوجائے گا وہ قوم بے لڑے بھڑے ایک دن شرق سے غرب تک حاکم و مالک ہوجائے گی۔

ان الارض یرثہا لعبادی الصالحون۔

انہیں نیک بندوں کو تمام روئے زمین میں میراث ہے بس۔

(ماخوذ از ”سرفراز“ لکھنؤ محرم نمبر سنہ ۱۳۷۶ھ)

امام حسینؑ کی بین الاقوامی شخصیت

حکیم الامت علامۂ ہندی آیۃ اللہ مولانا سید احمد نقوی

تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو عالم کا کوئی مذہب ایسا نہ ہوگا جس میں زندگی کے ہر شعبے میں خوبیوں اور بھلائیوں کی تعلیم نہ ہو۔بات یہ ہے کہ ہر مذہب کی غرض وغایت یہی ہوتی ہے کہ انسان سدھار کرے اور انسانیت کے شرف وعزت کو بڑھائے۔خودساختہ حکماء کے مذاہب ہوں،ان کی بھی یہی غرض ہوتی ہے کہ انسان کے ہر شعبۂ زندگی کو بلند وبالا رکھے۔اور جو الہامی مذاہب خدا کی طرف سے ہیں ان کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔بے شک ان کے جملہ قوانین اس مالک کل رب العالمین کے بنائے ہوئے ہیں جو منصف وعادل،حکیم وعلیم،رحیم وکریم ہے۔ان میں بدی کا شائبہ ممکن نہیں ہے۔پھر جب قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی قوم بغیر نبی ورسول نہیں چھوڑی گئی ہے تو ہرگز یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کی طرف سے مذاہب عالم میں اختلاف ہو اور یک رنگی نہ ہو۔مذاہب کی کہنگی اور ان کے ماننے والوں کی ایجادیں مذاہب کے اصلی رنگ وروپ کو بدل کر مسخ کر دیتی ہیں اور اس کے اختلاف کو مٹانے کے واسطے وقتاً فوقتاً انبیاء اور رسل آتے ہیں (قرآن) یہ اتحاد مذاہب خود بتاتا ہے کہ جملہ مذاہب میں ایسی باتیں موجود ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور حقیقی تعلیمات کو دہراتی رہتی ہیں۔خاتم النبیین نے تمام اہل کتاب کو اسی بات کی پرزور دعوت دی تھی کہ ”ہم تم ان باتوں میں مل جل جائیں جو ہم میں اور تم میں برابر سے ہیں اور یہ کہ عبادت خدا میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں“ (قرآن مجید)

مذاہب عالم نے اس دعوت کو آج قبول کرلیا ہے تمام مذاہب توحید الٰہی پر متحد ومتفق ہیں اور اسی بارے میں مرکزیت پیدا ہوچکی ہے۔محوری ڈکٹیٹر تقریروں میں اسی ایک خدا کا سہارا قائم کر رہے

ہیں ۔ جمہوریتیں بھی ، بودھ مت بھی ہندومت بھی ، سکھ صاحبان بھی ، برہمن سماج ، آریہ سماج ،
صوفی ، بتیا صوفی ، عیسائی ، موسائی ، مسلمان سبھی توحید کا پرچار کررہے ہیں کسی نہ کسی شکل سے ہو۔ پھر
کیا وجہ ہے کہ اس کلمۂ جامعہ وتوحید پر ایک دوسرے سے بغلگیر نہ ہوجائیں اور فروعی نزاعوں کی خلیج کو
متحدہ کوششوں سے پاٹ نہ دیں ۔ جس سے قرآن ورسول کا منشاء پورا ہو۔ اسی کے سب سے پہلے
رسول کے نواسے امام حسین نے رہنمائی کی اور اپنی عظیم ترین قربانی کو بین الاقوامی بنادیا۔ کیوں نہ
مذاہب عالم ٹھنڈے دلوں اپنا اور بیگانہ کہنا چھوڑ کر حسینی کارناموں کی تنقید وتبصرے اپنے مذہبی نقطۂ
نظر سے کر کے حسین کو اپنا نہ بنالیں اور ان کی معصومانہ شہادت کو اپنی مذہبی نمائندگی نہ قرار دیں ۔

دیکھو سہتیارتھ پرکاش سلانس ۸۵[۴] :۔

'' پاپی انسان دھرم کی راہ چھوڑ کر دروغ گوئی ، فریب ، پاکھنڈ سے مال کو لے کر اور بڑھتا ہے
بعد ازاں دولت وغیرہ مال ومتاع ، خورد ونوش و پوشاک وزیور سواری ، مکان ، عزت ورتبہ کو حاصل
کرتا ہے ۔ بے انصافی سے دشمنوں کو بھی فتح کرتا ہے پھر جلد تباہ ہوجاتا ہے ۔''

اس تباہی کی وجہ رگ وید است ادھیائے ۳ ورگ ۱۸ منتر ۲ میں دیکھو ''میں بدکردار ظالموں کو بھی
اشیر باد نہیں دیتا'' پھر رگ وید ادی بھاشا بھومکا میں ہے ''میں پرمیشور اس راج میں جہاں دھرم کی
پابندی ہوتی ہے قائم ہوتا ہوں ۔ جس ملک میں علم ودھرم کی ترقی واشاعت ہوتی ہے وہ میرا مقام
مالوف ہے ۔''

معلوم ہوا کہ جہاں علم ودھرم کی پابندی نہ ہو خدا اس ملک کو چھوڑ دیتا ہے جس کا تباہ وبرباد ہوجانا
لازمی ہے ۔ اب تاتاریوں میں ترب کی راجدھانیوں کی اس حالت کو دیکھو جو اپنے ظلم وستم ،
خونخواریوں ، بے علمی وجہالت وبے شرمی ، بیحیائی ، بے دھرمی میں خونخوار درندوں کے مانند ہوگئی تھی ،
اس وقت انسانیت کے ہیرو فرزند رسول حسینؑ شہید کی اتنی بڑی قربانی کی ضرورت ہندومت کے
اصول پر کتنی ضروری ہوگئی تھی اور پرمیشور کے اشیر باد کی کس قدر مستحق تھی ۔

گوتم رشی ایک فاختہ کی جان بچانے کے لیے اپنی گردن پیش کرتے ہیں ۔ کیا ان کے زمانے
میں یہی ہو رہا تھا کہ مظلوم میثم تمار کے دست و پا کاٹے جائیں اور زبان کاٹ کر اس لئے سولی دی
جائے کہ وہ داماد رسول علی ابن ابی طالب کی مدح وتوصیف کرتے تھے؟ کیا گوتم رشی کے زمانے میں
یہ بھی ہو رہا تھا کہ جناب محمد بن ابی بکر رسول خدا کے سالے اور خلیفہ کے بیٹے کو گدھے کی کھال میں
لپیٹ کر جلا دیا جائے اور اس لئے کہ وہ خلیفۂ وقت علی مرتضیٰ کے پیرو اور پروردہ تھے ۔ جناب رشید
کے شکم کو چاک کر کے پتھر بھر کر اس لئے شہید کیا جائے کہ وہ دوست علی تھے ۔ فرزند رسول امام حسن
کو باوجود حکومت سے دستبردار ہونے کے اس لئے زہر دیا جائے کہ علی و بتول کے لاڈلے تھے ۔
ایسے راج کے متعلق بودھ مت ایسے پاپیوں کی نسبت کیا حسین کا ساتھ نہ دے گی اور ان کی سنگت کو
اپنے اپنے دھرموں کے مطابق فرض انسانی قرار نہ دیں گے ۔

ہندومت کی جان اہنسا ہے ۔ کیا وہ حسینی اہنسا کی کوئی عملی مثال پیش کرتے ہیں ۔ انصاف سے
دیکھو نانا کی وفات پر ان کی اکلوتی بیٹی کو باپ کی جدائی پر رونے سے روکا جاتا ہے ۔ حسین کے باپ
بھائی کنبہ والوں کو محتاج کر کے بھوکوں مارا جاتا ہے ۔ حسین کے بھائی کو زہر دے کر مارا جاتا ہے اور
نانا رسول کے پہلو میں دفن نہیں ہونے دیتے ، لاش پر تیر برساتے ہیں ۔ پھر حسین کو خاموش قبر رسول
پر بیٹھنے نہیں دیتے ۔ حکومت کا مطالبہ ہے کہ بیعت کرو یا سر دو ۔ حسین مدینہ چھوڑ کر کعبہ میں پناہ لیتے
ہیں ۔ کربلا پہونچ کر نہر فرات کے کنارے خیمے گاڑتے ہیں ، پھر خیمے اکھاڑے جاتے ہیں عورتوں ،
بچوں ، سواری کے جانوروں پر تین روز تک کھانا پانی بند کیا جاتا ہے ۔ پھر بہتر پیاسوں پر ہزاروں
یزیدی ٹوٹ پڑتے ہیں ، چھ مہینہ کے بچے تک کو زندہ نہیں چھوڑتے ، بیک وقت دل ہلانے والے
مصائب کے پہاڑ اس مظلوم پر ڈھائے جاتے ہیں اور حسین تشدد کے موقعوں کو چھوڑتے ہوئے صبر
واستقلال وتحمل کرتے ہیں ۔ کیا اس اہنسا کی مثال تاریخ پیش کرسکتی ہے؟ استغفر اللہ
کیا حسین اس اہنسا کی بدولت اس ماتم داری کے مستحق نہیں ہیں جو منو جی مہاراج کی منوسمرتی

ادھیائے پانچ میں ہیں ''لڑائی کے میدان میں تلوار وغیرہ کے زخم کھا کر جو مر جائے تو اس کا کرما کرم
اس وقت ختم ہوجاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ پاپ کی بھی ختم ہوجاتی ہے مگر غیر ملک میں مرجائے اور دس
روزے پورے نہ ہوتے ہوں تو دس دن میں جتنی کمی ہوا تنے دن اس کا ماتم کریں۔''

پھر ادھیائے سات میں ہے'' قابل تعریف لڑنے والوں کا دھرم ہے ،لڑائی کی حالت میں
دشمنوں کو مارنا، کشتری اس دھرم کو نہیں چھوڑتے۔''

امام حسینؑ کی تحفظ انسانیت میں جنگ ،حفاظت دھرم کے لئے جنگ ،انسانیت سوز بداخلاقیوں
کی مدافعتی جنگ ، بہتر تنوں کی ہزاروں سے تین دن کی بھوک پیاس میں جنگ کرنا اور شہادت کے
بعد تین روز تک عرب کی ریگستانی تپتی زمین پر لاشوں کا پڑا رہنا اور کوئی کریا کرم نہ ہونا کیا قابل فخر
نہیں ہے۔

ہندو دھرم خود انصاف کرے اگر اس وقت منوجی مہاراج کربلا میں موجود ہوتے تو ان مظلوموں
کا کیا دفن وکفن نہ کرتے اور دس دن خود ماتم کرتے یا نہ کرتے۔ اس لئے کہ انسانیت کا تقاضا تو یہی
تھا۔ پھر ان کے پرستار، ان کو کیا یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس بین الاقوامی انسان کا پہلی محرم سے دس تک
ماتم کریں اور حسینی یاد منائیں۔ جیسا کہ شریف الخیال انسانیت کے علمبردار اہل ہنود کثرت سے اس
وقت بھی حسین مظلوم کی پرخلوص عزاداری کرتے ہیں۔

حسینؑ کی نبوتی شان

توریت، زبور، انجیل، قرآن کو نظر انصاف سے دیکھو۔ جس بدکاری، ظلم و بے انصافی و بے دینی
کے وقت نبیوں نے بے جگری سے مصیبتوں، تکلیفوں کو برداشت کیا ہے حسین نے بھی اپنے زمانے
میں عربوں کی بگڑی ہوئی بدترین حالت کو سدھارنے میں انبیائے سابقین سے زائد ہمت و مردانگی،
جابر وظالم سلطنت کا مقابلہ کر کے اپنی قربانی پیش کی ہے اور انسانیت کے سدھار میں نبیوں کے قدم
بقدم چلتے رہے اور وہی رنگ ڈھنگ رہا جو انبیاء کا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا اس لئے کہ حسین وارث

انبیاء ومرسلین تھے۔ اور وہ سب شرف وفضیلتیں بربنائے توارث عمرانی ذات حسین میں جمع تھیں۔
کربلا کے میدان میں اپنے عمل سے جس طرح سے قرآنی تعلیم دے رہے تھے اسی طرح توریت و
انجیل وزبور وصحف انبیاء کی تعلیم دے رہے تھے۔ اور جملہ انبیاء کی پوری نمائندگی کررہے تھے۔

جب اہل دنیا کے اخلاق بگڑتے ،خدا کے رسول سروں کو ہتھیلیوں پر رکھے سامنے آجاتے تھے۔
حسین نے بھی وہی کیا۔ اور ٹھیک موقع پر کیا حضرت موسیٰؑ کی نبوت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ
ظلم فرعون سے بچا کر بنی اسرائیل کو نکال لائے۔ حسین کا کیا یہ کم کارنامہ ہے کہ اپنی شہادت سے
کروڑوں بندگان خدا کو یزیدیت سے بچالیا؟ جناب عیسیٰؑ کا نصاریٰ کی نظر میں سب سے بڑا کام
سولی پر چڑھنا تھا۔ انصاف کرو حسین نے تنہا نہیں بہتر تنوں سے جن میں چھ مہینہ کا بچہ بھی ہے، راہ
خدا میں قربانی دیدی۔ اس لئے کوئی یہودی، نصرانی نہیں کہہ سکتا کہ حسین نے ان کے اصول وآئین
کی پوری پوری نمائندگی نہیں کی۔ اسی لئے اس شہادت عظمیٰ پر نبیوں نے خود ماتم کیا اور امتوں کو ماتم کا
حکم دیا۔ (دیکھو ہماری کتاب نبیوں کا ماتم) اس موقع پر صرف یرمیاہ نبی (باب ۴۶ آیت ۱۰) کی
پیشین گوئی سن لو۔

''کیونکہ خدا رب الافواج کے لئے اتر کی سرزمین میں دریائے فرات کے کنارے ذبیحہ مقرر
ہوا ہے۔''

حسینؑ کے سوا فرات کے کنارے کون ذبیحہ خدا کی راہ میں گزرا۔ اسی جرم پر جو اہل دنیا کی نظر
میں جرم تھا۔ یعنی حکومتوں نے جو اپنے لئے خدائی اختیارات سمجھ لئے تھے اس کی مزاحمت کرتے
تھے اور حیوانیت مٹا کر انسانیت کی رہبری کرتے تھے۔

❁❁❁

کیا نمازِ شاہ تھی ارکانِ ایمانی کے ساتھ

صفوۃ العلماء مولانا سید کلب عابد صاحب قبلہ رحمت مآب

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کربلا کے چٹیل میدان میں امام حسین علیہ السلام ان کے اعزہ اور اصحاب نے جیسی بے مثال قربانیاں پیش کی ہیں ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی قوم وملت میں کسی بھی مقصد کے لئے اتنی عظیم قربانیاں نہ پیش کی گئیں اور نہ قیامت تک پیش کی جاسکتی ہیں۔اس واقعہ میں جذبۂ قربانی،صبروتحمل اور راہ خدا میں خندہ پیشانی سے ہر مصیبت کو برداشت کرنے کے جتنے پہلو پائے جاتے ہیں نہ ان کی مثال مل سکتی ہے اور نہ اس کے نتیجے میں جیسے گوناگوں اور مختلف النوع آثار مرتب ہوئے اور ہوتے رہتے ہیں اور جس جس طرح سے انسان اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف موڑوں پر اس سے روشنی حاصل کرسکتا ہے اس کی کوئی حد ہے۔ یقینا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ ایک رہبر کامل میں رہبری کے کیسے جوہر ہونا چاہئے۔ دقت نظر سے صحیح رہبر کے انتخاب کے بعد آنکھ بند کرکے اس کی کیوں کر اطاعت کرنا چاہئے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ منزل مقصود حاصل کرنے کے لئے اہل کارواں میں کیسی ہم آہنگی ہونا چاہئے۔واقعہ کربلا رنگ ونسل وقومیت کی بنا پر تفوق وبرتری کے جذبے کو پامال کرتے ہوئے اسلامی مساوات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ جس زانو پر جناب عباسؑ وعلیؑ اکبر کا سر ہے اسی پر جونؑ غلام ابوذرؓ کا بھی سر نظر آتا ہے۔چھوٹوں بڑوں میں حفظ مراتب کی تعلیم بھی مل جاتی ہے،غرض کہاں تک فہرست گنوائی جائے،سرکار رسالتؐ نے اپنی سیرت سے جن باتوں کی تعلیم ۲۳/برس پر پھیلی ہوئی مدت میں دی امام حسینؑ نے ان باتوں کو ایک رات اور ایک دن میں اجاگر کردیا۔ واقعہ کربلا کوئی پھول نہیں،کوئی گلدستہ نہیں، بلکہ وہ اخلاق وکردار اسلامی کا ایک سدابہار چمن ہے جس سے ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق پھول چن سکتا ہے۔لیکن

اس ہمہ رنگی میں یک رنگی بھی ہے روشنیاں تو ہر رنگ کی ہیں لیکن وہ برقی رو جس نے دنیا کو چمکا اور جگمگا رکھا ہے وہ دو مثبت اور منفی طاقتوں لا الہ الا اللہ کی رہین منت ہے۔واقعۂ کربلا کی اصل روح قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ہے یعنی قابل پرستش،لائق اطاعت،سرجھکانے کے قابل ایک ہی یکتا اور بے نیاز ذات ہے جس کے مقابل سب کو اظہار نیازمندی کرنا چاہئے۔اسی کو ہر ایک کا مقصد نگاہ وملجا وماویٰ ہونا چاہئے اس کے علاوہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی طاقت جو ذات احدیت سے ٹکرائے وہ طاغوت ہے ایمان باللہ کے لئے طاغوتی طاقتوں سے کفران کے سامنے سر جھکانے سے انکار ضروری ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کا اظہار کبھی ؎

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت

سے اور کبھی ؎

حقّا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

سے کیا جارہا ہے۔اسی عقیدے کا عملی مظاہرہ ایک مسلمان نماز کی صورت میں کرتا ہے۔

نماز توتوحید فی الذات،توحید فی الصفات اور توحید فی العبادت صرف اللہ کے سامنے سرجھکانے ہر طاقت سے سربلندی،اللہ کے سامنے انتہائی خضوع وخشوع کے مظاہرہ کے لئے اسلام نے منتخب کیا ہے۔قبلہ کی طرف رخ کرنے کی شرط اشارہ ہے کہ ہر طرف سے رخ موڑ کر پوری توجہ اللہ کی طرف ہونا چاہئے ۔ قیام رکوع وسجود علامتیں ہیں مقصد الٰہی کے لئے قیام کرنے،صرف اسی کے سامنے جھکنے،اور بس اسی کے لئے مظاہرہ خضوع وخشوع کرنے کی۔

چونکہ نماز کو اسلام کے بنیادی مقاصد کے اقرار واظہار کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے اسی لئے اس کو تمام عبادتوں پر تفوق وبرتری حاصل ہے۔رسالت مآبؐ نے اس کو اپنی خنکی چشم فرمایا۔ارشاد ہوا کہ اگر نماز قبول ہوئی تو تمام اعمال قابلِ قبول ہوں گے اور اگر نماز رد ہوگئی تو ہر عمل رد ہوجائے گا۔رسولؐ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ نماز دین کا ستون ہے۔یعنی جس طرح عمارت ستونوں پر قائم ہوتی ہے

ستون گر جائیں تو عمارت ڈھا جاتی ہے۔ وسطی عماد نہ رہے تو خیمہ برقرار نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح اگر نماز نہ رہی تو گویا دین ہی ختم ہو گیا۔ یہاں تک ارشاد فرمایا کہ شرک واسلام میں مابہ الامتیاز نماز ہے۔ تارک الصلوٰۃ کو انبیاءؑ کا قاتل بتایا گیا ہے کیونکہ مقصد نبوت فرامین الٰہی کے سامنے سر اطاعت جھکانا ہے۔ تارک الصلوٰۃ اس مقصد کا قاتل ہوتا ہے۔

نماز کے یہی خصوصیات اور یہی امتیازات تھے جن کی بنا پر امام حسین علیہ السلام نے نماز کو معرکۂ کربلا میں جو اسلامی حقائق کا آئینہ ہے خاص درجہ عنایت فرمایا۔ جس سے بہتر طریقہ پر اہمیت نماز کا مظاہرہ حدود امکانی سے باہر ہے شب عاشور وہ رات ہے جس کو امام حسینؑ نے دل بھر کے نماز ادا کرنے کے لئے دشمنوں سے مانگ کر حاصل کیا۔ روز عاشور امام حسین علیہ السلام کی نماز ظہر مسلمانوں کے لئے اس بات کا عظیم درس ہے کہ کسی حالت میں بھی نماز ترک نہ ہونے پائے۔ مجھے یقین ہے کہ امام حسینؑ اول وقت نماز سے معاذ اللہ غافل نہ تھے۔ لیکن خود خاموش تھے۔ شاید اس لئے کہ دنیا دیکھ لے امام معصوم ہی نہیں حسینؑ کے اصحاب کو بھی کتنی فکر تھی کہ اس وقت جب جنگ مغلوبہ ہو رہی تھی بیس ہزار کا لشکر حسینؑ کے چند ساتھیوں کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ نیزہ و سنان وشمشیر کے ہر طرف سے وار ہو رہے تھے۔ ظاہر ہے اصحاب امام علیہ السلام جوش جہاد میں مدہوش ہوں گے۔ ان کی توجہ اس طرف بھی ہو گی کہ امام حسینؑ اور آپ کے اعزا پر کوئی زخم نہ آنے پائے۔ خیام حسینی کی حفاظت کی فکر بھی ہو گی مگر اس حالت میں بھی اصحاب کو نماز ہی یاد نہ تھی یہ بھی خیال لگا ہوا تھا کہ کب اول وقت ہوتا ہے۔ ابو ثمامہ نے بڑھ کر کہا آقا! نماز کا وقت آ گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ نماز پڑھ لوں یا حسینؑ اسی کے منتظر تھے، خوش ہو گئے اور دعا بھی دی تو ایسی جس سے نماز کی عظمت اور نمایاں ہو جائے ارشاد فرمایا۔

ذکرت الصلوٰۃ جعلك الله من المصلین۔ اے ابو ثمامہ! تم نے نماز یاد رکھی اللہ تم کو نماز گزاروں میں شمار کرے! اس موقع پر یہ بھی ممکن تھا کہ امامؑ اپنے اصحاب سے فرماتے کہ جاؤ دو دو

ایک ایک کر کے خیمے میں نماز ادا کر لو، مگر اس طرح نماز کی اہمیت تو ظاہر ہو جاتی، نماز جماعت کی فضیلت معلوم نہ ہوتی۔ امامؑ نے اس عالم میں جبکہ مصائب کا انبوہ تھا، دشمنوں کا ہجوم تھا، نماز جماعت پڑھ کر اپنے دوستوں بتایا کہ میں نے اس حالت میں نماز جماعت ادا کی ہے تم کم از کم پر سکون حالات میں تو نماز جماعت سے غفلت نہ برتو۔

نماز ظہر سے زیادہ پر ہیبت منظر وہ تھا جب امام یکہ وتنہا دشمنوں کے مجمع میں گھرے ہوئے تھے۔ نہ لشکرے، نہ سپاہے، نہ کثرت الناسے، نہ قاسمؑ، نہ علی اکبرؑ نہ عباسؑ

مگر اس حالت میں بھی حسینؑ پشت زین پر نماز عصر ادا فرما رہے تھے۔ اور پھر اس سجدۂ آخر کے لئے کیا کہا جائے جس سے حسینؑ نے خود سے سر نہیں اٹھایا سجدے سے سر اٹھا تو نوک نیزہ پر سر بلند ہوا۔ امام نے بتایا کہ یہ حقیقت نماز ہے۔ یہ روح نماز ہے۔ یہ شان نماز ہے، جو میں نے ادا کی یہ ہیں وہ ارکان ایمانی جن کا مظہر نماز ہوتی ہے۔

یقینا نماز شاہ ارکان ایمانی کے ساتھ تھی۔ اس نماز سے بہتر ارکان ایمان کا نمایاں ہونا اب قیامت تک ممکن نہ ہو گا۔ لیکن بزرگ مرتبہ شاعر سے اپنی گستاخی کی معافی مانگتے ہوئے یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ دوسرے مصرعے سے مجھے اتفاق نہیں میرے خیال میں یہ کہنا مناسب نہیں کہ ؎

دل بھی جھک جاتا تھا ہر سجدے میں پیشانی کے ساتھ

میرے خیال میں پیشانی جھکنے کی قید سر جھکنے کے لئے درست نہیں بلکہ وہ سر جو ہر لمحے اور ہر آن بارگاہ احدیت میں جھکا ہوا تھا اس کا اظہار تھا سجدے میں خون آلود پیشانی کا جھکا دینا۔ بارگاہ الٰہی میں دل کا جھکنا کوئی آنی اور لمحاتی واقعہ نہیں۔ اس کو تو ہر آن وہر لمحے اللہ کے سامنے خم رہنا چاہئے۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ خامسِ آل عبا نمبر، محرم وصفر ۱۴۰۴ھ/ اکتوبر نومبر ۱۹۸۳ء)

❁❁❁

دنیا کی بلند ترین ہستی

ذاکر شام غریباں عمدۃ العلماء آیۃ اللہ سید کلب حسین

جب سے ابتدائے انسانیت ہوئی اور اشرف المخلوقات نے بزم ہستی میں قدم رکھا اس وقت تک اس خاک دان ہست و بود میں ہزاروں ہی ایسی بلند ہستیاں بزم شہود میں آئیں جن کے اعمال و افعال، اخلاق و عادات خدمت حق اور اطاعت احکام کو خالق نے تمام بلند و پست عالم میں اتنا نمایاں پیش کیا کہ ہزاروں برس گذرنے کے بعد بھی انقلاب زمانہ کی دست درازیوں کی یاد دلوں سے نہ مٹا سکی اور کبھی نہ کبھی بھولنے والوں کے عالم خیال میں ان کی تصویریں اپنے روشن خدوخال کے ساتھ گردش کر ہی جاتی ہیں۔ جن میں علمی جلوہ گاہیں بھی، اور عملی بھی ہیں فکر و خیال کے پر کیف منظر بھی ہیں اور بے نظیر سوج بوجھ کے مرقع، سیاست مدن کی راہنمائیاں بھی ہیں اور ناموس شریعت کی ہدایتیں بھی،

وہ ہستیاں بھی دنیا کی پیش نگاہ ہیں جو محض عالم ظاہری کی حد بندیوں کے اندر قابل تقلید کردار کے مالک تھے اور وہ بھی جو منزل فانی سے آگے بڑھ کر دار باقی کی راہوں کے سالک رہے مگر جس کو دیکھئے اس کے لائحہ عمل کے آئینہ میں یا محض دنیا نظر آتی ہے یا محض دین، صرف سیاست نظر آتی ہے یا شریعت، فقط ظاہر نظر آتا ہے یا باطن، صرف نظر کی بلندیاں ملتی ہیں یا محض عمل کی لیکن ایسی ہستی عالم معنیٰ میں کمزور نگاہ نے تلاش کی تو کوئی نہ ملی۔ جس کے ایک عمل بدل دینے سے پہلو بدلتے جائیں۔

تصویریں بدلتی جائیں، نقش و نگار بدلتے جائیں پھول ایک ہو مگر خوشبو ہر قسم کی موجود، آئینہ ایک ہو کر مگر ہر تصویر کی جلوہ گاہ، آفتاب ایک ہو کر مگر ہر رنگ کی شعاؤں کا منبع، نقطہ ایک ہو مگر دائرۂ فکر کا مرکز البتہ ایک، حسینؑ اور محض حسینؑ جس کو قدرت نے اپنے جمال بلکہ کمال کا وہ بے نظیر آئینہ

بنایا تھا جس نے لباس بشری پہن کر بزم انسانی کو زینت دی اور اخلاق الٰہی سے متصف ہو کر ہر کمال کا منظر پیش کیا۔ وہ حسینؑ نہیں جو صرف شیعوں کے امام بلکہ وہ حسینؑ جو چشم و چراغ عرب، وہ حسینؑ جو آسمان اوج قریش، وہ حسینؑ جو نور نگاہ ہاشم، وہ حسینؑ جو پارۂ قلب محمد عربیؐ۔ سرور قلب علیؑ، زینت آغوش سیدۃ زنان عالم، منبع امامت، مقصد ذبح عظیم، وہ حسینؑ جس کو خدا نے شہادت کے واسطے چنا، رسولؐ نے اپنے دین کی حفاظت کے واسطے علیؑ نے اپنی شجاعت کا وارث قرار دیا، ماں نے اپنی عصمت کا مستحق بنایا۔

حسنؑ نے اپنی نیابت کے واسطے چھانٹا۔ عالم اسلام نے امامت کی سند عطا کی۔ یزید نے اپنے مظالم کا مرکز بنایا، تلواروں نے حد برداشت آزما کے دیکھا، نیزوں نے دل کی گہرائیوں کو ٹٹولا، تیروں نے مہمان نوازی آزمائی، پیاس نے تحمل کی حدیں دیکھیں، حد سے بڑھتی ہوئی گرمی نے پختگئ ایمان سے مقابلہ کیا، یزید کے ٹڈی دل لشکر نے ثابت قدمی کا امتحان لیا۔ یہاں تک کہ آخر کربلا کی زمین نے اپنی آغوش تمنا میں لے کر سکون و اطمینان کی نیند سلا دیا اور دنیا اس مظہر کمال قدرت کے حالات، اخلاق، کردار، علم و عمل کی بلندی دیکھکر محو جمال ہو گئی۔

یہی وہ ذات ہے جو ہر تفریق سے بلند، ہر حد بندی سے باہر، ہر تقسیم سے بالاتر، تمام قوموں، جماعتوں، ملکوں بلکہ ہر عالم کا نقطۂ نگاہ مذہب کے اعتبار سے مسلمانوں کا امام، بہادری کے اعتبار سے ہر لشکر کا علمدار، سیاست کے اعتبار سے بڑے سے بڑا لیڈر، اخلاق کے لحاظ سے تمام دنیا کا رہبر، کردار کی حیثیت سے حکمت عملی کا معلم، عصمت کے لحاظ سے ہر مذہب کا انسان کامل۔

ہمارے نزدیک یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ امام حسینؑ نے اپنی تمام عمر میں جو قدم بھی اٹھایا وہ حدود دین الٰہی کے اندر اور جو عمل بھی کیا وہ اپنے خالق کے بنائے ہوئے دستور العمل کے مطابق۔ عمل کا مشیت خالق کے مطابق ہونا حسینؑ ہی کا کام تھا اور نتائج کی ذمہ داری کا بار صرف خالق کی قدرت پر تھا مگر عمل کی خصوصیت یہ تھی کہ ہر نگاہ تلاش کو اپنا مطلوب اس سید و سردار جوانان جنت کی

سوانح عمری میں کچھ ایسے بے نظیر انداز سے مل گیا کہ ہر باخبر انسان حسینؑ کے کردار کو اپنی راہ عمل بنانے کے واسطے خوشی سے تیار ہو گیا۔

عالم انسانیت میں یہ شان صرف حسینؑ ہی کی ہے کہ جتنا جتنا زمانہ گذرتا جاتا ہے اتنا ہی اتنا رنگ شہادت نکھرتا جاتا ہے اور حسینؑ کی قربانی میں تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ آج سے چند صدی قبل مسلمانوں کے علاوہ کب کسی غیر نے اس مظلوم کے کارناموں سے سبق لینے کی اپنے پیروؤں کو تعلیم دی تھی مگر اب تیرہ سو سال گذرنے کے بعد رنگ شہادت اتنا روشن ہوا کہ ہر مذہب والا، ہر ملت کا پیرو کار، ہر قسم کی سیاست کا شیدا اپنی قوم اور اپنی جماعت کے سامنے حسینؑ کی مثال پیش کرنا اپنی تبلیغ کا جزو اعظم سمجھ رہا ہے۔

اگر مناسبت محل اجازت دیتی تو میں بلا مبالغہ سیکڑوں ایسے لیڈروں اور مذہبی پیشواؤں کے نام اور ان کے اقوال پیش کر سکتا تھا جو حسینؑ ابن علیؑ کی تقلید، ان کی پیروی اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی دنیا سے فرمائش کر چکے اور فرمائش کر رہے ہیں۔

نہ میرے پاس وقت ہے اور نہ اتنی گنجائش ہے نیز اس وجہ سے کہ میرا مذکورۂ بالا بیان کم از کم ہندوستان میں تو قابل انکار نہیں۔

کیا دنیا میں کوئی اور بھی ہستی ایسی پیش کی جا سکتی ہے جو یوں تمام اقوام عالم اور مذاہب عالم کے واسطے راہبر بن سکی ہو۔

نہیں ہرگز نہیں۔ یہ حسینؑ ہیں صرف حسینؑ جن کے مصائب کی یاد تازہ کرنے کا زمانہ محرم ہے اور اسی ماہ محرم سے سنِ ہجری کی ابتدا ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ دنیا کے انصاف پسند حسینؑ اور ان کے ماننے والوں کو ہرگز نہ بھولیں گے جو سب کے سب مظلوم کے فدائی اور ظالم کے دشمن ہیں۔

❀❀❀

حسینؑ اور انسانیت

حسینی کارنامہ پر ایک یادگار تقریر

عمدۃ العلماء آیۃ اللہ سید کلب حسین صاحب قبلہ طاب ثراہ

اس جلسہ کے داعی اور اس بزم کے بانی، اس شاہی بارہ دری میں حاضرین کو بلانے والے، آخری تاجدار اودھ کے اس حسینی عزاخانہ میں ذکر حسینؑ کا فرش بچھانے والے نہ صرف شیعہ ہیں، نہ صرف مسلمان نہ محض وہی لوگ ہیں جو سیاسیات سے الگ۔ اور نہ محض وہ طبقہ ہے جو معاملات ملک کے روح رواں، نہ محض دنیا والے۔ نہ صرف دین کے بندے نہ فقط دولت مند، نہ فقر و فاقہ میں بسر کرنے والے۔ نہ ایسے ہی لوگوں نے یہ جلسہ منعقد کیا ہے جو انفرادیت کے پیرو اور نہ صرف ویسے ہی لوگ بانی ہیں جو جمہوریت کے تابع بلکہ جب آپ دعوت نامہ پر دستخط کرنے والوں کے نام معلوم کریں گے اور اپنے میزبانوں کی فہرست پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ شیعہ سنی، ہندو مسلمان، آریہ، عیسائی، سکھ، قادیانی، اچھوت، سچھوت، ملکی، قومی، سیاسی، غیر سیاسی، مالدار، مفلس، سرمایہ دار اور کمیونسٹ شخصیت کے حامی اور جمہوریت کے پیرو۔ ہر ملت ہر دماغ، ہر خیال ہر جذبہ کے لوگ جلسہ کی دعوت دینے اور اشتہار پر دستخط کرنے میں شامل ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام حضرات اس جلسہ کے بانی ہیں سب ہی آپ کے میزبان ہیں اور شاید میرا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سب کا مشترکہ حکم یہ ہے کہ میں اپنا پراگندہ بیان اپنے بے حقیقت معلومات اپنے صحیح یا غلط جذبات حاضرین جلسہ کے سامنے پیش کروں اس حالت میں میرا فرض ہے اور مجھ پر واجب ہے کہ اگر میں بلاغت کی راہیں گذارنا چاہتا ہوں اور تمام دعوت دینے والوں اور بلانے والوں کو خوش کرنا چاہتا ہوں تو اپنا کلام ان الفاظ میں پیش نہ کروں جو کوئی سمجھے اور کوئی نہ سمجھے۔ کسی کی مرضی کے مطابق ہو

اور کسی کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ کسی کے جذبات مذہبی کے موافق ہو کسی کے خیالات مذہبی کے مخالف ہو۔ بلکہ محل کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب موقع کی تلاش کرتے ہوئے اپنی تقریر کا موضوع، اپنے بیان کا سرمایہ وہ چیز قرار دوں جو تمام عالم مختلف الخیال تمام الگ الگ مذاہب پر چلنے والوں اور ہر قوم و مذہب وملت کے پیروی کرنے والوں کے واسطے بالکل یکساں اور برابر کی حیثیت سے دلچسپ اور مفید ہو۔ مجھ کو یہ راستہ بے حد کٹھن ہو جاتا، میں اس راہ پر قدم ہی نہ رکھ سکتا۔ اگر میری نگاہوں کے سامنے حسینؑ کے علاوہ کوئی اور ذات ہوتی اور کسی اور بشر کی یادگار منانے کو یہ جلسہ طلب کیا گیا ہوتا مگر مظلوم حسینؑ! تیرا کیا کہنا۔ قربانی کی بے نظیر تصویر! تیری کیا تعریف کروں کہ تو نے کربلا کے خونی آئینہ میں ہر تصویر دکھا دی، ہر رنگ بھر دیا، ہر نقشہ بنا دیا۔ تو نے کربلا کی ویران زمین، چٹیل میدان، پرخار وادی کو اپنے خون سے سینچ کے جنت بنایا۔ باغ لگایا، چمن بنائے، نہریں جاری کیں، روشیں درست کیں، پھول کھلائے، مگر ایسا باغ نہیں جس میں پھول ایک ہی سے ہوں۔ خوشبو ایک ہی سی ہو، رنگ ایک ہی سے ہوں، مزے ایک ہی سے ہوں، طائروں کے چہچہے ایک ہی سے ہوں۔

نہیں۔ نہیں، ہر پھول لگایا، ہر گل کھلایا، ہر چمن سجایا، ہر کیاری بنائی، ہر خوشبو رکھی، ہر مہک دے دی، ہر نالہ بنایا، ہر نغمہ سنایا، بلکہ یہ بھی نہیں کہ پھول ہوں خار نہ ہوں، رنگینی ہو بے رنگی نہ ہو، نغمے ہوں نالے نہ ہوں، بہار ہو خزاں نہ ہو، نہریں ہوں بے آبی نہ ہو، عروج ہو زوال نہ ہو، صبح ہو دوپہر نہ ہو، جھٹپٹا ہو رات نہ ہو، چاندنی ہو تاریکی نہ ہو۔

خدا کی قسم کربلا کے چمن میں سب کچھ ہے تو پھر میری بھی مشکل حل ہوگئی، دشوار راہیں آسان ہوگئیں اور وہ ہیرا مل ہی گیا جو گدڑی میں لعل بھی بن سکے اور شاہوں کے تاج کی کلغی بھی۔ گو ہر شب چراغ بھی ہو آفتاب کی کرنوں میں ضوفگن بھی، شخصیت کی آنکھوں کا نور بھی اور جمہوریت کے دل کی ٹھنڈک بھی۔ میں یہ کیوں کہوں کہ حسینؑ نے خدا کی راہ میں قربانی دی اور خدا کو نہ ماننے والے

چراغ پا ہو جائیں۔ میں یہ کیوں کہوں کہ حسینؑ نے نانا کا دین بچایا کہ رسالت کے نہ ماننے والے بگڑ جائیں۔ میں یہ کیوں عرض کروں کہ حسینؑ نے سرمایہ پرستی کو مٹانا چاہا کہ دولت مند دل میں کڑھنے لگیں۔ جی نہیں میں تو آپ کے سامنے کہوں گا اور صرف یہی کہوں گا کہ حسینؑ ایک انسان تھے اور بحیثیت انسان ہونے کے ان کا یہ فرض تھا کہ انسانوں کی مدد کریں، انسانیت کی حمایت کریں، آدمی کو آدمی بنانے کی کوشش کریں اور غافل، بے شعور، جاہل، مغرور گمراہ اور مقہور انسانیت کو سیدھا ڈھرا، صحیح راستہ، راہ مستقیم دکھا دیں۔ اور بس یہی حسینؑ کا نقطۂ نظر تھا۔ یہی حسینؑ کا ذاتی فریضہ تھا، یہی حسینؑ کا منصب ان کا عہدہ، ان کا محل ان کو بتا رہا تھا۔ اور یہ میں اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ میری نظر میں اسلام اور انسانیت، مسلمان اور انسان تبلیغ اسلام اور تعلیم انسانیت، اسلام کی سنتیں اور واجبات اور انسانیت کی راہیں اور فرائض اگرچہ لفظوں کے اعتبار سے حروف کی حیثیت سے اپنی ظاہری لباس میں بالکل الگ الگ دو چیزیں ہیں مگر اصل میں، حقیقت میں، باطن میں معنوں کے لحاظ سے، نتیجہ کی حیثیت سے دونوں ایک ہیں۔ لہٰذا جب حسینؑ نے دنیا کو انسانیت سکھائی تو سب کچھ سکھا دیا اور جب فریضۂ انسانیت ادا کر دیا تو ہر فریضہ ادا کر دیا۔

حاضرین جلسہ! میں اپنے کلام میں محض دعویٰ ہی دعویٰ پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ دلیل کے ساتھ، وقت تنگ ہے اور حسینؑ ابن علیؑ کی ذات وہ ذات ہے کہ جب ان کے دامن پر ہاتھ پہنچ جائے اور دل میں ان کی محبت موجزن ہو تو مجھ ایسا تنگ نگاہ بھی یہ کہنے پر تیار ہو جاتا ہے کہ دل میں ایک سمندر موجزن ہے جو کئی دن تک بیان کی وسعت کو آخری حدوں تک پہنچنے سے روک رہا ہے۔ لیکن بندشیں سخت ہیں اور قوت بھی اس بات کے برداشت سے منکر ہے اس لئے سمندر کو کوزہ اور دریا کو قطرہ اور طولانی بیان کو لفظوں اور اشاروں میں پیش کر کے اپنا ٹوٹا پھوٹا بیان ختم کرنا چاہتا ہوں۔

سنئے اور غور سے سنئے! کہ جب ہم بطن مادر سے باہر آتے ہیں تو نہ ہماری آنکھیں کام دیتی ہیں

نہ کان مدد کرتے ہیں۔ نہ عقل سہارا دیتی ہے، اس وقت ہم میں اور ایک جانور میں اگر فرق ہوتا ہے تو صرف صورت میں ہاتھ پیر میں، ناک نقشہ میں۔ لیکن افعال، حالات اور سیرت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوتا۔ البتہ رفتہ رفتہ ہم میں اور جانور میں فرق ہونے لگتا ہے۔ آنکھیں ہمارے اچھے برے اور اپنے پرائے کی تمیز کرتی ہیں۔ کان آوازوں کو پہچانتے ہیں تمام حواسوں کے ساتھ عقل بھی رہبری شروع کر دیتی ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ آسمان ہے یہ زمین ہے یہ آگ ہے یہ پانی ہے یہ پھول ہے یہ کانٹا ہے۔ یہ چیزیں فلکی ہیں یہ عنصری ہیں، یہ جماد ہے پتھر ہے مٹی ہے یہ بے حس ہے، یہ درخت ہے نبات ہے، پھول ہے، پھل ہے بڑھتا ہے، گھٹتا ہے، پیدا ہوتا ہے، مٹ جاتا ہے، مگر پھر بھی بے حس ہے، یہ حیوان ہے جو دیکھتا ہے، سنتا ہے، کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، چلتا ہے، پھرتا ہے، محبت کرتا ہے، نفرت کرتا ہے، ملتا ہے، لڑتا ہے، اپنا بچاؤ کرتا ہے، حملہ کرتا ہے، غصہ کرتا ہے، برداشت کرتا ہے، راحت اُٹھاتا ہے، زحمت سہتا ہے، اپنے کھانے پینے کی فکر کرتا ہے، اپنے بچوں کی پرورش کرتا ہے مگر ان تمام باتوں کے بعد بھی جانور ہے۔ مگر ان تمام چیزوں کے بعد بھی ہم اپنی طرف اور اپنے بنی نوع کی طرف نظر کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ پتھروں کی طرح ہم میں جسم ہے مادہ ہے عناصر ہیں مگر ہم جماد نہیں، پتھر نہیں، مٹی نہیں۔ درختوں کی طرح ہم میں بڑھنا ہے، گھٹنا ہے، پھول ہیں، پھل ہیں، خوشبو ہے، بدبو ہے، رگیں ہیں، ریشے ہیں، بہار ہے، خزاں ہے، اصلیں ہیں، شاخیں ہیں، مزہ ہے، بدمزگی ہے مگر اس کے بعد بھی ہم نبات نہیں، درخت نہیں، پھول نہیں، پتی نہیں۔ جانوروں کی طرح ہم میں جسم ہے، گوشت ہے، ہڈیاں ہیں، پٹھے ہیں، خون ہے، رطوبات ہیں، کھانا ہے، پینا ہے، سونا ہے، جاگنا ہے، رحم ہے غصہ ہے، صلح ہے، جنگ ہے۔ سب ہی کچھ وہی ہے جو ایک جانور میں ایک حیوان میں ہے مگر پھر بھی ہم حیوان نہیں، جانور نہیں بلکہ اچھے خاصے انسان ہیں۔ تو جناب عالی جب ہم میں وہ سب کچھ ہے جو پتھروں میں ہے تو ہم پتھر کیوں نہیں اور جب ہم میں وہ سب کچھ ہے جو نباتات

میں ہے تو ہم درخت کیوں نہیں اور جب ہم میں وہ چیزیں موجود ہیں جو جانوروں میں ہیں تو ہم جانور کیوں نہیں۔ اس کا جواب اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہی ایک جواب کہ بے شک ہم جماد ہوتے پتھر ہوتے۔ اور یہی حالت ہماری ماں کے پیٹ میں تھی جب ہم پانی کی شکل میں تھے مگر خدا نے یا فطرت نے یا نیچر نے ہم میں نمو اور بڑھنے کی صفت دے کے جماد باقی نہ رکھا۔ یقیناً ہم نبات ہوتے درخت ہوتے اور یہی صورت ہماری ماں کے پیٹ میں تھی جب ہم میں رگ و ریشہ پیدا ہو رہے تھے مگر خدا نے یا فطرت نے یا نیچر نے ہم میں روح ڈال کے حس و حرکت دے کے ہمیں نبات باقی نہ رکھا۔ اور ہم کو پورا پورا جانور بنا دیا۔ اور اسی جانور کی صورت سے اسی جانور کے طریقے سے، حیوانیت کی شکل میں ہم پیدا ہوئے اور پرورش ہوئے تو اب یہ غور طلب ہے کہ خدا نے یا فطرت نے ہم میں اب اور کون سی ایسی صفت بڑھائی۔ کس جزء کا اضافہ کیا، کیا چیز زیادہ کر دی کہ ہم حیوان نہ رہے بلکہ انسان ہو گئے۔ تو کہنا پڑے گا کہ نفس انسانی یا نفس ناطقہ یا عقل۔ جو چاہے نام رکھئے مگر یہی ایک جزء تھا جو اگر نہیں تو انسان نہیں۔ انسانیت کے حکم میں نہیں، انسانیت کے برتاؤ میں نہیں، انسانوں کی سوسائٹی میں نہیں۔ اور اگر یہ جزء ہے تو انسان بھی ہے انسانیت کے حکم میں بھی ہے اس کے ساتھ انسانیت کا برتاؤ بھی ہے۔ انسانوں کی جماعت میں ہے۔ دیکھئے مجنوں، پاگل سڑی، سودائی، آنکھ بھی ہے دیکھتا بھی ہے، کان بھی ہے سنتا بھی ہے، زبان بھی ہے بولتا بھی ہے، آپ ہی کی طرح تمام اعضاء ہیں، صورت ہے، شکل ہے، حرکات و سکنات ہیں سب کچھ ہے مگر آپ اسے انسان نہیں سمجھتے بلکہ جانور سمجھتے ہیں اور ہرگز اس پاگل کے ساتھ وہ برتاؤ نہیں کرتے جو انسان سے کرتے ہیں۔ بلکہ وہی سلوک کرتے ہیں جو جانوروں سے یعنی موذی نہیں تو کھلا رہا نہیں تو باندھ دیا۔ کسی کو ضرر نہیں پہنچاتا تو آزاد رہا ورنہ کٹہرے میں بند کر دیا۔ انسانوں کی مجلس سے الگ، محفل سے جدا، اگر چوری کرے تو سزا کا مستحق نہیں، جیسے جانور کسی کو مار ڈالے تو قید کا مستحق نہیں جیسے حیوان کسی کو قتل کر دے تو پھانسی پر نہ لٹکایا جائے جیسے جانور، تو معلوم ہوا کہ اگر آپ ان کو انسان سمجھتے

ہوتے تو انسانوں کا سا سلوک کرتے۔ انسان کی سی سزائیں دیتے انسانیت کے کام لیتے، انسانوں کی بزم میں شریک کرتے مگر جب آپ نے یہ کچھ نہ کیا تو آپ کا طرزِ عمل پکار اٹھا کہ محض صورت کو دیکھ کر اس پاگل کو جانور کہتے ہوئے ڈرتے ہیں جھجکتے ہیں لیکن ہے درحقیقت جانور ہی بلکہ یوں عرض کروں کہ ہم نے کسی ایسی صورت والے کو کبھی جانور نہیں کہا اس وجہ سے ہماری عادت اس پاگل کو جانور کہنے سے رُکتی ہے لیکن ہمارا ہر برتاؤ بتاتا ہے کہ یہ محض صورت میں انسان ہے مگر حقیقت میں جانور ہے۔ تو معلوم ہوا کہ جس چیز نے انسان کو انسان بنایا وہ صرف عقل ہے، سمجھ ہے نفس ناطقہ ہے۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ یہ عقل یہ نفس ناطقہ ہے کیا چیز اس کی اصل اس کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ تو میں عرض کروں گا کہ اگر آج تک آپ کی عقل میں آپ کے دماغ میں کسی شئے کی اصل وحقیقت آ گئی ہو تو آپ آج بھی یہ کوشش کریں کہ عقل کی حقیقت و ماہیت کیا ہے۔ لیکن جب آج تک کسی شئے کی اصل حقیقت آپ کی سمجھ میں نہیں آئی کسی شئے کی ماہیت آپ کو معلوم نہیں ہوئی تو عقل کی حقیقت معلوم کرنے میں کوشش نہ کریں۔ میری التماس کو آپ یوں سمجھیں کہ دنیا کی لاکھوں کروڑوں چیزیں آپ کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ کسی کو آپ دیکھ رہے ہیں، کسی کو سن رہے ہیں، کسی کو سونگھ رہے ہیں، کسی کو چکھ رہے ہیں۔ کسی چیز کو چھو کے محسوس کر رہے ہیں، لیکن جب آپ سے سوال کیا جائے کہ ان کی اصل کیا ہے۔ ان کی حقیقت و ماہیت کیا ہے تو صرف آپ ہی نہیں بڑے سے بڑا حکیم اور فلسفی بھی جواب دینے سے عاجز ہوگا اور ہر شے کے صفات اس کے اثرات، خواص وافعال بیان کر کے خاموش ہو جائے گا اور اظہار حقیقت میں عقل کامل اور زبردست علمی معلومات بالکل بے حقیقت ہو جائیں گے۔ بوئے گل کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ وہ کیفیت جسے قوت شامہ محسوس کرتی ہے۔ نغمۂ بلبل کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ یہی جس سے قوت سماعت متاثر ہو رہی ہے۔ کسی چیز کی شیرینی یا ترشی کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ وہ کیفیت جسے قوت ذائقہ محسوس کر رہی ہے۔ آگ کی گرمی اور برف کی سردی کیا ہے؟ جواب ملے گا کہ وہ کیفیت جسے جسم محسوس کرتا ہے۔ اور

آگے بڑھئے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ہم اور آپ اور یہ تمام انسان جو ہمارے ابنائے جنس ہیں ان کی حقیقت اور ماہیت کیا ہے تو جواب ملے گا کہ حیوان ناطق یعنی وہ جانور جس میں حس ہے، ادراک ہے، سمجھ ہے، عقل وفہم ہے لیکن درحقیقت حس ہونا، ادراک ہونا، عقل وفہم ہونا یہ تمام باتیں بیان صفات واظہار کیفیات سے زائد کچھ نہیں البتہ بیان ماہیت کے مقام پر اگر کوئی چیز ملتی ہے تو حیوان جس میں یہ صفتیں ہیں۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ حیوان کیا ہے؟ تو بس ایک کہ وہ جسم جس میں بڑھنا گھٹنا ہے، حس ہے، ادراک ہے، حرکت ارادی ہے، سماعت و بصارت ہے۔ لیکن یہ تمام چیزیں صفات میں ہیں، حسن ہونا یا نہ ہونا، سماعت و بصارت ہونا یا نہ ہونا یہ سب جسم کی صفتیں ہیں اور مقام ماہیت وحقیقت میں صرف جسم ہی جسم نظر آتا ہے۔ لہٰذا سوال ہوگا کہ جسم کی حقیقت کیا ہے؟ تو جواب ملے گا کہ جسم وہ جوہر ہے وہ مادہ ہے جس میں لمبان، چوڑان اور گہران پائی جائے اور جو کسی مکان کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ لیکن گہری نظر بتاتی ہے کہ یہ سب چیزیں صفات میں ہیں اور مقام حقیقت میں صرف مادہ رہ جاتا ہے لیکن جب سوال کیا جائے کہ مادہ کیا ہے تو تمام حکمائے سابق اور موجودہ فلسفہ کے عالم صرف یہی جواب دیتے ہیں کہ مادہ یا ایتھر یا مادہ کے اجزاء اولیٰ، یا ایٹم، یا سالمات وہ چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں جو تمام فضائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اپنی سختی اور اختصار کی وجہ سے نہ کسی آلہ سے کٹ سکتے ہیں نہ کسی ضرب سے ٹوٹ سکتے ہیں نہ کسی تقسیم خارجی یا عقلی کو قبول کر سکتے وہ ازلی ہیں ابدی ہیں ان میں قوت جذب اور دفع دونوں موجود ہیں۔

یہ تمام بحثیں اپنے اپنے محل پر قابل تصفیہ اور میرے موضوع سے الگ ہیں کہ کوئی ایسا ذرہ ممکن بھی ہے یا نہیں جو تقسیم عقلی کو بھی قبول نہ کرتا ہو۔ اور اگر تقسیم عقلی کے قابل نہیں تو وہ جسم ہے یا نہیں۔ اور غیر مجسم ہونے کی صورت میں ایسے اجزاء سے جسم کی تشکیل محال ہے اور پھر اگر مادہ میں حس کی قوت نہیں تو حس پیدا کیونکر ہوئی۔ اور اگر ایک ہی قسم کا ہے تو اختلاف اثرات ونتائج کیونکر ہوا۔ اور اگر مختلف قسم کے ہیں تو ایک سے زائد قدیم کیونکر ممکن ہیں؟ کیونکہ ایک سے زائد ہوں گے تو لامحالہ

مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز دو جزء ماننا لازم ہوں گے اور جب دو جزؤں سے ترکیب ہوگی تو قدیم نہ ہوگا حادث ہوگا۔

یہ تمام بحثیں بے حد طولانی ہیں، اگر میں انھیں بحثوں میں الجھ جاؤں تو جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ نامکمل رہے گا۔ اس لئے میں اس وقت صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جب مادہ یا ایتھر یا عالم کے اجزاء اولیٰ کی تحقیق کی جائے تو ہر حکیم اور فلسفی اشارہ اور ضمیر یعنی لفظ وہ سے اپنے کلام کی ابتداء کرتا ہے۔ اور بیان صفات وخواص مادہ شروع کر دیتا ہے۔ اس سے آگے معلومات انسانی اور اسی کے ساتھ ساتھ قوت ناطقہ کی حد ختم ہوجاتی ہے جو ثابت کر رہا ہے کہ معلومات انسانی کی حد صرف صفات اور خواص اثرات وافعال تک منحصر ہے۔ اسی انسانی فہم کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے تمام انبیاء تمام مرسلین بلکہ خود تمام آسمانی کتابوں نے معرفت خالق میں بیان صفات اور افعال پر اکتفا کی اور انھیں صفات کی راہوں اور افعال کے راستوں سے انسان کو خالق اور موصوف کی معرفت تک بلند کیا اور بتا دیا کہ خالق کی حقیقت وماہیت عقل انسانی کی رسائی سے اسی طرح بلند ہے جس طرح دنیا کی ہر شئے اپنی ماہیت کے اعتبار سے ہمارے فہم میں نہیں سماتی۔ بہت ممکن ہے کہ میری اس تمہید کو عینیتِ ذات وصفات کا ثبوت قرار دیا جائے مگر یہ بھی علم کلام کی ایک زبردست بحث ہے جس کے طے کرنے کا یہ محل نہیں۔ اس تمام تمہید سے میری غرض یہ تھی کہ جس طرح کسی شئے کی حقیقت وماہیت ذہن انسانی میں نہیں آتی اسی طرح یہ مسئلہ بھی ہمارے طے کرنے کے قابل نہیں کہ وہ جزء جس نے حیوان کو انسان بنا دیا یعنی عقل، فہم، نفس ناطقہ، حقیقت اور ماہیت میں کیا ہے۔ البتہ اگر ہم اس جزء کو پہچان سکتے ہیں تو محض اس کے خواص افعال اور اثرات کو دیکھ کے بلکہ اگر کسی انسان سے کوئی فعل، کوئی کام، کوئی بات، ظاہر نہ ہو تو ہم یہ بھی نہیں سمجھ سکتے ہیں کہ اس انسان میں نفس ناطقہ ہے بھی یا نہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم افعال انسانی کی تحقیق کریں اور یہ دیکھیں کہ کون کون سے فعل نفس ناطقہ اور عقل انسانی سے مخصوص ہیں اور کون سے کام جماد، نبات، حیوان وانسان

میں مشترک ہیں؟

اس سوال کے حل کرنے میں موالید ثلٰثہ یعنی جماد ونبات وحیوان کی ان پوشیدہ قوتوں پر نظر کرنا ضروری ہے جو ان میں سے ہر ایک میں کارفرما ہیں۔ دنیا میں کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا نے یا فطرت نے یا نیچر نے جو چیز بھی پیدا کی اس میں کوئی نہ کوئی روح ضرور پیدا کی جس کو نفس بھی کہا جا سکتا ہے اور قوت یا پراکرتی سے بھی اس روح کو سمجھا یا جا سکتا ہے ہم کو ان روحوں یا قوتوں کی نہ حقیقت معلوم ہے نہ ماہیت، اور نہ ہم یہی معلوم کر سکتے تھے کہ کس چیز میں کون سی روح کام کر رہی ہے۔ لیکن محض آثار وافعال نے ہم کو بتایا کہ ہر اس جسم میں جو بڑھتا گھٹتا نہیں اپنی ایک حالت پر قائم رہتا ہے جیسے سنگ خارا، سنگ مرمر، ہیرا، یاقوت، سونا، چاندی وغیرہ ان سب میں ایک قوت منتظمہ جس کا نام ہے روح جمادی ضرور موجود ہے جس کا کام یہ ہے کہ اپنی قوت جذب ودفع سے اس جسم کے ہر جزء کو اپنے محل پر باقی رکھے اور خالق کی یا فطرت کی دی ہوئی شکل کو کسی قہری صورت کی دخل اندازی کے علاوہ اس کی اصلی حیثیت پر قائم رکھے۔ لیکن نبات میں یعنی شاخ، پھول، پتی برگ وثمر میں دو روحیں موجود ہیں۔ ایک وہی روح جو جمادات میں ہے جس کا کام یہ ہے کہ وہ تمام اجزاء کو منتشر نہ ہونے دے اور دوسری وہ روح جو اس جسم میں نمو دیتی ہے بڑھاتی ہے۔ تولید وتناسل یعنی ایک سے ایک درخت پیدا کرنے کی قوت دیتی ہے۔ یہ اسی روح نباتی کا کام ہے کہ جب کوئی مختصر سا تخم زمین پر ڈال دیا جاتا ہے اور پانی کی تری روح نباتی سے چھیڑ کرتی ہے تو وہ تخم بڑھتا ہے پھیلتا ہے اور ایک زبردست درخت بن کے ظاہر ہوتا ہے۔ اس درخت میں شاخیں پیدا ہوتی ہیں۔ پھول کھلتے ہیں، پھل آتے ہیں اور اس پھل سے بالکل ویسے ہی سیکڑوں تخم اور بیج پیدا ہوجاتے ہیں۔ جب تخم زمین میں ڈالا گیا تھا۔ اب اگر ان تمام بیجوں کو زمین میں ڈال دیا جائے تو پہلے درخت کے مثل سیکڑوں درخت اور پیدا ہوجاتے ہیں۔ یہی ہے نمو اور تولید۔

نباتات کے بعد حیوان کا درجہ ہے لہٰذا جب ہم حیوان کے حالات اور افعال پر نظر کرتے ہیں تو

ہماری عقل بتاتی ہے کہ اس میں تین قوتیں کام کر رہی ہیں ایک وہ جو اس کے جسم کو باقی رکھتی ہے دوسرے وہ جو حیوان میں نمو اور تولید وتناسل کی قوت دیتی ہے۔ تیسری وہ روح جو جانوروں میں حس، حرکت ارادی، سماعت، بصارت، ادراک جزئیات وغیرہ پیدا کرتی ہے اور اس روح کے ساتھ دو نفس یا دو قوتیں انسان میں اور پیدا ہوتی ہیں۔ ایک نفس سبعی جس کا ترجمہ قوت وغضب اور غصہ سے کرنا ناگزیر ہے۔ دوسرے نفس بہیمی جس کے معنی خواہشات وجذبات ہی کہے جاسکتے ہیں۔ نفس سبعی سے انسان میں غیظ وغضب اور مزاج کے خلاف چیزوں کے دفع کرنے کی قوت، دشمن سے مقابلہ کرنے کی طاقت، سربلندی، حکومت، جاہ وعظمت حاصل کرنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور نفس بہیمی کے کھانے پینے، سونے جاگنے، توالد وتناسل، لذت وراحت، زینت وآرائش، آسائش وآرام کی خواہشیں حادث ہوتی ہیں۔

حیوان کے بعد انسان کی منزل ہے۔ لہٰذا جب ہم حالات انسانی پر تحقیقی نظر ڈالیں گے تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس میں وہ کل روحیں یعنی جمادی، نباتی، حیوانی، نفس سبعی، نفس بہیمی موجود ہیں اور یہ تمام قوتیں انسان میں کام کر رہی ہیں۔ اور ہر قوت کے آثار وافعال انسان سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم نے یہ مان لیا کہ افعال انسانی صرف ایسے ہی اثرات میں منحصر ہیں جو حیوانات میں موجود ہیں اور ان سے الگ کوئی فعل یا اثر انسان سے ظاہر نہیں ہوتا تو انسان اور حیوان میں فرق کرنا ناممکن ہوگا البتہ اگر انسان میں جماد ونبات وحیوان سے الگ بھی کچھ افعال واثرات موجود ہیں تو یہ کہنا ناگزیر ہوگا کہ اس میں کوئی چوتھی روح یا نفس یا قوت کارفرما ہے جو نہ جماد میں ہے نہ نبات میں ہے نہ حیوان میں ہے۔ اسی کا نام ہے نفس انسانی یا روح بشری یا عقل یا نفس ناطقہ یا قوت ملکی۔

اس مقام تک پہنچنے کے بعد منزل تحقیق میں آخری بات صرف یہی رہ جاتی ہے کہ ہم انسان کے تمام افعال پر گہری نظر ڈالیں اور یہ دیکھیں کہ کون کون سے افعال وہ ہیں جو حیوان اور انسان دونوں میں مشترک ہیں اور کون کون سے افعال وہ ہیں جو انسان سے مخصوص ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے افعال

انسانی کی جانچ کرنے میں ہم کو کہنا پڑے گا کہ جسم کی حفاظت اور اس کے بقا کی تدبیریں جسمانی قوتوں میں بصارت، سماعت، حس وحرکت، سونگھنے اور چکھنے، سونے اور جاگنے، کھانے اور پینے، توالد وتناسل، مکان بنانے، حکومت کرنے، دشمن سے مقابلہ، خلاف طبیعت چیزوں کا دفع کرنا، محبت ونفرت جسم اور اس کی تمام قوتوں میں زیادتی وکمی، اولاد کی تربیت اور پرورش، دشمن سے بچنے کی کوششیں، ادراک جزئیات، طلب معاش میں سعی، بلکہ بعض قسم کی صنعت وحرفت، مختلف دواؤں اور تدبیروں سے علاج ومعالجہ وغیرہ وغیرہ کل کے کل حیوانات میں موجود ہیں۔ بلکہ بعض جانور تعلیم حاصل کرنے کے بعد ہماری ہی طرح بول بھی لیتے ہیں اور ہمارے احکام کی اطاعت بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ تمام افعال انسانیت سے مخصوص نہیں ہیں یہ یا ان سے ملتے جلتے ہوئے کل اعمال وافعال جانوروں میں موجود ہیں اس لئے ماننا پڑے گا کہ ان میں سے کوئی ایک فعل بھی اس جز کا اثر وثمر نہیں۔ جس نے انسان کو حیوان سے ممتاز کر دیا۔ البتہ علم وحکمت یعنی بقدر قوت وامکان بشری حقائق اشیاء کو معلوم کرنا، حکمت نظری کے منازل سے گذرنا، جزئیات کو دیکھ کے کلیات کو سمجھنا مشاہدات کے ذرائع سے بلند ہو کر نظریات تک پہنچنا اور صحیح نتائج نکالنا، یاد رکھنا اور فکر کرنا۔ تمام جمادی، نباتی، حیوانی روحوں کے ضروریات اور جذبات، خواہشات کو قابو میں رکھنا اور مختلف تدابیر کے ساتھ موقع اور محل کا لحاظ کرتے ہوئے ہر قوت سے کام لینا۔ بس یہی وہ افعال ہیں جو عقل اور نفس ناطقہ سے مخصوص ہیں۔

حقائق اشیاء کی تحقیق اور جزئیات سے کلیات تک پہنچنے ہی کا حقیقی نتیجہ ہے۔ خالق کی معرفت اور اس کی اطاعت کے جذبات وشوق جس کو دوسرے لفظوں میں یوں سمجھایا جاسکتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچاننا اور اس کی اطاعت کرنا ہی وہ افعال ہیں جو حیوان میں نہیں بلکہ انسان سے مخصوص ہیں۔ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ جانور بھی جس کے ہاتھ سے رزق پاتا ہے جو اس کی تربیت کرتا ہے، پالتا ہے، اس کی اطاعت کرتا ہے اپنے مالک کو خوب پہچانتا ہے۔ یہ فعل بھی انسان سے مخصوص نہیں لیکن

فرق یہ ہے کہ حیوان صرف اس مالک کو پہچانتا ہے جس کے ہاتھ سے رزق پاتا ہے۔ ظاہر بظاہر جانور کی تربیت اور پرورش کرتا ہے اور وہ جانور برابر اس مالک کو دیکھتا رہتا ہے لیکن انسان اس مالک کو پہچانتا ہے اس خالق پر ایمان اختیار کرتا ہے جو انسان کی تربیت کرتا ہے، پیدا کرتا ہے، رزق دیتا ہے۔ مگر انسان نے اس کو کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی اس پر نظر نہیں کی۔ دیکھا ہے ذریعوں کو واسطوں کو اور پہچانتا ہے، مالک حقیقی اور خالق اصلی کو۔ لہٰذا اگر انسان بھی اپنے حقیقی مالک اور ولی نعمت کے پہچاننے میں دیکھنے اور رویت کا محتاج ہو تو اس انسان اور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ انسان وہ ہے جو رویت کا محتاج نہ ہو۔ اس لئے ایمان میں غیب کی شرط ہے تا کہ بشریت ممتاز رہے اور اپنے پہچنوانے کے واسطے خدا اس کا محتاج نہ ہو کہ اس کا کوئی اوتار ہو یا کسی میں جنم لے یا کسی جسم کے اندر ظاہر ہو۔ اور نہ وہ اپنے افعال اور اظہار قدرت میں کسی جسم کا محتاج ہے بلکہ کسی جسم کے اندر آنا یا جنم لینا اس کو معدوم، قابل تقسیم، تغیرات سے متاثر و متکیف بنا کے غیر قدیم اور حادث بنا دے گا۔

میرے اس بیان سے واضح ہو گیا کہ خدا کی صحیح معرفت اور اس کی اطاعت کا شوق جس کی دوسری تعبیر عبادت سے کی جاتی ہے نفس ناطقہ اور عقل ہی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو انسان کو غور و فکر اور فلسفیانہ تحقیقات، دریافت ابتداء اور انتہاء پر مائل کرتی ہیں اور چونکہ خالق کا وجود اس کی وحدت، عدل، علم وقدرت وغیرہ حقائق میں داخل ہیں اور صحیح غور و فکر کا نتیجہ واقعیات ہی ہوا کرتے ہیں۔ لہٰذا عقل ہی ان تمام ارکان ایمانی تک راہبری کرتی ہے۔ جس کے بعد وہ جذبات محبت خالق اور پیدا کرنے والے کی رضا اور غضب کی تلاش پر مائل کرتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان کا ہر ہر فعل ایک ایسے دستور العمل کا تابع ہو جاتا ہے جو اس عمل کو پسندیدۂ خدا بنا دے۔

دوسرا فعل جو انسان سے مخصوص ہے وہ ہر قوت کا صرف بامحل ہے اگر انسان بھی جانور کی طرح اپنے جذبات اور خواہشات سے مجبور ہو کر کام کرتا رہے تو ایسے انسان میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں لیکن انسان صرف وہی ہو گا جو ہر جذبہ اور خواہش کے صرف کا محل دیکھنے کے بعد ان سے کام

لے، اور محل اور موقع کی تعیین کبھی وقتی اور ذاتی یا ملکی وقومی مضرت ومفاد سے کی جاتی ہے اور کبھی صرف شرعی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے، لیکن خالق کو پہچان لینے کے بعد اس کی رضا اور تقرب کی رعایت، تمام مصالح ملکی یا ذاتی وقومی سے یقیناً افضل و بہتر بلکہ سب پر مقدم ہے لہٰذا انسان صرف وہی ہے جس کی عقل، روح نباتی، جمادی، حیوانی، نفس سبعی اور بہیمی کی اطاعت میں کام نہ کرے بلکہ یہ تینوں روحیں اور دونوں نفس جب کوئی جذبہ یا خواہش عقل کے سامنے پیش کریں۔ تو عقل اس جذبہ اور خواہش کا محل، نفع وضرر، خدا کی رضا اور غضب کا لحاظ کر کے ان تینوں روحوں سے کام لے۔ یہی ہے عین انسانیت جس کی بڑی سے بڑی تعلیم حسینؑ بن علیؑ نے کربلا کے میدان میں یوں مکمل کر دی کہ آج تیرہ سو برس گذرنے کے بعد بھی دنیا اس تعلیم سے اثر لینے میں کوشاں ہے۔

اگر انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ہر چیز کی حقیقت معلوم کرے اور ہمیشہ صحیح نتیجہ نکالے تو حسینؑ ابن علیؑ کی کل سوانح عمری اور آپ کی زندگی کا ہر عمل اس کا بین ثبوت ہے کہ آپ کی قوت نظر کس درجہ بلند تھی کہ آپ کے ہر فعل کا نتیجہ ہمیشہ سمجھا بوجھا اور ہر بافہم کے نزدیک بالکل صحیح ہی برآمد ہوا۔ بھائی کی زندگی اور ان کے انتقال کے بعد تقریباً دس برس تک کامل سکوت اور امیر شام کے ظلم وتعدی پر صرف احتجاج کر دینے پر اکتفا، معاویہ کی زندگی میں ہی یزید کی بیعت سے انکار اور ان کے مرنے کے بعد اسی انکار پر ثابت قدم رہنا، مدینہ چھوڑ کے مکہ میں قیام اور کوفہ والوں کے اصرار نیز یزید کی طرف سے حاجیوں کے لباس میں ایسے لوگوں کی آمد کے بعد جن کو ہدایت کی گئی کہ جہاں حسینؑ کو پائیں قتل کر دیں حرمت خانہ کعبہ کا لحاظ نیز اپنی شہادت کو اہمیت دینے کے واسطے مکہ سے کوفہ کی طرف سفر کرنا، حُر کے ساتھ حسن سلوک اور قوت ہونے کے بعد بھی حُر سے جنگ کی ابتدا نہ کرنا، کربلا میں آنے سے قبل اور اس ویران زمین پر پہنچنے کے بعد کمزور اور دنیا طلب اشخاص کو جو راستہ میں ہمراہ ہو گئے تھے سمجھا سمجھا کر اور صحیح حالات بتا بتا کے اپنے ساتھ سے الگ کر دینا ہر صورت سے اتمام حجت اور اپنی حقیقت، مظلومی اور دیانتداری کا ثبوت پیش کر کے دفاعی صورت سے جہاد شروع

کرنا، لشکر کی ترتیب، مورچوں کی تعیین، بہرحال کوئی ایک فعل بھی حسینؑ ابن علیؑ کا ایسا نہ تھا جس میں
حسینؑ نے کسی قسم کی غلطی کی ہو یا دھوکا کھایا ہو یا کوئی ندامت انگیز طرزِ عمل اختیار کیا ہو۔

جاہلوں کے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ علی اصغرؑ کے سے کمسن بچہ کو میدان میں لانے کا سبب کیا تھا
لیکن آج جب کہ تمام دنیا کے بافہم شہادت حسینی پر تقریر وتحریر کے ذریعہ سے روشنی ڈال رہے ہیں
تو دنیا دیکھ رہی ہے کہ ہر غیر مسلم کی زبان پر سب سے زائد اسی بے شیر کا تذکرہ اور اسی کمسن بچہ کا نام
آرہا ہے جو اس کی دلیل ہے کہ جس طرح آپ نے اس بچہ کو اپنے خزانہ کا آخری موتی سمجھ کر پیش کیا
تھا در اصل تمام عالم نے بھی اس بچہ کو حسینی قربانی کی اعلیٰ منزل تسلیم کرلیا۔

اس وقت بھی سوال ہوئے اور آج بھی اعتراض ہوسکتا ہے کہ کربلا کے میدان میں چھوٹے
چھوٹے بچوں اور عورتوں کے ساتھ لانے کی غرض کیا تھی؟

لیکن جس طرح رسولؐ کے اس نواسہ کا ہر کام ظاہری اعتبار سے کتنا ہی تعجب خیز کیوں نہ ہو لیکن
نتائج کے لحاظ سے مفید ثابت ہوکے رہا اسی طرح اہل حرم کا ساتھ ہونا بھی تکمیل فوائد شہادت کے
واسطے جزءِ لازم تھا۔

اگر امام حسینؑ کے ساتھ صرف جوان اور جنگ کے قابل مرد ہی ہوتے تو جہاں اس مظلوم کو یہ
الزام دیا جاتا کہ پہلے ہی سے لڑائی کا خیال دل میں ٹھان کر نکلے تھے وہاں ایک ضرر یہ بھی تھا کہ
جب حسینؑ کے تمام ساتھ والے کربلا میں قتل کردیئے جاتے تو واقعات شہادت کو بتانے والے
صرف دشمن ہی دشمن ہوتے جن کا فرض اول یہ تھا کہ تمام الزام حسینؑ پر رکھ کے اپنے کو مجبور اور بے
خطا ثابت کریں، واقعات کو چھپائیں، غلط حالات پیش کرکے دنیا کو دھوکے دیں اور اس طرح حسینی
قربانی کی تمام افادی حیثیت نیست ونابود ہوجائے۔ مگر یہ صرف حسینی قافلہ کی عورتوں اور بچوں ہی کا
فیض ہے کہ آج دنیا حسینیت کی سچی تعلیم اور یزیدیت کی حقیقی تصویر سے باخبر ہے۔

میں ثابت کرچکا کہ عقل انسانی ہی معرفت خدا اور اس کی اطاعت کے جذبات پیدا کرتی ہے

لہٰذا حسینؑ ابن علیؑ نے محض دین خدا کی حفاظت کی غرض سے قربانی پیش کرکے جذبات اطاعت
خالق کی جو بہترین مثال پیش کی اس کا جواب عالم کی تاریخ میں ناممکن ہے۔ پھر اس کے بعد جنگ
کے عالم میں بھی خدا کو نہ بھولنا اس کی عبادتوں کو ہر وقت یاد رکھنا ثابت کررہا تھا کہ اس مظلوم کا ہر فعل
انسانیت کاملہ کا مظہر تھا اور اسی انسانیت کی تعلیم کے واسطے اس مظلوم نے یہ تمام قربانیاں گوارا
کرلیں تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس مظلوم کے بہادر ساتھیوں نے یزیدی لشکر کے ہزاروں ہی آدمی قتل
کردیئے اور یزیدی لشکر نے بھی ان بہتر سپاہیوں کو شہید کرڈالا مگر آج دنیا کا ایک بافہم بھی اصحاب
حسینؑ کو ظالم اور یزیدی لشکر کے کشتوں کو مظلوم نہیں کہتا بلکہ تمام دنیا معترف ہے کہ یزید والے ظالم
اور بہتّر مظلوم تھے۔ جس کی وجہ صرف یہی تھی کہ حسینؑ والے انسانیت کی لڑائی لڑ رہے تھے اور یزید
والے حیوانیت کی۔ حسینی لشکر کا ہر عمل عقل انسانی کے بعد تھا۔ اور یزیدی لشکر کا فعل جذبات بہیمیت
وحیوانیت اور ان کی نیت اطاعت خالق تھی جو عین انسانیت اور ان کی نیت اطاعت نفس امارہ تھی جو
عین حیوانیت، یقیناً امام حسینؑ کربلا کے پرہول میدان میں پکار رہے تھے ''امامن ناصر ینصرنا''
لیکن اس کا حقیقی مطلب صرف یہی تھا کہ اگر دنیا میں کوئی انسان نما حیوان در اصل انسان بننا چاہتا ہو
تو میری طرف آجائے تاکہ انسان کامل بن کے دنیا میں رہے اور حسینؑ کی یہ آواز اب بھی دنیا سے
نصرت ومدد طلب کرکے انسانیت کی دعوت دے رہی ہے اور حق یہ ہے کہ آج بھی انسان صرف وہی
ہیں جن کے قدم حسینی راستوں سے الگ نہ ہوں۔

یہ یقینی ہے کہ تذکرہ حسینی کے انسانیت آموز افادی پہلو کو ترک کرکے صرف گریہ وبکا پر اکتفا کرنا
غلطی ہے مگر مظلومیت کی داستان سن کر نہ رونا بھی کوئی اچھا راستہ نہیں ہے۔ ائمہ معصومینؑ کا حکم ہے
گریہ کرو اور زائد سے زائد گریہ کرو۔ جس کے افادی پہلو بہت زائد ہیں۔ مگر اس مقام پر میں صرف
اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ جو نافہم کہہ بیٹھتے ہیں کہ رونا رلانا سینہ زنی کرنا عورتوں کا کام ہے۔

مرد کے ہاتھ میں تلوار اور دل میں فداکاری کے جذبات ہونا چاہئے ہیں میں بھی کہتا ہوں کہ رونا بے شک عورتوں کا کام ہے۔ مردوں کو زیب نہیں دیتا۔ مگر نہ ہر رونا بلکہ صرف وہ جو اپنے درد پر ہو، اپنی چوٹ پر ہو جیسے لکڑی کی چوٹ کھا کے چیخ اُٹھنا، تلوار کا زخم کھا کے رو دینا نامردی ہے اور ضرور نامردی ہے۔ مگر دوسرے کے دردِ دُکھ مصائب دیکھ کے یا سن کے رو دینا عین انسانیت ہے۔ اگر یہ نہ ہوتو انسان انسان نہیں ہمارے سامنے کسی بچہ کو تکلیف پہنچائی جائے اور ہم دیکھ دیکھ کے مسکرائیں تو بہیمیت ہے، حیوانیت ہے اور اگر آنسو نکل آئیں تو عین انسانیت ہے۔ تکالیف شرعی کی تعیین تو اپنے محل ہی پر ہوسکتی ہے مگر اس وقت تو میں صرف اتنا ہی کہتا ہوں کہ شیعوں نے ہاتھوں سے، زنجیروں سے، تلواروں سے ماتم کر کے دکھا دیا کہ جرأت وہمت اور برداشت کی قوت کس قدر ہے مگر اسی کے ساتھ ذکر مصائب سن کے گریہ وبکا سے یہ ثابت کر دیا کہ انسانوں سے ہمدردی دوسروں کی مصیبت میں دل کا تاثر بلکہ انسانیت کے حقیقی جذبات کس قدر ہیں۔

بعینہ یہی چیز تھی جو کربلا کے خونی آئینہ میں حسینؑ ابن علیؑ نے گریہ اور مسکراہٹ غم اور مسرت، رونے اور ہنسنے کے مختلف نقشوں میں پیش کی تھی۔ جب اہلبیتؑ کی مصیبت، دوستوں کا غم، بچوں کا مرنا، عزیزوں کے گہرے اور دلدوز زخم دیکھے تو رو دیئے مگر جب اپنی نوبت آئی تو نیزوں، تیروں، تلواروں، پتھروں کے سیکڑوں زخم پڑنے کے بعد بھی مسکراتے رہے۔

وہ تھی عین انسانیت اور یہ تھی عین شجاعت و مردانگی۔

حسینؑ اور اسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

(وہ تقریر جو شب عاشورائے محرم ۵ ۷ ۱۳ ھ پاکستان ریڈیو اسٹیشن لاہور سے نشر ہوئی)

سلام علیکم۔ یہ زمانہ وہ ہے جو حسینؑ کے ساتھ خصوصی نسبت رکھتا ہے جس میں گویا ہر درودیوار سے حسینؑ حسینؑ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اس لئے اس وقت ''حسینؑ اور اسلام'' کے عنوان کے ماتحت اس پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں کہ حسینؑ کا اسلام سے اور اسلام کا حسینؑ سے کیا خصوصی تعلق ہے اور حلقہ بگوشان اسلام کے لئے حسینی یادگار کے قیام ودوام کی کیا اہمیت ہے۔

حسینؑ اور اسلام کے باہمی ارتباط کے اظہار کے لئے سب سے پہلے مجھے جو الفاظ ملتے ہیں وہ یہ کہ حسینؑ اور اسلام میں وہ تعلق ہے جو ایک گود میں پلے ہوئے دو بچوں میں ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں اسلام پروان چڑھ رہا تھا اور اسی گود میں حسینؑ نے پرورش پائی۔ حسینؑ نے آنکھ کھول کر اسلام کو دیکھا اور اسلام نے بڑھ کر حسینؑ کو گلے سے لگا لیا اور اسی وقت عہد و پیمان ہو گیا کہ جب اسلام پر وقت پڑے گا تو حسینؑ اس کے کام آئیں گے اور پیغمبرؐ اسلام نے اس معاہدہ کی توثیق کر دی اسلام کے اس روحانی جہاد میں جو مباہلہ کے نام سے ہوا تھا اس کم سنی کے عالم میں حسینؑ کو اپنی گود میں لا کر اور اس طرح گویا اسلام کا ہاتھ حسینؑ کے ہاتھ میں دے دیا کہ دیکھو آج میں موجود ہوں۔ میں تم کو اسلام کی نصرت کے لئے اپنے ساتھ لے گیا۔ کل کو جب میں نہ ہوں اور میرے اسلام پر وقت پڑے تو نصرت اسلام کے لئے یونہی چل کھڑے ہونا۔

وہ وقت ۶۰ ھ میں آیا اور حسینؑ اسی طرح اسلام کو بچانے کے لئے نکل کھڑے ہوئے جس طرح انھوں نے اپنے جد بزرگوار کو نکلتے دیکھا تھا۔

پھر حسینؑ اور اسلام کے باہمی تعلق کے لئے یہ الفاظ بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ ان میں وہ تعلق ہے

جولفظ اور معنی میں، متن اور شرح میں، اجمال اور تفصیل میں، قرآن اور اس کی تفسیر میں، انسان اور اس کی تصویر میں ہوتا ہے۔

اسلام کچھ عقائد واعمال کا مجموعہ ہے اور حسینؑ کی پوری زندگی ان عقائد واعمال کا مجسم نمونہ تھی اور حضرت امام حسینؑ کا بیعت یزید سے انکار بھی اسلام کی تفسیر ہی تھا۔

اسلام کے دو معنی ہیں: ایک خدا کے سامنے سر جھکانا دوسرے اپنے کو اللہ کے بالکل سپرد کردینا۔ اب جو خدا کے سامنے سر جھکا چکا ہے وہ یزید ایسے شخص کے سامنے سر کہاں جھکا سکتا ہے اور جو اپنے کو اللہ کے سپرد کئے ہوئے ہو وہ یزید کی بیعت کیونکر کرسکتا ہے؟

اسلام کا خصوصی پیغام بندگان الٰہی کو توحید کا پیغام تھا۔ کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا زبان ہی سے نہیں بلکہ اپنے سراپائے وجود سے اظہار واعلان ہی حقیقت اسلام ہے۔ یہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا پیغام فقط اُن لات وہُبل پر تیشہ رانی نہیں کرتا جو پتھروں سے تراشے ہوئے طاق کعبہ میں نصب تھے۔ بلکہ یہ پیغام ہر طاغوت باطل کے جلال وجبروت کو ختم کردینے کا اعلان ہے۔ ہر اس شخص کے اقتدار کو ختم کردینے کی منادی ہے جو اللہ کے مقابل میں اپنے سامنے بندگان الٰہی سے سر جھکانے کا مطالبہ کرتا ہو۔ یزید اپنے وقت میں ایک ایسا ہی طاغوت تھا جو مجسمہ حق یعنی حسینؑ سے بیعت کا طلبگار تھا اور یہ حسینؑ کا کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کے تقاضوں پر سختی سے قیام تھا جو انھوں نے یزید کی بیعت سے انکار کیا اسی لئے تو خواجہ غریب نواز کو کہنا پڑا:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ است حسینؑ

اور ڈاکٹر اقبالؔ نے کہا:

بہر حق در خاک و خون غلطیدہ است
پس بنائے لا الٰہ گردیدہ است

کربلا میں حضرت امام حسینؑ نے اسلام کی راہ میں جو قربانی پیش کی وہ ہمہ گیری کے اعتبار سے تاریخ عالم میں بے نظیر ہے اس لئے کہ راہ حق میں ہمیشہ جو قربانیاں پیش ہوتی رہیں وہ عموماً شخصی اور انفرادی تھیں مگر یہ کربلا کی قربانی ہی کی خصوصیت تھی اس میں امام عالی مقام نے اپنے بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں، یہاں تک کہ اپنے کڑیل جوان علی اکبرؑ اور اپنے شیر خوار علی اصغرؑ ہر ایک کو اپنی آنکھوں کے سامنے بلکہ اپنے ہاتھ سے راہ خدا میں نثار کیا اور اس سے بڑھ کر اپنے اہل حرم کی اسیری تک گوارا کرلی اور اس طرح یہ ثابت کردیا کہ اسلام سے کوئی شے عزیز نہیں۔

پھر یہ کہ اس ہنگامہ مصائب وآلام اور طوفان شدائد ومظالم میں شریعت اسلام کی ہر تعلیم کو بھی محفوظ رکھا اور ایسے نازک لمحات میں ان کی مثال پیش کی جن میں عام انسان کے تو ہوش وحواس بھی بجا نہیں رہ سکتے۔

ایک طرف خالق کی نماز بجماعت ادا کی اس وقت جب تیروں کی بارش ہورہی تھی مگر دو فداکار سعید بن عبداللہ حنفی اور زہیر بن قین سامنے کھڑے کردیئے کہ وہ تیروں کو اپنے اوپر روکیں۔ ادھر امام نے سلام پھیرا اور ادھر سعید زخموں سے چور زمین پر گرے اور امام سے مخاطب ہوکر پوچھا اوفیت یا اباعبداللہ کیوں مولا میں نے حق وفا ادا کیا ہے امام نے فرمایا نَعَمْ وَفَیْتَ جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرًا ''ہاں ہاں تم نے حق وفا ادا کردیا اللہ تمہیں جزائے خیر عطا کرے''۔

دوسری طرف حقوق العباد جن کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے، انھیں بھی سخت سے سخت اوقات میں حضرت امام حسینؑ نے ادا کیا۔ کربلا کے راستے میں فوج حر کو پانی پلانا کیا تھا...... حالانکہ وہ دشمنوں کی فوج تھی مگر چونکہ پیاسی تھی رحمۃ للعالمین کے جانشین سے دیکھا نہ گیا...... حالانکہ اپنے ساتھ اہل حرم اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے اور عرب کے بے آب وگیاہ صحرا کا مستقبل آگے تھا

مگر آپ نے اپنے ساتھ کا جتنا پانی تھا وہ اس فوج کو پلوا دیا یہاں تک کہ ان کے گھوڑوں تک کو سیراب کر دیا۔

روز عاشور جب کہ جدال وقتال کا بازار گرم تھا۔ تین دن کی بھوک پیاس تھی اور عرب کے صحرا کی دھوپ سر پر تھی......اس وقت اپنے ساتھ والوں کے ساتھ وہ مساویانہ سلوک کہ خیمہ گاہ سے معرکۂ جنگ میں ہر ایک ساتھی کے گھوڑے سے گرنے پر امام سرہانے پہنچتے تھے اور لاش اٹھوا کر خیمہ گاہ کی طرف لے جاتے تھے۔

وہ اسلامی مساوات کی ہمہ گیری جس میں غلاموں تک سے عزیزوں کا برتاؤ کیا جاتا ہے کربلا میں اپنی پوری شان کے ساتھ برتی گئی واضح غلام ترکی اور جون غلام حبشی کے ساتھ اس برتاؤ سے جو امام نے کیا بلکہ غلام کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ دوسرے اصحاب اور اپنے اعزاء کے ساتھ نہ کیا کہ جب وہ زخمی ہو کر گرا اور اس کی آواز پر امام تشریف لے گئے تو آپ اس کے سرہانے بیٹھ گئے اور اپنا مقدس ومطہر رخسار اس کے رخسار پر رکھ دیا اور اسی طرح رہنے دیا یہاں تک کہ اسی عالم میں اس کی روح نے جسد سے مفارقت کی ....اور اس مساوات کو اس سے بھی زیادہ سخت موقع پر اس وقت نبایا جب اصحاب کی شہادت کے بعد بلکہ اعزاء کے داغ اُٹھانے کے بعد بلکہ اس وقت جب علی اکبرؑ کو دم توڑتے دیکھ چکے تھے۔ جب عباسؑ کمر شکستہ کر چکے تھے بلکہ اس عالم میں جب ابھی ابھی اپنی تلوار سے قبر کھود کر اپنے ہاتھوں سے چھ مہینے کے شیر خوار علی اصغرؑ کو دفن کر چکے تھے۔ اس وقت جب رخصت آخر کے لئے در خیمہ پر آئے اور بلند آواز سے کہا: **السلام علیك یا زینب السلام علیك یا امّ کلثوم السلام علیك یا لیلیٰ ورباب السلام علیك یا سکینة ورقیة وان البنون۔** بی بیوں اور بیٹیوں کے سلام کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ **السلام علیك یا فضة جاریة امّی فاطمة الزهرآء** سلام ہو فضہ پر جو میری ماں فاطمہؑ زہرا کی کنیز ہے''۔

اس طرح حسینی کردار میں تعلیماتِ اسلامیہ اس صورت پر منسلک ہو گئے ہیں کہ حسینی یادگار کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو اسلامی تعلیمات کی یاد بھی تازہ ہوتی رہتی ہے۔

اس طرح حسینؑ اور اسلام دونوں ہی ایک ساتھ زندہ ہیں اور ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

❁❁❁

حضرت امام حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہیں مانا؟

اگر واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

آیۃ اللہ العظمٰی سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

(وہ معرکہ آرا تقریر جو ۱۰/اپریل ۱۹۵۵ء کو صبح ساڑھے دس بجے سے گیارہ بج کر ۵۵ منٹ تک لاہور کے عظیم الشان اجلاس ''حسین ڈے'' میں ہوئی)

۱۳۶۱ھ کے بین الاقوامی اجتماعات کے بعد جو ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ، ہر ہر دیہات میں منعقد ہوئے تھے اور جن میں سے ہر اجتماع میں قوم و مذہب کے افراد شریک ہوئے تھے کم از کم میرے لئے اور میرے ان رفقائے کار کے لئے جو دہلی یا لکھنؤ سے آئے ہیں یا اس زمانہ میں وہاں کے باشندہ تھے لاہور کا یہ مظاہرۂ حسینیت کوئی حیرت خیز یا غیر معمولی موقف نہیں۔ مگر یاد رکھئے کہ جتنا مرض شدید ہوتا ہے دوا کی تاثیر اسی قدر زیادہ نمایاں ہوتی ہے وہ ۱۳۶۱ھ تھا اور آج ۱۳۷۴ھ ہے اس مدت میں حالات میں زمین و آسمان کا فرق ہوگیا۔ اس درمیان میں جو زلزلے، آندھیاں اور سیلاب آئے جنھوں نے زمین و آسمان کو بدل دیا ہے ان حالات میں یقیناً لاہور کا جلسہ خاص اہمیت رکھتا ہے اور ایک قسم کا نیا تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہوا ہے۔

۱۳۶۱ھ میں دلوں کے آبگینوں میں بال پڑے تھے مگر ان کے پرخچے نہ اُڑے تھے اور خراشیں آئیں تھیں مگر گھاؤ نہ ہوئے تھے۔ ہمارے رجحانات کی سمتیں الگ الگ ہوئی تھیں لیکن جسم جدا جدا نہ ہوئے تھے مگر ۱۳۷۴ھ میں جب کہ لاہور میں آج یہ عظیم الشان اجتماع ہوا ہے وہ وقت ہے کہ جب حالات نے ایسا عظیم تفرقہ ڈال دیا کہ ملک کا کیا ذکر گھرانے اور گھر تقسیم ہوگئے۔ اکثر بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا، شوہر سے بیوی، بہن سے بھائی کی جدائی ہوگئی۔ اس دور میں

حسینیت کا یہ عجیب تجربہ ہے جو نوع انسانی کے سامنے پیش ہو رہا ہے اور یہ ثابت کر رہا ہے کہ گونا گوں انقلابات کے باوجود جب حسینیت کا پرچم کھل جاتا ہے تو مذاہب کا فرق اور اقوام و ممالک کا امتیاز مٹ جاتا ہے اور ہندوستان اور پاکستان ایک ہو جاتے ہیں۔

۱۳۶۱ھ سے زیادہ آج کا یہ تجربہ کارگر اور مفید ہے اس لئے کہ اس وقت ہم ایک ایسے نظام کے ماتحت گرفتار تھے کہ تمدن عالم میں ہماری آواز اثر نہ رکھتی تھی اور عالم کے بین الاقوامی مجالس میں آواز بلند کرنے سے ہم گھبراتے بلکہ شرماتے تھے مگر اب جب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں تو ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ بین الاقوامی عالم میں اپنے اس پیغام کو پہنچا سکیں۔

آج ہم اپنے اپنے ملک میں آزاد ہو چکے ہیں اور ہم میں سے ہر ایک اپنے اپنے وسائل کا خود مالک ہے۔ اقوام عالم میں کم از کم آئینی طور پر دوسروں کے ساتھ عالمی مسائل کے حل کے لئے ہم برابر سے بیٹھتے ہیں بلکہ بعض جگہ ہم ثالث بن کر مسائل کو بھی حل کرتے ہیں اور دنیا ہمارے سامنے اپنے مسائل پیش کرتی ہے تو یہ جلسہ ایک تجربہ گاہ ہے۔ اس کی کامیابی کے بعد میں اس مستقبل کو دیکھتا ہوں جب کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں کے اکابر علماء حسینیت کے زیر سایہ عالمی مسائل کو طے کریں اور شاید آگے چل کر وہ حالات پیدا ہوں کہ حسین ڈے کا یہ جلسہ عالم کے کسی اور بڑے مرکز میں منعقد کیا جائے خواہ امریکہ میں خواہ یورپ میں اور خواہ روس وغیرہ میں اور پھر اس حسینیت کے مرکز سے بین الاقوامی دکھ درد کا علاج کیا جائے۔

یاد رکھئے کہ آج کوئی تاجدار، فاتح ممالک ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جس کا نام اقوام و ملل کو گلے ملا دے چاہے وہ کتنے ہی جاہ و جلال کا مالک ہو مگر کربلا کے تڑپتے ہوئے لاشے بہتا ہوا خون اور نیزوں پر بلند ہونے والے سر آج دنیا کو ایک موقف پر لے آسکتے ہیں سمجھے آپ نظام اہلبیتؑ؟

دنیا نے فتح ممالک کو کامیابی کی دلیل سمجھا لیکن اہلبیتؑ نے فتح قلوب کو اصل فتح کی دلیل سمجھا۔ فاتحین ممالک ختم ہو گئے لیکن فاتحین قلوب اسی طرح زندہ ہیں۔

یاد رکھئے کہ یہ فتح کا راز وہ تھا جسے حسینؑ کے مشیر کار سمجھے ہوئے نہ تھے لیکن حضرت امام حسینؑ اس راز سے واقف تھے۔ مشیروں نے حضرت امام حسینؑ کو رائے دی کہ آپ کربلا نہ جایئے مگر امام نے مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا یہ برا کیا؟ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے مشیروں کا کہنا کب مانا تھا۔ کسی اور کا کیا ذکر۔ سگے چچا کا کہنا نہ مانا۔

یہ مشیران امام مادی مستقبل سامنے رکھتے تھے اور آج کے مشیروں کا حوالہ دینے والے بھی وہی دماغ رکھتے ہیں بیشک وہ محدود نگاہ کی رو سے مر گئے، مٹ گئے، برباد ہو گئے۔ گود کے بچے تک شہید ہو گئے عورتیں اسیر ہو گئیں یہ سب مشیروں کا کہنا نہ مان کر ہوا مگر پیغمبرؐ اسلام نے بھی تو مشیروں کا کہنا نہ مان کر دکھ ہی اٹھائے۔

یہ نہ دیکھئے کہ ۱۳؍ برس کے بعد ہجرت ہوئی اور انصار ملے لیکن ہجرت سے پہلے ۱۳؍ برس رسولؐ خدا نے کیا کیا۔ دکھ نہیں سہے، جسم مبارک پر پتھر نہیں کھائے، سر مبارک پر خس و خاشاک نہیں پھینکا گیا؟ یہ سب کچھ ہوا۔ شعب ابی طالب میں ۳؍ برس مقید رہے یہ زمانہ اتنا شدائد سے بھرا ہوا تھا کہ کئی کئی وقت نہ کھانا ملتا نہ پانی۔ اکثر درختوں کے پتے کھا کھا کر گذر کی جاتی تھی۔ انہیں تکالیف کا اثر تھا کہ محاصرہ سے باہر آنے کے بعد چند ہی ماہ کے اندر حضرت خدیجہ اور ابوطالب دونوں کی وفات ہو گئی جس کی بنا پر رسولؐ خدا نے اس سال کا نام عام الحزن رکھ دیا یہ سب کچھ کہنا نہ ماننے ہی کا نتیجہ تو ہوا۔

اب دنیا بتائے کہ انھوں نے اچھا کیا یا برا کیا اور اس کا کیا نتیجہ حاصل ہوا۔ پھر اگر پیغمبرؐ اسلام کا مشیروں کے مشوروں کو رد کر دینا درست تھا تو حضرت امام حسینؑ نے بھی اگر مشیروں کا کہنا نہ مانا تو کیا برا کیا؟

کتب تواریخ میں مشیروں کا ذکر بہت ہے مگر کسی ضعیف سے ضعیف روایت میں بھی یہ بات نہ ملے گی کہ کسی مشیر نے یہ رائے دی ہو کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔ مشورے اس طرح کے تھے کہ

عراق نہ جایئے، طائف تشریف لے جایئے، یمن چلے جایئے، مکہ معظمہ میں قیام کیجئے لیکن کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے۔

اس کے یہ معنی ہوئے کہ یزید کی بیعت کرنا امام حسینؑ کے لئے سب ہی کے نزدیک ناممکن یا ناروا بات تھی۔ اب بیعت نہ کرنے کے بعد جن جگہوں کے متعلق مشورہ دیا جا رہا تھا ان میں سے کوئی بھی کیا ایسی تھی جو مملکت یزید کے حدود سے باہر ہو۔ لہٰذا نتیجہ یہی تھا کہ یزید کی طرف سے فوج کشی ہو۔ پنڈت ویاس دیو مصرا کا وہ فقرہ کس قدر پسندیدہ ہے جو آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں کہا کہ اب سوال فقط مقتل کے انتخاب کا تھا۔ شہادت امام حسین علیہ السلام تو یقینی تھی ہی اگر مدینہ میں رہتے تو اس طرح ہوتا جیسا حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح مکہ میں ہوتے تو بھی کسی خفیہ طریقے سے خاتمہ کر دیا جاتا۔

امام حسینؑ کا مکہ چھوڑنا کن حالات میں تھا اس کو یوں سمجھئے کہ جو دستور فطرت کے خلاف عمل ہو اسے ضرور غیر معمولی اسباب کا نتیجہ ماننا پڑے گا۔ وہ حسینؑ جو ۲۵؍ حج پا پیادہ کر چکے ہوں اور حج کے اس قدر مشتاق ہوں کہ مدینہ سے آ آ کر حج کرتے ہوں اس طرح کہ مرکب ساتھ خالی جا رہے ہوں اور آپ پیروں پر جا رہے ہوں کیا اتنے ذوق عبادت رکھنے والے حسینؑ کو مکہ سے آج وہ رابطہ نہ تھا جو مسلمانوں کو خانہ کعبہ سے ہوتا ہے ان کا تعلق کعبہ کے ساتھ مذہبی تعلق کے علاوہ خاندانی تعلق بھی تھا وہ ان کے باپ کا مولد بھی تھا۔ پھر خیال تو کیجئے کہ پیغمبر اسلام کا نواسہ اور ایک دن حج کا باقی رہتے ہوئے وہاں سے سفر کر رہا ہے جب کہ تمام مسلمان مکہ کی طرف حج کرنے جا رہے ہیں وہ وہاں سے مکہ چھوڑ کر نکل رہے ہیں اور راہ میں قافلے والے حیرت سے پوچھتے ہیں کہ امام اس وقت کدھر جا رہے ہیں۔ اور ہر شخص کا سوال فرزند رسولؐ کے دل پر نشتر کا کام کر رہا ہے۔ ہر ایک سے کہاں اصلی بات بتاتے۔ کسی کسی سے کہہ بھی دیا کہ اگر میں نکل نہ کھڑا ہوتا تو قتل ہو جاتا یا گرفتار ہو جاتا **(واللہ لولم اخرج لا خضت)** اس لئے کہ حاجیوں کے بھیس میں سپاہی بھیجے گئے تھے کہ جب اور

جہاں امام ملیں انھیں شہید کر دیا جائے۔

ان ظالموں کے لئے جب وہ مشہر الحرام نہ تھے تو بلدالحرام اُن کے لئے حرام کہاں ہوسکتا تھا جب ان کو وقت کی حرمت کا خیال نہ تھا تو جگہ کا احترام کہاں کرتے۔

آج دنیاوی سیاست کی نظر سے اس امر کو جانچئے کہ اگر کہیں مکہ میں طواف یا سعی کی حالت میں یا نماز میں کوئی شخص آ کر شہید کر دیتا تو فرزند رسولؐ شہید ہوجاتے لیکن آج تک دنیا کو یہ نہ معلوم ہوسکتا کہ قاتل کون ہے۔

صفحات تاریخ پر آج یہ معاملہ صاف ہے کہ حضرت امام حسینؑ بالکل بے جرم تھے اوران کا قاتل یزید تھا لیکن اگر فرزند رسولؐ اس صورت میں شہید ہوجاتے تو قاتل امام پوشیدہ ہوکر زندہ رہتا البتہ امام حقیقی معنوں میں قتل ہوجاتے اور آپ کا مقصد بھی آپ کے ساتھ ہی قتل ہوجاتا۔

کیا مشیران امام اتنے دوررس تھے جو ان نتائج کو مدنظر رکھ کر مشورہ دیتے؟ ان میں کچھ واقعی ہمدرد تھے اور کچھ نمائشی طور پر خیر خواہ تھے جو سیاست کے ماتحت ہمدرد بن رہے تھے مگر سب کے مشورے صرف وقتی حالات کی بنا پر جذبات سے متاثر ہوکر دیئے گئے تھے۔ مگر امام حسین علیہ السلام جذبات سے بلند تر تھے کیونکہ جذبات سے بلند ہستی کا نام ہی معصوم ہے۔ اور انھوں نے مشوروں کی مخالفت کر کے اپنا جذبات سے بلند ہونا دکھا دیا اور ثابت کر دیا کہ وہ جذبات سے کسی طرح متاثر نہیں ہوتے۔

کہا جاتا ہے کہ کربلا کا واقعہ اس قدر اہمیت کیوں رکھتا ہے یا اس کو اہمیت کیوں دی جاتی ہے اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ مگر اب جب کہ واقعۂ کربلا ہو چکا میں کیا بتاؤں کہ نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ جس نے تاریکی دیکھی نہ ہو اور دن ہی کو آنکھ کھولی ہو وہ پوچھے کہ سورج نہ ہوتا تو کیا ہوتا تو اسے کس طرح بتایا جاسکتا ہے۔

امام نے جو قربانی پیش کی ہم نے اس کی برکات کے زیر سایہ آنکھ کھولی ہے آپ نے حقانیت کا

ایسا سورج چمکا یا جو کبھی غروب ہونے والا نہیں لہٰذا اب کوئی کیا سمجھے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا۔ یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی کہے کہ خدا نہ ہوتا تو کیا ہوتا ظاہر ہے کہ خدا نہ ہونے کا تجربہ ہی کسی کو نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ خدا ازل سے ہے میں تو سمجھتا ہوں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو یہ جو کچھ ہے کچھ بھی نہ ہوتا ہماری دینی زندگی جس کو دوسری لفظوں میں میں انسانی زندگی کہوں گا۔ اور شریفانہ باشعور باعزت اور خود دار زندگی اس سب کا کچھ پتہ نہ ہوتا، اذانیں نہ ہوتیں، اقامت نہ ہوتی، نماز نہ ہوتی، روزہ نہ ہوتا، حج نہ ہوتا، قرآن نہ ہوتا، اخلاق نہ ہوتا، احساس نہ ہوتا، تمدن نہ ہوتا، تہذیب نہ ہوتی مساوات واخوت نہ ہوتی، حریت نہ ہوتی جذبہ شہادت نہ ہوتا، حقانیت نہ ہوتی اور حق پرستی نہ ہوتی اب اس کے بعد میں کیا بتاؤں کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا مگر ابھی تک تو یہ دعویٰ ہی دعویٰ معلوم ہوتا ہے اس کے ثبوت کے لئے میں کہوں گا یہ دیکھئے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوا تھا تو کیا ہو رہا تھا اور خدا کی قسم جو ہو رہا تھا وہ ایسا ہے کہ اب یقین مشکل سے آتا ہے کہ یہ ہو رہا تھا۔

جس پیغمبرؐ نے یہ نمونہ پیش کیا ہو کہ دین و دنیا کا اقتدار زیر قدم رکھتے ہوئے کئی کئی وقت پیٹ پر پتھر باندھا اور کھانا نہ کھایا ہو اور جس پیغمبرؐ نے ہمیں یہ نمونہ دکھایا ہو کہ وہ معزز بیٹی جس کی تعظیم کو آپ کھڑے ہوجاتے ہوں۔ یعنی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا اپنی جگہ تو ان کا یہ اعزاز مگر جب انھیں کنیز سپرد فرماتے ہیں تو کنیز کے ساتھ مساوات کا اتنا خیال فرماتے ہیں کہ بیٹی گھر کا سارا کام کاج فضہ پر نہ ڈالنا بلکہ ایک دن گھر کا کام خود کرنا اور ایک دن فضہ سے لینا چنانچہ بیٹی نے ایسا ہی کر کے دکھا دیا کہ ایک دن فضہ لونڈی کھانا پکاتی اور کام کاج کرتی اور حضرت فاطمہؑ آرام فرماتیں اور دوسرے روز حضرت فاطمہؑ گھر کا کام کرتیں اور فضہ آرام کرتیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ غلامی کو ختم کیوں نہ کر دیا؟ اگر ایسا ہوتا تو معیار غلامی اپنی جگہ ہی رہتا آل رسولؐ نے بتایا کہ یہ تو باہمی تعاون کے ذریعے ہیں۔ آقا غلام خاوند بیوی وغیرہ۔ یہ رشتے گھر کے افراد میں شمول کا ذریعہ ہیں۔ ان کو ختم کرنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ذہنیت بدلنے کی ضرورت ہے آج جب چھوٹے بھائی سے یہ سلوک روا رکھا جاتا ہے کہ

کہتے ہیں ''سگ باش برادر خورد مباش'' تو ہمارے اس تمدن میں غلام کنیز کے ساتھ اچھا برتاؤ کہاں ہوگا۔ مگر یہ قصور ہمارے تمدن کا ہے آلِ محمدؐ کے غلاموں اور کنیزوں سے پوچھو کہ تم کو آزاد ہونا منظور ہے یا غلام رہنا۔ آج کی آزادی ہزار غلامی سے بدتر اور وہ غلامی رشک تاجداری تھی وہ فاطمہؑ زہرا کا حسب ہدایت پیغمبر برتاؤ اپنی کنیز فضہ کے ساتھ اور اسی طرح حضرت علیؑ کا برتاؤ اپنے غلام قنبر کے ساتھ اس وقت نہیں جب کہ آپ خانہ نشین تھے بلکہ اس وقت جب کہ آپ شہنشاہ تسلیم کئے جا رہے تھے ایسے وقت قنبر کے ساتھ جو برتاؤ آپ نے دکھلایا کہ بازار سے دو پیراہن خریدے ایک سات درہم کا دوسرا پانچ درہم کا۔ پہلا پیراہن اپنے غلام قنبر کو حضرت نے عطا فرمایا اور پانچ درہم والا خود زیب تن کیا۔ قنبر عرض کرتے ہیں کہ حضور یہ کچھ بہتر ہے۔ آپ اسے زیب جسم فرمائیے۔ ہم میں سے آج کا کوئی آدمی اوّل تو ایسا کرتا ہی کیوں۔ اگر کوئی لیڈر قسم کا آدمی ایسا کر بھی دیتا تو جب قنبر نے عرض کیا تھا کہ حضور یہ بہتر ہے آپ پہن لیں تو فوراً اپنی مصلحانہ حیثیت کا علم اونچا کر دیتا وہ جواب میں ایک تقریر کر دیتا کہ قنبر میں دنیا سے اس تفرقہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں میں دنیا میں غلاموں کا معیار بلند کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

لیکن حضرت علیؑ نے یہ جواب نہیں دیا حالانکہ پیش نظر یہی تھا لیکن قنبر سے اگر یہ فرماتے تو اس جواب میں خود عدم مساوات مضمر تھی اس ارشاد سے قنبر کو احساس غلامی پیدا ہو جاتا آپ قنبر کو ایسا جواب دیتے ہیں جیسا اپنے بچوں کو دیا جاتا ہے کہ تم جوان ہو تمہیں یہ پیراہن اچھا لگتا ہے۔

پیغمبرؐ اسلام خود جس طرح کی تربیت مسلمانوں کی کرنا چاہتے تھے وہ اس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ حضرت کے پاس صف میں ایک رئیس خالی جگہ پا کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اتنے میں ایک غریب بوسیدہ کپڑوں والا جو آداب نبوی کا عادی ہے آ کر اس رئیس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے رئیس صاحب نے اپنے معیار طبیعت کے لحاظ سے بہت اخلاق سے کام لیا بہت ضبط سے کام لیا اپنا دربار ہوتا تو شاید یہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر نکال دیتے اور بدتمیز کہہ دیتے۔

مگر وہ بارگاہ پیغمبر تھی یہاں یہ ممکن نہ تھا پھر بھی فطری طور پر ذہنیت کا مظاہرہ اس طرح ہو گیا کہ رئیس نے اپنا لباس سمیٹ لیا۔ پیغمبرؐ اسلام نے اتنا بھی گوارا نہ کیا اور خلق عظیم کی تیوریوں پر بل آ گئے اور فرمایا یہ تم نے کیا کیا؟ کیا اس کی غربت تم میں آ جاتی یا تمہاری ریاست اس کو مل جاتی یا چلی جاتی دامن کیوں سمیٹا؟

مربی اعظم کی اس تنبیہ کا اتنا اثر ہوا کہ وقتی طور پر اس کا ضمیر شرمندہ ہوا۔ اور عرض کی یا رسول اللہ اس گناہ کے کفارہ میں میں اپنی نصف دولت اس غریب بھائی کو دیتا ہوں۔ متبسّم ہوتے ہوئے حضور غریب کی طرف متوجہ ہوئے کہ یہ نصف دولت کی پیشکش تم کو منظور ہے؟ غریب صحابی نے جواب میں عرض کیا کہ میں اسے شکریہ کے ساتھ واپس کرتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ یہ خوشی سے دے رہا ہے اس نے عرض کیا مجھے ڈر ہے کہ یہ ذہنیت کہیں مجھ میں نہ پیدا ہو جائے۔

محض اخلاق کی کتابوں میں نمائشی طور پر اصول کو درج کر دینا آسان بات ہے لیکن جیتی جاگتی عمل کی دنیا میں اتنی کم مدت میں اس کو پیش کر دینا بڑی مشکل بات ہے۔ پیغمبرؐ خدا نے ہر تعلیم کو عمل کی صورت میں دنیا کے سامنے زندہ مجسمے کی شکل میں پیش کر دیا کہ میرا نظام فقط ذہنی یا دماغی نہیں بلکہ عملی ہے وہ زندہ نظام ہے جو سیرت و کردار کی شکل میں آنکھوں کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ میرا آئین اخلاق لفظی نہیں بلکہ بالکل عملی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ کتاب اللہ کے ساتھ اہلبیتؑ کی ضرورت ہوئی اور ارشاد ہوا "اِنِّیْ تَارِكٌ فِیْكُمُ الثَّقْلَیْنِ كِتَابَ اللّٰهِ وَعِتْرَتِیْ" اور اسی لئے ان اہلبیتؑ کو مباہلہ کے میدان میں اپنے ساتھ لے گئے تھے میرا عقیدہ ہے اور میرے نزدیک ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہونا چاہئے کہ دعائے رسولؐ کسی کی آمین کی محتاج نہ تھی بلکہ ان میں سے ہر فرد کی دعا تنہا کافی تھی، مگر خالق اکبر نے نبی علیہ السلام کو ہدایت فرمائی کہ ان سب کو ساتھ لے جاؤ منزل مباہلہ میں۔

اس لئے کہ جب صادقین اور کاذبین میں مقابلہ ہو رہا ہے تو دنیا جان لے کہ خالص صادقین

افراد یہ ہیں اور جب رسالت مآبؐ دنیا سے اُٹھ جائیں تو جو کام آپ کے بعد ان سے لیا جانا ہے وہ زندگی ہی میں ان سے لے لیا جائے۔ اس لئے فطرت اسلام کے لئے آج ان کو ساتھ لیا اور شریک کار بنایا۔ مباہلہ کے اس شریک کار ہونے میں سب سے کمسن حسینؑ تھے اور ان کو رسولؐ خود اپنی گود میں لے گئے تھے۔ پیغمبرؐ خدا کی نگاہ ماضی کے آئینے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ رہی تھی کہ اسی حسینؑ کی قربانی کی دنیا کو ضرورت پیش آئے گی۔ چنانچہ ۶۱ھ میں وہ پیش آگئی یہ اہلبیتؑ دنیا میں اسی لئے چھوڑے گئے تھے اور ان کا تعارف مسلمانوں سے اسی لئے کرایا گیا تھا کہ یہ اسلامی نظام تمدن کی زندہ تصویر تھے کیا حیرت کی بات نہیں ہے کہ جن مسلمانوں کی تربیت اس معیار پر کی جا رہی ہو۔ ان مسلمانوں میں صرف بچاس برس کے بعد ہی یہ وقت آگیا کہ دارالحکومت اسلامی میں ریشم کے پردے لٹک رہے ہوں اور غلام زریں کمر بند لگائے ہوئے بادشاہ کے سامنے کھڑے ہوں اور دروازوں کے اوپر پہرے لگے ہوں تا کہ کسی غریب کی رسائی نہ ہو سکے اور کسی مظلوم کی فریاد اس کے کانوں میں پہنچنا ناممکن ہو جائے یہی نہیں بلکہ بادشاہ کے سامنے طلا ونقرہ کے برتنوں میں پانی پلایا جا رہا ہو۔

یہ سب باتیں یزید سے پہلے ہو چکی تھیں اور اگر کوئی صحابی مثلاً عبادہ بن صامت وغیرہ ٹوکتے بھی تھے تو ان کو قدامت پسند ہونے کی سند ملتی تھی یاد رکھئے یہی حالات ترقی کر کے یزید کے کردار کے درجہ تک پہنچے یزید سے پہلے سونے چاندی کے برتنوں میں پانی پیا گیا جو ظرف کے اعتبار سے شرع اسلامی میں حرام ہے تو یزید کے یہاں شیشوں کے جاموں میں شراب پی جانے لگی اور شراب کے دور چلنے لگے اب بجائے صدائے تکبیر کے نائے ونوش کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں رنگ برنگ کی محفلوں میں نماز کا وقت آ کر گذر جاتا لیکن رونق محفل میں کچھ فرق نہ آتا۔

غضب یہ ہے کہ یہ سب کچھ جانشینی رسولؐ کے نام پر ہو رہا ہو اور سب مسلمان درباری وغیرہ مان رہے ہوں اور یہ ہونا اتنا حیرتناک نہیں جتنا کہ عام طور پر مسلمانوں کا ماننا یعنی یہ سب کچھ ہو رہا ہو اور

مسلمان اس حاکم کو خلیفۂ رسولؐ مان رہے ہوں۔ آج کا مسلمان ضرور حیرت سے یہ پوچھے گا کہ کیا مسلمان اس کو مان رہے تھے۔

جی ہاں سب مان رہے تھے اگر سب نہ مان رہے ہوتے تو تاریخ شمار کر کے کیوں بتاتی کہ فلاں فلاں نے نہیں مانا۔ تاریخ کا شمار کرنا بتا رہا ہے کہ اور سب مان رہے تھے۔ وفات پیغمبرؐ کے پچاس برس کے بعد ہی یہ احساس مذہبی کا حال ہو چکا تھا۔ اور ۶۱ھ سے اب تک کہ تیرہ سو تیرہ برس ہو چکے ہیں مگر جب کہ عموماً احساس کیا جاتا ہے کہ اسلام گھٹتا چلا جا رہا ہے اور تمدن وتہذیب کی حدیں پامال ہو رہی ہیں مگر ۶۰ھ کے مقابلہ میں اس وقت بھی حالت بہتر ہے اور یہ مجمع کم نہیں ہے میں اسی جلسہ کے مجمع سے شہر اور دیہات سے آئے ہوئے تمام لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ان میں سے کوئی ایک بھی یزید ایسے شخص کو جانشین رسول مان سکتا ہے؟

آج کے جاہل سے جاہل اور فاسق وفاجر مسلمان سے بھی پوچھا جائے تو یزید ایسے کسی آدمی کو جانشین رسولؐ نہ مانے گا۔ لیکن رسولؐ خدا کی وفات کے صرف پچاس برس کے بعد لوگ مان رہے تھے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے کہ واقعۂ کربلا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

(چاروں طرف سے نعروں کی صدا بلند ہوئی)

ظلم اور فسق وفجور سے یہ نفرت کیونکر پیدا ہوئی۔ یہ واقعہ کربلا کا فیض ہے آج کا یہ جلسہ اور اس طرح کی تمام یادگاریں اس اثر کو زندہ رکھنے کے لئے ہیں۔ اسی کے لئے عزاداری ہوتی ہے اور اسی کے لئے نام حسینؑ کی یہ تکرار کی جاتی ہے۔

اب بھی سوال ہوگا کہ حسینؑ نے مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا اور یہ کہ آپ یزید کی بیعت کر لیتے تو کیا حرج تھا۔ میں کہوں گا کہ وہ حسینؑ نہ ہوتے جو مان لیتے کوئی اور ہوتا۔ حسینؑ تو کبھی پشیمان نہیں ہوئے کہ مشیروں کا کہنا کیوں نہ مانا حسینؑ کے ساتھ والا بھی کوئی پشیمان نہ ہوا۔ کوئی بچہ حسینؑ کے ساتھ کا نادم نہ ہوا۔ اور اُدھر کوئی اور کیا خود یزید ملعون نادم ہوا مگر یاد رکھئے اس فرق کو کہ وہ ندامت

زندگی ضمیر کا نتیجہ نہ تھی جسے توبہ سمجھا جا سکے بلکہ وہ احساس شکست کا نتیجہ تھی اب اس خیال سے کہ میرے بعد والے مقررین پر ظلم ہوگا اور مجھے خود جلسہ کے مفاد کا بھی احساس ہے اس لئے اپنی تقریر کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ خدا کرے جس طرح آج کے جلسہ میں اجسام یکجا ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے دل و دماغ بھی یکجا ہو جائیں اور حسینیت کا جھنڈا خدا کرے برابر لہراتا رہے اور مشرق سے مغرب تک کو اپنے سائے میں لے لے۔

❁❁❁

مقام شبیری

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

(وہ تقریر جو محرم ۱۳۷۲ھ میں پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی کی کوٹھی، دین دیال روڈ، لکھنؤ میں ہوئی)

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی

یہ اسلام کے مشہور مفکر شاعر ڈاکٹر اقبالؔ کا مشہور شعر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حقیقت ہونا خود ابدی ہونے کا ذمہ دار ہے۔ حقیقت وقت کی پیداوار نہیں ہوتی۔ حقیقت انقلاب روزگار سے نہیں بدلتی۔ حقیقت طبائع کے رجحانات کے ساتھ مختلف نہیں ہوتی "لَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ" "اگر حق انسانی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو زمین و آسمان اور سب چیزیں تہ و بالا ہو جائیں۔"

حق ایک خط مستقیم ہوتا ہے اور خط مستقیم دو نقطوں کے درمیان ایک ہی ہو سکتا ہے۔ باطل ادھر اُدھر کے خطوط ہوتے ہیں جو بکثرت ہو سکتے ہیں۔

حق خداوند عالم کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے۔ آپ کہتے ہیں "حق سبحانہ وتعالیٰ" وہ حق اسی لئے ہے کہ ثابت ہے غیر متزلزل۔

مقام شبیری بھی حقیقت ابدی اسی لئے ہے۔ بدل سکتا ہے وہ شخص کہ جو جذبات کا پابند ہو وقتی سیاست اپنا چولا بہت جلدی جلدی بدل سکتی ہے مگر وہ ذات جو مقام طاعت میں عین حق بن گئی ہو ایسے انسان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

حق نا قابلِ تقسیم ہے اور پھر غیر اضافی شے ہے۔ اس لئے اس میں ذرّہ بھر تبدیلی کا امکان نہیں ہوتا۔ اگرچہ شاعر نے ضرورتِ شعر سے فقط ''ابدی'' کہا ہے مگر درحقیقت وہ ازلی بھی ہے۔ مقام شبیری ازلی اور ابدی دونوں ہے۔ اس لئے کہ وہ مجسم دین ہے اور دینِ الٰہی ازل سے ایک ہے اور ابد تک ایک ہی رہے گا۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ یہ دین نام ہے صرف معبودِ حقیقی کے سامنے سرِ نیاز جھکانے کا، آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاءؑ سب اسی کے معلم تھے۔ یہ اور بات ہے کہ عامۂ بشر کے ظرف صلاحیت کے اعتبار سے اس کے پیمانہ میں وسعت ہوتی گئی۔

جیسے ایک طالب علم اسکول میں داخل ہو۔ عربی، انگریزی جس تعلیم میں جائے ابتدائی درجہ سے انتہا تک اس کا نصب العین اصل ایک ہے۔ اور منتہائی نقطہ لیکن ایک دم اس کی تعلیم دی جائے تو بچہ کا ذہن کہاں قبول کر سکتا ہے۔ اس لئے ہر درجہ کا کورس الگ الگ ہے مگر وہ مختلف اور متضاد نہیں ہے۔ اسی طرح سابق انبیاء کے تعلیمات اور ان کا منتہائی نقطہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تعلیم ہے جو ظاہر بظاہر اسلام کے نام سے موسوم ہوئی۔ ''مقامِ شبیری'' بھی بس یہی تھا۔ معبودِ حقیقی سے ہٹ کر کسی دوسرے کے سامنے سر جھکانے سے انکار۔

طاغوت باطل ابتدائے آفرینش انسان سے ہر زمانہ میں حق کو دبانے کی کوشش کرتا رہا۔ اگر مادّی طاقت کے مقابلہ میں حق دبا کیا ہوتا تو آج دنیا میں حق کا وجود نہ ہوتا۔ اگر انبیاء مخالفتوں کی شدت سے مرعوب ہو کر چپ ہو جایا کرتے تو آج دنیا میں اچھے تعلیمات ہمارے سامنے ہوتے ہی نہیں۔

پیامِ حق پہنچانے کا راستہ ہمیشہ خارزار رہا۔ ''چوں حرفِ حق بلند شود دار می شود'' مگر اہل حق کبھی سپر انداختہ نہیں ہوئے۔ نہ نمرود کے سامنے ابراہیمؑ نے سر جھکایا۔ نہ فرعون کے سامنے موسیٰؑ نے اور نہ ابوجہل کے سامنے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔ پھر حسینؑ یزید کے سامنے سر کیوں جھکاتے؟

ایک دشوار گزار راستہ ایسا ہو جس پر ابھی تک کسی نے جانے کی ہمت نہیں کی تو اس پر چلنے کا ارادہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے لیکن اگر کچھ رہروؤں کے نقش قدم موجود ہوں تو ہمت بلند ہوتی ہے۔

اتنی مثالیں آنکھوں کے سامنے آنے کے بعد بھی تو آج راہِ حق پر قیام میں ہمارے قدم تھرّا جاتے ہیں۔ کتنے ہی ہیں جو ذرا سختی اُٹھا کر صحیح جادے سے ہٹ جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے سامنے ہماری پوری تاریخ ہے جسے اسلاف نے پسینے اور آنسو اور خون سے مرتب کیا ہے پھر بھی تو ہمارے پاؤں اُکھڑ جاتے ہیں۔ اگر یہ مثالیں ہمارے سامنے نہ ہوتیں تو کون ہوتا جو حق پر برقرار رہے؟

یاد رکھئے کہ دنیا میں جو کبھی انصاف، عدل، مساوات، حقوقِ انسانی یا ایثار وغیرہ کی صدائیں سننے میں آجاتی ہیں۔ یہ فیض ہے فقط انہیں داعیانِ حق کا۔ ورنہ مادیت کا تو فلسفہ یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام ''تنازع للبقاء'' پر مبنی ہے۔ بڑا پودا چھوٹے کو کھا جاتا ہے۔ بڑا جانور چھوٹے کو کھائے جاتا ہے تو طاقتور انسان کمزور کو فنا کے گھاٹ کیوں نہ اُتار دے۔ یہ طاقت کی بنا پر اس کا حق ہے۔ اس فلسفہ کی بنا پر تو ظلم ظلم نہیں رہتا اور عدل کا کوئی مفہوم نہیں ہوتا۔ اب اگر اس کے باوجود انصاف وعدل کی آوازیں ذہنوں سے بلند ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں تو تسلیم کرنا چاہئے کہ یہ صرف انہی رہنمایانِ دین کے تعلیمات کا اثر ہے جو غیر شعوری طور پر دماغ انسانی میں مرتسم ہو گیا ہے۔ دنیا لاکھ پلٹے کھائے۔ آسمان اور زمین کے درمیان بے شمار تبدیلیاں ہوتی رہیں مگر حق نہ بدلے گا، حق نہ بدلے گا تو مقام شبیری نہ بدلے گا۔

حق کے جتنے مظہر تھے وہ کبھی وقت کے ساتھ نہیں بدلے۔ علی بن ابی طالبؑ کا زہد اور ترکِ دنیا ۲۵ / برس کی خانہ نشینی کے دور میں ایسا تصور ہو سکتا تھا کہ یہ بے بسی کا نتیجہ ہے مگر جب آپ کو جمہوری طور پر بھی خلیفۂ اسلام مان لیا گیا اور تختِ حکومت ظاہری طور پر بھی آپ کے زیرِ قدم آ گیا اس وقت بھی دنیا نے دیکھا وہی پیوند دار قبا ہے، وہی جو کا بھوسی ملا ہوا آٹا آپ کی غذا ہے، جو تبدیلی ہو گئی تھی وہ عامۃ الناس میں تھی کہ وہ پہلے آپ کو خلیفہ نہ مانتے تھے اور اب ماننے لگے تھے مگر آپ میں ذرہ بھر بھی تبدیلی نہ تھی۔

مامون الرشید نے امام رضاؑ کو سلطنت بنی عباس کا ولی عہد کیوں بنایا تھا؟ صرف ایک خیال خام

کی بنا پر۔ چونکہ ان شخصیتوں کا زہد اور ترک دنیا وغیرہ کے صفات کی وجہ سے قلوب خلائق پر اثر تھا تو مامون نے اپنی پست ذہنیت کے پیش نظر دنیا کو یہ تجربہ کرانا چاہا تھا کہ دیکھو یہ بھی جب دنیا میں پڑ جائیں تو تمام زہد اور سادگی ختم ہوجائے مگر اس تجربہ کا نتیجہ اُلٹا ہوا یعنی دنیا نے آنکھوں سے یہ دیکھا کہ یہ سلطنت کے سب سے بڑے صاحب اقتدار رکن ہونے کے باوجود اپنے مکان پر چٹائی ہی پر بیٹھتے ہیں۔ ان کا غذاؤ لباس وہی ہے جو پہلے تھا۔ اس کی وجہ سے ان کی روحانیت کا قلوب پر اور زیادہ اثر بڑھنے لگا۔ اس کا تدارک تھا جو پھر بعد میں حضرت کو زہر دے کر کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ابدی کے وہ عملی مرقعے ہیں جن میں وقت کے ساتھ تبدیلی نہیں ہوتی۔

رسولؐ اللہ کی خاص صفت کردار جو دنیا میں نمایاں تھی کیا تھی؟ سچائی اور امانتداری۔ آپ کا لقب ہی صادق اور امین ہوگیا تھا۔ ۴۰ برس تک ان اوصاف کی بنا پر وہ ہر دلعزیزی رہی کہ پوری قوم آپ کے لئے آنکھیں بچھاتی تھی مگر جب پیام حق کی آواز بلند کی کہ خدا کو ایک مانو، بت پرستی ترک کرو تو وہ پوری قوم دشمن ہوگئی مگر امانتیں مشرکین کی آپ کے پاس شب ہجرت تک تھیں یہاں تک کہ جب سب متفق ہوگئے کہ رات کو آپ کی زندگی کا خاتمہ کردیں تب بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ پہلے اپنی امانتیں واپس لے لو۔ خون بہانے پر تیار تھے مگر اپنی امانتوں کے تحفظ کا یقین تھا اور آپ نے بھی ان کی امانتوں کے تحفظ کے لئے یہاں تک کیا کہ اپنی گود کے پالے اور اپنی جان سے زیادہ عزیز بھائی کو خطرہ میں ڈال دیا مگر کہہ دیا کہ یا علی جب تک امانتیں مشرکین کی ان تک واپس نہ کرلینا مکہ نہ چھوڑنا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ ہستیاں ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ دوست ہو یا دشمن بہر حال امانتیں ہیں اور ان کی حفاظت ضروری ہے۔

یہی بلندی اوصاف کی منزل وہ ہوتی ہے جہاں دوست اور دشمن سب کو یکساں طور پر سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے حسینؑ ایسے ہی صفات کے حامل تھے چنانچہ ایک مرتبہ جب آپ نے امیر شام معاویہ کو احتجاجی خط لکھا ہے اور اس خط کو پڑھ کر انھیں ناگواری محسوس ہوئی تو حاضرین دربار میں سے کسی

نے خوشامد میں کہہ دیا کہ آپ بھی حسینؑ کو ایسا خط لکھ دیجئے جو ان کی نظر میں خود ان کو سبک کردے تو امیر شام نے کہا کہ یہ تو تم نے کچھ صحیح مشورہ نہیں دیا اس لئے کہ جو کچھ میں انھیں لکھوں گا وہ اگر غلط ہے تو اس کے لکھنے پر سبک میں خود ہونگا اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو برائیاں پاؤں کہاں سے جو ان کے متعلق انھیں درج کروں۔

یہ حقیقت کا مقام وہ ہے جو متبدل نہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ اضافی نہیں ہے۔ اضافی کا مطلب یہ ہے کہ جیسے کسی عزیز کی نسبت انسان بڑا احسان کرنے والا ہے مگر غیر کی نسبت وہ احسان نہیں ہے تو وہ اچھائی اس کے لحاظ سے ہے مگر اس کے لحاظ سے نہیں اس کے برخلاف وہ اچھائی جو غیر اضافی ہو یہ ہے کہ ہر ایک کی بہ نسبت اور ہر ایک کے سامنے وہ قائم رہے۔

اسی کا نتیجہ تھا کہ جب یزید نے مطالبۂ بیعت کے لئے ولید بن عقبہ کے پاس خط لکھا تو اگرچہ ولید خود بھی بنی امیہ میں سے بلکہ آل ابوسفیان میں سے تھا یعنی یزید کا چچازاد بھائی تھا اور اس کی طرف سے مدینہ کا حاکم بھی تھا مگر اس نے بھی حسینؑ سے بیعت کے مطالبہ کو حق بجانب نہیں سمجھا اور جب مروان نے مشورہ دیا کہ بیعت نہ کریں تو ابھی سر قلم کردو تو وہ اس مشورہ پر عمل سے قاصر رہا اور جب مروان نے زجر و توبیخ کی کہ تم نے میرا کہا نہ مانا اب حسینؑ پر دسترس پانا مشکل ہے تو ولید نے یہ فقرے کسے جو طبری میں درج ہیں کہ میں عمل کیونکر کرتا۔ تم نے تو مجھے ایسی رائے دی جس پر میرے دین کی ہلاکت ہے۔ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ''بخدا جو شخص قتل حسینؑ کے جرم میں گرفتار ہوگا اس کے اعمال خیر کا پلہ روز قیامت انتہائی سبک ہوگا۔''

اسی طرح نعمان بن بشیر حاکم کوفہ، امام حسینؑ کے فرستادہ مسلم بن عقیل کے مقابلہ میں یزید کے منشا کی تکمیل سے قاصر رہا۔

یہ نتیجہ تھا اسی حقانیت کا جو حسینؑ میں ان کی مخالف جماعت کے بھی ذی شعور افراد کو محسوس ہوتی تھی۔ خود عمر سعد نے جو کربلا میں امام حسینؑ کے بالمقابل فوج کا افسر بنا کر بھیجا گیا تھا صاف صاف

اقرار کیا کہ امام حسینؑ کا طرز عمل امن پروری اور صلح کوشی پر مبنی ہے۔ نیز یہ کہ یزید سے بیعت کی توقع آپ سے بے جا ہے۔

یہ ''مقام شبیری'' وہی ثبات قدم ہے جس کی نظیریں ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ سب ہی کے یہاں نظر آئیں یہ اور بات ہے کہ ان کے مقابلہ میں مشکلات و مصائب اتنے نہیں آئے جتنے حسینؑ کے سامنے آ گئے۔ اس لئے حسینؑ کا موقف بلند تر نظر آتا ہے۔

حق پر ثبات کا نام اگر ''ضد'' ہے تو جتنے انبیاء تھے سب انتہائی ضدی تھے۔ ان انبیاء کا کیا ذکر خود خلاق عالم سے بڑھ کر ضدی کون ہوسکتا ہے کہ جو نبی آتا ہے قتل ہوجاتا ہے۔ جو رسول بھیجا جاتا ہے اس کی تکذیب ہوتی ہے اور طرح طرح سے ایذا رسانی کی جاتی ہے مگر وہ تھا کہ انبیاء بھیجے ہی چلا جاتا تھا اور ہادیان دین کا سلسلہ اس نے برابر قائم رکھا اور اعلان کر دیا کہ تم اللہ کے طریقہ میں تبدیلی اور انقلاب کبھی نہ پاؤ گے۔

باطل اس کے بالمقابل حق کو دبانے کی طرح طرح سے کوشش کیا کرتا ہے۔ اس کا بھی نصب العین ایک ہے یعنی حق کو دبانے کی کوشش کرنا جس کے کمال کا رمز شاعر نے ''کوفی و شامی'' کے الفاظ میں ادا کیا ہے۔ یہ ''کوفی و شامی'' نام ہے اہل باطل کا۔ ان کے انداز حق کو شکست دینے کی کوشش میں بدلتے رہتے ہیں۔ آتش نمرود، مظالم فرعون، یحییٰ کا سر قلم کیا جانا، زکریا کو آرے سے چیر ڈالنا، جرجیس کو کھولتے ہوئے تیل کے کڑھاؤ میں ڈال کر اُبالنا۔ پھر حضرت خاتم الانبیاء کو طرح طرح کی تکلیفیں پہنچانا۔ دیگر رہنمایان دین کے منھ کے سامنے زہر کے پیالے اور کبھی گردنوں پر کھنچی ہوئی تلواریں۔ یہ سب وہ کوفی و شامی انداز تھے جو موقف شبیری کے سامنے آتے ہیں جیسا کہ اقبال نے دوسری جگہ کہا ہے:

موسیٰ و فرعون و شبیر و یزید
این دو قوت از حیات آمد پدید

زندہ حق از قوت شبیری است
باطل آخر داغ حسرت میری است

حقیقت ناقابل تبدیل ہوتی ہے مگر باطل اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکتا کیونکہ حق کا اقرار ضمیر کے دباؤ سے اہل باطل کو اکثر اوقات کرنا ہی ہوتا ہے۔

رسولؐ کی امانتداری کا عملی اظہار مشرکین نے دشمنی کے باوجود اپنی امانتیں شب ہجرت تک رسولؐ کے پاس رکھوا کے کیا۔ یہ باطل کی طرف سے حق کی قوت کا اقرار تھا۔

حسینؑ کے حق پر ہونے کا بھی باطل والوں کو یقین تھا۔ ولید کوفی و شامی حکومت کا نمائندہ تھا مگر آپ نے دیکھا اس نے اقرار کیا کہ جو حسینؑ کو قتل کرے گا وہ روز قیامت ناکام و نامراد ہوگا۔

ابن سعد بھی اسی طاقت کا سرغنہ تھا مگر اسے حق سے متاثر ہو کر بار بار اپنا مرکز چھوڑنا پڑتا تھا۔ فوج شام کا حسینی جماعت کی مختصر تعداد کے سامنے فرار کیا تھا؟ اپنے مرکز سے بار بار تزلزل ہی تھا اور پھر حکومت اموی کے مقابلہ میں جمہور کی برہمی کیا تھی؟ حالانکہ دیکھئے تو جمہور سب ہی کوفی و شامی بن چکے تھے مگر ان پر یہ اثر بھی کمزور تھا۔ اس لئے ان میں سے بہت سے افراد میں مستقل تبدیلی پیدا ہوگئی۔

حسینؑ کی جنگ ہی یہی تھی۔ وہ باطل کی ذہنیت کو شکست دینے کے لئے آئے تھے چنانچہ اپنے ساتھ ایسے ہی سامان لائے تھے جو ضمیر انسانی کے شعور کو بیدار کر سکیں۔

حسینؑ کی آنکھوں کے سامنے ان کی فتح کے آثار نمودار تھے۔ حر کا فوج مخالف سے ادھر آجانا ان کی فتح کا ناقابل انکار ثبوت تھا۔

اور پھر جو کوفی و شامی محاذ کو دنیا طلبی کی زنجیروں کی وجہ سے بالکل نہ چھوڑ سکے ان کے بھی حالات سے ان کا تزلزل نمایاں تھا۔

قتل حسینؑ کے وقت متعدد اشقیاء کا تلواریں پھینک پھینک کر بھاگنا کیا تھا؟ شہادت حسینؑ کے بعد لوٹ کے وقت کسی شقی کا شاہزادی کے پاؤں سے خلخال اُتارنا مگر اس کے ساتھ روتے جانا کیا تھا؟

سب سے بڑا ذمہ دار یزید بدلا کہ نہیں؟ جنگ براہ راست کاہے کی تھی؟ طلب بیعت ہی تو تھی اور حسینؑ سے طلب بیعت بحیثیت شخص واحد تو نہ تھی بلکہ خاندان رسولؐ کے نمائندہ کی حیثیت سے تھی۔ مگر یہی حیثیت حسینؑ کے بعد زین العابدینؑ کو حاصل ہوگئی تھی اور وہ یزید کی طاقت باطل کے حصار میں اس کے دربار کے اندر موجود تھے۔ مگر یزید کو اب اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سید سجادؑ سے بیعت کا مطالبہ کرتا بلکہ حسینؑ کے کسی ایک بچہ سے یہ نہ کہہ سکا کہ بیعت کرلو۔

حسینؑ اور ان کے بعد ان کی اولاد اپنے موقف سے ذرہ بھر کبھی نہیں ہٹی اور یزید خود ہی اپنے مطالبہ پر اصرار سے مجبور ہوکر باز آ گیا۔ سچ کہا ہے اقبالؒ نے:

حقیقت ابدی ہے مقام شبیری
بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی وشامی

حسینؑ کا پیغام عالمِ انسانیت کے نام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

غور سے سنو! کربلا کے بے گناہ شہید کی آواز فضائے کائنات میں گونج رہی ہے۔

اے میرے خالق کی وسیع زمین کے بسنے والو! اے وسعت دنیا کے آباد کرنے والو! میں تمہیں تمہارے مختلف فرقہ وارانہ اور جماعتی ناموں سے نہیں پکارتا، اس لئے کہ میری وسیع انسانیت اور عظیم مظلومیت کے ساتھ ہمدردی میں تمہارے باہمی اختلافات کی کشمکش اسی طرح مٹ جاتی ہے جیسے بڑے سمندر کی ساکن سطح میں دریاؤں کا اضطراب اور آبشاروں کا خروش، میں تم سب کو دعوت دیتا ہوں تم معلوم کرو کہ میں کون تھا؟ کس مقصد کے لئے اٹھا اور میں نے اس کے لئے کیا کیا؟

سنو! میں کون ہوں؟

میں عرب کے سب سے معزز خاندان بنی ہاشم کا اپنے وقت میں بزرگ ترین فرد اور اس خاندان کی سب سے بڑی ہستی محمد مصطفیؐ کا اپنے زمانہ میں اکیلا یادگار تھا۔ تم نے اسلامی تعلیمات کو غور سے کبھی نہ دیکھا ہو، مگر تم نے مذہب اسلام کا نام ضرور سنا ہوگا۔ یہ خداوندی پیغام میرے نانا محمد مصطفیؐ کے ذریعہ سے دنیا کو پہنچا تھا۔ اس پیغام کے ذریعہ سے کائنات کو ایک خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرجھکانے کی تعلیم دی گئی تھی اور اپنے ہاتھ کے تراشے ہوئے بتوں کی پرستش کو مٹایا گیا تھا۔

یاد رکھو! یہ بت سونے چاندی پتھر ہی کے ہونا ضروری نہیں ہیں بلکہ گوشت پوست سے بنا ہوا انسان بھی صنم بن جاتا ہے جب وہ خداوندی پیغام اور اس کے اقتدار کے مقابلہ میں دنیا پر اپنی سطوت وہیبت کا سکہ جمانا چاہتا ہو اور دنیا کو اپنے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کرے۔

میرے ناناؐ نے اس راستہ میں بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ تمام ان کا قوم قبیلہ اور عرب کی تمام

جماعتیں ان کی مخالف ہوگئیں۔لوگ انھیں پتھر مارتے تھے، زخمی کرتے تھے، راستوں میں سر پر کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے اور طرح طرح سے تکلیفیں پہنچاتے تھے مگر میرے دادا ابوطالبؑ نے جو اس مقدس رسولؐ کے چچا تھے اپنے بھتیجے کی ہر طرح حمایت کی اور ان کو خطرات سے محفوظ رکھا۔میرے والد علی مرتضیٰؑ ابھی کمسن ہی تھے کہ انھوں نے اپنے بڑے بھائی محمد مصطفیٰؐ کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کرنا شروع کردیا۔میرے جدِ بزرگوار محمد مصطفیؐ کو اسلام کی اشاعت کے لئے اپنے وطن مکہ معظّمہ کو ترک کرنے پر آمادہ ہونا پڑا۔اس موقع پر دشمنوں کو یہ معلوم ہوا تو آپ کے قتل پر آمادہ ہوگئے اور اس ارادہ سے آپ کے مکان کو گھیر لیا۔یہ ایک یادگار واقعہ ہے کہ جب گھر کو خون کے پیاسے دشمن گھیرے ہوئے تھے اور حضرت رسولؐ خدا خاموش طریقہ سے مکہ سے روانہ ہوگئے تھے تو اپنے چچازاد بھائی میرے والد علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر اپنی چادر اُڑھا کر سلا گئے تھے اور وہ دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے اندر اپنی جان کو حفاظت رسولؐ میں سپر بنائے ہوئے ان کے بستر پر آرام کرتے رہے۔

مدینہ میں پہنچنے کے بعد بھی میرے نانا کو مخالفین نے اطمینان کی زندگی بسر کرنے نہیں دی۔ان پر متعدد مرتبہ بڑی بڑی فوجوں کے ساتھ چڑھائی کی۔تم نے اس سلسلہ میں بدر واحد وخندق وخیبر اور حنین کا تذکرہ ضرور سنا ہوگا یہ تمام لڑائیاں وہ تھیں جن میں مخالف طاقتوں نے ایکا کرکے میرے ناناؐ کے مشن کو شکست دینا چاہی تھی مگر وہ سچائی کی طاقت اور میرے باپ علیؑ مرتضیٰ کی تلوار تھی جس نے ان تمام موقعوں پر پیغمبرؐ کو فتح عطا کی۔جب تک دنیا کی تاریخ میں اسلام کا نام باقی ہے، میرے نانا محمد مصطفیٰؐ اور میرے باپ علیؑ مرتضیٰ کی یاد قائم رہے گی۔

دنیا میں انسانیت کی جتنی خوبیاں ہیں، سب میرے ناناؐ نے عرب میں اپنی تعلیم کے ذریعہ سے شائع کیں۔تم کو معلوم ہے کہ دنیا میں ہمیشہ طاقتور لوگ کمزوروں کو ذلّت کی نگاہ سے دیکھتے رہے اور انسانی مشترک حقوق میں بھی تفریق قرار دے دی، مگر میرے ناناؐ نے انتہائی پرزور آواز مساوات

کی بلند کی اور عملی طور پر ہر جماعت کے معیار کو اونچا کیا۔تمہیں معلوم ہوگا کہ میرے ناناؐ کی مسجد کا موذن ایک سیاہ رنگ حبشی بلال تھا جس کی وہ اتنی عزت کرتے تھے جتنی بڑے بڑے ذی عزت خاندانوں کے لوگوں کی بھی نہ کرتے ہوں گے۔

میرے ناناؐ کی ایک اکلوتی بیٹی میری ماں فاطمہ زہراءؑ تھیں جنھیں آپ انتہا درجہ عزیز رکھتے تھے اور جب آپ کے پاس آتی تھیں تو تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے۔ان کی شادی آپ نے اپنے چچازاد بھائی علیؑ مرتضیٰ کے ساتھ کی مگر دنیاوی حیثیت سے میری ماں کی حالت یہ تھی کہ ایک مدت تک آپ کے پاس کوئی عورت گھر کے کاروبار کے لئے نہ تھی۔خود ہی چکی پیستی تھیں اور خود ہی چرخہ کاتتی تھیں کھانا پکاتی تھیں اور گھر میں جھاڑو دیتی تھیں۔میرے ناناؐ نے اپنی اس پیاری بیٹی کو ایک کنیز عطا کی تھی جس کا نام فضہ تھا تو یہ ہدایت کردی کہ پورا کام برابر فضہ سے نہ لینا بلکہ ایک دن گھر کا کاروبار تم کرنا اور ایک دن فضہ سے کام لینا یہ وہ مساوات کی تعلیم ہے جسے دنیا کو یاد رکھنا چاہئے۔

اپنے ماں باپ کے ہم دونوں بھائی حسن مجتبیٰؑ اور میں بڑے محبوب فرزند تھے۔ہمارے ناناؐ ہم سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ہم سے بچوں کی طرح کھیلتے تھے، مسجد میں خطبہ پڑھتے میں ہم کو گود میں اٹھا لیتے تھے اور سب کو پہچنواتے تھے کہ یہ دیکھو یہ دونوں میرے نواسے مجھ کو بہت عزیز ہیں، تم سب بھی ہمیشہ ان کا خیال رکھنا۔حضرت کبھی ہمارا رونا گوارا نہیں کرتے تھے اور اگر اس بچپنے کے عالم میں کبھی ہم سجدہ کی حالت میں آپ کی پشت پر آکر بیٹھ جاتے تھے تو ہم کو اس وقت تک اتارتے نہ تھے جب تک کہ ہم خود سے نہ اتر جائیں۔آپ نے ہم دونوں بھائیوں کی نسبت یہ بھی فرمایا کہ یہ ”حسنؑ اور حسینؑ سردار ہیں جوانانِ اہل جنت کے“۔کبھی ہمیں اپنا گلدستہ کہا اور کبھی عرش کا زیور۔ہمیں اپنے ناناؐ کے زمانہ میں جو مسرت اور اطمینان حاصل تھا وہ پھر کبھی خواب میں بھی نظر نہیں آیا۔

ہماری سب سے پہلی مصیبت

ہم دونوں بھائی مہر و محبت کی ایک بے پایاں فضا میں زندگی بسر کررہے تھے کہ دفعتاً ہمارے

جد بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰؐ بیمار ہو گئے۔ میرا سن اگرچہ اس وقت کم تھا لیکن میں بھی اتنا اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ ناناؐ کی بیماری کے زمانہ ہی سے ہمارے لئے فضا ناخوشگوار پیدا ہونے لگی۔ ہمارے نانا برابر زبانی اپنے اہلبیتؑ کے لئے تمام مسلمانوں کو وصیت کرتے رہتے تھے۔ آپ نے اپنی بیماری کے زمانہ میں چاہا کہ اس وصیت کو تحریری صورت سے مکمل کر دیں مگر لوگوں نے آپ کو اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا اور تحریر لکھنے نہ دی ہم کو اس وقت یہی واقعہ سمجھا دینے کے لئے کافی تھا کہ فضا کیا ہے اور صورت حال کیا ہونے والی ہے؟

میرے ناناؐ کے بعد

جد بزرگوار حضرت محمد مصطفیٰؐ کی وفات کے بعد میرے باپ علیؑ مرتضیٰؑ اور مادر گرامی فاطمہ زہراؑ کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑیں انتہا یہ ہے کہ میری ماں یہ شعر پڑھتی تھیں:

صُبَّتْ عَلَيَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّهَا
صُبَّتْ عَلَى الْاَيَّامِ صِرْنَ لَيَالِيَا

(یعنی میرے اوپر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو شبِ تار ہو جاتے)

آخر میری والدہ نے اسی حسرت والم اور غم و یاس کے عالم میں دنیا سے سفر کیا۔

یہ میرے لئے دوسری مصیبت تھی

میرے والد بزرگوار کی طرف عام افراد کی جتنی توجہ دختر رسولؐ کی حیات میں تھی اتنی بھی بعد کو باقی نہیں رہی۔ یقیناً اگر میرے والد اس وقت اس مذہب اسلام کے مفاد کو ملحوظ نہ رکھتے جس کے لئے آپ رسولؐ کی زندگی میں اپنا خون پسینہ ایک کر چکے تھے تو اس وقت مسلمانوں میں ایک بہت بڑی خانہ جنگی برپا ہو جاتی مگر میرے پدر بزرگوار نے دنیاوی سلطنت کی طرف سے بالکل سیر چشمی اور بے توجہی سے کام لیا۔ آپ نے اپنے حقوق کے زبانی اظہار پر اکتفا کر کے عملی مخالفت سے علیحدگی اختیار کی اور اس طرح اسلام کو ایک بڑی بربادی سے بچا لیا۔

یہ میرے لئے سلطنت دنیا سے بے اعتنائی کا ایک بڑا نمونہ تھا۔ تین دور اسی طرح گذر گئے۔ چوتھی مرتبہ لوگوں نے میرے والد علیؑ مرتضیٰ کو مجبور کیا کہ وہ حکومت کی ذمہ داریوں کو اپنے متعلق کریں۔ میں نے دیکھا کہ وہ جناب باوجود اس بات کے کہ اس کے پہلے ہمیشہ اپنے حق کا اعلان کرتے رہے تھے، اس وقت باوجود لوگوں کے اصرار کے انتہائی انکار کر رہے تھے اور کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس کا باعث یقیناً یہ تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور خلافت کے بارے میں زاویۂ نگاہ ہی میں تبدیلی ہو گئی تھی۔ خلافت رسولؐ بالکل حکومت دنیا اور سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت وقیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس سادگی اور بے تصنع کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے دنیا میں میرے ناناؐ نے پھیلایا تھا اور جس پر میرے باپ قائم تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ میں نے دیکھا جب انتہائی اور حد سے گذرے ہوئے اصرار پر میرے والد تخت سلطنت پر بیٹھے تو دنیا آپ کے احکام کی پابندی اور آپ کے تعلیمات کی پیروی کے قابل ثابت نہیں ہوئی۔ آپ کی مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور آخر مسجد میں حالت نماز میں آپ کے سر پر زہر آلود تلوار لگائی گئی اور آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔

یہ بڑا تلخ تجربہ تھا جو مجھ کو عینی مشاہدہ کی صورت میں حکومت وسلطنت سے متنفر بنانے کے لئے کافی تھا۔

شام کی سلطنت پر میرے پورے خاندان بنی ہاشم کے دشمن بنی امیہ کا قبضہ تھا۔ اسی خاندان کا ایک شخص معاویہ بن ابوسفیان دمشق کے تخت پر فرماں روا تھا۔ اسی خاندان کے ہاتھوں میرے ناناؐ کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں۔ معاویہ کی ماں ہندہ وہ تھی جس نے رسولؐ کے چچا جناب حمزہؓ کی لاش چاک کرائی تھی اور ان کا جگر منھ میں لے کر چبانا چاہا تھا۔ میرے والد سے بھی معاویہ برسر پیکار ہوئے۔ اب والد بزرگوار کی شہادت کے بعد میرے بڑے بھائی حسنؑ مجتبیٰ سردار خلق ہوئے۔ حسنؑ

نے دیکھا کہ انتہائی خونریزی کے ساتھ بھی حالات کے اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے، اس لئے آپ نے مخصوص شرائط کے ساتھ امیر شام کے ساتھ مصالحت کر لینا پسند کیا۔

ان شرائط مصالحت میں سب سے اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی دوسرے شخص کو خلافت کے لئے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔ بلکہ خلافت بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔

اس صلح کے ساتھ مجھے بھی پورا اتفاق تھا۔ ہمارے جد بزرگوار اور ہمارے ناناؐ کی تعلیم یہی تھی کہ جب تک حمایت باطل کی ذمہ داری اپنے او پر نہ آتی ہو اس وقت تک صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہے اور رواداری سے کام لینا مناسب ہے۔

ہمارے ناناؐ نے ''حدیبیہ'' میں کفار قریش کے ساتھ اسی اصول پر صلح کی اور ہمارے والد بزرگوار نے صفین میں اہل شام کے ساتھ مصالحت اختیار کی۔ یہی اصول بھائی حسنؑ کے پیش نظر تھا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی میرے بھائی امام حسنؑ کو اطمینانی زندگی بسر کرنے نہیں دی گئی اور آخر ایک مخفی سازش کے ساتھ زہر دلوا کر ان کی زندگی کو ختم کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد بھی جب تک کوئی واضح سبب نہ ہوتا، مجھے کسی اقدام کا موقع نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد دس برس تک میں بالکل خاموش رہا۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ جوانی کا دور جو عام انسانی حیثیت سے جوش اور ولولہ کا عہد ہوتا ہے، جس میں انسانی افعال زیادہ تر ہنگامی جذبات کے ماتحت ظاہر ہوتے ہیں، یہ پورا دور میرا اس خاموشی اور متحمل فضا میں گزرا جو میرے والد علی ابن ابی طالبؑ کو ان کی گوشہ نشینی کے دور میں حاصل تھی۔

میری طبیعت میں صبر وتحمل اور ناگوار مشکلات کا برداشت کرنا بالکل راسخ ہو گیا تھا۔ اگر امام حسنؑ کی صلح میرے مذاق طبیعت کے خلاف ہوتی یا ان کے دباؤ سے میں نے اس صورت کو گوارا کر لیا ہوتا تو ان کی وفات کے بعد کافی موقع تھا کہ میں حالات میں انقلاب پیدا کرتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور دس برس کی طویل مدت اس کے بعد بھی گزار دی۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ میری عمر ساٹھ

برس کے قریب ہو چکی تھی اور یہ دور کسی جوش وخروش اور امنگ و ولولہ کا نہیں ہوتا۔ نہ تم کو یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ مجھے حکومت وسلطنت کی کوئی ہوس تھی، جب کہ میری سابقہ زندگی کے خود حالات اور میری نفسی ساخت کے مشاہدات اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

پھر کیا تھا؟

امیر شام معاویہ نے ان تمام شرائط کی خلاف ورزی کی جو اس صلح نامے میں طے پائے تھے۔ میرے باپ کے شیعوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کیا۔ یہ صورت حال خود ہی نا قابل برداشت تھی۔ اس لئے کہ میرے والد بزرگوار بھی یہ فرما چکے تھے کہ میں زیادتیوں کو اس وقت تک برداشت کر سکتا ہوں جب تک وہ صرف میری ذات سے متعلق ہوں اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہ ہو، لیکن اب یہ حالت تھی کہ ہمارا نام لینے والے دوسرے مسلمان تکلیفوں میں مبتلا کئے جا رہے تھے۔ حجر بن عدی اور ان کے ساتھی دمشق میں سولی پر چڑھائے گئے عمرو بن الحمق الخزاعی کا سرتن سے جدا کر کے نیزہ پر چڑھایا گیا۔ یقیناً یہ حالات میرے لئے انتہائی تحمل شکن تھے، مگر اتنے سنگین واقعات کے باوجود میں نے احتجاج پر اکتفا کی اور معاویہ کو خط لکھا کہ شاید اتنے ہی سے صورت حال کی اصلاح ہو جائے۔ یہ اس لئے کہ تم کبھی میرے او پر جلد بازی اور انتہا پسندی کا الزام عائد نہ کرو۔

مجھے خبریں پہنچتی تھیں کہ میرے باپ کو منبروں پر گالیاں دی جاتی ہیں۔ اس کے لئے ہم نے اور ہمارے بھائی نے اتنے ہی پر اکتفا کی کہ ہمارے سامنے ایسا نہیں ہوتا، اس سے بڑھ کر صلح پسندی اور رواداری کیا ہو سکتی تھی۔

مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ احکام شرعی میں تراش وخراش شروع ہو گئی ہے اور مذہب کے مقرر کردہ رسوم کو توڑا جا رہا ہے مثلاً اسلامی ملک میں شراب کی درآمد آزادی سے ہونے لگی اور اس پر کوئی ٹوکتا ہے تو اعتنا نہیں کی جاتی۔

ممکن تھا کہ یہ صورتیں بھی انفرادی معصیت قرار دے کر سکوت اختیار کیا جاتابی ان اسلام کے بڑے بڑے احکام کی پابندی کو غنیمت سمجھ کر جو ظاہری طور پر ضروری سمجھی جاتی تھی، لیکن معاویہ نے سب سے آخر میں اپنے فرزند یزید کو جانشین بنانا ضروری سمجھا اور تمام مسلمانوں سے بہ جبر وقہر اس شخص کی بیعت لی گئی۔

یزید لعنۃ کون تھا؟

یزید معاویہ کا بیٹا تھا، جو ایک صحرائی عرب عورت سے پیدا ہوا تھا۔ یہ انتہائی فاسق وفاجر اور بدکار تھا۔ وہ نماز کو ترک کرتا تھا اور شراب علانیہ پیتا تھا۔ زنا کاری اور لہوولعب میں منہمک رہتا تھا اور انتہا ہے کہ نفسانی خواہشوں کے حاصل کرنے کے لئے ماں اور بہن کی تمیز سے بھی اسے سروکار نہ تھا۔

وہ خلیفۂ رسولؐ کی حیثیت سے برسر اقتدار ہوجاتا تو مسلمانوں میں شریعت اسلام کا کوئی وقار اور اعزاز باقی نہ رہ سکتا تھا۔ ایسے شخص کو برسر اقتدار لایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ مجھ سے اس کی بیعت کی خواہش کی جارہی تھی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اپنی جانب سے خود بھی اس کو جانشین رسولؐ تسلیم کرلوں اور اس طرح اس کی تمام سیاہ کاریوں کے جائز ہونے کی ذمہ داری لے لوں۔

میں نے اس کو گوارہ نہیں کیا۔ تم ممکن ہے، پہلے کے واقعات سے میری حیثیت کا اس بارے میں اندازہ کرسکتے ہو۔ میں رسولؐ کے خاندان کا نمائندہ تھا۔ میں منصبی طور پر شریعت اسلام کا ترجمان تھا۔ اور چونکہ میرا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت بالکل ایک تھا یعنی وہی رسولؐ کا سینہ جو وحی کے اترنے کی جگہ تھی۔ میرے نشست وخواب کی منزل تھی۔ میری نگاہ میں احکام اسلام کی جو اہمیت ہوسکتی تھی کسی دوسرے کی نگاہ میں نہیں ہوسکتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہی بت پرستی جسے میرے ناناؐ نے جزیرہ نمائے عرب سے مٹانے کی کوشش کی تھی آج وہ انسانی اقتدار کے لباس میں شریعت خداوندی اور مذہب توحید کو فنا کررہی تھی۔ میں نے صاف انکار کردیا تھا کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا مجھے معلوم تھا کہ اس صورت میں میرے

لئے کیا ہوگا مگر میں اس کے لئے بالکل تیار تھا۔

یزید کی خلافت

معاویہ نے میرے معاملے میں سکوت سے کام لیا۔ مگر معاویہ کا انتقال ہوا اور یزید تخت سلطنت پر متمکن ہوگیا۔ اس کی نخوت اور جباریت کے لئے میرا وجود نہایت ناگوار تھا اس لئے کہ میں نے اس کی بیعت نہیں کی تھی اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا خط لکھا کہ ”حسین سے بیعت ضرور لو، ورنہ ان کا سر قلم کرکے میرے پاس بھیجو۔“ مجھے اس پیغام سے بالکل تعجب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ میں اسے پہلے سے سمجھے ہوئے تھا۔ بیعت میرے لئے ایک بالکل غیر ممکن چیز تھی۔ سر کا قلم ہونا بیشک آسان تھا مگر اس حفاظت خود اختیاری کے فرض کو انجام دینے کے بعد، جو میرے نانا کی شریعت کا ایک بنیادی حکم ہے۔

میں نے اس فرض کے انجام دینے کے لئے اپنے وطن کو خیر باد کہنے کا تہیہ کرلیا۔

وطن سے جدائی

میں براہ راست کسی سے لڑنے نہیں جارہا تھا۔ اس لئے میں نے اپنے تمام گھر بھر کو (جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے) اپنے ساتھ لیا میرے خاص الخاص عزیز، بھائی بھتیجے، بیٹے میرے ساتھ تھے میں نے مدینہ سے ان کے علاوہ کچھ بھی اعوان وانصار کو اپنے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی اسی سے تم میرا مقصد سمجھ سکتے ہو۔

خانۂ خدا میں پناہ

میں نے رسولؐ کے حرم کی جدائی کے بعد خدا کے حرم سے بہتر کوئی جگہ نہیں پائی۔ اس لئے میں نے مکہ معظّمہ میں جا کر قیام کیا۔ میں نے یہاں بھی فوج ولشکر کی جمع آوری کی فکر نہیں کی۔ ممکن تھا کہ مجھے یہاں خاموشی کی زندگی بسر کرنے دی جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں سچ کہتا ہوں کہ میں اگر حج کو ترک کرکے مکہ سے باہر نہ چلا جاتا تو خانۂ کعبہ کے پاس میرے خون کی بارش ہوتی۔ مگر مجھے یہ کسی

طرح گوارا نہ تھا کہ خانۂ خدا کی حرمت میرے قیام کی وجہ سے برباد ہو۔

عراق کی طرف روانگی

میں مکہ سے نکل کھڑا ہوا۔ اب میں کدھر جاتا؟ عراق کے لوگ مجھے بلا رہے تھے اور میں اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ کو وہاں کے حالات کے مشاہدے کے لئے بھیج بھی چکا تھا۔ انھوں نے مجھے یہ اطلاع بھی بھیجی تھی کہ یہاں کے لوگ آپ کے مذہبی ہدایات کی اطاعت کے لئے تیار ہیں۔ بیشک مجھے وہیں جانا چاہئے تھا۔ میں روانہ ہوا مگر اس دوران میں کوفہ میں میرے دشمنوں کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور وہاں کی فضا بالکل میرے خلاف ہو گئی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ کوفہ میں میرے سچے ماننے والوں نے جو میرے بلانے کے اصلی محرک تھے کوئی غداری نہیں کی، انھیں خود ایسے خلاف امید سخت حالات سے دوچار ہونا پڑا کہ وہ مجبور ہو گئے مگر پھر بھی انھوں نے میرے ساتھ وفاداری کی حد کر دی کہ باوجود انتہائی سخت حراست اور ناکوں کی حفاظت کے یہ لوگ کوفہ سے نکل کر مجھ تک پہنچ گئے اور میری خاطر اپنی جان نثار کی۔

میرا عزیز قاصد میرا بھائی مسلمؑ بن عقیل کوفہ میں قتل کر ڈالا گیا، اس نے اکیلے وہ کارنمایاں انجام دیا جس کا لازوال نقش میرے دل پر قائم ہے۔ مجھے اب کوفہ میں کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ مگر مجھے مکہ اور مدینے جانا بھی ممکن نہ تھا۔ میں نے جنگ کا اپنی جانب سے نہ ارادہ کیا تھا۔ نہ کوئی سامان، میرے ساتھ میرے ہی خاص لوگ تھے۔ اس صورت میں کوئی وجہ نہ تھی کہ میرے خلاف جنگجویانہ طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ میں نے وہ خط جو اہل کوفہ کو لکھا تھا اس میں بھی صاف لکھ دیا تھا کہ امام کے معنی ہیں بس وہ جو حق پر عمل کرے اور احکام خدا پر قائم رہے اور سنت رسولؐ کی پابندی کرے۔ میں سلطنت وحکومت کے لئے دنیا کے امن وامان کو خاک میں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ اس کا میں نے اپنے طرزِ عمل سے پورا اظہار کر دیا تھا۔ لیکن کوفہ سے میرے گرفتار کرنے کو فوجیں بھیجی گئیں۔ میں نے اس مخالف لشکر کے آنے کے وقت اپنی طرف سے یہ خوش گوار طرزِ عمل اختیار کیا

کہ اس فوج کو جو اس وقت بہت پیاسی تھی کوشش کے ساتھ سیراب کرا دیا۔ مجھے انسانی ہمدردی اس وقت تمام دوسرے خیالات پر غالب تھی۔ میں تمام دنیا سے اسی کا طالب بھی ہوں کہ وہ اپنے درمیان ہزاروں خیالی اختلافات کے باوجود انسانی ہمدردی کو کبھی نظر انداز نہ کرے، اور اس میں کسی تنگ نظری سے کام نہ لے۔

مجھے اس کا صلہ کوئی مدنظر نہ تھا۔ اور نہ میں اس کا معاوضہ چاہتا تھا لیکن انسانیت کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اسی فوج کی جانب سے عاشور کے دن اور اس کے دو دن پہلے سے مجھ پر اور میرے عزیزوں، بلکہ چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی پانی بند کر دیا جائے۔

بہر حال میں اس فوج کی حراست میں جو کوفہ سے آئی تھی، کربلا کی سرزمین پر پہنچ گیا۔

کربلا پہنچنے کے بعد

مجھے دوسرے ہی دن سے ہزاروں سواروں کے دستے پے در پے آتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ فوجوں سے وہ تمام میدان چھلکنے لگا۔ میرے ساتھ میرے سترہ اٹھارہ عزیز تھے اور بس وہ میرے دوست تھے جو کوفہ یا بعض دوسرے مقامات سے میرے پہنچنے کی خبر سن کر کسی طرح مجھ تک پہنچ گئے تھے۔ ان کی تعداد سو سے کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مجھے حفاظت خود اختیاری کا اصول بہر حال پیش نظر تھا مگر اس شرط سے کہ میرا اہم ترین مذہبی مسلک قربان نہ ہو۔ میں نے ایسی صورتیں اختیار کیں کہ معاملات رو بہ اصلاح ہو جائیں اور جنگ کی صورت نمودار نہ ہو۔ میرا طریقۂ کار اتنا سلجھا ہوا تھا کہ خود یزیدی فوج کا افسر عمر سعد بھی اس بات کا قائل ہو گیا کہ میں صلح کے راستہ پر گامزن ہوں۔ اس نے حاکم کوفہ ابن زیاد کو اس مضمون کا خط بھی بھیجا مگر ابن زیاد کو حکومت کا غرور اور سلطنت کا نشہ تھا۔ اس نے مجھے پہچانا بھی نہ تھا کہ میں مشکلات کو کہاں تک برداشت کر سکتا ہوں۔ اس نے میری صلح پسندی کو کمزوری کا نتیجہ خیال کیا تھا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ حسینؑ کو یزید کی بیعت کر لینا چاہئے۔ یہی صورت صلح کی ہے میرے سامنے یہ وہی سب سے پہلا سوال تھا جواب

آخر میں بھی پیش تھا اور یہ طے شدہ بات تھی کہ مجھے یزید کی بیعت ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ صلح کا تجربہ میرے بھائی حسن مجتبیٰؑ اور میرے ابتدائی دور سے اس وقت تک ہو چکا تھا، اب اس طرح کی صلح کا کوئی امکان نہ تھا، جس کا نتیجہ میری نہیں بلکہ میرے اصول، مسلک اور دیانت وامانت کی فنا ہو۔ میرے سامنے فوجوں کا سمندر لہریں مار رہا تھا، میرے گردو پیش ویرانی اور بربادی کے سوا کچھ اور نظر نہ آتا تھا۔ میرے عزیز بھائی بھتیجے اور اولاد کے خوبصورت چہرے موجود تھے اور میرے ساتھ پردہ دار عورتیں تھیں اور چھوٹے بچے بھی موجود تھے دریا پر فوج کا پہرہ بیٹھ گیا تھا اور ایک قطرہ پانی ہم تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ اور میں چھوٹے بچوں کو پیاس کی شدت سے بیتاب اور مضطرب دیکھ رہا تھا۔ یہ تمام وہ اسباب تھے جو مجھے یزید کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر ان سب کے مقابل میں اس تعلیم کا خیال تھا جو میرے ناناؐ کی پھیلائی ہوئی تھی۔ میرے بیعت کر لینے سے وہ تعلیم یقیناً فنا ہو جاتی، میرا ارادہ پہلے ہی سے مضبوط تھا مگر عملی طور پر جتنے مشکلات بڑھتے جاتے تھے، میری ہمت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

نویں محرم کی شام تھی۔ جب اس عظیم لشکر نے ہم پر حملہ بھی کر دیا۔ مگر میں نے ایک شب کی مہلت لے لی۔ یہ میں نے کسی دنیوی مقصد سے مہلت نہیں حاصل کی تھی، بلکہ ایک طرف تو مجھے ایک آخری مرتبہ اپنے خدا کی عبادت میں پوری رات بسر کر لینا تھی اور دوسری طرف میں یہ چاہتا تھا کہ اپنے ساتھیوں میں سے جو لوگ میرا ساتھ چھوڑ کے جانا چاہیں انھیں جانے کا موقع دے دوں، کیونکہ میں کسی کو ہنگامی طور پر بے سوچے سمجھے اپنے ساتھ جان دینے پر مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ان کو صاف طور سے یہ اجازت دے دی کہ وہ میرا ساتھ

چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر کیا کہنا ان جانبازوں کی وفاداری اور فرض شناسی کا جنھوں نے میری پیش کردہ رعایت سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اور یک زبان ہو کر کہا کہ ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے، مجھے دنیا کے سامنے مثال میں اپنے ان اصحابؓ کو پیش کرنا تھا۔ مجھے دنیا کے رہنماؤں کو

نمونہ دکھلانا تھا۔ یہ بالکل غلط اصول ہے کہ انسان کسی سخت اقدام کے لئے ترغیب وتحریص کر کے دوسروں کو آمادہ کرے، اور اس سے مقصود یہ ہو کہ یہ لوگ ایک حد تک ہماری سپر قرار پائیں۔ ان لوگوں نے جو کچھ کہا تھا وہی کر دکھایا۔ دسویں محرم کی صبح سے دوپہر کے بعد تک یہ میرے جانثار برابر اپنی جانیں اس اصول کی حمایت میں جس پر میں قائم تھا، فدا کرتے رہے۔ یہ ایک حیرت انگیز وفاداری کی مثال سمجھی جانا چاہئے کہ جب تک ان میں ایک بھی باقی رہا۔ میرے کسی عزیز کسی جوان یا کم سن بچے تک کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ جب یہ میرے مجاہد دنیا سے رخصت ہو گئے اب میں تھا اور میرے عزیز۔ میرے لئے یہ بہت آسان تھا کہ میں خود آگے بڑھ کر اپنا سرتن سے جدا کرا دوں، مگر مجھے تو اپنی قوت برداشت کا پورا امتحان دینا تھا۔ چنانچہ میرے عزیز مجھ سے جدا ہونے لگے۔ میں ان میں سے کس کو پہلے موت کے منہ میں جانے کی اجازت دیتا؟ ان میں میرے بھائی امام حسنؑ کی نشانی تھی۔ میرے باپ کی یادگاریں تھیں۔ میں نے یہ مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اپنے انتہائی عزیز فرزند علی اکبرؑ کو جو شبیہہ رسولؐ بھی تھا مرنے کے لئے بھیج دوں۔ یقیناً یہ مرحلہ میرے لئے سخت تھا۔ مگر جب میں نے اس مشکل کو طے کر لیا تو اندازہ نہیں کیا جا سکتا کہ مجھے کتنی کامیابی کا احساس ہو رہا تھا۔ اب میرے دوسرے عزیزوں کی باری تھی۔ میرا بھتیجا قاسم بن الحسنؑ رخصت ہوا اور دوسرے عزیز بھی یوں ہی ایک ایک کر کے موت کی نیند سو گئے۔ سب سے آخر میں میرا جانباز بھائی ابوالفضل العباسؑ مجھ سے رخصت ہوا۔ میں اس کی جدائی کو کسی طرح گوارا نہ کر رہا تھا۔ اس لئے کہ میرا علم اسی کے ہاتھ میں تھا۔ اور میری فوج کا نشان اس کے دم سے قائم تھا۔ مگر جب کوئی اور نہ رہا تو آخر عباسؑ بھی جنگ کر کے دنیا سے سدھارے۔ میری کمر اس غم سے شکستہ ضرور ہو گئی۔ مگر میری طاقتِ عمل میں کمی پیدا نہیں ہوئی۔ اب میری خود باری تھی۔ میں نے تلوار کھینچی۔ اس حد تک مجھے مقابلہ ضرور کرنا تھا جتنی کہ مجھ میں انسانی طاقت موجود تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان تمام صدموں کے باوجود، ان سب مصائب اٹھانے کے بعد بھی میں نے میدان جنگ میں اپنے بزرگوں کی یاد

فراموش نہیں ہونے دی۔ بہر حال ہزاروں آدمیوں سے میں نے تنہا مقابلہ کیا۔ اس میں مجھے جتنا زخمی ہونا چاہئے تھا اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔ آخر وہ انتہائی مرحلہ جو میرے لئے پہلے ہی آسان تھا وہ بھی آسان ہو گیا میں گھوڑے سے زمین پر گرا اور شمر کے خنجر سے راز و نیاز کے بعد میرے سر و گردن کا باہمی اتصال جدا ہوا۔ میرا سر قلم ہو گیا۔ اور نیزہ پر بلند کیا گیا۔ ابن زیاد کی فوج نے وہ سب کچھ کیا جو ایک ظالم کے ظلم کی آخری حد ہو سکتی ہے۔ مگر اس سب کے بعد فتح کس کو ہوئی؟ اور شکست کس کو؟

میں پشیمان نہیں ہوں اور نہ اپنے عمل سے منفعل۔ مگر دنیا کو معلوم ہے کہ یزید پشیمان ہوا اور انتہائی شرمندہ، اس کی زندگی موت بن گئی۔ اور میری موت حیات لازوال۔ مجھے تم کو پیغام بھی یہی دینا ہے کہ کسی شریف اور مقدس مقصد کے لئے دنیاوی مشکلات کی کبھی پروا نہ کرنا۔ تمہاری انسانیت کا جوہر یہی ہے۔

تم جو میری یادگاریں قائم کرتے ہو اور یاد تازہ کرتے ہو، ان کا حاصل یہی ہونا چاہئے کہ تم میرے مقصد کی بلندی سے بھی روشناس ہو، اور عملاً اس کی پیروی کی کوشش کرو۔ میں، یاد رکھو، کسی خاص جماعت سے مخصوص تعلق نہیں رکھتا ہوں۔ جو میرے اصول اور میرے مسلک پر غور کرے اور اس سے سبق حاصل کرے وہی مجھ سے بہترین فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

(محرم الحرام ۱۳۹۱ھ)

مظلومِ کربلا

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطاہرین۔

کون ہے جس نے محرم میں حسینؑ حسینؑ کی آواز نہ سنی ہوگی۔

اکثر آپ نے اس آواز کے ساتھ کچھ لوگوں کو سر برہنہ نوحہ پڑھتے اور ماتم کرتے بھی دیکھا ہوگا اور شاید آپ نے رونے کی صدائیں بھی سنی ہوں۔

انسانی ہمدردی کی بنا پر ضرور آپ کے دل میں ہمدردی کا احساس پیدا ہوا ہوگا اور آپ نے خیال کیا ہوگا کہ یہ حسینؑ کون تھے جن پر آج تک اس طرح ماتم ہوتا ہے۔ تھوڑا وقت مجھے عاریت دے کر اس مختصر کتاب کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حسینؑ کون تھے ان کا مقصد کیا تھا اور اس مقصد کے سلسلہ میں انھوں نے کیا راستہ اختیار کیا اور اس کا نتیجہ کیا ہوا۔

نسبی خصوصیات

ملک عرب میں مکہ کی سرزمین پر بنی ہاشم کا خاندان ایک ممتاز درجہ رکھتا تھا اس خاندان میں عبد المطلب سب سے بڑے سردار تھے ان کے دو بیٹے تھے: عبداللہ اور ابوطالب۔ عبداللہ کے فرزند حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جو مذہب اسلام کے بانی اور مسلمانوں کے پیغمبر ہیں اور ابوطالبؑ کے فرزند علیؑ تھے جو حضرت محمدؐ کے بڑے مددگار اور جاں نثار تھے جو متفقہ طور پر رسول کے بعد مسلمانوں کے ایک پیشوا اور رسولؐ کے ایک جانشین تھے۔ حضرت محمدؐ کے ایک بیٹی تھی فاطمہ

زہراؑ جن کی وہ بڑی عزت کرتے تھے۔ اس بیٹی کا عقد حضرت محمدؐ نے علیؑ کے ساتھ کیا تھا جنھیں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں میں سب سے زیادہ چاہتے تھے اور فاطمہؑ سے دو بیٹے پیدا ہوئے بڑے کا نام حسنؑ تھا جو علیؑ کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور چھوٹے کا نام حسینؑ تھا جن کا نام آپ آج تک سنا کرتے ہیں۔

پیدائش

حضرت محمد مصطفیٰؐ اپنے گھرانے سمیت مکہ کی سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ آئے اور یہیں بس گئے۔ ہجرت اسی کا نام ہے۔ اس ہجرت کے تیسرے برس حسینؑ دنیا میں آئے۔ آپ کی پیدائش سے آپ کے نانا رسولؐ اللہ باپ علیؑ مرتضیٰ ماں فاطمہ زہراؑ سب کو بڑی خوشی ہوئی اور خاندان میں یہ ایک قابل شکر یہ اضافہ سمجھا گیا۔

بچپنا

حسینؑ نے سات برس تک اپنے نانا رسولؐ اللہ کی پرورش کا لطف حاصل کیا۔ رسولؐ کو اس اپنے چھوٹے نواسے سے بڑی محبت تھی۔ ایسی خوشی اور دل جوئی کے دن پھر حسینؑ کو اپنی تمام عمر نصیب نہیں ہوئے۔

نانا کے بعد

حسینؑ سات برس کے تھے کہ جب ان کے نانا کا انتقال ہوگیا۔ یہ مصیبت تمام خاندان کے لئے ایک بڑی مصیبت تھی۔ حسینؑ نے پہلے دن ہی محسوس کیا کہ وہ، ان کے بھائی اور ان کے ماں باپ اب لوگوں کی نگاہ میں وہ عزت نہیں رکھتے جو اس کے پہلے تھی۔ بہر حال انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ان کے باپ نے اس بلند مقصد کی خاطر جس کے رسولؐ اللہ حامل تھے اور مسلمانوں میں یک جہتی قائم رکھنے کے لئے تمام ناگوار حالات کو صبر وضبط کے ساتھ برداشت کیا یہاں تک کہ مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر سال کے اندر ہی حسینؑ کی مہربان ماں فاطمہ زہراؑ بھی دنیا سے سدھاریں علیؑ گوشہ

نشین ہوگئے اور حسینؑ نے دیکھا کہ بارگاہ کی چہل پہل اب سناٹے سے بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔

پچیس برس تک حضرت علیؑ نے خاموشی میں گذارے۔ جب مسلمانوں میں بغاوت پیدا ہوئی اور انہوں نے حاکم وقت کو قتل کر دیا تو وہ علیؑ کے پاس آئے اور کہا: ''اب آپ ہماری رہنمائی کیجئے۔'' حضرت علیؑ نے بہت انکار کیا مگر بہت مجبور کرنے پر حضرت علیؑ نے اس ذمہ داری کو قبول کیا مگر ابھی کچھ ہی زمانہ گذرا تھا کہ آپ کے پرانے دشمنوں نے اور ان کے عزیزوں اور ہواخواہوں نے آپ کے خلاف مخالفت کا طوفان اٹھا دیا اور آپ کو لڑائیوں میں الجھا دیا یہاں تک کہ پانچ ہی برس کی عمر میں آپ کو عین حالت نماز میں مسجد کے اندر قتل کر دیا گیا۔

ان کے بڑے بیٹے امام حسنؑ ان کے جانشین ہوئے مگر حالات ایسے ناسازگار تھے کہ آپ کو ملت اسلامیہ کی حفاظت کے لئے اپنے باپ کے دشمن شام کے باغی حکمراں سے صلح کرنا پڑی اور اس کے بعد بالکل گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے کے باوجود حاکم شام کی طرف سے ان کو زہر دے دیا گیا۔

اخلاق واوصاف

حسینؑ نے اپنے حسن فطرت کے ساتھ ایسی بلند تربیت پائی تھی جو ان کے اخلاق واوصاف کی بلندی کی ضامن تھی پھر ان کو مختلف حالات اور متضاد واقعات کے ایسے دور سے گذرنا پڑا جن میں ان کو جذبات کی طاقت کے خلاف اپنے نفس کی طاقت سے کام لینا پڑا تھا۔ اس لئے ان کے نفس میں پختہ کاری، تدبر اور استقلال پیدا ہوگیا تھا۔ وہ فیاض تھے اور خلق خدا کو فائدہ پہنچانے کی فکر رکھتے تھے، وہ عالم تھے ایسے جن سے لوگ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات مین رجوع کرتے تھے، وہ رحم دل تھے ایسے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھا جاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو فراموش کر کے دوسروں کی ضرورتوں کو پورا کرتے تھے۔ کیا تم ایسے انسان کے نفس کی بلندی کا اندازہ کر سکتے ہو جس نے اس لشکر کو جو خود اس سے جنگ کے لئے آیا تھا پیاسا دیکھ کر عرب کے بے آب راستوں میں اپنے ساتھ کا تمام پانی پلوا دیا اور اپنے اور اپنے ساتھیوں کا بلکہ عورتوں اور

چھوٹے بچوں تک کا کوئی خیال نہ کیا وہ راست باز اور راست کردار ایسے تھے کہ انھوں نے اپنی جماعت کی تعداد کو قائم کرنے کے لئے کبھی آئندہ خطرات کو پوشیدہ نہیں کیا بلکہ بار بار آئندہ کے خطرات کو یقینی بتا کر ان کو حفاظت جان و مال کے لئے اپنے ساتھ سے چلے جانے کا مشورہ دیا اور یہ طریقہ اس وقت تک جاری رکھا جب تک کسی ایک شخص کے بھی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا امکان تھا۔

وہ امن پسند بھی ایسے تھے کہ انھوں نے آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی خود اپنی طرف سے کوشش جاری رکھی مگر اس کے ساتھ عزم و استقلال و ہمت ایسی رکھتے تھے کہ جان دے دی مگر جو پہلے دن راستہ صحیح سمجھ کر اختیار کر لیا اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔

انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی، اس طرح کہ ان کی وفادارانہ اطاعت میں کبھی کمزوری نظر نہ آئی، اور پھر بحیثیت حاکم کے کربلا کے واقعہ میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ ان کے نظم قیادت کی مثال مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان کی نگاہ نے مردم شناسی کا وہ حیرت انگیز نمونہ پیش کیا کہ اتنے سخت اور دشوار گذار راستہ کے لئے جن ساتھیوں کو منتخب کر کے انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا ان میں سے ایک نے بھی وفاداری اور جاں نثاری میں کمی نہ کی اور سب یک جان و یک دل ہو کر ان کے مقصد کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ جانیں قربان کر دیں۔ یہ واقعات کچھ ایسے صفات کا پتہ دے رہے ہیں جو حسینؑ کو دنیائے انسانیت کا ایک معیاری نمونہ ثابت کرتے ہیں۔ حسینؑ میں جاذبیت صرف اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ بے گناہ قتل ہو گئے اور مظلوم کے ساتھ ہمدردی ہر انسان کی فطرت ہے بلکہ ان کے اوصاف و کمالات جو ان کے واقعات سے ظاہر ہیں ان کی جانب تمام انسانی برادری کے دلوں کو موڑتے ہیں اور ہر باخبر اور کشادہ دل انسان اس پر مجبور ہے کہ وہ حسینؑ کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور عظمت کا اعتراف کرے۔

قوت برداشت

ناظرین آئندہ کے واقعات میں غلط نتائج تک پہنچ سکتے ہیں اگر وہ حسینؑ کی افتادِ طبع اور سابقہ زندگی میں ان کی قوت برداشت کا اندازہ نہ کر لیں آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ حسینؑ کو سات برس ہی کی عمر میں ایسے حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا جن میں ان کے والد بزرگوار حضرت علیؑ کے مقابلہ میں دوسرے افراد نے اقتدار قائم کر لیا تھا اور حضرت علیؑ ایسے شجاع اور طاقتور بہادر نے مفاد اسلامی کی خاطر صبر و ضبط سے کام لیا تھا۔ یہ زمانہ پچیس برس تک رہا ظرف مکان کا یہ حصہ وہ ہے جس میں حسینؑ نے کمسنی کے حدود کو ختم کر کے نوجوانی کی منزل کو طئے کیا اور پورے شباب کے درجہ تک پہنچے۔ عمر کا یہ دور وہ ہوتا ہے جس میں ولولہ، امنگ اور حوصلہ انسان سے خلاف تدبر اقدامات کرا دیا کرتا ہے مگر تمام ناگوار حالات کے باوجود حسینؑ نے کوئی فعل ایسا نہیں کیا جو نظم اصول اور اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے اختیار کردہ مسلک کے خلاف ہو بلکہ تاریخیں بتلاتی ہیں کہ جب مسلمانوں کے تیسرے خلیفہ جناب عثمان محاصرہ میں تھے اور ان پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو حضرت علیؑ نے حسنؑ اور حسینؑ، اپنے دونوں فرزندوں کو پانی پہنچانے کے لئے بھیجا تھا، وہ باغیوں کی شورش کی پرواہ نہ کرتے ہوئے گئے اور اپنے فرض کو انجام دیا۔ حضرت علیؑ کے دور حکومت میں مخالفوں کی جارحانہ کاروائیوں کے مقابلہ میں حسینؑ شریک رہے مگر جب صفین میں قرآن نیزوں پر بلند کئے گئے اور اپنے گرد و پیش کے لوگوں کے اختلاف سے مجبور ہو کر حضرت علیؑ کو جنگ کے ملتوی کرنے کا فیصلہ کرنا پڑا تو جواں سال حسینؑ نے بلا توقف سر تسلیم خم کیا اور اپنے بھائی حسنؑ کے ساتھ اس معاہدہ پر دستخط کئے جو التوائے جنگ کے لئے تحریر کیا گیا تھا۔ حضرت علیؑ شہید ہوئے اور ان کی جگہ پر حضرت حسنؑ پیشوا تسلیم کئے گئے اور آپ کو اپنے حریف سے صلح کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو حسینؑ نے بھی اس مصالحت کی پابندی کی۔ دس برس تک کا زمانہ یوں ہی گذرا اور اس زمانے میں ایسے واقعات پیش آتے رہے جو پیمانۂ صبر و ضبط کو چھلکا دیں مگر امام حسینؑ نے کوئی اقدام نہیں کیا یہاں تک کہ دنیا کے معاملات سے کنارہ کش گوشہ نشین اور خاموش رہتے ہوئے بھی امام حسنؑ زہر سے شہید کر دئے

گئے اور یہ تاریخ کا ایک عبرت ناک واقعہ ہے کہ حضرت حسنؑ کو اپنے نانا کے پہلو میں دفن ہونے کی اجازت نہ دی گئی بلکہ مزاحمت ہوئی یہاں تک کی جنازہ پر تیر چلائے گئے جن میں چند تیر تابوت کو توڑ کے امام حسنؑ کے جسم تک پہنچے مگر بھائی کی وصیت اور حالات کے تقاضے کی بنا پر حضرت حسینؑ خاموش رہے اور اپنے بھائی کو روضۂ رسولؐ سے الگ مقام پر دفن کر دیا۔ ان واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ حسینؑ کوئی جذباتی انسان نہیں تھے، وہ صابر اور متحمل تھے اور کبھی غصہ اور جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام نہیں کرتے تھے جو نظم وضبط اور سکون کے خلاف ہو سخت سے سخت مواقع پر خاموشی آپ کا ایک مستقل کردار بن گئی تھی، بشرطیکہ اس خاموشی سے ان مقاصد کو کوئی ضرب نہ پہنچے جن کے وہ خود اور ان کے نانا، باپ اور بھائی محافظ رہے تھے۔

واقعۂ کربلا کے اسباب

اب آپ کو اندازہ ہونا چاہئے کہ ایک ایسا صلح کل، متحمل، امن پسند انسان کیسے ایک ایسے اقدام کے لئے تیار ہو سکتا ہے جس میں اس کے تمام ساتھیوں کے تہہ تیغ ہو جانے کا یقین ہو، بغیر غیر معمولی اسباب کے پھر وہ اسباب کیا تھے؟

اچھا سنئے! یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ حسینؑ حضرت محمد مصطفیؐ کے نواسے تھے اور حضرت محمدؐ اس انقلاب کے مرکز تھے جس کا نام ہے اسلام، اسلام سے پہلے عرب کی معاشی اور معاشرتی دنیا جس قدر تاریک تھی اس کا آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مساوات انسانی کوئی چیز نہ تھی اور غلبہ طاقت و اقتدار سب کچھ تھا اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ تھی ایک بڑے آدمی کے قتل ہو جانے پر صرف اس کے قاتل کو نہ قتل کیا جاتا تھا بلکہ فریق مخالف کے سیکڑوں آدمی مار ڈالے جاتے تھے تب سمجھا جاتا تھا کہ خون کا اس کے بدلا ہوا، اس کے خلاف اگر بڑے آدمی کے ہاتھ سے کوئی چھوٹا آدمی قتل ہو جاتا تھا تو اس کا خون معاف تھا۔

یہ بڑے اور چھوٹے کی تفریق ہزاروں تمدنی گناہوں کی سرچشمہ تھی اور انسانیت کے پرخچے اڑا

رہی تھی۔ ان سب کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مادیت کو اپنا معبود سمجھ لیا تھا، ماوراء المادہ کا تخیل نہ باقی رہا تھا، اس لئے مادی طاقت ہی ان سب کے نزدیک سب کچھ تھی۔

اسلام جو ایک عظیم انقلاب کا حامل بن کر آیا تھا اس نے سب سے پہلے اس کا اصلی سبب دور کرتے ہوئے لوگوں کی نگاہ کو مادیت کے احاطے سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی جانب متوجہ کیا جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے تھے اور پھر اس نے سابق کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات کو مٹا کر نیا امتیاز قائم کیا کہ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے (ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم) اس اصول کے ماتحت غلبۂ طاقت اختیار (واقتدار) قوم وقبیلہ کی زیادتی اور تعداد کی اکثریت یہ تمام باتیں کچھ نہ رہیں۔ اس نے کہا کہ ہر انسان دوسرے کے برابر ہے جب تک کہ انسانیت کے اوصاف میں اپنے تئیں اس سے بہتر نہ ثابت کرے۔

اس سے معاشی معاشرتی اور تمدنی حالات میں بڑی تبدیلیاں ہو گئیں۔ اسلام نے اس انقلاب کے پیدا کرنے میں بہت حد تک کامیابی حاصل کی، بہت سے بلند خاندان کے افراد کی شادی کی گئی، ان خاندانوں میں جو قدیم زمانہ سے پست سمجھے جاتے تھے۔ ایک بلند مرتبہ شخص کے قاتل کے بدلے یہ امر ناممکن ہو گیا کہ سوائے اس کے کوئی دوسرا شخص قتل کیا جائے۔

بہت سی غیر قوم اور پردیسی انسانوں کو جو اس سے پہلے جانوروں کے برابر سمجھے جاتے تھے ان کے انسانی اوصاف کی بدولت وہ عزت حاصل ہوئی جو بڑے بڑے خاندانی عربوں کو نہ تھی اور اکثر مہموں میں عرب قوم کو سرداری قبول کرنا پڑی ان لوگوں کی جنھیں وہ نسلی حیثیت سے اپنے برابر نہ سمجھتے تھے یا مادی غلبہ اور اختیار کے لحاظ سے جنھیں وہ کمزور خیال کرتے تھے۔

ہر انقلاب کے بالکل متوازی ایک اور انقلاب شروع ہو جاتا ہے جو انقلاب سے پیدا ہونے والے امتیازات کو مٹا دینا چاہتا ہے اور رجعت پسندی اور قدامت پسندی کے امتیازات کو برقرار رکھنا

چاہتا تھا۔

اسلام کو اس حیثیت سے ان تمام قبائل کا مقابلہ کرنا پڑا جو اس سے پہلے اپنے تئیں غلبہ و اقتدار کا حقدار سمجھتے تھے، خواہ نسلی تفوق کی بنا پر خواہ مال و دولت کی بنا پر، خواہ اپنے قوم وقبیلہ کی بنا پر۔

حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سلسلہ میں کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں جن میں بدر، احد اور احزاب بہت مشہور لڑائیاں ہیں ان میں بنی امیہ کا سردار ابوسفیان بہت آگے آگے تھا اور وہ مخالف جماعت کا سرگروہ تھا۔

ان مقابلوں میں گرچہ کامیابی اسلام کو ہوئی مگر ہر کامیابی مخالف جماعت کے دل میں ایک جذبۂ انتقام پیدا کر دیتی تھی، اس لئے ظاہری قوتوں کے توازن میں اسلام اگرچہ سب سے وزنی طاقت بن گیا مگر اس کے خلاف مخالفت کا جذبہ باطنی طور پر اور سنگین تر ہوتا گیا یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا جب فریق مخالف کی شکست نے مختتم طور پر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا اور مخالف جماعت کے لوگ یہاں تک کہ خود ابوسفیان اور اس کے خاندان والے اسلام لے آئے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ دبی ہوئی اور شکست خوردہ قوموں کے کچھ نفسیات ہوتے ہیں۔ اسلام سے شکست خوردہ جماعت یعنی بنی امیہ اور ان کے ہواخواہ جب اسلام لے آئے تو ان کی نفسیاتی حیثیت یہ تھی کہ وہ برابر موقع کے منتظر تھے کہ کس طرح ہم اسلام کو نقصان پہنچا دیں اور اگر اس کو ختم نہ کر سکیں تو کم از کم اس کے مقصد کو تبدیل کر کے ان امتیازات کو مٹا دیں جو اسلام نے قائم کئے ہیں اور اس کے پردہ ہی میں سہی مگر ان امتیازات کو قائم کر دیں جو اسلام کے پہلے عرب میں قائم تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کی زندگی میں ان کے اس مقصد کی تکمیل مشکل تھی مگر پیغمبرؐ کے بعد ان کو اپنے مقاصد کی کامیابی کی کافی توقع تھی۔

پیغمبر اسلامؐ کے بعد اسلامی انقلاب کے محافظ پیغمبرؐ کے ورثہ دار ان کے گھرانے والے وہ لوگ تھے جنھیں وہ برابر اپنے کاموں میں شریک رکھتے تھے اور جنھوں نے انہیں اپنے مقاصد کو پورے

طور سے مطلع کر دیا تھا اور ان کی عملی تربیت اس طرح کر دی تھی کہ وہ اپنے افعال واقوال سے ان مقاصد کے ترجمان اور محافظ بن سکیں۔ ان میں اور اس کے متوازی دوسرے انقلاب کے علمبرداروں میں کش مکش لازمی تھی اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر دفعہ آزمائش کے وقت آل رسولؐ کے ساتھی کم نکلے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، اس کے وجوہ اقتصادی بھی ہیں اور سیاسی بھی نفسیاتی بھی اور نسلی بھی۔

آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام قدیم امتیازات کو مٹا کر مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا اور اس نے امتیاز صرف فرائض انسانی کی بنا پر قرار دیا تھا۔ مال و دولت کی اس طرح تقسیم کہ جس میں جانب داری اور عدم مساوات پیدا ہو جائے، اسلام کے اصول کے خلاف تھی اور اس کے محافظین بھی اس کے قریب نہ جا سکتے تھے، اس لئے کہ آل رسولؐ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ خزانہ میں روپیہ جمع کر کے دولت مند بنیں اور خصوصیت سے ان لوگوں کو زر و جواہر سے مالا مال کریں جن سے ان کو اپنے اقتدار کے قوی بنانے میں فائدہ کی امید ہو۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ حضرت علیؑ سے ان کے بھائی عقیل تک برگشتہ ہو گئے اس بنا پر کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کو تمام مسلمانوں سے کچھ زیادہ دیا جائے اور حضرت علیؑ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ پھر جب خاص اپنے بھائی کا یہ عالم تھا تو دوسروں کا کیا ذکر۔

اس کے برخلاف دوسری جماعت کے لوگوں کو اس بات کی پرواہ نہ تھی وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے لے لئے خزانہ کا منھ کھول دیتے تھے اور جس کو اپنے مطلب کا سمجھتے تھے اس کو مالا مال کر دیتے تھے۔

اس کے علاوہ اسلام نے اُن تمام مقتدر اشخاص اور جماعتوں کے امتیازات کو ختم کر دیا تھا جو اس کے پہلے برسر اقتدار تھیں اور ایک بالکل الگ معیار قائم کیا تھا۔ وہ مقتدر جماعتیں آپس میں کتنی ہی رقیبانہ چشمک رکھتی ہوں لیکن اسلام سے زخم خوردہ وہ سب ہی تھیں۔ اس لئے اسلام کے حقیقی مقصد اور قائم کردہ امتیاز کو مٹانے میں وہ سب ہم آہنگ بن سکتی تھیں اس لئے کہ اس کو مٹانے میں ان میں سے ہر ایک کے اقتدار کا قیام منحصر تھا پھر یہ بھی ہے کہ سابق کی شکستوں کا ان سب ہی کے دل پر اثر تھا اور سب ہی میں جذبۂ انتقام پایا جاتا تھا اور پھر اتفاق کی بات یہ ہے کہ رسولؐ کے مسلک کے تمام

محافظ ایک خاص خاندان (بنو ہاشم) کے لوگ تھے جن سے اکثر عرب خاندانوں کو پہلے سے حسد اور عناد تھا۔ اس لئے وہ نسلی تعصّبات بھی مخالفت پر آمادہ کرتے تھے اور چونکہ عرب میں قبائلی نظام بڑی قوت کے ساتھ قائم تھا۔ ہر قبیلہ کے سرگروہ اور بڑے افراد ان جذبات کی بنا پر جو ابھی بیان ہوئے تھے جس راستے پر جاتے تھے عوام اور پست افراد اہل قبیلہ ان ہی کی پیروی کرتے تھے کیونکہ عوام کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا، نہ ان کی کوئی رائے، خصوصاً جبکہ جہالت بھی ان میں اس حد تک تھی کہ جو ان ہی کے ساتھ مخصوص تھی۔

بنوامیہ کا اقتدار مسلمانوں میں بحیثیت ایک صوبہ دار حاکم کے شروع ہوا۔ ملک شام میں معاویہ کا گورنر مقرر کیا جانا اس کا آغاز تھا۔ انہوں نے اپنے دورِ حکومت کی ابتدا ہی سے اپنی سیاسی روش ملوکانہ شان وشوکت کی حامل رکھی۔

مسلمانوں کو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس پر انتباہ ہوا تو ایک چالاک اور شاطر سیاست داں کی طرح یہ کہہ کر تسکین کر دی گئی: چونکہ شام کی سرحد قیصر روم کے ملک سے ملی ہوئی ہے، اس لئے یہاں اسلام کی عظمت کو قائم رکھنے کے لئے اس طرح کے جاہ و جبروت کی ضرورت ہے۔

سمجھنے والے سمجھے کہ اس طرح درحقیقت اسلام کے اس قدر و قیمت اور معیار کو مٹانا ہے جو اس نے بڑی کوشش سے دنیوی جاہ وشوکت کی قدر و قیمت کو مٹا کر قائم کیا تھا۔ اس میں ترقی اس وقت پوری طرح ہوگئی جب اسلام کا اقتدار اعلیٰ بھی بحیثیت خلیفہ بنوامیہ کی ایک بزرگ شخصیت کو حاصل ہوگیا۔ اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے پورے طور پر اس وقت بنوامیہ کو قوت حاصل ہوئی اور وہ امتیازات بالکل نظرانداز ہونے لگے جو اسلام کے سادہ اور غربا پرور اصول نے قائم کئے تھے۔ اس کا ادنیٰ نمونہ تھا ابوذر غفاریؓ کو جلاوطن کیا جانا۔ عمار یاسرؓ اور ابن مسعودؓ کو زدوکوب کیا جانا۔ مخفی نہ رہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اسلام کے قائم کردہ حدود وامتیازات میں بڑی عظمت کے مستحق تھے مگر موجودہ طاقت واقتدار کے حدود میں وہ بالکل کم حقیقت اور بے وقعت ہوگئے تھے۔ اس کے معنیٰ یہ تھے کہ

اسلامی انقلاب کی جگہ قدامت پرستانہ انقلاب فتح پانے لگا اور اسلام کے مقررہ حدود کے بجائے دوسرے حدود وامتیازات قائم ہوگئے۔

حضرت علیؑ کی خلافت کا مختصر دور تمام تر اسی اموی اقتدار کے مقابلہ میں صرف ہوا جس میں حضرت علیؑ کو بہت محدود کامیابی حاصل ہوسکی۔

حضرت علیؑ کی زندگی ختم ہونے کے ساتھ اس اقتدار میں اور اضافہ ہوگیا یہاں تک کہ حضرت امام حسنؑ کو صلح پر مجبور ہونا پڑا اور اس طرح آپ نے مخالف طاقت کے جارحانہ اعمال کو شرائط صلح کے ذریعہ سے محدود بنانے کی کوشش کی مگر حضرت امام حسنؑ کو زہر دے کر شہید کر دیا گیا اور شرائط صلح کی خلاف ورزی کی جانے لگی اور سیاسی اقتدار کی جرأت وبے باکی اس حد پر پہنچی کہ حجر ابن عدی اور ان کے بہت سے ساتھیوں کو جو بڑے عابد و زاہد متقی و پارسا تھے تہ تیغ کر دیا گیا اور عمر ابن الحمق الخزاعی کا جو اسلامی نقطۂ نظر سے بڑا درجہ رکھتے تھے سر قلم کر کے نیزے پر بلند کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسلام کا نظریۂ روحانیت وللّٰہیت فنا ہونے لگا اور مسلمانوں میں بھی ''طاقت حق ہے'' کا عملی طور پر کلمہ پڑھا جانے لگا۔ حق پرستی ختم ہوئی، آزادیٔ ضمیر رخصت ہوئی، ایمان اور اعتقاد رُوپہلے اور سنہرے سکوں پر بیچا جانے لگا اور مادی اقتدار کے طاغوت کی پرستش ہونے لگی۔

یہ حالات پھر بھی برداشت کئے جانے کے قابل تھے اگر معاویہ کی جانب سے اس شرط کی مخالفت نہ ہوتی کہ ان کو اپنے بعد کسی جانشین کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

امام حسنؑ نے بڑی عاقبت اندیشی اور انجام بینی سے یہ شرط قرار دی تھی مگر اموی سیاست اپنے مقاصد کے لحاظ سے نامکمل اور ناکام رہتی اگر اس شرط پر عمل کر لیا جاتا، اس لئے معاویہ نے اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اور صرف نامزد ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی سے بڑی کوشش کے ساتھ یزید کی بیعت حاصل کی گئی۔

یزید کے افعال واعمال اگر وہ نہ بھی ہوتے جن کو اس کے بعد مختصر طور سے بیان کیا جائے گا تب

بھی اس کو ولی عہد بنانا شرائط صلح نامہ کی بنا پر ناجائز تھا مگر مسلمانوں میں اقتدار و طاقت سے مرعوبیت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ کسی کو اس پر توجہ نہ ہوئی اور توجہ ہوتی بھی تو اظہار کی جرأت نہ تھی۔

آلِ رسولؐ میں اس وقت بزرگ ہستی امام حسینؑ کی تھی۔ آپ بنی امیہ کے طرزِ عمل کو مدت سے محسوس کر رہے تھے کہ وہ کس طرح سے اسلام کے بنیادی مقاصد کے خلاف ہے اور کس طرح دنیا کو رجعت پسندی اور قدامت پسندی کی طرف لے جا رہا ہے؟ پھر بھی وہ اس سے متوقع تھے کہ شائد یہ صورت حال معاویہ کی زندگی کے اختتام کے بعد ختم ہو جائے گی مگر یہ اس انقلابی سیاست کی آخری چال تھی کہ شاہان خودمختار کی طرح اپنے بعد کے لئے اپنے بیٹے کو بغیر اس کے اوصاف کا لحاظ کئے ہوئے نامزد بنا دیا۔ آپ نے اس کو شدت سے محسوس کیا اور اندازہ کیا کہ آپ پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔

معاویہ بھی سمجھتے تھے کہ اس معاملہ میں سب سے زیادہ متعلق انسان امام حسینؑ ہیں اس لئے انھوں نے آپ کو ملانے کی پوری کوشش کی مگر نتیجہ میں ناکام ہونا پڑا۔ یہ بنی امیہ کے اقتدار کو بڑی کاری ضرب تھی جسے معاویہ کی قوت فراست سمجھ چکی تھی۔ اسے حسینؑ ابن علیؑ کا ایک بڑا تدبر سمجھنا چاہئے کہ آپ نے اپنے عمل کو سکوت اور بے تعلقی تک محدود رکھا۔ آپ جانتے تھے کہ فریق مخالف اس سکوت کو توڑنے میں انتہائی تشدد سے کام لے گا جس کے لئے آپ تیار تھے مگر آپ یہ نہ چاہتے تھے کہ آپ کی طرف کسی جارحانہ اقدام یا بغاوت یا شورش کا اقدام عائد کیا جا سکے۔

معاویہ بڑے جہاں دیدہ انسان تھے۔ وہ حسینؑ کے اس سکوت کو اپنے اقتدار کی شکست کا مرادف سمجھ کر بے چین تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ اگر ہم سختی کریں گے تو وہ اس شکست کی انتہائی تکمیل ہوگی۔ اس لئے حسینؑ چاہتے تھے کہ میں خاموش رہوں اور حریف تشدد سے کام لے اور معاویہ کا مطلب یہ تھا کہ ہم تشدد سے علاحدہ رہیں اور حسینؑ کی خاموشی قائم نہ رہے۔

یاد رکھنا چاہئے کہ کربلا کی جنگ یہیں سے شروع ہوتی ہے مگر یہ ایک صبر آزما اور روحانی کشمکش تھی جو نہ معلوم کب تک جاری رہتی اگر معاویہ کا رشتۂ عمر ختم نہ ہوتا اور نوعمر، ناتجربہ کار، غرور سلطنت سے

بدمست یزید تخت سلطنت پر نہ بیٹھتا۔

حسینؑ کی بیعت سے علاحدگی اور خاموشی معاویہ کو اتنی ہی شاق تھی جتنی یزید کو، مگر معاویہ کو تشدد کے نتیجہ کا اندازہ تھا اور یزید کو نہ تھا۔ یزید نے حسینؑ کی خاموشی کو طاقت و اقتدار سے توڑنا چاہا اور بجبر آپ سے بیعت لینے کی خواہش کی۔

ولید ابن عقبہ جو مدینہ میں اس کا گورنر تھا اسے وفات معاویہ کی اطلاع کے ساتھ ہی یہ پیغام بھیجا کہ جلد سے جلد حسینؑ ابن علیؑ سے میری بیعت لو اور اگر بیعت نہ کریں تو ان کا سر قلم کر کے بھیج دو۔ یہ تھا وہ پہلا قدم تشدد کا، جو یزید کی طرف سے اٹھایا گیا اور اگر ولید اس حکم کی پوری تعمیل کرنا چاہتا تو مدینہ ہی کربلا بن جاتا۔ امامؑ کے سامنے اس مطالبہ کا اس طرح پیش ہونا گویا حسینی تدبر کی پہلی فتح اور اموی سیاست کی ابتدائی شکست تھی۔ اس نے سمجھا تھا کہ حسینؑ کی بیعت سے علاحدگی ایک وقتی بات ہے جو اس دھمکی سے فوراً قبول بیعت سے تبدیل ہو جائے گی اور حسینؑ نے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ سوچ سمجھ کر اس کے تمام آخری نتائج کا اندازہ کر لینے کے بعد اختیار کیا تھا اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اسلامی مقاصد، حدود و امتیازات میں کس طرح تبدیلی ہوگئی ہے مگر اس پر ابھی تک ظاہری اسلام کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس لئے عام اشخاص اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ حسینؑ چاہتے تھے کہ فریق مخالف کو تشدد کے آخری درجہ پر پہنچا کر اس کے غیر انسانی جذبات کو اس طرح نمایاں ہونے کا موقع دیں کہ عوام کو اس کا قوی احساس پیدا ہو جائے اور آنکھوں کے سامنے سے پردے ہٹ جائیں۔

امام حسینؑ کے لئے اپنے مقاصد کے حصول کا سوائے اس کے کوئی ذریعہ ہی نہ تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ اپنی جان بچا لیتے مگر جان کو بہرحال بچانا ہوتا تو وہ شروع ہی سے بیعت کا انکار نہ کرتے۔ جان کا بچانا انھیں مدنظر تھا اس حد تک کہ ان کے اصول اور مقصد کا بھی تحفظ ہو، لیکن اگر مقصد کا تحفظ جان دینے پر ہی موقوف ہو پھر ان کے نزدیک جان کا دے دینا آسان امر تھا۔

مقصد کے تحفظ کے لئے صرف دو طریقہ ہو سکتے ہیں: ایک فریق مخالف سے مل کر شرائط صلح کے

ذریعہ سے، دوسرے جنگ کر کے فتح وغلبہ حاصل کر کے۔ یہ دونوں طریقے امامؑ کے لئے ناممکن تھے۔ صلح کی منزل کو امام حسنؑ طے کر چکے تھے اور شرائط صلح کی مخالفت ہی اب وہ صورت حال تھی جو امام حسینؑ کے سامنے تھی۔ حالانکہ معاویہ اپنے کردار کے ذریعہ سے بہ نسبت یزید کے کہیں اونچا درجہ رکھتے تھے پھر جب معاویہ کے ساتھ مصالحت نتیجہ میں ناکام ہوئی تو یزید کے ساتھ مصالحت کے کیا معنیٰ؟ جب کہ یزید کے افعال وہ تھے جو کھلم کھلا اسلامی اصول وقوانین کے ساتھ جنگ رکھتے تھے، یہاں اسلام کے ظاہری رسوم نماز، روزہ وغیرہ کا بھی پتہ نہ تھا اور نکاح وازدواج کے اصول وقوانین کی بھی مراعات نہ تھی اور اسلام کے منہیات مثلاً شراب وغیرہ کا ظاہر بظاہر ارتکاب تھا اور اس کے ساتھ اسلامی خلافت کا دعویٰ تھا۔ موجودہ حالت میں اگر حسینؑ بھی جو کہ اسلامی تمدن کے محافظ تھے یزید کی بیعت کر لیتے اور مصلحت سے کام لیتے تو یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کا تمدن وتہذیب اور اصول معاشرت مستقل طور پر یہی بن جاتا کہ جس طرف بنی امیہ کی سیاست لئے جارہی تھی اور جس کا یزید اپنے وقت میں بہترین نمونہ تھا۔

کہنے والے کہہ سکتے ہیں کہ حسینؑ کے واقعۂ شہادت کے بعد بھی تو بہت سے سلاطین انہی افعال کے مرتکب ہوئے جن کا یزید ارتکاب کرتا تھا مگر یاد رکھنا چاہئے کہ حسینی مقاومت نے اسلام کے تمدن واصول کو اتنا نمایاں کر دیا کہ اب اس کے خلاف جو افعال ہوتے ہیں وہ بالکل انفرادی اور شخصی جرائم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا کوئی ذہنی اثر افراد جامعہ پر نہیں پڑتا یہ خطرہ اب ہمیشہ کے لئے دور ہو گیا ہے کہ اسی کو اسلام کا مستقل اصول اور طریق معاشرت سمجھ لیا جائے کیوں کہ حسینؑ اور ان کے ساتھیوں نے کربلا میں اسلام کے حقیقی اخلاق کا نہ مٹنے والا نمونہ پیش کر دیا اور اس کی آئینی اہمیت کو انتہا درجہ واضح کر دیا ہے اب اگر اسلام کے دامن پر دھبہ لگانے کے لئے سلاطین بنی امیہ و بنی عباس کی مثال پیش کی جائے تو فوراً اسلام کی جانب سے صفائی پیش کرنے کے لئے حسینؑ کا اقدام تاریخ کے صفحات پر سامنے آجاتا ہے۔

یزید اور امام حسینؑ کے مقاصد بالکل مختلف اور متضاد تھے۔ وہ جاہلیت کے مادی دور کے پلٹانے کا علمبردار اور حسینؑ روحانیت اور انسانیت کو قائم کرنے کے ذمہ دار، وہ طاقت اور اقتدار کا سکہ چلانے کا درپے اور حسینؑ حق وراستی کا علم بلند کرنے پر آمادہ، وہ اسلامی حدود وامتیازات کو مٹانے پر تلا ہوا اور حسینؑ اسلامی امتیازات کو باقی رکھنے پر کمر بستہ۔

پھر بھلا بتلایئے کہ امام حسینؑ اور یزید میں صلح کیوں کر ہو سکتی تھی۔

دوسری صورت یہ تھی کہ آپ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرتے اور فتح وغلبہ حاصل کر کے یزید کو شکست دیتے مگر آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ طاقت کے مقابلہ میں آل رسولؐ کے ساتھی ہمیشہ کم نکلتے تھے۔ اس طرح کا تجربہ پورے طور پر حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے وقت میں ہو چکا تھا۔

پھر دنیا کی ذہنیت اتنی ماؤف ہو چکی تھی کہ اگر آپ فوج ولشکر جمع کر کے جنگ بھی کرتے تو جو اس کی واقعی حیثیت تھی اس کے سمجھنے والے بہت کم اور یہ سمجھنے والے زیادہ ہوتے کہ یہ حکومت وسلطنت کی غرض سے دو بادشاہوں کی جنگ ہے اور سیاسی حیثیت سے یزید کا پلہ گراں رہتا، اس لئے کہ وہ بادشاہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور حسینؑ کا پلہ سبک رہتا اس بنا پر کہ وہ ایک باغی کی حیثیت رکھتے تھے۔ اگر اس صورت میں آپ کو فتح حاصل بھی ہوتی، جو بظاہر ناممکن تھی تو اس کا اثر ایک وقتی انقلاب کی صورت سے ہوتا جس کا اثر دیرپا نہیں رہتا اور بنی امیہ پر جو ظاہری اسلام کا پردہ تھا وہ اب بھی اسی طرح پڑا رہتا جیسے اس کے پہلے تھا اور اگر کچھ لوگ حسینؑ کو حق پر سمجھتے بھی ہوتے تو فریق محارب کو خطاء اجتہادی کا سارٹیفکٹ دے دیتے جیسا کہ اس سے پہلے صفین کی جنگ میں ہوا۔ اس صورت میں بنی امیہ کے باطنی حالات کا اس درجہ انکشاف کہ جو ان سے ہمدردی کا کوئی گوشہ انسانیت کے دل میں باقی نہ رکھے ہرگز نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک ان سے نفرت انتہائی درجہ پر پیدا نہ ہوتی اس وقت تک ان امتیازات وحدود کی مکمل شکست نہیں ہو سکتی تھی جسے بنی امیہ نے عملی طور پر قائم کرنا چاہا تھا۔

معلوم ہوا کہ صلح بھی ناممکن تھی اور جنگ بھی، پھر اب تیسرا راستہ کون سا تھا؟ وہی جسے حسینؑ نے اختیار کیا اور اگر حسینؑ اختیار نہ کرتے تو اس کا تصور بھی ہمارے لئے دشوار ہوتا۔

آپ نے اقتدار کا مقابلہ بے بسی سے، کثرت کا مقابلہ وحدت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومیت کے ساتھ کیا اور یہ وہ طریقۂ جنگ تھا جس کا مقابلہ اس کے پہلے دنیا نے نہیں کیا تھا۔ آپ کی نظر میں شکست و فتح کا مفہوم بالکل جداگانہ تھا۔ فتح کے معنیٰ یہ نہ تھے کہ آپ دشمن کی فوجوں کو پامال کر کے اس کے ملک پر قبضہ کر لیں اور شکست کے معنی یہ نہ تھے کہ آپ کے ساتھ والے سب ختم ہو جائیں اور آپ بھی ختم ہو جائیں۔

آپ کے نزدیک فتح کے یہ معنیٰ تھے کہ کہاں تک آپ اپنے اصول کی حمایت میں مصائب کا زیادہ مقابلہ کرتے ہیں اور کہاں تک آپ کا دشمن اپنے مقاصد کے تحفظ میں تشدد سے کام لیتا ہے۔ دشمن کے تشدد کا ہر قدم ایک مورچہ تھا جسے حسینؑ فتح کرتے تھے اور اس کا انتہائی مشددانہ انجام حسینؑ کے اپنے مقاصد کے لحاظ سے ایک مکمل فتح تھی۔

اس اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے حسینؑ نے اپنے ساتھ بڑا سامان کیا تھا، طاقت کا مقابلہ طاقت سے کرنا ہوتا تو فوج و لشکر کی تعداد میں اضافہ کرتے، انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ تعداد کو تو حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ مختصر بنایا مگر انھوں نے اپنے ساتھ ایسے ایسے عابد و زاہد و متقی و پارسا لوگوں کو لیا جن کی نیکی اور پاک دامنی اور زہد و تقویٰ کا سارے ملک میں کلمہ پڑھا جاتا تھا، انہوں نے ایسے بوڑھے اپنے ساتھ لئے جن کی بھویں لٹک کر آنکھوں تک آ گئی تھیں اور انہوں نے ایسے جوان اپنے ساتھ لئے جن کے شباب اور حسن و جمال کا نظیر نہ تھا، کچھ ایسے بچے بھی ساتھ لئے جن کے ہاتھوں میں تلوار اٹھانے کی طاقت نہ تھی بلکہ گہوارے میں لیٹے ہوئے شیرخوار بچے تک کو ساتھ لیا اور پردہ نشین عورتوں کو جو رسولؐ اللہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور جن میں رسولؐ کی حقیقی نواسیاں بھی موجود تھیں اپنے ساتھ لیا۔

تم اس ساز و سامان سے سمجھ سکتے ہو کہ حسینؑ کا مقصد کیا تھا اور وہ کس طرح اپنے مخالف سے جنگ کرنا چاہتے تھے یاد رکھو کہ حسینؑ کے ساتھ یہ وہ مشین گنیں تھیں جن کو حسینؑ بنی امیہ کے قصر و استبداد کے تباہ کرنے کا انتہائی طاقتور ذریعہ سمجھتے تھے اور بیشک ان کا خیال صحیح تھا۔ امام حسینؑ کے لئے بہتریں اور مفید ترین راستہ یہی تھا اور اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہ تھا۔

مدینہ سے روانگی

امام حسینؑ نے بیعت کے مطالبے کو سن کر پہلا قدم یہ اٹھایا کہ مدینہ کو چھوڑ دیا اس میں امن پسندی کے ثبوت کے علاوہ اپنے مقاصد کی اشاعت کا پہلو بھی مضمر تھا اگر آپ مدینہ میں شہید ہو جاتے تو مخالف کی طرف سے اس کی بہت سی تاویلیں کر دی جاتی اور جس طرح امام حسنؑ کا قتل آج تک عوام کی نگاہ میں مشتبہ ہے اسی طرح امام حسینؑ کی شہادت بھی مخفی رہتی اور قربانی کا وہ مقصد حاصل نہ ہوتا جو امامؑ کے پیش نظر تھا۔

مکہ میں پناہ

آپ نے مدینے سے نکل کر حرم خدا میں پناہ لی۔ بظاہر تو یہ صرف خود اختیاری کا ایک طریقہ تھا مگر اس میں بہت بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ مکہ معظّمہ تمام ممالک عربیہ کا مرجع و ماویٰ تھا اور ہر سمت کے لوگ مکہ میں مجتمع تھے امام کا مکہ میں قیام لوگوں کو اس سوال پر مجبور کرتا تھا کہ کن اسباب کی بنا پر فرزند رسولؐ نے نانا کے جوار کو ترک کیا ہے۔

اس صورت سے آپ کے یزید کے ساتھ خاموش اختلاف اور اس کے وجوہ کا اعلان تمام ملک میں ہو گیا اور ان غلط فہمیوں کا سد باب ہو گیا جو اس سلسلہ میں پھیلائی جا سکتی تھیں۔

مکہ سے روانگی

آپ کی مکہ سے روانگی بالکل غیر متوقع حالات میں تھی۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ حج کو صرف دو روز باقی تھے اور دور دور کے لوگ سمٹ سمٹ کے مکہ میں جمع ہو رہے تھے، ایسے موقع پر آپ کا حج

کو ترک کر کے مکہ کو روانہ ہو جانا غیر معمولی ہی حالات کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ آپ کو اندیشہ تھا کہ آپ کی موجودگی مکہ معظّمہ کی سرزمین پر خونریزی کا باعث نہ ہو آپ نے حرم خدا کی عزت پر اپنی سکون کی زندگی کو قربان کر دیا۔

کیا آپ کی اس غیر متوقع طور پر روانگی مکہ معظّمہ کے بین القبائلی اجتماع میں شدید احساس و توجہ پیدا کرنے کا باعث نہ ہوئی ہوگی۔

اس موقع پر جب کہ ذرائع خبر رسانی کے مفقود تھے، امامؑ نے اپنے اس طرزِ عمل سے دنیائے اسلام کو صورت حال سے آگاہ کرنے کے وہ اسباب مہیّا کئے جن سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ممکن نہ تھا۔

کربلا میں ورود

امام حسینؑ کو اہل کوفہ رہنمائی کے واسطے مدت سے بلا رہے تھے۔ جب کہ آپ کا مکہ سے نکلنا ناگزیر ہو گیا تو کوفہ کی طرف متوجہ ہوئے، آپ اپنے چچازاد بھائی مسلمؑ بن عقیلؑ کو وہاں کے حالات کے مطالعہ کے لئے بھیج بھی چکے تھے اور انھوں نے بھی لکھ دیا تھا کہ یہاں کے لوگ آپ کے ساتھ وفاداری پر تیار ہیں۔

ان حالات کی بنا پر آپ کوفہ کی جانب متوجہ ہوئے مگر اس عرصہ میں وہاں کی فضا میں انقلاب ہو چکا تھا اور یزید کی جانب سے ابن زیاد کی حکومت قائم ہو گئی تھی جس نے کوفہ کے گرد افواج کا آہنی حصار قائم کر دیا تھا۔ امام بھی راستے ہی میں تھے کہ کوفہ کی فوج آ کر سد راہ ہو گئی اور آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روکا۔ مجبوراً آپ کربلا کی زمین پر اتر پڑے۔ یہ وہی زمین ہے جو اس عظیم الشان قربانی کا مرکز قرار پائی جو واقعۂ کربلا کے نام سے آج دنیا میں مشہور ہے۔

کربلا پہنچنے کے بعد

ابن زیاد کو علم ہوا کہ حسینؑ کربلا پہنچ گئے ہیں، اس نے فوجیں بھیجنا شروع کیں اور اس قدر فوجیں کہ وسیع جنگل آدمیوں کی کثرت سے لبریز نظر آنے لگا۔ سمجھ لیجئے کہ کوفہ کی تمام جنگ کے قابل

آبادی کربلا کی سرزمین پر امنڈ آئی تھی۔ عمر سعد اس فوج کا افسر تھا۔

امن و امان کی کوشش اور اس میں ناکامی

امام حسینؑ نے کوشش کی کہ کسی طرح خونریزی کی نوبت نہ آنے پائے اور امن و امان کو صدمہ نہ پہنچے، اس غرض سے آپ نے عمر سعد کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری کیا اور بات اتنے پر ختم ہوئی جاتی تھی کہ آپ عراق میں قیام کے خیال کو ترک کر دیں گے اور اگر ضرورت ہو تو عرب کا ملک بھی چھوڑ دیں گے اور کسی دور دراز جگہ پر چلے جائیں گے۔

غور کیجئے تو اس صورت سے بھی حسینؑ کی فتح تھی یعنی آپ کا ملک کو ترک کرنا بھی اسی مقصد کا ایک اعلان تھا جس کی خاطر آخر میں آپ کو جان دینا پڑی لیکن چونکہ عقل و آئین کے حدود میں جب تک مقصد کا تحفظ جان دئے بغیر ہو سکے اس وقت تک ایسا اقدام خودکشی ہے اس لئے آپ دوسری صورتیں پیدا کرنے کی کوششیں کر رہے تھے۔

عمر سعد نے اس بے ضرر تجویز کا خیر مقدم کیا تھا اور اس نے ابن زیاد کو لکھا تھا کہ الحمدللہ فتنہ وفساد ختم ہو گیا۔ حسینؑ آمادہ ہیں کہ وہ جہاں سے آئیں ہیں، وہاں واپس جائیں یا ملک کو چھوڑ دیں مگر ابن زیاد جسے آل رسولؐ سے سخت عداوت تھی بعض مفسدین کے ورغلانے سے اس پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے اسی پر اصرار کیا کہ حسینؑ بیعت کر لیں، تب ان کی جان بچ سکتی ہے۔ یہ وہ بات تھی جسے پہلے سے حسینؑ طے کر چکے تھے کہ ناممکن ہے۔

انھیں بیعت کرنا ہوتی تو پہلے ہی دن کیوں نہ کرتے؟ اب خطرہ کو سامنے دیکھ کر وہ اس بیعت پر تیار ہو جاتے تو وہ ایک کمزور نفس اور ضمیر کے انسان ثابت ہوتے اور وہ حسینؑ نہ ہوتے کوئی اور شخص ہو سکتا تھا۔

حقیقتاً امام حسینؑ اور یزید کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ شخصی یا ذاتی نہ تھی اسلامی اور اجتماعی تھی۔

یہ تو اتفاق کی بات تھی کہ مقابل میں بنی امیہ کا ایک شخص یزید ہی تھا نہیں وہ بنی امیہ نہ ہوتے تو

کوئی اور قبیلہ ہوتا بلکہ بنی ہاشم کا ہی کوئی شخص ہوتا لیکن اگر وہ ان مقاصد کے ساتھ تصادم رکھتا ہوتا جس کے حسینؑ محافظ تھے تو آپ اس کے مقابلے میں یونہی کھڑے ہو جاتے جس طرح یزید کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے۔

امام حسینؑ کے مقاصد

ہر جنگ میں مقاصد کا سوال ضرور پیدا ہوتا ہے۔ حسینؑ کے مقاصد بہت حد تک ان کے افعال سے ظاہر ہیں جن پر کسی حد تک اس کے پہلے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے اقوال جو مختلف خطبوں میں ہم تک پہنچے ہیں آپ کے مقاصد کی تشریح کر سکتے ہیں۔ افسوس ہے کہ تاریخ نے ان تمام خطبوں کو محفوظ نہیں کیا جو آپ نے متعدد مواقع پر ارشاد فرمائے مگر جہاں تک محفوظ ہو سکے ہیں وہ کسی حد تک ہماری رہنمائی کے لئے کافی ہیں۔

سب سے پہلے اس وقت جب ولید نے آپ کے سامنے بیعت یزید کا مطالبہ پیش کیا ہے آپ نے شروع میں دفع الوقتی سے کام لینا چاہا لیکن مروان کی مداخلت بیجا پر آپ کو غیض آ گیا آپ نے ولید کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

انا اهل بیت الرسالة و معدن النبوة و مختلف الملائکة بنا فتح الله و بنا ختم الله و یزید رجل فاسق شارب الخمر قاتل نفس المحرمة معلن بالفسق و مثلی لا یبایع۔

''ہم اہل بیت رسالت ہیں اور معدن نبوت اور ملائکہ کی آمد کی منزل۔ کمالات انسانی کی ہم سے ابتدا اور ہم پر انتہا ہے اور یزید بدکار ہے اور شراب خوار، بے جرم و خطا خون بہانے والا اور علی الاعلان گناہوں کا ارتکاب کرنے والا اور میرا ایسا شخص اسکی بیعت نہیں کر سکتا۔''

اس میں آپ نے اپنی ذمہ داریوں کو بتلاتے ہوئے اپنے اور یزید کی حیثیت کا تفرقہ اور اختلافات کے وجوہ صاف بیان کر دئے ہیں۔ آپ کا عمل اپنے آخری نقطہ تک آپ کے اسی قول کی

تفسیر ہے اور بس۔

کربلا میں عمر سعد کے جواب پر آپ نے ارشاد فرمایا:

والله لا اعطیکم بیدی اعطاء الذلیل ولا افر فرار العبید۔

''خدا کی قسم میں ذلت کے ساتھ اپنے کو تمہارے قبضہ میں نہ دے دوں گا اور نہ غلاموں کی طرح تمہارے سامنے سے بھاگوں گا''

یہ تھا بہادری اور جانبازی کی موت کا اعلان۔ اسی کو ایک دوسری جگہ اہل شام کو مخاطب کر کے اس طرح ارشاد فرمایا:

یا عباد الله انی عذت بربی و ربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب الموت فی عز خیر من حیوة فی ذل۔

''اے بندگان خدا میں پناہ مانگتا ہوں ایسے شخص سے جو نخوت و غرور رکھتا ہو اور روز قیامت پر ایمان نہ رکھتا ہو اور موت عزت کے ساتھ بہتر ہے اس زندگی سے جو ذلت کے ساتھ ہو۔''

پہلے فقرے میں جبار و سرکش یزید کے جبروت سلطنت کی تحقیر ہے اور دوسرے فقرے میں اس کی تشریح ہے کہ مادی طاقت کے آگے بلند مقاصد کے خلاف سر جھکا دینا عزت انسانی کے خلاف ہے اور اس زندگی سے جو اس طرح ہو موت بہتر ہے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا ہے کہ:

الموت اولیٰ من رکوب العار۔

''مر جانا عار و ننگ سے بہتر ہے۔''

شب عاشور کے خطبہ میں اعوان و انصار کو مخاطب کر کے فرمایا:

انی رأیت القتل فی العز حیوة والعیش فی الذل قتلاً۔

''میں باعزت مر جانے کو زندگی سمجھتا ہوں اور ذلت کی زندگی بسر کرنے کو موت خیال کرتا ہوں۔''

جنگ کا قطعی فیصلہ

نویں محرم کی شام تھی جب ابن زیاد کا خط عمر سعد کے پاس آیا جس نے صلح کی گفتگو کو قطعی طور پر ختم کر دیا یا بیعت اور یا قتل، اور یہ بات عمر سعد بھی جانتا تھا کہ بیعت کا کرنا امام حسینؑ کے لئے ناممکن ہے، اس لئے اس کے نزدیک اب سوائے جنگ کے کوئی دوسری صورت نہ تھی چنانچہ اس نے فوراً ہی لشکر حسینؑ پر حملہ کر دیا۔

امامؑ نے اس غیر متوقع حملہ کا کسی مضطربانہ انداز میں استقبال نہیں کیا بلکہ بہت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ آپ نے اپنے بھائی عباسؑ کو بھیج کر حملہ کا سبب دریافت کیا، اور یہ معلوم ہونے پر کہ ابن زیاد کا قطعی حکم جنگ کے لئے آ گیا ہے، آپ نے صرف ایک شب کی مہلت طلب کی۔

ناواقف لوگ اس ایک رات کی مہلت میں نفس کی کمزوری کا پہلو مضمر سمجھ سکتے ہیں مگر جس نے حسینؑ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے وہ اس کا خیال بھی ناممکن سمجھتا ہے۔

اس ایک شب کی مہلت میں بڑی مصلحت یہ مضمر تھی کہ آپ خطرہ کے یقینی ہونے کے بعد اپنے ساتھیوں کو اپنی طبیعتوں کے تول لینے کا موقع دے دیں اور ایک بار اور یہ کہہ دیں کہ جو ساتھ چھوڑ کر چلا جانا چاہے وہ جائے تاکہ عین وقت پر کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے جو خطرہ کے ہنگامی ہونے کی وجہ سے بادل نخواستہ آپ کا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا ہو۔ چنانچہ آپ نے اس شب کو اپنے مجمع کو چھانٹنے کی کوشش کی اور لوگوں کو غور و خوض کر لینے کا پورا موقع دیا۔ اب جو لوگ حسینؑ کے ساتھ رہ گئے تھے وہ موت کو اپنے سامنے یقینی سمجھتے ہوئے دل و جان سے آمادہ تھے، اس لئے کمزوری کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ فریق مخالف کے افراد لشکر کو بھی آپ نے ایک شب کا موقع غور و فکر اور حق و باطل کے موازنہ کے لئے دے دیا اور اسی مہلت کا نتیجہ تھا کہ عمر سعد کی فوج کا ایک بڑا افسر حر ابن یزید ریاحی جو سب سے پہلے حسینؑ کو گھیر کر کربلا میں لانے کا ذمہ دار تھا، اپنے ضمیر کی ہدایت سے الگ ہو کر فوج عمر ابن سعد سے الگ ہو کر حسینؑ کی جانب آ گیا اور آپ کی نصرت میں جان نثار کی۔

یاد رکھئے کہ ایک داعیٔ حق کی یہ بڑی کامیابی ہے اگر وہ ایک انسان کو بھی گمراہی سے نکال کر ہدایت تک پہنچا دے، اور یاد رکھئے کہ حسینؑ کے اصول کی یہ ایک بہت بڑی فتح صرف اس شب کی مہلت کا نتیجہ تھی جو آپ نے دشمن سے مانگ کر حاصل کی تھی۔

عاشور کی صبح

رات گئی اور دسویں محرم کی صبح نمودار ہوئی۔ عمر سعد نے میدان جنگ میں اپنے صفوف لشکر کو مرتب کیا اور حسینؑ نے اپنی مختصر جماعت کی ترتیب دی اس وقت آپ نے ضرورت سمجھی کہ فریق مخالف کو اپنی بے گناہی پر آخری بار تنبیہ کر دیں، اور اس کثیر التعداد لشکر کے سامنے صورت حال کو واضح کر دیں کہیں ایسا نہ ہو کہ ناواقفیت میں کوئی شخص اس جرم عظیم میں مبتلا ہو اور اس کی ذمہ داری آپ پر رہے۔

آپ ایک ناقہ پر سوار ہوئے اور صفوف لشکر کے سامنے جا کر ایک فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جس میں اپنی خاندانی خصوصیات، رسولؐ اللہ کے ساتھ اپنا تعلق، اپنی اخلاقی پاکیزگی اور جرائم سے علیحدگی نیز رسولؐ اللہ کے احادیث جو آپ کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان قابل تسلیم تھے، ان کو ایک ایک کر کے پیش کیا اور پھر یہ دریافت کیا کہ اس صورت میں کس بنا پر میرا خون تمہارے لئے حلال ہو سکتا ہے۔

فوج کے لوگ جو اقتدار سلطنت کے غلام بنے ہوئے تھے اس سے کیا اثر لیتے مگر آپ نے اپنا فرض ادا کر دیا اور دکھا دیا کہ ایک مصلح کسی وقت بھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتا۔

آغاز جنگ

سب سے پہلے عمر سعد نے ایک تیر چلۂ کمان میں جوڑا اور حسینی جماعت کی طرف لگایا، یہ کہہ کر کہ گواہ رہنا پہلا تیر میں لگاتا ہوں، اور اسی کے ساتھ ہزاروں کمانیں کڑکیں اور ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ یہ تھا پیغام جنگ حسینؑ، اس کے لئے پہلے سے تیار تھے۔ انھوں نے اپنے بہادروں کو آواز

دی کہ ہاں مجاہدو! کھڑے ہو جاؤ، دشمن کے سفیر تمہاری طرف جنگ کا پیغام لے کر آ گئے۔

معرکۂ جہاد

کیا تصویر کھینچی جا سکتی ہے اس موقع کی جب ایک طرف ہزاروں کا لشکر ہو اور دوسری طرف تھوڑے سے بھوکے پیاسے آدمی ہوں جن میں مشکل سے لڑنے کے قابل سو آدمی ہوں گے ورنہ باقی سب تو کمسن بچے تھے اور ضعیف العمر بوڑھے مگر انھوں نے اس طرح جنگ کی کہ صفحۂ تاریخ پر اس کا تذکرہ نمایاں حروف میں باقی رہ گیا۔

وہ گذر گئے مگر ان کی بہادری اور جنگ آزمائی کی یاد آج تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اصحاب کا خاتمہ

پہلے سب سے حسینؑ کے دوست اور انصارؓ جو آپ سے خاندانی تعلق نہ رکھتے تھے وہ ایک ایک کر کے میدان جہاد میں گئے اور شہید ہوئے۔

یہ ایک حیرت انگیز نظام تھا جو اس سخت اور اضطراب انگیز موقع پر انتہائی استقلال سے قائم کیا گیا تھا۔ جب تک اصحاب میں سے ایک بھی زندہ رہا، حسینؑ کا کوئی عزیز میدان جنگ میں جانے نہ پایا اور باوجودیکہ جنگ مغلوبہ بھی ہوئی اور تیروں کی بارش بھی ہوئی، پھر بھی آپ کے کسی عزیز کو زخم تک لگنے نہ پایا۔

ہاں جب اصحابؓ ختم ہو گئے تو عزیزوں کی باری آئی۔

جوان بیٹے کی شہادت

عزیزوں میں سب سے پہلے حسینؑ نے اپنے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو میدان جنگ میں بھیجا، ان کی ماں لیلیٰ خیمہ میں تھیں اور باپ خیمہ کے دروازہ پر اور ان کا چاند دشمنوں کی فوج کی گھٹا میں چھپا تھا۔

باپ نے دیکھا اور ماں نے سن لیا کہ علی اکبرؑ تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر صبر و سکون میں فرق نہ آیا، وہ اس قربانی کے لئے پہلے سے تیار تھے وہ یہ سمجھ کر مطمئن تھے کہ ان کی اسکیم کا ایک

جز پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

بھانجوں بھتیجوں اور دوسرے عزیزوں کی شہادت

عقیلؑ کی اولاد جعفرؑ کی اولاد اور سب سے زیادہ حسینؑ پر مہربان بھائی حسن مجتبیٰؑ کی اولاد یکے بعد دیگرے حسینؑ سے جدا ہوتی گئی ان میں اپنے بھائی کے کمسن یتیم قاسمؑ کی جدائی حسینؑ پر بہت شاق تھی مگر مقصد کی عظمت کے سامنے یہ بھی آسان تھا، حسینؑ نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔

علمدار کی رخصت

جب حسینؑ کے پاس کوئی لڑنے والا نہ رہا تو آپ کے بھائیوں کی باری آئی اور یہ سب شہید ہو گئے تو آخر میں آپ کے لشکر کے علمدار قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ نے اجازتِ جہاد طلب کی۔

حسینؑ کو بہت ناگوار تھا یہ کہ آپ کے لشکر کا نشان جو آپ کے جہاد کا سربلند اعلان تھا وہ جھک جائے مگر اور کوئی قربانی باقی نہ تھی، مجبوراً عباسؑ کو بھی میدان میں بھیج دیا۔

دنیا نے دیکھا جب تک عباسؑ میں جان باقی رہی علم کاندھے پر لہراتا رہا یہاں تک کہ ہاتھ قلم ہو گئے پھر بھی علم کو دونوں بازوؤں سے سنبھالا، عباس گھوڑے سے گرے، حسینؑ کا علم خاک پر آ گیا وہ جھک گیا، مگر نہیں نہیں! وہ علم اتنا سربلند ہوا کہ وہی علم ہر حق پرست کے کاندھے پر ہے۔ جب تک دنیا میں سچائی اور حق گوئی کا نشان ہے، جب تک اسلام کا نام ہے، اس وقت تک حسینیت کا علم دنیا میں بلند ہے اور ہمیشہ بلند رہے گا۔

آخری قربانی

حسینؑ کی بارگاہ میں کوئی سرمایہ حق کی بارگاہ میں نذر دینے کے لئے نہ تھا، مگر نہیں بی فریق مخالف کے تشدد کا آخری تیر باقی تھا اور اس کے لئے حسینؑ کو نشانے کی تلاش تھی انھیں دنیائے انسانیت کے سامنے وہ معصوم ہدیہ پیش کرنا تھا جس پر کسی شریعت اور قانون کی رو سے جرم و گناہ کا الزام نہ آ سکتا ہو۔

ڈھونڈھ لیا، حسینؑ نے یہ آخری تحفہ بھی ڈھونڈھ لیا۔ ربابؑ کی گود میں شیر خوار بچہ پیاس سے

سسکیاں لے رہا تھا۔ ضعیف باپ نے بچے کی حالت دیکھی اور خیمہ کے دروازہ پر اسے گود میں لیا، کہا جاتا ہے کہ دشمن کی فوج سے بچے کے لئے پانی مانگا۔

یہ تھا حسینؑ کا سب سے آخری ہتھیار۔

انسانیت کے ہاتھ پاؤں میں لرزہ پڑ گیا، رحم وکرم کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا جب حرملہ نے تیر چلۂ کمان میں جوڑا اور بچہ کی گردن کو نشانہ بنالیا، بچے نے جان دے دی اور حسینؑ کے مقصد میں لازوال جان پڑ گئی۔

نمائشی انسانیت کی نقاب کا یہ آخری تار تھا جو معصوم بچے کی رگِ گردن نے شکستہ کر دیا۔

اب ہر دھندھلی نگاہ پر بھی کھل گیا کہ اس وقت کے انسانوں کی جتنی جماعت تھی وہ انسانیت سے کتنی دور تھی اور حسینؑ ایسا انسان کامل ان کے ساتھ اتحاد کامل کیسے کر سکتا تھا۔

تکمیل قربانی

حسینؑ کے پاس اب کچھ نہ تھا۔ بس اپنا وجود تھا، یہ مرحلہ حسینؑ کے لئے پہلے ہی بہت آسان تھا ،مگر انھیں تو اپنی قوت برداشت کا انتہائی مظاہرہ کرنا تھا۔

اب جب کہ کسی دوسرے کا انتظار نہ تھا تو حسینؑ تھے اور میدان جہاد۔

اُتنا کہ جس قدر انسانی طاقت کے لحاظ سے حفاظت خود اختیاری کے لئے فرض تھا۔ اتنی جنگ بھی کی، اور دنیا نے دیکھ لیا کہ حسینؑ نے اس فرض کو بھی ویسا انجام دیا جیسا اتنی شکستگی اور بیکسی کے عالم میں کوئی دوسرا انجام دے نہیں سکتا، آخر ایک انسانی جسم اور فولادی تلواروں کا سیلاب۔۔۔۔۔ جسم زخموں سے چکنا چور ہو گیا، گھوڑے کی پشت پر سنبھلا نہ گیا، مجاہد زمین پر آیا، اور دشمنوں کا چاروں طرف سے ہجوم، آخر حق کا مجسمہ تلواروں کا حصہ بن گیا۔ سچائی کی گردن قلم ہوئی اور انسانیت کا سر نیزہ کی نوک پر بلند ہو گیا۔ دشمن نے وہ سب کچھ کیا جو اس کی درندگی کا آخری حصہ ہو سکتا تھا۔ اگر امام حسینؑ کو صرف اپنے راستے سے ہٹانا ہی مقصود ہوتا تو یہ مقصد آپ کے قتل سے پورا ہو گیا مگر نہیں!

آپؑ کی لاش کو پامال کیا گیا، آپ کے اہل حرم کو در بدر پھرایا گیا، صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف آپ کی ہستی کو فنا کرنا مقصود نہ تھا بلکہ ایسے مرکز کو فنا کرنا اور عوام کی نظروں سے گرانا مقصود تھا جو اقتدار حاصل کرنے والی جماعت کے مقاصد سے اختلاف رکھتا تھا۔

یہ ہیں حسینؑ اور یہ ہے ان کا عظیم کارنامۂ جاوید۔ حسینؑ دنیا سے اٹھ گئے مگر وہ زندہ ہیں، ان کا مشن زندہ ہے، اور ان کی بدولت سچائی اور اسلام کا نام زندہ ہے۔

۱۳۶۱ھ میں

حسینؑ کے اس عظیم الشان کارنامۂ شہادت کو تیرہ سو برس ہو جائیں گے اور اس موقع پر آپ کی سیزدہ صد سالہ یادگار کے قیام کا انتظام ہو رہا ہے۔

حسینؑ کی ذات کسی خاص قوم اور اور مذہب سے محدود تعلق نہیں رکھتی بلکہ تمام دنیائے انسانیت سے تعلق رکھتی ہے۔

دیکھنے کی بات ہے کہ وہ انسان کیسا تھا جس نے اصول کی حمایت اور سچائی کی حفاظت میں اس استقلال، انتظام، اور اطمینان کے ساتھ قربانیاں پیش کیں اور ذرا پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

اس بنا پر تمام دنیائے انسانیت کو دعوت دی جاتی ہے کہ حسینؑ کی سیزدہ صد سالہ یادگار کے قیام میں حصہ لے کر انسانی ہمدردی کا ثبوت دیں اور اس انسانی مقصد کو تقویت پہنچائیں جس کے لئے شہید کربلاؑ نے اپنی بے نظیر قربانی پیش کی تھی۔ والسلام

علی نقی نقوی عفی عنہ

(اشاعت اوّل: محرم ۱۳۶۰ھ)

حسینؑ اور اسلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

حسینؑ تاریخی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہیں، ان کی شخصیت اور عظیم کارنامے کروڑوں افراد کے سر عقیدت کو خم کئے ہوئے ہیں۔ تم نے ممکن ہے کہ ان کے عظیم کارنامۂ زندگی کے مطالعہ اور ان کے حیرت انگیز ثبات قدم اور استقلال و تدبر سے بھرے ہوئے بے مثال اقدام اور قربانی کے حالات پر اطلاع حاصل کرنے کا موقع نہ پایا ہو، لیکن کم سے کم تم نے حسینؑ کا نام ضرور سنا ہوگا اور اتنا جانتے ہو گے کہ وہ کسی بڑے تاریخی واقعہ کے ہیرو ہیں۔ ممکن ہے یہ خیال بھی تمہارے دل میں کبھی آتا ہو کہ یہ حسینؑ کون تھے اور آخر اس واقعہ کے خصوصیات کیا ہیں جو اس بڑے انسان کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ اچھا تو پھر آؤ۔ صبر و سکون کے چند لمحے مجھ کو رعایت دو۔

میں تم کو حسینؑ اور ان کے مشن سے جس کے سلسلہ میں انہوں نے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے میں دریغ نہیں کیا مختصر لفظوں میں شناسا کراؤں جس سے تم کو حسینؑ اور ان کے اقدامات کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل سکے۔

حسینؑ کون تھے؟

حسینؑ کے ساتھ اسلام کا روحانی تعلق

چھٹی صدی عیسوی میں جبکہ دنیا تاریکی کے عظیم دور سے گزر رہی تھی اور انسانی تمدن کی کشتی تفرقہ اور فساد کے طوفان سے ڈانواڈول تھی جزیرہ نمائے عرب سے اسلام کا آفتاب طالع ہوا جس کی ابتدائی کرنیں اگرچہ حجاز کے مرکزی مقام مکہ معظّمہ سے ظاہر ہوئی تھیں لیکن رفتہ رفتہ اس کی روشنی شرق و غرب عالم پر چھاگئی اور دنیا کو روشن کر دیا۔

یہ ہر دلعزیز اور عالمگیر مذہب جس کا نام ہے اسلام اپنے ابتدائی دور میں ترقی و اشاعت کی حیثیت سے دو عظیم شخصیتوں کی جانفشانی اور انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ایک پیغمبر اسلام محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، دوسرے ان کے چچازاد بھائی علیؑ بن ابی طالب۔

اگرچہ دوسرے بہت سے صحابہ کرام نے جو خدمات انجام دی ہیں اور جاں نثاری اور فداکاری کے فرض کو انجام دیا ہے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور وہ تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہیں لیکن ان کو اسلام کے سنگ بنیاد نصب ہونے اور اس کے بعد والے ابتدائی مراحل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ اس کے بعد انہیں اساسی حیثیت دی جا سکتی ہے بلکہ وہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن حقیقتاً انہی دو بزرگوں کے ثبات قدم اور حیرت ناک استقلال اور اپنے خون کو پسینہ سمجھ لینے کا اثر تھا کہ اسلام کی بنیادیں قائم ہوئیں اور حیرت ناک تیزی کے ساتھ اس کی اشاعت ہوئی۔

قدرت کو ان دونوں بھائیوں کے اتحاد کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا تھا۔ حضرت رسول اکرمؐ کی اکلوتی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ حضرت علیؑ بن ابی طالب کا عقد ہوا اور اس طرح علیؑ کو بھائی ہونے کے علاوہ ایک قسم کی فرزندی بھی رسولؐ سے حاصل ہوگئی اور یہ دونوں سلسلے جو کہ اشاعت اسلام میں متحد تھے اور زیادہ استحکام کے ساتھ ایک نقطہ پر جمع ہوگئے۔

انہی ماں باپ حضرت فاطمہؑ اور علی بن ابی طالبؑ سے دو بچے متولد ہوئے جن کا نام تھا حسنؑ او رحسینؑ، اور عین اس وقت کہ جب اسلام ایک نوعمر بچہ کی حیثیت سے رسول اسلامؐ کی آغوش میں پرورش پا رہا تھا ان دونوں بچوں کی ولادت ہوئی جن کی پرورش بھی رسولؐ کی آغوش میں شروع ہوئی اور اسطرح ان دونوں کا اور اسلام کا گہوارۂ تربیت ایک قرار پایا، ایک طرف نانا کہ جو بانیِ اسلام تھے اور دوسری طرف باپ کی جو مجاہد و محامی اسلام تھے ان کے خدمات اور کارگزاریاں سامنے تھیں اور اس ماحول کے باعث اسلام کے ساتھ روحانی تعلق اور دلی ارتباط ان دونوں بچوں میں بچپنے ہی سے راسخ ہوگیا اور جتنی عمر بڑھتی گئی الفت اسلام کا جذبہ مستحکم تر ہوتا گیا۔

مذہبی عقائد سے جن کی بناء پر یہ دونوں بزرگ (حسنؑ وحسینؑ) امام خلق وحقیقی ذمہ دار اسلام قرار پاتے ہیں بالکل الگ ہوکر تاریخی اعتبار سے بھی یہ ایک مسلمہ حقیقیت ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی زندگی پابندیِ شریعت اور حفظانِ اصول مذہب کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا مکمل آئینہ اور احکام شریعت کا مجسم نمونہ تھی اور اس لئے بھی اسلام اور شریعت اسلام کے ساتھ جتنی گہری ہمدردی ان کو ہوسکتی تھی کسی کو نہیں۔

بنی امیہ کا دور حکومت یا تاریخ کا ایک سیاہ ورق

پیغمبرؐ اسلام کی وفات اسلام کے لئے ایک سخت ترین مصیبت تھی جس کے بعد ہی سے اس کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ شروع شروع میں کچھ عرصہ تک اس کی سادگی اور حقیقت پروری، ظاہری جاہ وعزت سے بےتعلقی اور مادی ساز وسامان سے کنارہ کشی ایک حد تک محفوظ تھی لیکن ادھر فتوحات نے ترقی کی، قیصر وکسریٰ کے ممالک پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا، شاہانہ تزک واحتشام اور سلطنتی جاہ وجلال سے آنکھیں دوچار ہوئیں۔ ادھر اسلامی افراد میں بھی کشورآرائی اور جہاں بانی کے جذبات نے پرورش پائی اور مذہبی پابندیوں کے بجائے سیاسی منصوبہ بازیوں اور کمزوروں کے مقابلہ میں جابرانہ طاقتوں کے مظاہرہ کا دور دورہ ہوگیا۔

رسولؐ اور ان کے خاندان (بنی ہاشم) کے قدیمی حریف بنی امیہ کو جو برابر رسولؐ سے اشاعت اسلام کے خلاف اپنی طاقت کے آخری نفس تک جنگ کرتے رہے اور سب سے آخر میں امید کے تمام رشتے منقطع ہوجانے کے بعد بادل ناخواستہ اسلام لائے تھے انہیں ان انقلابات میں اپنے منصوبوں کے پورا کرنے کا اچھا موقع ملا۔

حضرت خلیفہ ثانی (عمر بن الخطاب) ہی کے دور میں شام پر ان کا تسلط ہوگیا تھا جو صرف گورنری کی حیثیت سے تھا لیکن قدم جمانے کیلئے بہت کافی تھا۔

تیسرے دور میں خوش قسمتی سے مرکزی حکومت یعنی خلافت کا سہرا بھی بنی امیہ کے سر پر بندھا

اور اس گروہ کو اسلام کے ساتھ اپنے دیرینہ منصوبوں کے پورا کرنے کا پورا موقع مل گیا۔

حضرت خلیفہ ثالث کے ساتھ حسن ظن کو راہ دیتے ہوئے یہ کہا جاسکتا کہ صاف وسادہ لوح خلیفہ وقت کو اپنے خاندانی افراد کے اغراض ومقاصد اور ان کے اطوار وحالات کی اطلاع نہ تھی، لیکن یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ اس عہد میں صحابہ رسولؐ اور سچے اسلامی فرزندوں کے ساتھ انتہائی شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے اور اپنوں کی جانبداری اور ان کے بدترین مظالم کی حمایت انتہا تک پہنچ گئی جس کے بعد پانی سر سے اونچا ہوگیا اور مظالم کو برداشت کرتے کرتے صبر کے پیمانے لبریز ہوگئے جس کا افسوس ناک نتیجہ قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تاریخ کے مطالعہ سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔ اس کے بعد کے حالات نے پلٹا کھایا اور خلافت کے لئے بڑے بڑے صحابہ کرام اور اہل حل وعقد کے اتفاق آراء سے حضرت علیؑ کا انتخاب ہوا اور سب نے باتفاق آپ کی بیعت کی لیکن شام کے گورنر معاویہ بن ابی سفیان جو وہاں پورے طور پر قبضہ جما چکے تھے وہ اسلامی متفقہ فیصلے کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھے نہ ہوئے اور خونِ حضرت عثمان کی طلب کے بہانے سے علیؑ بن ابی طالبؑ سے برسرپیکار ہوئے، چنانچہ جنگ صفین کے سیکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا اسی کا کرشمہ تھے۔

آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کے ساتھ ہوا جس میں اگر دیانت وامانت کا جوہر کارفرما ہوتا تو یقیناً مسلمانوں کے درمیان سے ناگوار اختلاف کا خاتمہ ہوسکتا تھا لیکن افسوس کہ حرص وآز کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ وفساد کا پیش خیمہ قرار دے دیا اور اختلاف وافتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئی۔

یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کے ساتھ جم گئے تھے۔ ادھر امیر المومنین علیؑ کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہلبیتؑ کا طوفان پوری قوت پر بلند

ہو گیا اور دمشق بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرأت کے ساتھ اہل بیت رسولؐ پر لعن وطعن کا بازار گرم ہو گیا۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

امیر معاویہ اگرچہ صحابۂ رسولؐ کی ایک ممتاز فرد سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کے دورحکومت کے یہ افسوس ناک خصوصیات ہیں جو اسلامی تاریخ میں جلی حروفوں سے مرقوم نظر آتے ہیں اور ان سے اس زمانہ میں اسلام کے ضعف وکسمپرسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۱) وضع احادیث اور خداؤرسولؐ پر افترا اور بہتان کوئی جرم نہ رہا بلکہ اس پر مخصوص مصالح کے تحت میں جائزہ وانعام دیا جاتا تھا چنانچہ ابوالحسن علی بن محمد مدائنی جو اسلامی مورخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اس نے کتاب الاحداث میں اس زمانہ کے حالات درج کرتے ہوئے لکھا ہے:

کتب معاویة الی عمّاله فی جمیع الاٰفاق ان لا یجیز والاحد من شیعة علی شهادته و کتب الیهم ان انظروا من قبلکم من شیعة عثمان و محبیه واهل ولا یته الذین یروون فضائله ومناقبه فادنوا مجالسهم وقربوهم واکرموهم واکتبوا الیّ بکل مایروی کل رجل منهم واسمه واسم ابیه وعشیرته ففعلوا ذلك حتی اکثروا فی فضائل عثمان ومناقبه لما کان یبعثه الیهم معاویة من الصّلات والکسآء والحبآء والقطائع ویفیضه فی العرب منهم والموالی فکثر ذلك فی کل مصر وتنا فسوا فی المنازل والدنیا فلیس یجد امرؤمن الناس عاملا من عمال معاویة فیروی فی عثمان فضیلة اومنقبة الا کتب اسمه وقربه وشفعه فلبثوا بذلك حینا۔

”معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع مرتبہ کے میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ وانعام سے اس کو مالا مال

کر دو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں احادیث کثرت سے ہو گئے اور ایک مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔

ثم کتب الی عمّاله ان الحدیث فی عثمان قد کثروفشا فی کلّ مصر و کلّ وجه وناحیة فاذاجاء کم کتابی هذافادعواالناس الیٰ الرّوایة فی فضائل الصحابة والخلفاء الاوّلین ولا تترکوا خبرا یرویه احد من المسلمین فی ابی تراب الاوأتونی بمناقض له فی الصحابة فان هذااحبّ الیّ واقرّ لعینی وادحض لحجة ابی تراب وشیعة واشد علیهم من مناقب عثمان وفضله فقرأت کتبه علی الناس فرویت احادیث کثیرة فی مناقب الصحابة مفتعلة لاحقیقة لها وجدّالناس فی روایة مایجری هذاالمجری حتیٰ اشادوابذکرذلك علی المنابر والقی الی معلّمی الکتاب فعلّموا صبیانهم من ذلك الکثیر الواسع حتیٰ رووه تعلّموه کما یتعلمون القراٰن وحتیٰ علموه بناتهم ونسائهم وخدمهم وحشمهم فلبثوا بذلك ماشآء الله۔

”پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے فضائل میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لئے بھی بیان کرو۔ علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے، بس پھر کیا تھا، فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور سیکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب میں تصنیف ہو گئیں جن کی کچھ اصلیت نہ تھی۔ واعظین ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں عورتوں اور غلاموں کنیزوں تک کو یاد کرانا ضروری سمجھتے تھے۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہو کر بے اعتبار

بن گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب وشتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا، دمشق وشام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ رسم ادا ہوتی رہی اور علیؑ بن ابی طالب کی نسبت اس جسارت کا سلسلہ قائم رہا۔

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید وفروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسولؐ) نے شراب کے بار سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا حضرت معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے عبدالرحمن نے سنا تو کہا خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالتمآبؐ نے ممانعت فرمائی ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا برتنوں میں رکھی جائے۔

(دیکھو کتاب اسد الغابہ ابن اثیر جزری ج ۳ ص ۲۹۹ واصابہ حافظ ابن حجر عسقلانی ج ۲ ص ۴۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں بہت خوبی سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا، سیکڑوں کلمہ گویوں کی گردنیں زیر تیغ ہو گئیں۔ سمرۃ بن جندب اور بسر بن ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیاہ کاریاں اسی عہد کا نامۂ عمل ہیں۔ عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دئے گئے جس سے وہ مجنوں ہو گئیں۔

(ملاحظہ ہو استیعاب ابن عبد البر مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول ص ۶۶)

(۵) مذہب کا وقار بالکل کم ہو رہا تھا اور بڑے سے بڑے ارکان مذہبی کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ امیر معاویہ نے بڑے فخر سے جاریہ بن قدامہ اور احنف دو شخصوں کی نسبت فرمایا کہ اشتریت منهما دينهما "میں نے ان سے ان کا مذہب مول لے لیا ہے" استیعاب ج ۱ ص ۱۵۴

مصر کے لوگوں نے دربار میں آکر السلام علیك یا رسول الله کہا اور اس کو گوارا کر لیا گیا سزا دینا تو بڑی بات تھی معمولی سی زبانی تنبیہ بھی نہ کی گئی

(ملاحظہ ہو تاریخ طبری ج ۶ ص ۱۸۴)

ان دونوں واقعوں کو ہم نے اپنے رسالہ "قاتلان حسین کا مذہب" میں تفصیل سے لکھا ہے اور ان سے اس وقت کے اسلامی احساسات وجذبات کی کمزوری کا پتہ چلتا ہے۔

امیر معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انہوں نے اپنی عمر گزار دی مگر مسلمانوں کے سر پر ظلم وستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جس نے اسلام کے شیرازہ کو بالکل درہم برہم کر دیا۔ یزید کے اخلاق وعادات سے امیر معاویہ بے خبر تھے؟ نہیں ہرگز نہیں، وہ خود یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر مکی اپنی کتاب "تطهير اللسان والجنان" میں جو حضرت معاویہ کے مناقب وفضائل میں تصنیف کی گئی ہے لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ رونے لگے، مروان نے کہا کہ کیوں کیا ہوا؟ آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ

اىّ شئ كنت عنه عزوبا كبرت سنىّ ورقّ عظمى و كثرت الدموع فى عينى ورميت فى احسن ما يبدو منى ولولا هواى فى يزيد ابصرت قصدى"

"دنیا میں کون راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو، اب سن زیادہ ہو گیا، ہڈیاں گھل گئیں، جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہ راست کو حاصل کر لیتا"

(حاشیہ صواعق محرقہ مطبوعہ مصر ص ۵۶)

علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:-

قوله ولولا هواى الخ فيه غاية التسجيل على نفسه بان مزيد محبته ليزيد اعمت عليه طريق الهدىٰ واوقعت الناس بعده مع ذلك الفاسق المارق فى الرّدىٰ۔

"ان الفاظ میں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کرلیا ہے کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق وفاجر کے ہاتھوں میں مبتلا کر دیا جوان کی ہلاکت کا باعث ہوا"

(حاشیہ صواعق محرقہ ص ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال وعادات سے بے خبر تھے اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی، یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی اور زر وجواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کردئے گئے ۔ یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق وفجور نے دنیا کو پر کردیا ۔ ہر طرف معصیت خدا اور مخالفت شریعت کا بازار گرم ہوا، مذہب بازیچۂ اطفال اور اسلام زینتِ طاقِ نسیاں بن گیا ۔ یزید کے افعال وعادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو پر نہیں کیا جاسکتا، اسلام کی مستند تاریخیں ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں ۔ واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویریں کھینچی ہے وہ حسب ذیل ہے ۔

کان رجلاینکح امھات الا ولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمرویدع الصّلوٰۃ ۔

"وہ ایسا شخص تھا کہ اپنے باپ کی منکوحہ کنیزوں اور اپنی بہنوں بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا"

(ملاحظہ ہو: صواعق محرقہ، علامہ ابن حجر مکی ص ۱۳۵)

اب بتاؤ کہ کیا اسلامی بادشاہ یا خلیفۃ المسلمین اور مجوسیوں میں کچھ بھی فرق ہوا؟ حد سے زیادہ فاسق اشخاص بھی اپنی ماں بہنوں بیٹیوں سے مقاربت کرنا حمیت وغیرت بلکہ انسانیت کے خلاف سمجھتے ہیں ۔

بادشاہ وقت کی ان عادات واخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا اور مذہبیت بالکل فنا ہوگئی

تھی ۔ لطف یہ ہے بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے اور کسی کے دہن سے صدائے اعتراض بھی بلند نہ ہوتی تھی ۔ سوائے پانچ شخصوں کے تمام صحابہ وتابعین یزید کو خلیفۂ رسولؐ تسلیم کر چکے تھے ۔ ان پانچ میں سب سے پہلا نام حسینؑ بن علیؑ کا ہے اور آپ کی دیکھا دیکھی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر اور عبداللہ بن عباس ۔ یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا ۔

گذشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے کہ علیؑ بن ابی طالب کا فرزند اور خاندان رسولؐ کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو اسلام کا نام بھی باقی نہ رہ سکتا ۔

حسن مجتبیٰؑ کی صلح مجاہدہ کربلا کی تمہید تھی

ہر اقدام جو اپنے وقت پر ہو وہ مفید نتیجہ خیز اور مؤثر ہوتا ہے لیکن اگر وقت سے پہلے کیا جائے تو وہ نتیجۃً مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتا ہے بلکہ اپنے کرنے والے کو اکثر ہمیشہ کے لئے مورد الزام بنا دیتا ہے ۔

واقعات کی رفتار یکساں نہیں رہتی بلکہ تدریجی حیثیت سے ترقی کرتی ہے اور ان کا طریقۂ علاج بھی اسی اعتبار سے مختلف ہوجاتا ہے ۔ عالم کا نظام اسی پر قرار پایا ہے اور انسان کی افتاد طبع یوں ہی واقع ہوئی ہے اس میں تغیر وتبدل کا امکان نہیں ۔

زخم رسیدہ پکے ہوئے جز و بدن ہاتھ یا پیر کا علاج کرو، پھاہے لگاؤ، مرہم بدلو، ضرورت ہو تو بار بار نشتر دلواؤ، پھر اگر نہ اچھا ہوا اور اس کی سمیت کے جسم میں سرایت کرنے کا خوف ہو تو اسے کاٹ کر بھی پھینک دو ۔ کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا لیکن اگر زخم پیدا ہونے کے ساتھ ہی یا کوئی علاج معالجہ کرنے کے پہلے ہی کاٹ ڈالتے تو ضرور مورد الزام اور عام طور پر بے عقل سمجھے جاتے حالانکہ

یہ طرزِ عمل وہی تھا جو بعد میں اختیار کئے جانے پر ممدوح و مستحسن سمجھا جارہا تھا۔دشوار گزار حالات کی اصلاح کے لئے قربانی اور وہ بھی جان کی قربانی کامیاب اور موثر ترین حربہ ہے لیکن سب سے آخری، جب تمام وسائل و ذرائع ختم ہوجائیں اور کوئی تدبیر کارگر نہ ہو اس وقت اس کا درجہ ہے۔وہ جہاں تک آخری رہے وہیں تک ممدوح ہے اور اگر اس سے پہلے عمل میں آگئی تو اس پر جلد بازی، غیر موقع شناسی اور ناعاقبت اندیشی وغیرہ کا الزام آجانا ضروری ہے جس کے بعد اس کو حق بجانب نہیں سمجھا جاسکتا اور اسی کے ساتھ اس کی کامیابی اور تاثیر رخصت۔

حالات کی اصلاح کے لئے احتجاج واستغاثہ، مصالحت و رواداری، شرط وشروط اور قرارداد اور معاہدہ، یہ ایسی چیزیں ہیں جن کا اختیار کیا جانا ابتدائی حدود میں ضروری ہے۔

بے شک جب یہ سب وسائل و ذرائع اختیار کئے جانے کے بعد ناکام ثابت ہوں تو پھر من جرب الهجر حلت به الندامة "آزموده را آزمودن جهل است" کے مطابق انسان سے ان ذرائع کا مطالبہ نہ ہوسکے گا اور اس کی رفتارِ عمل کو آگے بڑھ کر کسی دوسرے اقدام تک پہنچنے کا حق پیدا ہوگا۔

یہی تدریجی رفتار اقدام عمل میں جب تک قائم ہے کامیابی کی توقع ہے ورنہ نہیں۔ایک بات ہوجانے پر پہلے ہی دن مرنے مارنے پر آمادہ ہوجانے والا مغلوب الغضب کہا جائے گا۔وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں برخلاف اس کے اگر تمام دیگر ذرائع واسباب کے ذریعہ سے اتمام حجت کے بعد انسان کسی اہم مقصد کے لئے جان دینے پر تیار ہوجائے تو فداکاری وجاں نثاری اور موثر قربانی قرار پائے گی۔

ایک انسان اگر اپنے افعال واعمال میں توازن کو ملحوظ رکھتا اور اپنی کارگزاریوں میں صرف جذبات کا فرماں بردار نہیں بلکہ عقلی غور وتدبر کا پابند ہے تو اسے اس نظام کا پابند ہونا ضروری ہے۔

شام کی اموی سلطنت کے ہاتھوں بے شک مذہب خطرہ میں تھا اور حق وصداقت پامال ہورہے

تھے جس کی اصلاح کے لئے قربانی درکار تھی لیکن اس قربانی کے حق بجانب قرار پانے کے لئے دوسرے پرامن اور صلح پرور وسائل وذرائع کے صرف کئے جانے کی ضرورت تھی۔

بیشک اگر امام حسینؑ ایکی ایکا بغیر کسی قسم کے سابقہ حالات کے یزید کی بیعت سے کنارہ کشی کرکے باوجود فقدان اعوان وانصار مخالفت پر، جس کا لازمی نتیجہ آپ کا قتل ہونا تھا تیار ہوجاتے اور ایسا کرتے تو ان سوالوں کا پیدا ہونا ناگزیر تھا کہ آخر امامؑ نے اتحادِ عمل کے ساتھ حالات کے درستی کی کوشش کیوں نہ کی؟ مخصوص شرائط کے ساتھ صلح کرکے اپنے مقاصد کو کیوں نہ حاصل کیا؟ کم سے کم امور سلطنت سے بے تعلقی اختیار کرکے مدینۂ رسول میں قیام پذیر کیوں نہ رہے اور کربلا آکر اپنے تئیں معرض خطر میں کس لئے ڈالا؟

یہ سوالات پیدا ہونے کے بعد جن کا کوئی صحیح حل بھی موجود نہ تھا یقیناً آپ کا قتل ہونا صرف جذبات کی کارفرمائی کا نتیجہ قرار پاتا اور اس لئے نہ قابل ستائش ہوتا اور نہ موثر وکامیاب، لیکن واقعہ یہ تھا کہ امام حسینؑ کا اقدام عمل یا قربانی وہ ایک مکمل نظام کے تحت میں واقع ہوا تھا جس کے لئے برسوں کی طویل مدت کے حالات موقع کو قریب لارہے تھے یہاں تک کہ ۶۱ھ میں اس کا وقت آگیا۔

شروع شروع میں امام حسنؑ کا صلح کرلینا اور مخصوص شرائط معاہدہ کے ساتھ سلطنت کی ذمہ داریوں سے دستکش ہوکر دس برس خاموشی کی زندگی بسر کرنا، اور پھر دس ہی برس تک خود امام حسینؑ کا بھی عملی حیثیت سے خاموش رہ کر حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے اکثر زبانی یا مکتوبی احتجاج کرتے رہنا، لیکن باوجود اس کے حالات کا رویہ اصلاح ہونے کے بدلے بد سے بدتر ہوتے جانا، شرائط معاہدہ کا ٹھکرادیا جانا، صلح نامہ کے دفعات کا پامال ہوجانا، زبانی احتجاج واستغاثہ پر کوئی شنوائی نہ ہونا بلکہ اپنے انسانیت سوز اور اسلام کش افعال پر بیش از بیش اصرار کیا جانا اور اس سلسلہ میں پانی کا سر سے اونچا ہوجانا اور معاملات کا حد سے گزر جانا وہ تھا جس نے امام حسینؑ کے لئے اس عظیم اقدام کا موقع پیدا کردیا تھا کہ جو انہوں نے کربلا کی سرزمین پر انجام دیا۔

یہ اعتراض تاریخی حالات سے بے خبری کا نتیجہ ہوگا کہ امام حسینؑ نے خود اپنی جان کو معرض خطر میں ڈالا۔ اگر وہ مدینہ میں قیام کرتے اور یزید سے برسرِ پرخاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا۔

یہ خیال بالکل بے حقیقت ہے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علیؑ بن ابی طالب کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتے تھے اور ان کی خاموش ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسن مجتبیٰؑ نے باوجود صلح جوئی اور خاموشی وکنارہ کشی کے کیا پھل پایا؟ یہ کہ زہر قاتل کے اثر سے کلیجہ کے ٹکڑے ہوئے اور دشمنوں کی ظلم وبیداد کا خاموش افسانہ سناتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ جناب خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی اپنی کتاب یزید نامہ ص ۸۳ میں لکھتے ہیں:۔

''پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم وجدید محاکمہ تاریخی وقانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کرسکتا۔''

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسینؑ عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کردیا جاتا جس طرح حضرت امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا۔

اس وقت آپ کی جان بھی جاتی اور افرادِ بشر کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا بھی کوئی طریقہ نہ ہوتا بلکہ جس طرح اس سے پہلے امام حسنؑ کی شہادت سے انکار کیا جاتا رہا اسی طرح حضرت کی شہادت سے بھی انکار کرنا ضروری خیال کیا جاتا، اور یہ یقیناً یزید کی فتح اور حسینؑ کی شکست قرار پاسکتی تھی، کیوں کہ اس حالت میں اول الذکر نے اپنے مقصد کو حاصل کیا، حسینؑ کے وجود کو دنیا سے محو کردیا اور پھر عالم کے سامنے اپنے تئیں بری بھی ثابت کردیا اور حسینؑ نے اپنی جان سے ہاتھ دھویا اور کوئی نتیجہ خیز اثر بھی دنیا میں نہ چھوڑا، بھلا حسینؑ سے محیر العقول تدبر واستقلال کی

مالک ہستی سے کب توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس پہلو پر متوجہ نہ ہو۔ حسینؑ نے اپنے معاملہ کو دو مختلف صورتوں میں منحصر پایا: ایک یہ کہ خاموش طریقہ پر اپنی جان سے ہاتھ دھوئیں اور دین اسلام وشریعت نبویہ بھی یزید کے افعال واقوال سے محو ہوکر رہے، دوسرے یہ کہ اپنی ہستی کو ظاہری صورت میں دستِ فنا کے سپرد کرکے ہمیشہ کے واسطے اپنی اور اپنے نانا کی تحریک کو زندہ کرکے اسلام کا ایک پائدار نقش چھوڑ دیں، فرزند رسولؐ نے اپنے عظیم تدبر وعاقبت اندیشی سے کام لے کر دوسری صورت کو ترجیح دی اور اسلام کو زندہ کرنے کے ساتھ اپنی موت کو اپنے اور اسلام دونوں کی فنا کے مقابلہ میں اختیار کیا۔

حسینؑ نے اپنی جان دے کر اپنے مخالفین کے مفاد کو ہمیشہ کے لئے پامال کردیا، اور یہی وہ عظیم فتح ہے جس کو حضرت نے ظاہری صورت میں فنا ہوکر حاصل کیا۔

حسینؑ کا اقدام عمل خالص تبلیغی شان رکھتا تھا اور تدبر وسیاست کا بہترین نمونہ تھا

امام حسینؑ درحقیقت مدینہ سے اس بات کا بیڑا اٹھا کر نکلے تھے کہ دنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کردیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مقصد کی اشاعت اور یزید کے ننگ انسانیت افعال کو طشت از بام کرنے میں وہ تمام وسائل وذرائع اختیار کئے جوان کے عظیم تدبر وسیاست کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ دیکھو کہ حسینؑ نے مدینہ رسولؐ کو چھوڑنے کے بعد مکہ معظّمہ کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا۔ مکہ معظّمہ کا قیام سطحی نظروں میں تو اس غرض کے لئے تھا کہ اس مقام مقدس میں خوں ریزی حرام ہے لہٰذا ان کی زندگی دشمنوں کے خطرہ سے محفوظ رہے گی لیکن یہ نقطہ نظر ایسے شخص کے لئے تسلیم کیا جاسکتا ہے جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسینؑ کو جو مرنے پر کمر باندھ چکے تھے اور پورے طور سے آخر تک ہونے والے واقعات پیش نظر رکھتے تھے جس کو برابر الفاظ میں

بتلاتے بھی رہتے تھے ان کی نسبت اس خیال کو کوئی وقعت نہیں دی جاسکتی۔

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظّمہ قلب جزیرۃ العرب اور عالم اسلام کا مرکز تھا، اطراف وجوانب کے قافلے برابر آتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مستطیع مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت اشہرِ حج میں چاروں طرف سے مختلف قبائل عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ عمل درآمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کو باطل کرنے کی ضرورت نہ سمجھی تھی عرب کے اس خطہ کو تمام مختلف الخیال قبائل عرب کا محل اجتماع ہونا لازمی تھا، وہ مشہور کانفرنسیں جو شعروسخن اور خرید وفروخت وغیرہ کے لئے قائم ہوتی تھی جن کو اسواق العرب کہا جاتا ہے ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ وطائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوتی تھیں۔

امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی، اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہوگئے ہوں اور حسینؑ کو ان کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسولؐ کا نواسا، سلطان حجاز وعراق کا فرزند، ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی وجواد، جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا بزرگ خاندان، یہ عنوان وہ تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہیں ہوسکتی تھی۔

حسینؑ نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا مکہ میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا ہم یہ نہیں کہنا چاہتے کہ حسینؑ اپنے لئے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ روابط بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کا خیال رکھتے تھے۔ نہیں، ہرگز نہیں، اگر وہ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ اس میں کامیابی نہ ہوتی۔

یمن بالکل نزدیک تھا، جس کا اسلام علیؑ بن ابی طالب کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علیؑ بن ابی طالبؑ اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔

طائف بھی کچھ اولادِ رسول کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسولؐ کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا، وہ اپنے تئیں ایک عظیم الشان بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے، مگر حسینؑ کا قیام مکہ معظّمہ میں صرف اس لئے تھا کہ جمہور عرب کے اندر صورت حالات کی طرف ایک توجہ پیدا ہوجائے اور یزید کے افعال واعمال کا چرچا ہونے لگے۔

حسینؑ کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا حضرت کے پابہ زنجیر کر لئے جانے کا سامان کیا گیا ہو بہرحال نامعلوم اسباب وعلل کے ماتحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہونا اور زمانہ حج کے گزرنے کا انتظار بھی نہ کرنا، اس کو امام کے تبلیغی مقصد میں پورا دخل ہے۔

ایکی ایکا خلاف توقع حسینؑ کا حج ترک کر دینا اور تمام اہل وعیال کے ساتھ مکہ معظّمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک لہر دوڑادی اور اگر کوئی تاریخ اس موقع کی قلم بند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور نظر آتا کہ اس موقع پر کن خیالات کا اظہار کیا جاتا تھا۔

حسینؑ بن علیؑ کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہ کیا؟ ان تمام اہل وعیال واقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسینؑ سے بیعت کا طالب ہے) **لاحول ولا قوۃ!** بھلا ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے؟ فرزند رسولؐ اور یزید ایسے شراب خور اور زناکار فاسق وفاجر کی بیعت کرے! اچھا پھر مکہ معظّمہ میں کیوں قیام نہ کیا؟ کس لئے حج کو بھی ترک کر دیا؟ جان کا خطرہ تھا، شاید مکہ میں حسینؑ کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے۔ توبہ توبہ! اس سے بڑھ کر سفا کی وظلم کیا ہوگا کہ فرزند رسولؐ کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے۔

یہ تذکرے وہ ہوں گے جو مکہ معظّمہ اور اس کے اطراف وجوانب میں اکثر باخبر حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری تھے۔

وہ زمانہ کہ جب طرق مراسلت ومخابرت مسدود تھے۔ تار ٹیلیفون وغیرہ خبر رسانی کے ذرائع

نایاب، اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا نہیں ہوسکتا تھا۔ مکہ سے روزانہ لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ جو شخص تازہ اپنے شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کی ضمن میں حسینؑ کے نقل وحرکت اور اس کے اسباب وعلل کا بیان کرنا ضروری تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں تھا کہ امامؑ کے لئے کوئی بڑا لشکر جمع ہوجائے، لیکن مطلب صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت ہوجانے کے سبب حسینؑ کی شہادت عام طور سے نامعلوم اسباب وعلل کا نتیجہ قرار نہ پائے تاکہ اہل شام کو اپنے دل سے اس کے لئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسینؑ کی مظلومیت وحقانیت مخفی ہوجائے یقیناً اگر امامؑ کی طرف سے ان طرق نشر واشاعت کو عمل میں نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امامؑ کی شہادت کو طرح طرح کے لباس پہنائے جاتے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسینؑ کا خون رائگاں چلا جاتا بایں معنی کہ آپ اپنی جان بھی ہاتھ سے کھوتے اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں چھوڑ کر نہ جاتے اور نہ وہ مقصود جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ امام شہید ہوئے اور تمام دنیا نے اس بات کو تسلیم کرلیا کہ وہ ناحق قتل کئے گئے۔ شام کا حاکم اور اس کے دشمن انسانیت وزراء اور ساتھی کسی تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پاسکے۔ اسے خداوند عالم کی قوت قاہرہ کے بعد حسینؑ کے تدبر سے تعلق ہے اور وہ اسباب وعلل شہادت کے نشر واشاعت کا نتیجہ تھا حسینؑ نے اپنی نقل وحرکت کے وجوہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کردیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کرالیا، اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ کیا ہوسکتی ہے؟۔

حسینؑ کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا، عراق، یمن، طائف وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آرہے تھے، ادھر امام حسینؑ اپنے اہل واقرباء، انصار واصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ وخرگاہ تمام اسباب ساتھ لئے ایک بڑے قافلہ کی صورت میں مکہ سے جارہے تھے۔ عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستہ میں چار پانچ آدمیوں کا بھی قافلہ نظر آئے تو کھوج ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ

ہیں؟ کہاں سے آتے ہیں؟ پھر کہاں امام حسینؑ کا شاندار قافلہ اور اصحاب واعوان کا مختصر لشکر، اس پر طرہ یہ کہ حج کو دو دن باقی رہے مکہ معظّمہ کی طرف سے آرہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظّمہ کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے! یہ وجوہ یقیناً جاذب نظر اور جالب توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جارہا ہے؟ اور حسینؑ کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے ہیں۔ چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں۔

فرزدق سے ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ بن مطیع وعمر بن عبدالرحمن مخزومی بھی راستہ میں خلاف توقع امام سے دوچار ہوگئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علیؑ اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانۂ خدا کو مجبوری چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کردیتا تھا۔

کربلا کی سرزمین پر تبلیغ

راستہ کے تمام اہم واقعات کو چھوڑتے ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کربلا کی سرزمین پر حسینؑ سے ظاہر ہوئی۔ وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں طرف سے امام پر راستہ بند کردیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین ومذہب بلکہ انسانیت وغیرت کو خیرباد کہہ کر فرزند رسولؐ کے قتل پر کمر باندھ لی تھی۔ ان کا گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسینؑ اسباب سے واقف تھے لیکن ایک مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کر دے اور تبلیغ ودعوت میں کوتاہی نہ کرے اور اس فرض کو امامؑ نے خوب ادا کیا۔

ایک شب کی مہلت نماز کے لئے اور مفاد اسلام کی بے نظیر تبلیغ

۹ محرم کو اس وقت کہ جب خونخوار لشکر کی یورش تھی اور حسینؑ اور ان کی مختصر جماعت کے قتل کے

لئے حملہ کر دیا گیا تھا، حسینؑ نے اپنے بھائی کو بھیج کر ایک شب کی مہلت مانگی، کیوں؟ کیا اس لئے کہ حسینؑ اپنے اہل حرم سے رخصت ہولیں، اپنے عزیزوں کو دل بھر کر ایک رات اور دیکھ لیں یا ایک شب میں کوئی سامان جنگ کرلیں؟ نہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آج کی رات پھر خدا کی عبادت کرلیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ شب اس طرح گزاری کہ **لهم دوی کدوی النحل**
''اس جماعت کی آوازیں ذکر الٰہی اور تسبیح کے ساتھ اس طرح گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھی کے چھتے سے آواز آتی ہے۔''

اس طرح انہوں نے دکھلا دیا کہ سخت ترین مواقع پر کس طرح اصول مذہب کا خیال رکھا جاتا ہے اور یہ کہ مذہبی جذبہ عالم کے ہر جذبہ سے زیادہ پر طاقت ہے۔

عاشور کے دن نماز ظہر

گذشتہ موقع سے سخت اور زیادہ کٹھن وہ موقع تھا جب لڑائی شروع ہو چکی تھی، حسینی مختصر لشکر کے بہت سے جوان قتل ہو چکے تھے۔ اور کمزوری محسوس ہونے لگی تھی۔ تیروں کی بارش تھی اور کمانوں کی کڑکنے کی گرج، لیکن اس حالت میں بھی نماز ظہر بجماعت ادا کی گئی اور ایسی نماز کہ جس کی نظیر عالم کی تاریخ پیش نہیں کرسکتی۔

امامؑ روبقبلہ، اور مجاہدین کی صفیں پیچھے، اور دو بہادر جوان امامؑ کے آگے سینہ سپر بنے ہوئے کہ جو تیر آئے وہ اپنے اوپر روکیں، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ نماز ختم ہوتے ہوتے ان دونوں بہادروں میں سے ایک سعید بن عبداللہ حنفیؓ زمین پر گر کر تڑپنے لگتے ہیں اور دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

یہ تھے حقانیت کے مظاہرات اور صداقت کے نمونے، جو اگرچہ اپنے وقت وقوع میں خاموشی کے ساتھ عمل میں آئے لیکن انہوں نے دنیا کو دعوت حق کی پرزور آواز سے مملو کر دیا اور افراد اسلام کے اسلامی احساسات کو جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا اور دوسری طرف یزید اور ہوا خواہان یزید کے ظالمانہ افعال اور اسلام کش حرکات کا پردہ چاک کیا۔

تبلیغ حق کے دیگر مظاہرات

عاشورے کی صبح سے لے کر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ مضمون کافی نہیں ہوسکتا تاریخ شاہد ہے کہ حسینی فوج کا ہر جوان ایک مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔ بریرؓ ہمدانی کا مباہلہ، حبیبؓ بن مظاہر کا مکالمہ، زہیرؓ بن قین کا خطبہ اور تمام انصار واقرباء کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے اسباب وعلل بیان کرنے میں ایک مبلغ کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہو یا نہ ہو کیوں کہ ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ سخت اور کٹھن موقعوں پر اور دشوار گزار منازل میں اپنے فریضہ کو ادا کر دے اور جو دعوت واظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔

حسینی فوج کے تمام جوان داد شجاعت دے کر رخصت ہو چکے، ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے، صرف مظلوم حسینؑ باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے، دل پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے مگر وہ مبلغ الٰہی، ربانی داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک سکینڈ کے لئے غافل نہیں ہے۔ وہ خطبے پڑھتا ہے، تقریریں کرتا ہے، صحابہؓ رسولؐ کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے، کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر حسینؑ کی حالت پر رحم کھائے گا یا وہ درہم ودینار کی جلوہ آرائی اور اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت وسلطنت کی طمع وحرص سے آزاد ہو کر حق کے راستہ پر آ جائے گا؟ لا واللہ! حسینؑ بھولے اور ناعاقبت اندیش نہ تھے، وہ خوب جانتے تھے مگر بنی نوع بشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے، انہوں نے کوئی دقیقہ اظہار حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے۔

اس وقت بھی جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفیؐ کے قریب آ چکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت وحقانیت کو ثابت کر دکھایا ''اے شمر ذرا اپنے چہرہ سے نقاب اٹھا'' شمر نے نقاب ہٹائی، حضرت نے فرمایا صدق واللہ

جدّیؐ ''میرے نانا رسولؐ نے سچ کہا تھا کہ اے حسینؑ تیرا قاتل ایک مبروص (کوڑھی) شخص ہوگا''۔

روحی لک الفداء اے حسین بن علیؑ! آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا ،آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیر خنجر بھی ثابت کر دی۔ آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملت اسلامیہ کا واحد مبلغ تھا۔

واقعۂ کربلا کے بعض روشن پہلو

ایثار و مواسات

مشترکہ ضرورت کے وقت دوسرے کو اپنے نفس پر مقدم کرنا ایثار ہے اور سخت موقع پر دوسرے کو مبتلا پا کر خود شریک مصیبت اور ہمدرد ہو جانے کا نام مواسات ہے۔

ان دونوں صفتوں کا بہتر اور مکمل ترین نمونہ زمین کربلا کے مجاہدین نے پیش کیا، ان میں سے ہر فرد نے امام کے نفس کی حفاظت کو اپنے نفس و بدن پر اس طرح مقدم سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے تئیں جیتے جی معدوم سمجھ گئے تھے۔

سید الشہداؑء مصلیٰ پر نماز ظہر ادا کر رہے ہیں اور دشمنوں کے تیروں کی بوچھار ہے۔ سعیدؓ بن عبداللہ اور زہیرؓ بن قین امامؑ کے سامنے سپر بنے ہوئے کھڑے ہیں اور ابھی نماز صبح ختم نہیں ہوتی کہ سعید زخموں سے چور ہو کر زمین پر گر جاتے ہیں۔

اور خود امامؑ نے مفاد ملی کی حفاظت کو اپنے نفس بلکہ نفس سے عزیز تر اولاد و اقرباءؑ اور ان سے بھی بالاتر عزت و ناموس پر اس طرح مقدم کیا کہ خود دنیا کی ہر چیز سے ہاتھ دھو لیا اور اپنے کو عالم بھر کے مصائب و آلام کا نشانہ بننا گوارہ کیا لیکن دین اسلام کو قائم کر گئے۔

اور مواسات کا یہ عالم کہ کوئی مصیبت انصار و اصحابؓ پر نہیں پڑی جس میں امامؑ نے ان کا ساتھ نہ دیا ہو۔ انصار و اعزاؑ کی شہادت کے عنوان مختلف تھے لیکن جب امام مظلومؑ کی شہادت پر ایک نظر کی جاتی ہے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک عنوان کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ ایک بیکس کے قتل

کی جتنی صورتیں ہو سکتی ہیں وہ اس ایک ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔

حسینؑ اس دن صرف اپنی جان نہیں دے رہے تھے بلکہ دنیا کو ایثار و مواسات کا نہ بھولنے کے قابل سبق دے رہے تھے اور بے نظیر مثال قائم کر رہے تھے۔

ثبات قدم و استقلال

سخت اور دشوار گزار مصائب کے باوجود قدم میں لغزش نہ ہونا ثبات و استقلال ہے اور اس امتحان میں کربلا کے مجاہدین کا نمبر سب سے اول ہے ان کے سخت اور دشوار گزار مصائب کی نوعیت عالم سے جداگانہ تھی۔ سر و گردن کے باہمی ارتباط کا ایک مرتبہ دم شمشیر سے قطع ہو جانا ایک جانباز سپاہی کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن تین دن کی بے آبی اور زخموں کی کثرت کے سبب کلیجہ کے اندر آگ کا بھڑکنا ہر لحظہ احتضار و نزع روح کی تکلیف برداشت کرنے سے کم نہ تھا، کمسن بچوں کو ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دیکھنا، اپنے ہاتھ سے اپنی زندگی کے عزیز ترین سرمایہ اولاد کو کھنچی ہوئی تلواروں اور برستے ہوئے تیروں میں بھیجنا، نہیں، بلکہ اپنے ہاتھ پر جگر کے ٹکڑے کو نشانۂ تیر بنوا دینا ہر انسان کا کام نہیں۔ ان کے استقلال و ثبات قدم کی نظیر تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے اور انہوں نے اس کے ذریعہ جو حیرت انگیز کامیابی حاصل کی اس کی مثال بھی ملنا ناممکن ہے۔ وہ فنا نہیں ہوئے بلکہ ہمیشہ کے لئے خود زندہ ہوئے اور ہزاروں کو زندہ کر گئے۔ دور فلک میں جب تک اسلام کا دور ہے ان کی یاد سچے مسلمانوں کے دل میں ہمیشہ تازہ رہے گی اور سرشک غم کے سبحۂ صد دانہ پر ان کے نام کا ورد ہوتا رہے گا۔

عزت نفس اور موت کا موازنہ

مجاہد کربلا کا نعرہ شیرانہ

الموت اولیٰ من رکوب العار

زندگی عزیز شے ہے اور فطرت انسانی میں حیات دنیا کی محبت ودیعت کر دی گئی ہے، انسان اسی

کی خاطر سخت ترین دنیا کے مشکلات کو برداشت کرتا اور سرد و گرم عالم کا تحمل کرتا ہے۔ اس کی طبیعت اگر افراط بخل وغیرہ کے سبب حد اعتدال سے خارج نہیں ہوگئی ہے تو وہ اپنی جان کی حفاظت میں مالی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتا اور تمام ممکن ذرائع جن سے اس کی ہستی کی بقاء ممکن ہے ان کو صرف کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ اسلام نے بھی اس فطری رجحان کو روکنے کی کوئی وجہ نہیں پائی بلکہ **لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ** کے حکیمانہ حکم سے حفاظت نفس اور زندگی کی نگہداشت کو فریضۂ لازمہ قرار دیا لیکن فلک اعظم کے دور اور لیل ونہار کی آمد و رفت میں ایسے نازک مواقع پیش آجایا کرتے ہیں جب جذبات نفسانیہ میں تلاطم اور طبعی وعقلی رجحانات میں تصادم ہوتا ہے۔ زندگی اپنی تمام دلفریبیوں کے باوجود اتنی مہیب صورت میں نظر آتی ہے کہ انسان بے اختیار اس سے آنکھ بند کر لینا پسند کر لیتا ہے اور وہ اسی محبوب زندگی سے جس پر وہ ہر شے کو قربان کرتا تھا ہاتھ دھونے میں لذت محسوس کرتا ہے۔ یہ صورت کبھی غیر عقلی، شہوانی، جاہلانہ، ناعاقبت اندیشانہ رجحانات سے پیدا ہوتی ہے اور اس موقع پر جان دینے سے نہ عقل بڑھ کر مرحبا کہتی اور نہ شرع شاباش کی آواز دیتی ہے لیکن جس وقت موت سے بدتر زندگی یا زندگی سے بہتر موت میں معاملہ پڑ گیا ہو جس وقت حیات دنیا اہم ترین مقاصد کے پامال ہونے کا پیش خیمہ ہو اور جس وقت عزت نفس اور فنائے ظاہری کا سوال درپیش ہو، جبکہ میزان عقل نے صورت حال کے مختلف پہلو پر غور کر کے موت کو حیات پر ترجیح دے دی ہو تو اس وقت موت کے منہ میں جا پڑنے والے دائمی حیات کے مالک ہو جاتے ہیں۔

عزت دار ہستیاں ہمیشہ عزت کا صدقہ جان کو سمجھتی ہیں۔ حسینؑ بن علیؑ نے کربلا میں جو راستہ اپنے لئے مقرر کر لیا تھا وہ اسی اصول پر مبنی تھا۔ ان کی زبان سے نکلی ہوئی لفظیں اگرچہ وسیع صحرائے کربلا میں گونج کر فنا ہو گئیں لیکن ان کا پائدار مفہوم اب بھی غیرت دار اقوام کے صحیفۂ حیات کا سرنامہ اور ان کے دیباچۂ زندگی کا عنوان اول ہے (**الموت اولیٰ من رکوب العار**) ننگ و عار کے برداشت کرنے سے موت کا آنا بہتر ہے'' ان کی یہ مختصر لفظیں علو ہمت کی منادی اور عزت نفس کی

ترجمان ہیں اور انہی کو حسینؑ نے عملی صورت سے دنیا کو دکھلا دیا۔

اصول کی حمایت اور قربانی

حسینؑ کی قربانی دنیا سے نرالی تھی

اس قربانی کے انتظامات عجیب وغریب تھے

کربلا کے مجاہد حسین بن علیؑ کا اصول حق کی حمایت، شریعت اسلامیہ کی نگہداشت اور جابر و ظالم طاقت کے مقابلہ میں روحانی و مذہبی خودداری کی حفاظت تھی۔ انہوں نے اپنے آخری نفس تک اس اصول کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، وہ اگر پہلی ہی مرتبہ اپنی جان کی قربانی پیش کر دیتے تو بہت ممکن تھا۔ اس قسم کی قربانیاں کم سہی لیکن بے مثال نہیں ہیں۔ سقراط نے بھی اپنے ہاتھ سے زہر کے جام کو اٹھا کر پی لیا تھا اور اپنی جان کو مقصد پر سے قربان کر دیا تھا، لیکن حسینؑ بن علیؑ کا مقصد بہت اہم تھا، وہ اپنی قربانی کی نوعیت ہی عالم سے جداگانہ قرار دینا چاہتے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اپنی طرف نسبت رکھنے والی ہر عزیز شے کو خود اپنے ہاتھ سے قربان کریں اور جب اپنے نفس کے سوا کچھ باقی نہ رہ جائے تو اس متاع گراں مایہ کو قربانی کے میدان میں پیش کر دیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے راحت وآرام، وطن کی اطمینانی زندگی کو قربان کیا جس کے سلسلہ میں ان کو ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنا پڑی۔

روز عاشور کی قربانیوں کے سلسلہ میں اپنے محبوب ترین اصحاب وانصارؓ ساتھ کے کھیلے ہوئے احباب کو قربان کیا، عزیزوں کی باری آئی اور ایک ایک کر کے ان سب کو میدان قربانی میں بھیجا، اپنے داہنے بازو وفادار بھائی قمر بنی ہاشمؑ کو قربان کیا، اپنے پیارے بھتیجے اور داماد قاسم بن الحسنؑ کو قربان کیا، اپنے دل کی قوت آنکھوں کی روشنی اور پیری کے سہارے علیؑ اکبر کو قربان کیا۔

باغ امید کی آخری کونپل اور غنچۂ ناشگفتہ علی اصغرؑ کو خود اپنے ہاتھوں پر لا کر قربان کیا، ابھی تک دل کے ٹکڑوں کی قربانی ہو رہی تھی اب اعضائے بدن تک نوبت پہنچی، ان کو ایک ایک کر کے قربان کیا۔

گوشت و پوست، سینہ و دست، دل و جگر، چہرہ و جبین بلکہ سطح جسم کا چپہ چپہ اور اجزائے بدن کا ہر ذرہ قربان کیا، نوبت یہ پہنچی کہ تیروں کو جگہ نہ ملتی اور دشمنوں کی تلواروں، نیزوں کو جستجو کے بعد بھی خالی مکان نظر نہ آتا تھا، جب جسم کا ہر حصہ اور دل کا ہر ٹکڑا قربان ہو چکا، اصحاب و انصار اہل بیتؑ میں سے تو پہلے ہی کوئی باقی نہیں رہا تھا، اعضائے جسم کی قربانی کا بھی امکان نہ رہا، ایک نیزہ پر سیکڑوں نیزے اور ایک ایک تلوار پر سیکڑوں تلواریں پڑ چکیں اور تیر بھی اپنا پورا حوصلہ نکال چکے، اب حسینؑ کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا، کوئی قربانی کے قابل شے باقی نہیں رہی تھی، صرف ایک رشتۂ حیات تھا جو روح و بدن کے اندر پوری کشمش حیات کے باوجود قائم تھا اور ایک سر و گردن کا ارتباط تھا جس میں اب تک جدائی نہ ہوئی تھی۔

اس باہمت مظلوم کے لئے گذشتہ تمام قربانی کے مرحلوں کو طے کرنے کے بعد ایک قربانی کا مرحلہ بالکل آسان تھا، بلکہ اس میں خاص لذت محسوس ہو رہی تھی، عصر کے ہوتے ہوتے حسینؑ اس قربانی میں بھی کامیاب ہو گئے اور خنجر شمر سے کچھ دیر راز و نیاز کے بعد ایک طرف نفس کی آمد و شد کا سلسلہ اور نفس بدن کا ظاہری حلقۂ اتصال قطع ہوا اور دوسری طرف سر و گردن کے ارتباط میں جدائی پیدا ہوئی۔

آسمان لاکھوں برس گردش کرے، زمانہ کے ورق گوناگوں خصوصیتوں کے ساتھ سامنے آئیں اور الٹ جائیں لیکن اتنی شاندار، مکمل، منظم اور مرتب قربانی کی مثال پیدا نہیں ہو سکتی۔

حسینؑ کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہراؑ کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں سے کامیاب ہو چکے ہیں، اب کوفہ و شام کے بازار ہیں اور بنی ہاشم کے گھرانے کی معزز خواتین، اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہلبیت رسولؐ کے لئے سخت توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہوں گے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت

حسینؑ کی تبلیغ منتہائے شباب پر پہنچ گئی ہے اور دعوت حق کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہو گیا ہے۔ اگر چشم حقیقت بیں سے نظر کرو تو نیزہ پر سر حسینؑ جس کی پیشانی پر سجدۂ معبود کا نشان پڑا ہوا ہے **سیماھم فی وجوھھم من اثر السّجود** چہرہ سے نور ساطع ہے۔ ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں **(ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من اٰیاتنا عجبا)**

دوسری طرف مخدرات عصمت، جوان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنعہ سے محروم ہونے کے بعد غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدیہ کی تصویر، جاہ و جلال کی چادروں میں پنہاں، طہارت و عفت کے اندر ملبوس اور ان کے وہ حقائق و دقائق سے مملو خطبے **کانّھا تفرغ عن لسان ابیھا** زینبؑ گویا علی بن ابی طالبؑ کی زبان کے ساتھ کلام کر رہی تھیں

یہ چیزیں وہ ہیں جنہوں نے صداقت کے پیکر میں روح پھونک دی، دنیا کی آنکھوں کے سامنے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا، عالم کو شرق سے لے کر غرب تک حسینؑ بن علیؑ کا مرثیہ خواں اور یزید کے افعال و اقوال سے بیزار و متنفر کر دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آج عالم کے گوشہ گوشہ اور دنیا کے ہر چپہ میں حسینؑ کا نام ہے، اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت تک کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیہ کے جبروت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے۔ عالم نے دیکھ لیا کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم؟ ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے۔

(اشاعت اولیٰ محرم الحرام ۱۳۵۳ھ امامیہ مشن، لکھنؤ)

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے شب دہم محرم ۱۳۶۴ھ کو نشر ہوئی
(کمی وقت کی وجہ سے اس کا خلاصہ نشر ہوا پوری تقریر نشر نہیں ہو سکی۔)

بے شک حسینؑ شاہ تھے اور بادشاہ بھی تھے مگر وہ دنیوی بادشاہ نہ تھے۔ نہ اس بادشاہت کے کبھی طالب ہوئے۔ نہ انھوں نے اس بادشاہت کے لئے جنگ کی۔

''دنیوی بادشاہ'' وہ ہوتا ہے جو تاج وتخت رکھتا ہو جو حشم وخدم کا مالک ہو جس کے گرد لاؤ لشکر جمع رہتا ہو مگر حسینؑ تو اس نانا کے نواسے تھے جو دو وقت بھوک سے پیٹ پر پتھر باندھے پھرا کرتا تھا جس کے گھر سے کئی کئی دن دھواں نہ اُٹھتا تھا۔ اس ماں کے بیٹے تھے جو اپنے گھر میں چکی پیستی تھی۔ چرخہ چلاتی تھی اور جھاڑو دیتی تھی۔ اس باپ کے بیٹے تھے جو باغوں میں جا کر مزدوری کرتا تھا اور محنت ومشقت سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔

ان کے نانا رسولؐ اللہ کا قدرتی جاہ وجلال گو اتنا تھا کہ سلاطین روم وفارس کے درباروں کے دیکھنے والے کہتے تھے کہ وہاں وہ رعب وداب نہیں جو یہاں نظر آتا ہے مگر انھوں نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا پسند نہ کیا۔ ان کے سامنے جب ایک عرب آیا اور ہیبت سے تھرانے لگا تو انھوں نے کہا سنبھل جاسنبھل جا میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں۔ میں تو عرب کی ایک غریب عورت کا فرزند ہوں جو بہت معمولی غذا کھاتی تھی۔

ان کی مقدس ماں حضرت فاطمہ زہراؑ جو پیغمبر اسلامؐ کی اکلوتی بیٹی تھیں گو اتنی سخی اور فیاض تھیں کہ گھر پر سے کسی سائل کو کبھی محروم واپس نہیں کیا مگر اپنے مقدس باپ کی فقیرانہ سیرت کی ایسی پیرو تھیں کہ دروازہ پر ایک بوسیدہ پردہ کے سوا کبھی دوسرا پردہ نظر نہ آیا۔ عرصہ تک تو گھر کے کاروبار کے لئے کوئی کنیز یا خادمہ تھی ہی نہیں۔ جب ایک کنیز جس کا نام فضہ تھا پیغمبر نے گھر کے کام کاج کے لئے عطا کی تو یہ ہدایت کردی کہ ایک دن گھر کا کام تم کرنا ایک دن فضہ سے لینا، حضرت فاطمہؑ نے ہمیشہ اسی پر عمل کیا۔

حسینؑ کے بلند مرتبہ باپ حضرت علی مرتضیٰؑ گو اسلام کے سب سے بڑے سپہ سالار، سب سے بڑے فاتح، پیغمبرؐ کے وزیر اور مسلمانوں کے سردار تھے، جنھیں رسولؐ نے خود امیر المومنینؑ کا خطاب دیا تھا اور جنھیں آج تک بچہ بچہ جناب امیرؑ کے نام سے یاد کرتا ہے مگر اس امارت کے باوجود غربت کی زندگی بسر کرتے تھے ایسی کہ بھوسی ملا ہوا جو کا آٹا غذا میں کھاتے تھے اور پیوند دار لباس پہنتے تھے، ایسے نانا کی گود میں پل کر ایسی ماں کی پرورش اُٹھا کر اور ایسے باپ کی تعلیمات حاصل کر کے اپنی خدا ساز بلند فطرت کے ساتھ ساتھ حسینؑ کا مزاج بھی فقیرانہ نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ گو سخاوت جلالت وجاہت اور شان ان میں موروثی تھی مگر شاہانہ غرور وتمکنت، شاہانہ جاہ وحشمت، شاہانہ طنطنہ وطمطراق اور سب سے زیادہ شاہانہ فریب سیاست سے ان کو دلی نفرت تھی۔ اور اس بنا پر نہ وہ بادشاہ تھے نہ اپنے کو بادشاہ سمجھتے تھے نہ دوسروں کی زبان سے بادشاہ کہے جانے کو پسند کرتے تھے۔

وہ اس بادشاہت کے کبھی طالب نہیں ہوئے اس وقت جب حضرت امام حسنؑ نے معاویہ سے مصالحت کر کے تخت سلطنت ان کے سپرد کر دیا تو بہت سے آدمی اچھے اچھے ممتاز درجہ کے لوگ حضرت امام حسینؑ سے کہہ رہے تھے کہ آپ کھڑے ہو جایئے ہم آپ کی مدد کریں گے۔

اگر آپ کے دل میں سلطنت کی کوئی خواہش ہوتی تو یہ بہت اچھا موقع تھا مگر آپ نے انکار کیا پھر اس وقت کہ جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوگئی تو لوگ پھر حضرت امام حسینؑ کے پاس آئے او

رکھا کہ اب کھڑے ہو جائیے۔ حضرت نے پھر بھی انکار کیا اور برابر خاموشی کی زندگی بسر کرتے رہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؑ دنیاوی سلطنت کے کبھی طالب نہیں ہوئے۔

آپ نے اس بادشاہت کے لئے جنگ بھی نہیں کی۔ جب آپ اس کے طالب ہی نہیں تھے تو اس کے لئے جنگ کیا کرتے؟ اس کے علاوہ یہ آپ کے قول اور عمل دونوں سے ظاہر ہے۔

اگر آپ بادشاہت کے لئے جنگ کرنا چاہتے تو اسی وقت جب آپ کو سابق امیر شام کی وفات اور یزید کے تخت سلطنت پر بیٹھنے کی اطلاع ہوئی ہے اور مدینہ کے حاکم نے آپ کو بیعت کے لئے طلب کیا ہے اسی وقت حاکم مدینہ پر حملہ کر دیتے۔ مدینہ پر قبضہ کر لیتے اور پھر اپنی قوت میں اضافہ کر کے یزید سے برسرِ پیکار ہوتے۔ جب کہ عبداللہ بن زبیر کے لئے یہ ممکن ہو کہ وہ حجاز و عراق ہی میں اپنی سلطنت قائم کر کے ایک کافی مدت تک حکومت شام سے لڑتے رہیں تو حسینؑ کے لئے ایسا کیوں نہیں ممکن تھا حالانکہ آپ مسلمانوں کے دلوں پر عبداللہ بن زبیر سے زیادہ اقتدار رکھتے تھے۔

اس کے بعد جب مکہ میں آپ پہنچے تاریخ بتلاتی ہے کہ اس وقت لوگوں نے عبداللہ بن زبیر کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا اور امام حسینؑ کے گرد رہنے لگے مگر آپ نے کسی اقتدار کے حصول کے لئے اس جماعت کی مدد حاصل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس وقت جب کوفہ کے لوگوں نے مذہبی ہدایت کی غرض سے آپ کو کوفہ آنے کی دعوت دی تو انھوں نے یہ لکھا کہ اگر آپ آئیے تو ہم حکومت شام کے گورنر کو نکال دیں اور تخت سلطنت پر قبضہ کر لیں مگر آپ نے ان کو لکھا کہ امام کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ احکام شرعیہ کو نافذ کرے۔ فرائض ہدایت کو انجام دے اور تعلیمات خداوندی سے ایک سرِمو انحراف نہ کرے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے دارالحکومت یا تخت سلطنت کی کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے تو ہدایت خلق منظور ہے اور احکام خدا کی تبلیغ مدنظر ہے۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ جناب مسلم بن عقیل جو حضرت کے نمائندہ ہو کر کوفہ گئے تو انھوں نے خاموشی

کے ساتھ ایک دوست کے مکان پر قیام کر لیا اور کوئی کوشش اس بات کی نہیں کی کہ کوفہ کے حاکم کو کوفہ کے تخت سے ہٹا دیں یا دارالسلطنت پر قبضہ کر لیں۔

پھر جب کہ نہ وہ بادشاہ تھے۔ نہ بادشاہت کے کبھی طالب ہوئے۔ نہ بادشاہت کے لئے انھوں نے جنگ کی تو انھیں شاہ اور بادشاہ کہنے کا کیا مطلب یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ شاہ معین الدین چشتی اجمیری نے اپنی رباعی میں یہ دو لفظیں ایک ساتھ نظم کی ہیں:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ
دین است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سرداد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

تو کیا شاہ اور بادشاہ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ دو لفظیں صرف ضرورت شاعری سے مصرع کو پورا کرنے کے لئے لائی گئی ہیں بہت سے لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

جناب خواجہ غریب نواز نے جن کا مزار اجمیر میں زیارت گاہ جمہور ہے حضرت شہید کربلا امام حسین علیہ السلام کی بارگاہ میں جو عقیدت کا نذرانہ پیش کیا ہے وہ کوئی معمولی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

یہ اور بات ہے کہ آج جب دنیا سطحی اور مادی علوم کی گرویدہ ہو کر حقیقت اور علم باطن سے کوسوں دور جا پڑی ہے تو وہ ان بزرگ افراد کی گہری باتوں کی تہوں تک نہ پہنچ کر اعتراض پر اُتر آتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہ اور بادشاہ دونوں کے الگ الگ معنی ہیں اور دونوں کے ملنے سے شہید کربلا کی شخصیت اور آپ کے بلند کردار پر جو تیز روشنی پڑتی ہے وہ کبھی ان میں سے ایک لفظ سے نہیں پڑ سکتی تھی۔

غور کیجئے تو انسان آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش پر جب نظر ڈالتا ہے تو ہر طرف مادی اجسام،

مادی حالات اور مادی عناصر کی ترکیب یافتہ شکلیں اس کی آنکھوں کے سامنے آتی ہیں۔ وہ محبت کرنا چاہتا ہے تو مادی اسباب کے قائم کردہ رشتے اس کی محبت کو جذب کر لیتے ہیں۔ بچپنے میں ماں باپ بھائی سے روشناس ہوا اور ان کی محبت دل میں بیٹھی۔ جوان ہوا تو جذبات کی رو میں بہہ کر بہت سے بیگانوں سے اُلفت کرنے لگا کبھی شخصی اغراض اور انعام وعطا کی لالچ میں کسی کا گرویدہ ہو گیا۔ اس وقت دنیا اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے اور وہ اس کائنات کے جمال میں کھو جاتا ہے۔

وہ دیکھتا ہے تو مادی نگاہ سے، سنتا ہے تو مادیت کے کانوں سے، کامیابی سمجھتا ہے تو اسی دنیا کے ظاہری اقتدار کو، محبت کرتا ہے تو وقتی فائدوں اور سامنے کی دلربا صورتوں کو دیکھ کر اور نفرت کرتا ہے تو اسی دنیا کے نقصانات اور ناگوارِ خاطر باتوں کے احساس سے۔

خواہش پروری اور اقتدار پسندی اور پھر آخر میں دہریت، الحاد اور مادہ پرستی سب اسی پہلی نگاہ میں جذب ہو جانے کے مختلف درجے ہیں۔

اس صورت میں بادشاہت اگر ہوگی تو وہ نام ہوگا کمزوروں کو غلام بنانے کا، فقیروں کو اپنا بندہ بے دام قرار دینے کا اور دوسروں کا خون چوس کر اپنا پیٹ بھرنے کا، حیلہ ومکر وفریب جس طرح سے اپنا کام نکالے گا جس کو کہا جاتا ہے ملوکانہ سیاست۔

یہی وہ سلطنت ہے جس سے محمدؐ وآلِ محمدؐ ہمیشہ الگ رہے، نہ وہ بادشاہ بنے نہ اس بادشاہت کے طالب ہوئے نہ اس کے لئے کبھی جنگ کی۔

مگر دوسرا درجہ انسان کی نظر وفکر کا یہ ہے کہ وہ جمالِ صنعت کو دیکھ کر صناع کی طرف متوجہ ہو، وہ اپنے گردوپیش کی کائنات پر غور کر کے اس بلند طاقت کی جانب مڑ جائے جو ان تمام کائنات کی پیدا کرنے والی اور ان سب کے باقی رکھنے اور تربیت کرنے کی کفیل ہے۔

جب انسان دل کی آنکھوں کو کھول کر اس طرف نظر ڈالے گا تو مافوق امکان بجلیاں نظروں کے

سامنے کوندنے لگیں گی وہ جمال نظر آئے گا جس کے مثل کوئی جمال آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں۔ وہ عظمت محسوس ہوگی جس کے مثل کسی عظمت نے دل پر کبھی اثر نہیں ڈالا اس درجہ تک پہنچنے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر چیز سے آنکھ بند کر لے ہر شے سے رشتہ قطع کر لے۔ نہ کوئی حسن اپنی طرف اس کے دل کو مائل کر سکے، نہ کوئی خوف اس کے دل کو مرعوب کر سکے، نہ کوئی دلکش مرقع اس کی نظر کو اپنی طرف موڑ سکے۔ بیوی بچے، بھائی بہن، عزیز، اقارب کسی سے اس کی دل بستگی نہ ہو۔ وہ پہاڑوں کی اونچی اونچی سطحوں پر غاروں کی تاریک گہرائیوں کے اندر جنگل کی وسیع فضا میں اسی ایک مرکزِ حُسن کی یاد میں مستغرق رہے کہ جس سے زیادہ حسین جلوہ اسے کہیں نظر نہیں آ سکتا۔

جو اس درجہ پر پہنچ جائے اس کو اہلِ سلوک کی عام اصطلاح میں ''شاہ'' کہتے ہیں۔ اسی میں رفتہ رفتہ انسان ترقی کرتا ہے تو محوسہو اور آخر میں فنا فی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اور ایک طبقہ ہے کہ جو اسی کو انسانیت کی معراج تصور کرتا ہے مگر غور کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ درجہ انسانی زندگی کا آخری مقصد نہیں بن سکتا کیونکہ اس درجہ میں انسان کے اندر انفرادیت اور توحّد یعنی تنہائی کا احساس نمایاں نظر آتا ہے۔ حالانکہ انسان فطری طور پر تمدنی زندگی کا حامل ہے کسی شے کا نقطۂ کمال وہ نہیں ہو سکتا جو اس کی اصلی فطرت کے ساتھ متضاد حیثیت رکھے بلکہ ایسا نقطۂ کمال وہ ہوگا کہ جس میں نظری خاصیت حکیمانہ تربیت کے ساتھ زیادہ مفید اور منظم شکل میں نمایاں ہو۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درجہ بھی ایک درمیانی منزل ہے جہاں رک جانا سالک کے حوصلہ کی پستی کا نتیجہ ہے وہ جمال مطلق کہ جہاں اس کی نگاہ جا کر جمی ہے اور اس کے جلووں میں غرق ہو گئی ہے ایک الگ تھلگ ہستی نہیں ہے جس کا کچھ تعلق اس کائنات کے ساتھ نہ ہو بلکہ خالق، رازق، مربی اور اصل مرکزِ فیض اور سرچشمہ وجود ہونے کی بنا پر اسے اس کائنات کے ساتھ اور کائنات کا اس کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ وہ اس کی وسعت رحمت سے جو ہر ہر فرد پر چھائی ہوئی ہے انسان اگر صحیح معنی میں کسی کے ساتھ محبت رکھتا ہے تو ہر اس شے کے ساتھ محبت ہونا بھی ضروری

ہے جسے اس محبوب کے ساتھ تعلق ہو اور ہر اس مفاد کو عزیز رکھنا ضروری ہے جو اس کے محبوب کو مدنظر ہو اور اس لئے اگر انسان حقیقی معنی میں عشق الٰہی کے درجہ تک پہنچتا ہے تو وہ خلائق سے جدا ہو نہیں سکتا بلکہ اگر جذبۂ عشق نے محض وارفتہ نہیں بنا دیا ہے اور اسے محبوب کی نگاہوں کا بھی خیال ہے اور اس کی مرضی بھی منظور نظر ہے تو وہ اللہ تک پہنچنے کے بعد پھر ایک دفعہ واپس آئے گا اس خلق کی طرف مگر اپنی محبت کی آغوش کو اتنا کشادہ کر کے جو اللہ کی وسعت رحمت کے ساتھ سازگار ہو سکے اور ان فرائض کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو احتیاط زندگی کے کامیاب بنانے کے لئے اس کے خالق کو مطلوب ہیں اب اسے اللہ عزاسمہ کے ساتھ وہ عشق بھی ہے جو ایک شاہ یعنی عارف کامل کو ہونا چاہئے اور خلق کے ساتھ وہ تعلق بھی ہے جو ایک بادشاہ کو اپنی رعایا کے ساتھ ہمہ گیر طور پر ہونا چاہئے۔ پہلی منزل میں یعنی مادہ پرستی کے دور میں اگر انسان کو دنیا والوں پر اقتدار حاصل ہوا وہ جس کا نام ہے بادشاہت تو ہر وقت اپنے اقتدار کی گرفت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرے گا اپنے اثر کو بڑھانے میں مصروف رہے گا۔ اپنے عزیزوں دوستوں اور خوشامد کرنے والوں کو ہر طرح کے فائدے پہنچانے کا مقصد پیش نظر رہے گا۔ اور کمزوروں کی آزادی کے سلب کرنے میں لذت محسوس کرے گا اور یہی کوشش رہے گی کہ

جہاں میں جہاں تک جگہ پایئے
عمارت بناتے چلے جایئے

لیکن شاہی کی منزل تک پہنچ جانے کے بعد انسان کو عامۂ خلائق سے جو تعلق پیدا ہو گا اس میں خلق خدا کی بہبودی ہر وقت پیش نظر رہے گی۔ کمزوروں کو مدد پہنچانا نقطۂ نگاہ رہے گا۔ گرتے ہوؤں کو سنبھالنے، ڈوبتے ہوؤں کو نکالنے اور تباہ حال افراد کو بچانے کی کوشش ہو گی۔ یہاں اپنے اور پرائے کی تمیز نہ ہو گی، بلکہ اپنا سگا بھائی بھی حق سے زیادہ طلب کرے گا تو اس کی بات رد کر دی جائے گی چاہے وہ اس پر خفا ہی کیوں نہ ہو جائے بلکہ آئین وقانون کے معاملہ میں بیٹوں تک کی

مراعات پیش نظر نہ ہو گی۔ ہر وقت حق پروری اور فرض شناسی سے مطلب ہو گا۔ یہ ہو گی وہ بادشاہت جو شاہ ہونے کے ساتھ ہو اور ایسا ہی انسان حقیقی معنی میں سلطان عادل ہو سکتا ہے چاہے تاج وتخت نہ رکھتا ہو اور حشم وخدم اس کے پاس موجود نہ ہو۔

آپ اگر پہلی قسم کے بادشاہوں کو ڈھونڈھنا چاہیں تو بہت سے نمرود، فرعون اور یزید اس کی مثال پیش کرنے کے لئے آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے اور اگر ایسے شاہ ڈھونڈھنا چاہیں جو بادشاہ نہیں ہیں تو بہت سے درویش اور تارک الدنیا تاریخ کے اوراق پر اور شاید کہیں کہیں مشاہدہ میں بھی آپ کے سامنے آجائیں لیکن اگر آپ شاہ ہونے کے ساتھ بادشاہ ہونے کی مثال تلاش کیجئے تو آپ کو پیغمبرؐ اسلام اور ان کے حقیقی پیروؤں میں مل سکتی ہے اور اہلبیت رسولؐ اس کا بہترین نمونہ ہیں ان کی شاہی دیکھنا ہو تو محراب عبادت میں دیکھئے اور ان کے الفاظ میں معرفت کے دریا بہتے ہوئے دیکھ کر اندازہ کیجئے اور بادشاہی دیکھنا ہو تو مجمع اصحاب میں دیکھ لیجئے۔ مسند قضا پر دیکھ لیجئے یا غریبوں اور محتاجوں کی صدا پر اُن کے تڑپ جانے، ضرورت مندوں کی آواز پر اُٹھ کھڑے ہونے اور ہر ایک کی ضرورت کو فوراً پورا کرنے کی کوشش بلکہ کبھی کبھی غریبوں کے گھر پر جا کر راتوں کے پردہ میں اس کی خبر گیری اور اعانت کے مناظر کو دیکھئے۔

حسینؑ ان ہی پیغمبرؐ اسلام کے نواسے تھے جنھوں نے خالق اور مخلوق کے رشتوں کے اس باہمی ارتباط کا دنیا کو سبق دیا۔

انھوں نے جن سخت اوقات میں اور کٹھن منزلوں پر شاہی اور بادشاہی کے حدود کو نباہا ہے اس کی نظیر تاریخ انسانیت میں ناپید ہے۔

موقع نہیں کہ ان کی سیرت زندگی کے واقعات سے مکمل طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جائے مگر صرف کربلا کی سرزمین پر محرم کی دسویں تاریخ میں آپ نے جس جس طرح اس کا نمونہ پیش کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔

عاشور کی تاریک رات جب کہ تباہی کی ڈراونی پرچھائیاں ہرسمت پھرتی نظر آتی تھیں۔موت کا فرشتہ پر کھولے ہوئے فضا میں سایہ افگن تھا۔اور امید سلامتی کے دھندلے نقوش بھی رفتہ رفتہ مٹتے جارہے تھے بلکہ بالکل مٹ چکے تھے۔کوئی دنیادار انسان ہوتا تو یہ رات عزیزوں سے دل بھر کر رخصت ہونے میں صرف کرتا۔اپنے پسماندگان کو اپنے بعد کے لئے وصیتیں کرتا اور کم از کم تدابیر جنگ میں مشورے کرتا مگر حسینؑ کامل ''شاہ'' تھے اس لئے انھوں نے اپنا مصلیٰ بچھا دیا۔ان کے ساتھ والوں کے بھی مصلیٰ بچھ گئے اور پوری رات صرف عبادت خدا میں گزاری۔

اسی کے ساتھ حسینؑ بادشاہ تھے اسی لئے انھیں یہ فکر تھی کہ اگر ساتھ والے ضمیر کی اجازت سے اپنی جانیں بچانا چاہیں تو میرے ساتھ اپنی جانیں کیوں دیں۔اسی لئے انھوں نے عبادت خالق کی مصروفیت کے اندر اتنا وقت بھی نکالا کہ ان سب کو جمع کر کے یہ اجازت دی کہ تم لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ اور اس پردۂ شب میں مجھ سے الگ ہو جاؤ کیونکہ دشمن کو تو میری جان سے مطلب ہے تم سے سروکار نہیں ہے تم اپنی جان میرے سبب سے کیوں دو۔

اتنا ہی نہیں کہ انھوں نے عمومی طور پر یہ ایک تقریر فرمادی بلکہ خصوصی طور پر ایک ساتھی کے لئے جب یہ سنا کہ ان کا فرزند سرحد پر گرفتار ہو گیا ہے تو انھیں بلا کر کہا کہ تم خاص طور پر میری بیعت سے آزاد ہو جاؤ اور اپنے بیٹے کی رہائی کی فکر کرو۔ جب وہ کسی طرح ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو آپ نے ایک قیمتی لباس ان کے حوالہ کیا کہ اسے اپنے دوسرے بیٹے کے ساتھ بھیجو کہ وہ جا کر اسے فروخت کرے اور اپنے بھائی کو چھڑانے کا انتظام کرے۔

کیا کربلا کے ایسے ہولناک موقع پر اپنے ساتھیوں کے دکھ، درد اور تکلیف کا اتنا خیال کسی معمولی انسان کو ہو سکتا ہے۔

روز عاشور کی قربانیوں میں بھی یہ دونوں باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں۔حسینؑ حق کی خاطر اپنے عزیز ترین دوستوں اور بھائیوں بھتیجوں اور بیٹوں کو خوشی خوشی تلواروں کے اندر بھیج رہے تھے کیونکہ

وہ شاہ تھے۔اللہ کی مرضی کے سامنے دنیا کا کوئی رشتہ عزیز نہ تھا مگر ان کی جدائی پر روتے بھی تھے۔ ان کا غم بھی کرتے تھے اور ان کی لاشیں مقتل سے اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اس لئے کہ وہ بادشاہ بھی تھے یعنی خلق کے ساتھ تعلق اور محبت رکھتے تھے۔

سب سے زیادہ سخت موقع وہ حسینؑ کی زندگی کا آخری وقت ہے جب وہ زخموں سے چور تھے۔ کربلا کی گرم زمین اور اس وقت قاتل کا قریب آنا خنجر کا نیام سے نکلنا اور حسینؑ کا سجدہ خالق میں پیشانی رکھے ہونا، دوپہر کی دھوپ سے جلتی ہوئی ریت اور زخمی پیشانی یہ شاہی کی بلند تصویر ہے۔

قاتل سنتا ہے کہ حسینؑ کچھ کہہ رہے ہیں۔کان قریب لے گیا تو ضعف سے تھرائی ہوئی آواز میں یہ الفاظ گوش زد ہیں کہ خداوندا میں نے اپنے امکانی فرض کو پورا کیا۔ یہ تیرا کام ہے کہ تو میرے نانا کی امت کو عذاب سے نجات دے۔

یہ تھا بادشاہی کا تقاضا جسے حسینؑ آخر وقت تک نباہ گئے بالکل سچ ہے کہ

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ

نہ ایسی شاہی کہیں نظر آسکتی ہے اور نہ بادشاہی نظر آسکتی ہے واللہ کہ اے حسینؑ کارے کردی۔

❁❁❁

دیں پناہ است حسینؑ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

(سرکار سید العلماء مدظلہ کی وہ تقریر جو ۷ محرم ۱۳۶۶ھ کو ریڈیو اسٹیشن لکھنؤ سے نشر ہوئی)

کوئی شک نہیں کہ اللہ کا دین جس کے انسانوں تک پہنچانے کی خاطر پیغمبر بھیجے گئے۔ کتابیں اتاری گئیں، شریعتیں جاری کی گئیں۔ جس کی خاطر نوحؑ نے تکلیفیں اٹھائیں، ابراہیمؑ نے سختیاں جھیلیں، موسیٰؑ نے مصیبتیں برداشت کیں اور عیسیٰؑ نے مخالفتوں کا مقابلہ کیا۔ وہ دین الٰہی جس کے پہنچانے میں محمد عربیؐ نے صدمے سہے، زحمتیں گوارا کیں، دل پر زبان کے اور جسم پر پتھروں کے زخم کھائے وہ وہ دین جس کی حفاظت میں حمزہ کام آئے، عبیدہ بن الحارث بن عبدالمطلب نے جان دی، حمزہ کا جگر چاک ہوا، جعفر کے ہاتھ قلم ہوئے اور علی عمر بھر جہاد کرتے رہے۔

اس وقت چاروں طرف مددگار کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور بہ زبان حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا "هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنِيْ" کوئی مددگار ہے ایسا جو میری مدد کرے، جب ۶۰ھ میں دمشق کے تخت سلطنت پر یزید حکمران ہوا اور امام حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہوا۔

حسینؑ خوب سمجھتے تھے کہ مجھ سے بیعت طلب کرنے سے اس کا مقصد کیا ہے۔ اگر صرف بحیثیت ملک عرب کے ایک باشندے، نسل قریش کی ایک فرد کے بیعت طلب کی جا رہی ہوتی تو اس میں اتنی کدوکاوش کی ضرورت نہ تھی۔ جب کہ تمام ملک عرب اور حجاز کے کل باشندے یزید کی بیعت کر چکے تھے تو ایک حسینؑ نے اگر بیعت نہ بھی کی تھی تو اصول جمہوریت پر یزید کی سلطنت کا کیا

بگڑتا تھا۔ ایک فرد اور وہ بھی تارک الدنیا، عزت گزین اور گوشہ نشین، دنیا کے شور شر سے الگ تھلگ ساکت اور ساکن۔

حسینؑ کا کوئی دوست نہیں دشمن بھی یہ نہیں بیان کر سکا کہ حسینؑ نے اپنے مدینہ کے قیام میں کبھی کوئی تقریر حکومت شام کے خلاف کی کبھی کوئی خط وکتابت کی کسی طرح کی بھی کوشش یزید کے مقابلہ پر کی ہو یا کسی صورت پر بھی ساکن فضا کو متحرک بنانا چاہا ہو۔ پھر صرف ایک منفی طرز عمل یعنی بیعت نہ کرنا یزید کو کیا نقصان پہنچا سکتا تھا جب کہ عرب میں کتنی ہی بڑی کانفرنسیں یزید کی بیعت لینے کے لئے ہوئی ہوں کتنے ہی بڑے پیمانہ پر اس تحریک کا سب کو پابند بنایا گیا ہو لیکن ہزاروں آدمی اس ملک کے گوشوں کے پھر بھی ایسے ہوں گے جن سے نہ یزید کی بیعت کا مطالبہ ہوا نہ انھوں نے بیعت کرنے کا کوئی مظاہرہ کیا۔

خود خاندان بنی ہاشم میں عبداللہ بن جعفر بھی تو تھے۔ محمد بن حنفیہ بھی تو تھے۔ عمر بن علیؑ، عون بن علیؑ اور حسینؑ بن علیؑ کے دوسرے بھائی بھی تو تھے۔ ان میں سے کسی ایک سے بیعت کا مطالبہ ضروری نہیں سمجھا گیا۔ بس صرف حسینؑ وہ تھے جن پر یزید کی تمام کوششیں مرکوز ہو گئیں کہ آپ سے بیعت لی جائے۔

اسی سے صاف ظاہر تھا کہ حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ بحیثیت ملک عرب کے ایک شخص اور حجاز کے ایک رہنے والے اور قریش یا بنی ہاشم کی ایک فرد کی نہیں ہے بلکہ آپ سے بیعت کا مطالبہ اس خصوصیت کے لحاظ سے ہے کہ حسینؑ خاندان رسولؐ کی عظمت کے نمائندے، علیؑ کے جانشین اور حضرت محمد مصطفی کے قائم مقام ہیں۔ حسینؑ سے بیعت لینے کے معنی یہ تھے کہ یزید گویا بانی اسلام حضرت محمد مصطفیؐ کی بارگاہ سے اپنے افعال پر مہر تصدیق ثبت کرا لے اور اس طرح دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرے کہ یزید کا رواج دادہ نظام معاشرت اور نظام حکومت حق ہے۔ اس لئے حسینؑ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا حسینؑ نے اپنے موقع کی نزاکت محسوس کر لی۔

انھوں نے سمجھ لیا کہ میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ علیؑ نے بیعت کی اور میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ محمد مصطفیؐ نے اس نظام کو تسلیم کرلیا اور میری بیعت کے معنی یہ ہیں کہ حق باطل کے سامنے، سچ جھوٹ کے سامنے اور دین لادینی کے سامنے ہمیشہ کے لئے جھک گئے۔ حسینؑ جانتے تھے کہ بیعت نہ کرنے کا انجام کیا ہوگا مگر وہ جیسے محسوس کر رہے تھے کہ اس وقت دین اسلام کی نظر میرے چہرے پر ہے اور وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ میری حفاظت کی خاطر حسینؑ کسی ایثار و قربانی پر تیار ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

حسینؑ جانتے تھے کہ یہ وہ دین ہے جو میرے مالک، میرے معبود اور میرے خالق کی امانت ہے اس لئے بحیثیت مخلوق، بحیثیت عبد اور بحیثیت مملوک مجھے اس کی حفاظت ضروری ہے۔ یہ میرے نانا محمدؐ رسول اللہ کی تمام عمر کی مشقتوں زحمتوں اور کوششوں کا نتیجہ ہے اس لئے بحیثیت فرزند رسول ہونے کے مجھے اس کی حمایت لازم ہے۔ اور اس دین کا استحکام میرے باپ علیؑ مرتضیٰ کی تلوار کا ثمرہ ہے اس لئے بحیثیت علیؑ جانشین کے بھی مجھ ہی کو سینہ سپر ہونا چاہئے۔

کوئی شک نہیں کہ دین اسلامی اس وقت بے کسی اور بے بسی کے عالم میں تھا اس کی آئین و تعلیم کو شام سے نکالا جا رہا تھا۔ عراق میں کوئی اس کی حفاظت کا مرکز نہ تھا اور حجاز میں کوئی پناہ نہ تھی سب طرف سے ناامید ہو کر وہ دین حسینؑ کے دامن میں پناہ لے رہا تھا اور حسینؑ نے یہ طے کرلیا کہ میں جان دوں گا مگر اس دین کو بچاؤں گا۔ فقط جان ہی نہیں جان کو تو راہِ خدا میں مجاہد دیتے رہے تھے بلکہ جان سے زیادہ عزیز دل کے ٹکڑے بھی نثار کئے جائیں گے اور اس سے بڑھ کر سراپردۂ عصمت کی رہنے والی خواتین کو قید و بند کی مصیبتوں کے لئے بھی دین کی خاطر لے آیا جائے گا۔

حسینؑ نے اپنی قربانی بھی ۶۱ھ میں محرم کے مہینہ میں جمعہ کے دن اور دسویں تاریخ کربلا کے میدان میں پیش کردی۔ شہیدوں کے لاشے زمین پر تھے حسینؑ کے خیموں سے آگ کے شعلے بلند تھے۔ خواتین خاندان رسالت کی قید کا سامان تھا اور صداقت کی زبان بلند آواز سے پکار رہی تھی بے شک ''دین پناہ است حسینؑ''

❀❀❀

مجسمۂ انسانیت

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعَالَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الۡاَنۡبِیَاءِ وَالۡمُرۡسَلِیۡنَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ۔

وہ خصوصیات جو کسی انسان کو بلند نقطۂ انسانیت پر پہنچانے کے ذمہ دار ہو سکتے ہیں، ان کی دو قسمیں قرار دی جاسکتی ہیں۔ ایک خصوصیات داخلی، دوسرے خصوصیات خارجی۔

داخلی خصوصیات میں انسان کا حسب و نسب، کسی خاص خاندان سے تعلق رکھنا، خاص آباء اجداد کی نسل سے ہونا، جو مخصوص صفات و روایات کے حامل ہوں، یہ ایک انسان کے کمال کا باعث ہیں۔

جانے دیجئے اس اصول کو، جسے بہت سے لوگ آج تسلیم کر رہے ہیں اور وہ ''توارث صفات'' ہے، یعنی نفسانی صفات بھی بطور وراثت اولاد کی طرف منتقل ہوتے ہیں، اور اس کا تجربہ انسان تو انسان، حیوانوں تک میں ہوا ہے، چنانچہ ادنیٰ قسم کے حیوان کو، اعلیٰ قسم کی طرف منتقل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ اس نسل کے تعلقات ازدواجی میں ترقی کا لحاظ رکھا جائے، اگر برابر اچھی نسل کے افراد اس سلسلہ میں آتے رہیں تو رفتہ رفتہ اس کے نقائص دور ہو کر وہ نسل اعلیٰ قسم کی ہو جائے گی۔

انسان بھی طبعی خصوصیات کے لحاظ سے جب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، تو کیوں نہ اس میں بھی یہ اصول درست ہو، پھر یہ کہ اخلاق و اوصاف نفسانی بھی اکثر تابع مزاج ہوتے ہیں، اور یہ طب میں بھی ثابت ہے کہ مزاجی خصوصیات اولاد کی جانب منتقل ہوتے ہیں، خیر جانے دیجئے اس کو، پھر بھی یہ ہے کہ انسان کو لاج ہوتی ہے اپنے باپ دادا کے طرز، طریقہ، اصول اور مسلک کی، اس کا نتیجہ یہ ہے

کہ اکثر وہ غلط باتوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا، صرف اس دلیل سے کہ ہمارے باپ دادا ان کے پابند تھے۔ پھر اگر آباء واجداد اچھی صفتوں کے حامل ہوں، تو اولاد کو ان صفتوں کے ساتھ الفت ضرور ہونا چاہیے، اس کا بھی نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک انسان کا کسی کامل خاندان، اور بلند انسانی طبقہ میں پیدا ہونا، اس انسان کی بلندی کا ایک مستقل باعث اور سبب ہے۔

خارجی خصوصیات کو ہم تین قسموں میں درج کر سکتے ہیں۔

(۱) تعلیم وتربیت، کیونکہ ایک پست طبقہ کا آدمی بھی اگر اچھی تعلیم وتربیت پا جائے تو بسا اوقات وہ بلند ہو جاتا ہے۔

(۲) ماحول۔ تعلیم وتربیت تو زیادہ تر انسان کی زندگی کے ابتدائی دور سے متعلق ہے، لیکن ماحول ایسی چیز ہے جو ابتدائے عمر سے آخر تک ایک انسان کے ساتھ رہتا ہے، اور اس کی زندگی کے ہر حصہ میں اثر انداز ہوتا ہے۔

(۳) وہ واقعات وتجربات اور مشاہدات جنھیں انسان نے دیکھا، جن کا اسے سابقہ پڑا ہے، اور زندگی کے مختلف دوروں میں اسے جن سے گزرنا پڑا ہے، اس حیثیت سے انسان کا کمال اس وقت زیادہ ظاہر ہوتا ہے، جب انسان کو متضاد حالات کا مقابلہ کرنا پڑا ہو، اور اس وقت اسے متضاد طرز عمل اختیار کرنا پڑے ہوں۔ کیونکہ انسانی جذبات ہمیشہ یک طرفہ ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص غصہ ور ہے، تو اسے ہمیشہ غصہ کی بات پر غصہ آجائے گا، اور غصہ میں وہ کچھ نہ کچھ کر گذرے گا۔ ممکن ہے کہ اس کا نتیجہ بعض وقت بہت قابل تعریف ہو، مثلاً کوئی مظلوم اسے مدد کے لئے پکارے، اور ظالم کی زیادتی کو دیکھ کر اس شخص کو غصہ آجائے، اس وقت اس کے ہاتھوں مظلوم کی مدد ہوگی، مگر بہت ممکن ہے کہ بعض اوقات اس کا غصہ خراب نتائج بھی پیدا کرے، اور اس کے ہاتھوں فتنہ وفساد پیدا ہو، اور امن عالم کو صدمہ پہنچے، یہ شخص خود ہلاک ہو اور دوسرے کے ہلاک کرنے کا باعث ہو۔ یہ صرف اس لیے کہ اس کے اقدامات سب غصہ کے ماتحت ہوتے ہیں، اس لیے اس کے نتائج میں

دورنگی نہیں پیدا ہوسکتی۔

اب دیکھئے، ایک دوسرا شخص ہے، جو فطرتاً حلیم اور متحمل واقع ہوا ہے، اس کا طرز عمل اکثر اوقات قابلِ تعریف ہوتا ہے، ایک ایسے موقع پر جب کسی دوسرے کو غصہ آجائے یہ خاموشی اختیار کرتا ہے، اور اس کی خاموشی سے ایک بڑا فتنہ فرو ہو جاتا ہے، کیا کہنا اس کی اس برمحل خاموشی کا، مگر یاد رکھیئے کہ یہ خاموشی کبھی جرم بن جائے گی، اس وقت جب اس خاموشی سے ظالم کی ہمت افزائی ہو رہی ہو، اور مظلوموں کا گلا کٹ رہا ہو۔ یہ انسان اپنی خاموشی سے اس وقت تعریف کے بجائے، مذمتوں کا مستحق ہوگا۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ اس کی خاموشی طبیعت کی کمزوری، اور سردی کا نتیجہ تھی، اس لیے وہ ہر حال میں یکساں رہے گی، اور اس میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔

انسانیت کا کمال مضمر ہے، تضاد اور نیرنگی میں، وہی انسان جو غصہ کے موقع پر بڑا ہی غصہ ور معلوم ہوتا ہے، خاموشی کے محل پر اس طرح خاموش ہو جائے گو یا اس میں غصہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ ہوگا انسان کامل۔

تمام جرائم کا سرچشمہ جذبات نفس ہیں، اور جذبات میلان طبعی کا نتیجہ ہوتے ہیں، جو یک طرفہ ہی ہوں گے، مگر انسانیت نام ہے، جذبات کی مخالفت کا، وہاں جذبات، قوت عاقلہ کے ماتحت ہو جاتے ہیں، ممکن ہے کہ کبھی عمل جذبۂ نفس کے مطابق ہو، مگر وہ صرف اس لیے کہ عقل کا فیصلہ بھی اسی کے موافق ہے اور اگر محل وموقع کا تقاضا اس کے خلاف ہو، تو عمل بدلا ہوا اور طریق عمل مختلف نظر آئے۔ اس کا نام ہوگا فرض شناسی، اور یہی ہوگا جوہر انسانیت، اور اس جوہر میں جلا پیدا ہوتی ہے، یا اس کی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا ہے ان ہی مواقع سے، جو کسی انسان کو متضاد شکل میں درپیش ہوں، اور پھر متضاد طریقے اسے اختیار کرنا پڑیں۔

اس صورت میں اس کے حکیمانہ تدبر کی رفعت، اس کے طبعی رجحانات، اور نفسانی جذبات پر پورے طور سے ثابت ہوتی ہے، اور وہ پتہ دیتی ہے اس کا کہ وہ کمال انسانیت کے نقطہ پر کس درجہ

تک فائز ہے۔

میں دیکھتا ہوں تو کربلا کا انسان حسینؑ بن علیؑ ان تمام خصوصیات میں بڑے بلند نقطہ پر نظر آتا ہے۔

پہلا سبب کیا تھا! خاندانی خصوصیات، حسینؑ کے خاندانی خصوصیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ خلیل خدا سے۔ یہ ہستی بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہود، نصاریٰ اور مسلمان، سب ان کو تسلیم کرتے ہیں، اور اسلام کے مورث اعلیٰ یہی حضرت ابراہیمؑ ہیں۔ ان کے دو بیٹے تھے اسحقؑ اور اسمٰعیلؑ۔

اولاد اسمٰعیلؑ کو حرم خدا کی قربت کی وجہ سے عرب میں امتیازی خصوصیت اور مرکزیت حاصل ہوئی، اولاد اسمٰعیلؑ میں نضر بن کنانہ کی اولاد، قریش کے نام سے موسوم ہوئی، قریش کا امتیاز تمام قبائل عرب میں تسلیم کرلیا گیا، اور پھر قریش میں ہاشم کو خصوصیت خاص حاصل ہوئی، بنی ہاشم تمام قریش میں دینی اور دنیوی اعتبار سے مخصوص اہمیت کے مالک تسلیم کیے گئے، عبدالمطلب کو سیدّ البطحا کا لقب دے کر گویا تمام اہل حجاز نے ان کی سرداری اور بلندی تسلیم کرلی، اور ان کے بعد ان کی اولاد میں یہ لقب برقرار رہا۔ یہ سیادت، نہ صرف امور دنیوی میں تھی، بلکہ جو مقدس شعائر تھے ان کی حفاظت وحمایت اور ذمہ داری کے تمام فرائض اولاد ہاشمؑ سے متعلق رہے، اور اس کے ساتھ دین خدا، حرم خدا اور شعائر الٰہیہ پر جو کوئی مصیبت پڑی تو سخت وقت میں یہی خاندان کام آیا۔ عبد المطلب کے دو فرزند تھے، عبداللہ اور ابو طالب مگر عبداللہ کا انتقال عبدالمطلبؑ کی زندگی میں ہوگیا، اس لئے جتنی ذمہ داریاں عبدالمطلبؑ کے متعلق تھیں، ان کی وفات کے بعد ابوطالبؑ کی طرف منتقل ہوئیں، اب ابوطالبؑ تبرکات ابراہیمؑ کے حامل بھی تھے، متروکات اسمٰعیلؑ کے وارث بھی۔ حرم کے متولی اور محافظ بھی تھے، اور اس ملت ابراہیمیہ کے ورثہ دار بھی، جس کا نام تھا اسلام، اور جس کا سنگ بنیاد خلیلؑ نے رکھا تھا۔

عبداللہ کے فرزند تھے حضرت محمد مصطفیٰؐ جو اسلام کے پیغمبر ہیں، اور آپ بھی ابتدائے عمر سے

ابوطالبؑ کی پرورش میں رہے، کیونکہ آپ کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ابوطالبؑ نے اس ذمہ داری کو جس طرح پورا کیا ہے، وہ دنیا کی تاریخ میں ایک یادگار چیز ہے، انھوں نے اپنی اولاد کو رسول اسلامؐ پر جاں نثاری کا سبق دیا، اس وقت جب شعب ابی طالبؑ میں محصور تھے، تو اس خوف سے کہ کہیں شب کو رسولؐ قتل نہ کر دیئے جائیں، ابوطالبؑ آپ کی جگہ پر اپنے بیٹوں میں سے ایک ایک کو باری باری سلا دیتے تھے، اور اس طرح گویا سکھلاتے تھے کہ رسولؐ پر کوئی وقت پڑے تو یوں جان فدا کر دینا۔

قدرت نے اس عبداللہ کے یتیم اور ابوطالبؑ کے پروردہ کو یہ عزت دی کہ اس کو اپنے دین کا حامل بنایا، اسلام کا کلمہ ان کی زبان سے پہونچایا، اس پر دنیا ان کی دشمن ہوگئی، مگر رسولؐ نے اس سلسلہ میں ہر مصیبت کو برداشت کیا، اور اسلام کی تبلیغ کرتے رہے، یہاں تک کہ سب آپ کے مخالف ہوگئے، اور قتل پر متفق ہوگئے۔ ابوطالبؑ بھی مر چکے تھے جو آپ کے محافظ تھے، مجبوراً آپ کو رات کے وقت مکّہ سے جدا ہونا پڑا، اس موقع پر ابوطالبؑ کے فرزند علیؑ ہی کی ذات تھی، جسے آپ نے دشمنوں کی تلواروں کے حلقہ میں، اپنے بستر پر لٹا دیا تھا کہ جاں نثاری آپ بچپن میں باپ کے کہنے سے کر چکے تھے، اور اسے آپ نے اس متیقن خطرہ کے موقع پر عمل کر کے دکھلا دیا، کہنے دیجئے کہ علیؑ نے اس خطرہ میں اپنے تئیں ڈال کر اپنے کو فدیۂ اسلام بنا دیا، یہ اور بات ہے کہ خدا نے حفاظت کی اور علیؑ کی جان سالم رہی۔

رسول اللہؐ کو خدا نے ایک بیٹی دی تھی، جس کا نام تھا فاطمہؑ زہرا۔ رسولؐ نے اپنی ہجرت کے بعد ہی اس اپنی بیٹی کا عقد علیؑ ابن ابی طالبؑ کے ساتھ کر دیا، انہی سے دو فرزند ہوئے، ایک کا نام تھا حسنؑ اور دوسرے کا نام تھا حسینؑ، اب کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ حسینؑ کی نگاہ میں اپنے آباؤ اجداد کے کتنے روایات تھے، اور وہ کون سا سلسلۂ عزّت وشرافت، سلسلۂ صدق وحقانیت، سلسلۂ ایمان و روحانیت تھا جس کی اس وقت آخری کڑی یہ حسینؑ تھے، کیا نسبی معیار کے لحاظ سے اس سے زیادہ بلندی کی انسانی کمال کے لیے توقع کی جا سکتی ہے؟

دوسرا سبب

تعلیم وتربیت

حسینؑ کی تربیت رسولؐ نے کی، جو دنیا کے لیے معلم اخلاق تھے، اور یہ ظاہر ہے کہ آپ پر سب سے پہلا فرض اپنی اولاد کی تربیت کا عائد ہوتا تھا۔ حسینؑ نے خلق عظیم کی آنکھیں دیکھیں، خلق عظیم کی گود میں رہے، خلق عظیم کے ہاتھوں پر پلے۔

رسولؐ اپنی اولاد کو اس اسلام کی حفاظت کا ذمہ دار بنا رہے تھے، کہ جس کی وہ تعلیم وتلقین میں مصروف تھے، اس لیے ان کی تربیت کا خاص پہلو یہ تھا کہ وہ بچوں کو اسلام کے متعلق ان کی ذمہ داری کا احساس پیدا کراتے رہیں، اس کے لیے بھی اقوال تھے، اور افعال بھی تھے۔ اقوال میں، ان کو قرآن کا ہمراہی قرار دینا، یہ بتانا کہ یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، اور اعمال میں اس موقع پر کہ جب نصاریٰ کے ساتھ مباہلہ ہو رہا تھا، ان کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ سمجھنا، بالکل غلط ہے کہ رسولؐ کی دعا آمین کی محتاج تھی، مگر ایک طرف تو آپ دنیا کو بتلا رہے تھے کہ دیکھو، اگر حق وباطل کا مقابلہ ہو، تو خالص حق کے مجسمے یہ ہیں، دوسری طرف ان کو احساس پیدا کرا رہے تھے، کہ دیکھو اگر اسلام پر کوئی وقت پڑے، تو مجھے تم ہی سے امید ہے، اس وقت میں موجود ہوں، میں خود تمہیں لے جا رہا ہوں، اور کسی وقت میں موجود نہ ہوں گا تو تم خود اٹھ کھڑے ہونا۔ حسینؑ کے گوشت اور خون کو، اپنا گوشت اور خون کہا تھا، اس کے بھی یہ معنی ہو سکتے ہیں، کہ اے حسینؑ اگر اسلام پر کوئی وقت پڑے، تو اس گوشت کو اپنا گوشت اور اس خون کو اپنا خون نہ سمجھنا۔ اسے میرے اسلام پر قربان کر دینا۔

یہ تھی وہ تربیت جو حسینؑ کو حاصل ہوئی تھی۔

تیسرا سبب

ماحول

کیا پوچھنا حسینؑ کے ماحول کا۔ وحی کی صدا قرآن کی آواز، رسولؐ کے جہاد، اور علیؑ کے مجاہدانہ

کارنامے۔

یہ ہے بچپنا۔ جوانی میں باپ کو خانہ نشین ضرور دیکھا، مگر یہ برابر نظر آیا کہ جب اسلام کے لیے کوئی سخت موقع ہوا، کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوا، کوئی اہم مشورہ، فوراً اسلام کے مفاد کے لئے فائدہ پہونچانے کو تیار ہو گئے۔ ذاتی اغراض، خواہش نام ونمود، زمانے کی بے التفاتی کا کبھی اس معاملہ میں خیال نہ کیا۔ ہاتھ میں تلوار، بازوؤں میں طاقت ہوتے ہوئے، کبھی شمشیر آزمائی کا ارادہ نہ کیا، حقوق تلف ہوتے دیکھے خاموشی اختیار کی، اس لیے کہ اسلام کو نقصان نہ پہونچے۔ جب مسلمانوں نے خود سے آ کر اقتدار کی پیشکش کی، اور آپ کو اسے ماننا پڑا، تو دیکھا کہ حقانیت کی حفاظت کے لئے، اور حمایت باطل سے علیٰحدہ رہنے کے لئے، اور اسلام کے آئین واصول کو برقرار رکھنے کے لیے، علیؑ نے حاکم شام کے ساتھ ذرا بھی چشم پوشی، رواداری، اور سہل انکاری کو جائز نہیں سمجھا، ہزاروں مصیبتیں برداشت کیں، مگر ایک منٹ کے لئے اس کو گوارا نہ کیا کہ آپ معاویہ کی حکومت کو ملک شام پر منظور کر لیں۔

غرض یہ ماحول تھا، جس میں حسینؑ نے زندگی کے دن گزارے، ہمیشہ یہی رہا کہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، ہر بات میں اسلام کا مفاد سامنے رکھو۔ حق اپنا ضائع ہو کچھ نہ بولو، اسلام کی خاطر دنیا کنارہ کشی کر لے، اور دوسرے بے جا اقتدار قائم کر لیں، خاموش رہو، اسلام کی خاطر راحت وآرام میں خلل پڑے، مگر یہ سب اختیار کر لو، اسلام کی خاطر اس ماحول کا قطعی نتیجہ یہ تھا کہ جان بھی جا رہی ہو، اولاد بھی کام آ رہی ہو، مال واسباب بھی لٹ رہا ہو، تو اس سب کو گوارا کر لو اسلام کی خاطر۔

چوتھا سبب

واقعات وتجربات، اور متضاد حالات میں متضاد طرز عمل اختیار کرنے کے مواقع۔

اس حیثیت سے حسینؑ کو جتنے مختلف ادوار سے گزرنا پڑا۔۔۔۔کو گزرنا پڑا ہوگا۔

سات برس کی عمر حسینؑ نے اپنے نانا رسولؐ اللہ کی زندگی میں گزاری، یہ بچپنا تھا، جو بچپنے ہی کے لائق راحت آرام دلجوئی اور خاطر داری میں گزرا، اس کے بعد آیا علیؑ بن ابی طالبؑ کا زمانہ، حسینؑ نے

دیکھا، سمجھا، اور محسوس کیا کہ زمانہ بدل گیا۔ ڈیوڑھی کی رونق سناٹے سے تبدیل ہوگئی، جو ہر وقت کے آنے جانے والے لوگ تھے، اب دور دور تک نظر نہیں آتے، یہ بھی سنا کہ میرے باپ جس حق کو اپنا سمجھتے ہیں، اس حق پر دوسروں کا قبضہ ہے، اس موقع پر بچوں اور نوجوانوں کے جذبات عجیب تلاطم خیز ہوتے ہیں، پھر حسینؑ اسی زمانہ میں بھر پور جوان ہوئے، اور چونتیس (۳۴) برس کی عمر تک پہونچے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ زمانہ صبر وسکون عافیت اندیشی اور انجام بینی کا ہوتا ہے، اور کیا انسانی جوش و ولولہ اس موقع پر مصالح کی بندش آسانی سے گوارا کرتا ہے مگر حسینؑ کو باپ کے اختیار کردہ مسلک کی پابندی لازم تھی۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس زمانہ میں کوئی فعل انھوں نے نظم وضبط کے خلاف کیا ہو۔

بلکہ اس وقت جب تیسرے دور میں خلیفہ وقت محصور تھے، اور حملہ آوروں نے پانی بند کر دیا تھا، تو حسنؑ اور حسینؑ کو علیؑ بن ابی طالبؑ نے پانی پہنچانے پر مامور کیا تھا، اور کہہ دیا تھا کہ اگر اس سلسلہ میں جنگ بھی کرنا پڑے تو کر لینا۔ باپ کے حکم کی اطاعت تھی کہ حسینؑ پانی لے کر گئے، اور پوری قوت سے کام لے کر پانی پہنچا دیا، کیا عام طبعی جذبات اور رجحانات کا بھی تقاضا یہی ہوتا ہے؟

تیسرا دور وہ آیا، جب حضرت علی بن ابی طالبؑ سریر خلافت پر متمکن ہوئے، اب بغاوتیں برپا ہوگئیں، اور علی بن ابی طالبؑ کو جنگ کرنا پڑی۔

اس سلسلہ میں جنگ جمل ہوئی، اور صفین، اور نہروان، اس وقت حسینؑ میدان جنگ میں تلوار لے کر اپنے باپ کی حمایت میں مصروف جہاد ہوگئے۔

حسینؑ کی عمر پینتیس چھتیس برس کی ہے، اور بے شک اس عمر کا ولولہ جہاد کا متقاضی ہے، مگر صفین میں قرآن نیزوں پر بلند ہوتے ہیں، علوی فوج میں اختلاف ہو جاتا ہے، اور علی بن ابی طالبؑ موقع شناسی کی بناء پر التوائے جنگ کا حکم دیتے ہیں۔ لیجئے حسینؑ کی تلوار بھی نیام میں چلی جاتی ہے، کیا جوانی کی عمر کا جوش آسانی سے ترک جنگ پر آمادہ ہونے دے سکتا ہے، ایک ایسے موقع پر، جبکہ فتح بالکل سامنے تھی، اور مالک اشترؒ کی بہادری کا جذبہ، بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدل رہا تھا، مگر یہاں

جذبات سے تو کام نہ تھا، فرض کا احساس، حسینؑ کے سر کو جھکا دیتا ہے، معلوم ہوتا ہے، اب تلوار میں باڑھ ہی نہیں، یہاں تک کہ التوائے جنگ کے معاہدہ پر، حسنؑ اور حسینؑ دونوں بطور گواہ دستخط کر دیتے ہیں اس کے بعد امیر المومنینؑ شہید ہوتے ہیں امام حسنؑ جانشین ہوئے اور اپنے باپ کے دشمن معاویہ سے جنگ پر تیار ہوئے، حسینؑ بھی بھائی کے ساتھ جہاد پر مستعد ہیں، حالات ایسا پلٹا کھاتے ہیں کہ امام حسنؑ کو معاویہ کے ساتھ صلح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، یاد رکھیئے کہ یہ موقع دوسرا ہے، باپ کا سا تفوق بھائی کو عام انسانوں کی نگاہ میں حاصل نہیں، مگر حسینؑ تو اپنے بھائی کو پیشوا تسلیم کیئے ہوئے تھے، حسینؑ اسی راستہ پر ہیں، جو حسنؑ کا راستہ ہے حالانکہ ساتھیوں میں شورش ہے، وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح حسینؑ جنگ پر تیار ہو جائیں۔

مگر وہ فرض شناس انسان کہتا ہے کہ ہم نے صلح کر لی اور ہم اس کے پابند ہیں، دس برس حسنؑ کی زندگی میں گزارے جاتے ہیں، دس برس حسنؑ کے بعد گزارے جاتے ہیں، اور وہی خاموشی کا مسلک قائم رہتا ہے، وہ حسینؑ جس نے اس کے بعد کربلا میں دکھلا دیا کہ اس کے سینہ میں کون سا دل، اور پہلو میں کون سا جگر ہے، وہ اس تمام طولانی مدت میں ہزاروں ناگوار واقعات کے باوجود یوں خاموش رہتا ہے جیسے اس کے سینہ میں دل، اور دل میں حوصلہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

کیا کم ہے یہ بات کہ حسنؑ کو زہر دے دیا جائے، کیا کم ہے یہ بات کہ حسنؑ کو روضۂ رسولؐ میں دفن نہ ہونے دیا جائے، کیا کم ہے یہ کہ حسنؑ کے جنازہ پر تیر چلائے جائیں، مگر حسینؑ ان تمام باتوں پر خاموش رہیں۔ تلوار نیام سے نہ نکالیں، کیا اس سے بڑھ کر جذبات پر قابو کی کوئی مثال ہو سکتی ہے؟

لیجئے وہ وقت آ گیا کہ یزید طالب بیعت ہوا۔ اب وہی خاموش انسان یہ کہتا ہے کہ بیعت تو میں نہیں کروں گا۔ یہ حسینؑ نہیں کہہ رہے تھے، حسینؑ کے خاندانی خصوصیات، حسینؑ کی تعلیم و تربیت، حسینؑ کا ماحول، اور حسینؑ کا ضمیر، سب متفق ہو کر آواز دے رہے تھے، کہ یزید سے بیعت تو نہ

ہوگی، کیونکہ اس بیعت سے اسلام فنا ہی ہوجائے گا، شریعت اسلام فراموش ہوجائے گی، اور آئین اسلام میں تبدیلی ہوجائے گی۔

''بیعت نہیں کروں گا'' کہا، اور وطن چھوڑ دیا، مکّہ بسایا، وہاں ستائے گئے، اسے چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے، عراق کی طرف چلے، فوج آگئی روک لیا، کربلا میں اتر پڑے، چاہتے ہیں خیمے فرات پر برپا کریں، مخالف فوج، وہی فوج جسے حسینؑ ابھی پانی پلا چکے تھے، وہ حسینؑ کا پانی کے پاس رہنا گوارا نہیں کرتی۔

''ہمیں'' امیر کا حکم ہے کہ آپ کے خیمے ریتی پر برپا ہوں'' اصحاب بگڑتے ہیں، چاہتے ہیں کہ اس بات پر لڑیں، حسینؑ کہتے ہیں، نہیں، نہیں، لڑو نہیں، ہم خیمے یہاں سے ہٹائے لیتے ہیں۔ ریتی پر خیمے برپا کردو۔ فوجیں آنے لگیں دشمن نے گھیر لیا۔

حسینؑ امن وصلح کی کوشش شروع کرتے ہیں، ناواقف لوگ سمجھتے ہوں گے کہ یہ دل کی کمزوری کا نتیجہ ہے، آج تک یہی سمجھتے، اگر عاشور کا دن نہ آتا، اور حسینؑ کربلا کے ذرّے ذرّے کو اپنی بہادری، استقلال، اور تحمل کا گواہ نہ بنادیتے۔

صلح کی گفتگو کامیابی کے قریب پہونچتی ہے، مگر ابن زیاد اسے ختم کردیتا ہے، ''یا بیعت یا قتل'' اور حسینؑ بیعت کو پہلے ہی کہہ چکے تھے، کہ نہیں، وہ اگر جذبات کی بنا پر فیصلہ ہوتا، تو شاید اب خوف کے جذبہ سے بدل جاتا، نہیں وہ تو حسینؑ کے ضمیر کا فیصلہ تھا، اور دل ودماغ کا سمجھوتہ تھا، اس میں تبدیلی کی گنجائش نہ تھی۔

اب تو بس ایک ہی صورت ہے قتل، حسینؑ ساتھیوں سے کہتے ہیں چلے جاؤ میں اکیلا اس مہم کو سر کرلوں گا۔ ساتھی کہتے ہیں، نہیں ہم ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔

اچھا تو پھر آؤ عاشور کی صبح، اب تو ایک مرنے والے کو انتظار کی ضرورت نہیں، مگر وہاں تو فرائض کی تکمیل ہورہی تھی۔

کہیں دشمن کی جماعت میں کوئی ناواقف نہ ہو، کوئی ہدایت کا تشنہ نہ ہو۔

لیجئے حسینؑ نے اتمام حجت بھی کرلی، وہ تقریر جس میں اپنی صفائی کے دلائل پیش کیے تھے، ہاں ہاں حسینؑ کی تقریر بے اثر نہ تھی، حُر سمجھا اور حسینؑ کی طرف آگیا۔

دشمن نے تیروں کی بوچھار کرکے اعلان جنگ بھی کردیا، حسینؑ میدان قربانی میں ہیں۔ مگر اپنی جان کی قربانی تو کوئی بات نہ تھی، اپنے سے وابستہ ہر فرد کو خود قربان کردیا۔

ایک بھی جب تک باقی رہا، حسینؑ نے جہاد کا ارادہ نہیں کیا، معلوم ہوتا ہے اب بھی نفس کا سکون ختم نہیں ہوا ہے۔ مراحل عمل ہیں جو ترتیب کے ساتھ طے ہورہے ہیں، کوئی گھبراہٹ کا اقدام، اور بے چینی کا عمل نہیں ہے، لیجئے کوئی نہیں رہا، وہ جو بیس (۲۰) برس تک خاموش رہا، وہ جو نو دن تک صلح کی نرم شرطیں پیش کرتا رہا، وہ جو صبح سے اب تک دوستوں اور عزیزوں کو قتل ہوتے دیکھتا رہا، اور تلوار نیام سے نہ نکالی، اب جب کہ کوئی نہیں رہا ہے، جبکہ کمر بھی شکستہ ہے، آنکھوں کا نور بھی رخصت ہوچکا ہے، بے کسی، بےبسی تین دن کی پیاس اور صبح سے اس وقت تک کی تمازت آفتاب کو برداشت کیئے ہوئے، اب وہ جہاد پر تیار ہوتا ہے، وہ خاموشی کے ساتھ اپنے کو دشمن کے سپرد نہیں کردیتا، کیونکہ یہ اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے، اسے حفاظت خود اختیاری کے لیے مدافعانہ جہاد فرض ہے، وہ تلوار نیام سے کھینچتا ہے۔

اتنی جنگ کرتا ہے، جسے تاریخ نے نمایاں الفاظ میں لکھنا ضروری سمجھا ہے۔ آخر کو قربانی کی تکمیل ہوجاتی ہے، حسینؑ دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، مگر ان کی عظیم انسانیت، آج تک عالمِ امکان سے کلمہ پڑھوائے بغیر نہیں رہ سکتی۔

یہ تھا وہ مجسّمۂ انسانیت جس کی مثال تاریخ دنیا میں ملنا ناممکن ہے۔

❖❖❖

حسینی اقدام کا پہلا قدم

قدمائے علماء ومؤرخین کے بیانات اور ان پر تبصرہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جب یزید کا خط طلب بیعت کے متعلق ولید کے پاس پہنچا۔ شیخ مفید علیہ الرحمہ لکھتے ہیں:

فانفذ الولید الی الحسینؑ فی اللیل فاستدعاہ فعرف الحسین الذی اراد فدعا جماعة من موالیه فامرهم بحمل السلاح وقال لهم ان الولید قد استدعانی فی هذا الوقت ولست امن ان یکلفنی فیه امرا لا اجیب الیه وهو غیر مأمون فکونوا معی فاذا دخلت الیه فاجلسوا علی الباب فان سمعتم صوتی قد علا فادخلوا علیه لتمنعوه عنی۔ (ارشاد)

ولید نے امام حسینؑ کے پاس شب کے وقت ایک آدمی بھیجا اور آپ کو طلب کیا، حضرت نے سمجھ لیا کہ اس کا مقصد کیا ہے لہٰذا آپ نے اپنے مخصوصین کی ایک جماعت کو بلا کر فرمایا کہ وہ مسلح ہو جائیں، اور کہا کہ ولید نے اس وقت مجھے بلایا ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ سے کسی ایسے امر کی خواہش کرے گا جسے میں منظور نہیں کروں گا، اور وہ خطرہ سے خالی نہیں ہے، لہٰذا تم لوگ میرے ساتھ رہو اور جب میں اندر جاؤں تو تم دروازہ پر بیٹھنا اگر سننا کہ میری آواز بلند ہوئی تو تم میری حفاظت کے لئے اندر داخل ہو جانا۔

دینوری نے درمیان کے واقعات کی کچھ کڑیاں زیادہ تفصیل کے ساتھ بتائی ہیں وہ رقم طراز ہیں:۔

فلما ورد ذٰلك علی الولید قطع به وخاف الفتنة فبعث الیٰ مروان وکان الذی بینهما متبا عدا فاتاہ فاقرأہ الولید الکتاب واستشارہ فقال له

مروان اما عبداللہ بن عمرو عبدالرحمٰن ابن ابی بکر فلا تخافن ناحیتهما فلیسا بطالبین شیئا من هٰذا الامر ولکن علیك بالحسین بن علی وعبداللہ بن الزبیر فابعث الیهما الساعة فان بایعو الا فاضرب اعنا قهما قبل ان یعلن الخبر فیثب کل واحد منهما ناحیة ویظهر الخلاف فقال الولید لعبد اللہ بن عمرو بن عثمان وکان حاضرا وهو حینئذ غلام حین راهق انطلق یابنی الی الحسین بن علی و عبداللہ بن الزبیر فادعهما فانطلق الغلام حتی اتی المسجد فاذا هو بهما جالسین فقال اجیبا الامیر فقالا للغلام انطلق فانا صائران الیه علیٰ اثرك فانطلق الغلام فقال ابن الزبیر رضی اللہ عنه للحسین علیه السلام فیمتراہ بعث الینا فی هٰذہ الساعة فقال الحسین احسب معاویة قدمات فبعث الینا للبیعة فقال ابن الزبیر ما اظن غیرہ وانصرف الیٰ منازلهما فاما الحسینؑ فجمع نفرا من موالیه و غلمانه ثم مشی نحو دارالامارة وامر فتیانه ان یجلسوا بالباب فان سمعوا صوته اقتحموا الدار۔ (الاخبار الطوال، ص۲۲۸و۲۲۹)

جب یزید کا خط ولید کے پاس پہنچا تو وہ پریشان ہو گیا، اور اسے فتنہ وشورش کا اندیشہ ہوا لہٰذا مروان کو بلا بھیجا، حالانکہ ان دونوں کے تعلقات اس زمانہ میں کشیدہ تھے، مروان آیا تو ولید نے وہ خط دکھایا اور مشورہ چاہا۔ مروان نے کہا کہ عبداللہ بن عمر اور عبدالرحمن بن ابوبکر کی طرف سے تمہیں کوئی اندیشہ نہ کرنا چاہئے۔ وہ اس منصب کے کسی حیثیت سے بھی طلبگار نہیں ہوں گے۔ مگر ہاں حسینؑ ابن علیؑ اور عبداللہ بن زبیر کا تدارک تم پر لازم ہے۔ انھیں اسی وقت بلوا بھیجو، اور اگر بیعت کر لیں تو خیر، ورنہ ان دونوں کا سر قلم کر دو، اس سے قبل کہ اس خبر کا اعلان ہو، اور ان میں سے ہر ایک ایک سمت کو جست وخیز کرنے لگے، اور اختلاف ظاہر کرے۔ یہ سن کر ولید نے عبداللہ بن عمرو

بن عثمان سے جو اس وقت موجود تھا اور وہ ابھی کم سن نوجوانی کے حدود سے قریب تھا کہا کہ بیٹا تم
حسینؑ ابن علیؑ اور عبداللہ ابن زبیر کے پاس جاؤ اور انھیں بلا لاؤ۔ وہ لڑکا روانہ ہوا یہاں تک کہ مسجد
میں پہنچا۔ دیکھا کہ وہ دونوں بیٹھے ہیں، اس نے کہا۔ امیر نے آپ کو بلایا ہے، دونوں نے کہا کہ تم
چلو۔ ہم ابھی آتے ہیں۔ وہ لڑکا چلا گیا۔ ابن زبیر نے امام حسینؑ سے پوچھا۔ آپ کا کیا خیال ہے
ہمیں اس وقت کیوں بلایا گیا ہے، حضرت نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ معاویہ کا انتقال ہو گیا ہے، اور
ہمیں بیعت کے لئے بلایا گیا ہے، ابن زبیر نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے، اور دونوں اپنے اپنے
مکان کی طرف واپس گئے۔ امام حسینؑ نے اپنے عزیزوں اور غلاموں کی ایک جماعت کو جمع کیا پھر
دارالحکومت کی طرف تشریف لے گئے اور اپنے جوانوں کو حکم دیا کہ وہ دروازہ پر بیٹھیں، اور جب
آپ کی آواز سنیں تو مکان میں داخل ہو جائیں۔

طبری نے بھی یہ واقعات اتنی ہی بلکہ کچھ اور زیادہ تفصیل سے بیان کئے ہیں:

لما اتاه نعی معاویة فظع به و کبر علیه فبعث الیٰ مروان بن الحکم فدعاه
الیه و کان الولید یوم قدم المدینة قدمها مروان متکارها فلما رائ ذالك
الولید منه شتمهٔ عند جلسائه فبلغ ذٰلك مروان فجلس عنه وصرمه فلم
یزل کذلك حتی جاء نعی معاویة الی الولید فلما عظم علی الولید هلاك
معاویة وما امر به من اخذ هؤلاء والوهط بالبیعة فزع عند ذٰلك الیٰ مروان و
دعاه فلما قرأ علیه کتاب یزید استرجع و ترحم علیه واستشاره الولید فی
الامر وقال کیف تریٰ ان تصنع قال فانی اریٰ ان تبعث الساعة الیٰ هؤلاء
النفر فتدعوهم الیٰ البیعة والدخول فی الطاعة فان فعلوا قبلت منهم و
کففت عنهم وان ابوا قدمتهم فضربت اعناقهم قبل ان یعلموا بموت
معاویة فانهم ان علموا بموت معاویة وثب کل امرئ منهم فی جانب واظهر

الخلافة والطمانینة ودعا الیٰ نفسه الا ادری اما ابن عمر فانی لا اراه یزید
القتال ولا یحب انه یولیٰ امر الناس الا ان یدفع الیه هذا الامر عفوا فارسل
عبدالله بن عمرو بن عثمان وهو اذ ذاك غلام حدث الیهما لیدعوهما فوجد
هما فی المسجد وهما جالسان فاتاهما فی ساعة لم یکن الولید یجلس فیها
للناس ولا یاتیانه فی مثلها فقال اجیبا الامیر یدعو کما فقالا له انصرف
الان ناتیه ثم اقبل احدهما علی الاخر فقال عبدالله بن زبیر للحسین ظن
فیما تراه بعث الینا فی هذه الساعة التی لم یکن یجلس فیها فقال حسین قد
ظننت ادری طاغیتهم قد هلك فبعث الینا لیا خذنا بالبیعة قبل ان یفشو
فی الناس الخبر فقال وانا ما اظن غیره قال فما ترید ان تصنع قال اجمع
فتیانی الساعة ثم امشی الیه فاذا دخلت الباب علیه قال فانی اخافه علیك
اذا دخلت قال لا اٰتیه الا وانا علی الامتناع قادر فقام فجمع الیه موالیه
واهل بیته ثم اقبل یمشی حتی انتهی الی باب الولید و قال لا صحابه انّی
داخل فان دعوتکم او سمعتم صوته قد علا فاقتحموا علی باجمعکم ولا فلا
تبرحوا حتی اخرج الیکم۔ (الطبری، جلد ۶ صفحہ ۱۸۹)

جب معاویہ کے انتقال کی خبر ولید کے پاس پہونچی تو وہ گھبرا گیا اور اسے اس کی بڑی اہمیت
محسوس ہوئی، اور اس نے مروان ابن حکم کے پاس آدمی بھیجا، اور اسے اپنے پاس آنے کی دعوت
دی، حالانکہ ولید جب مدینہ کا حاکم ہو کر آیا ہے تو مروان نے اس پر نا گواری محسوس کی تھی، اور ولید
نے اس کی بے رخی دیکھ کر اسے اپنے دربار میں کچھ برا بھلا کہا تھا۔ یہ خبر مروان کو پہنچی تو وہ اس سے
کھنچ گیا، اور آمدورفت ترک کر دی۔ یہ حالت یونہی قائم رہی۔ اس موقع تک کہ جب معاویہ کی خبر
پہنچی، تو چونکہ معاویہ کے مرنے اور پھر ان لوگوں سے جن کے نام لکھے گئے تھے، بیعت لینے کے

مسئلہ کی اہمیت ولید نے بہت محسوس کی تھی، اس لئے مجبوراً مروان کو بلایا، ولید نے اسے یزید کا خط پڑھ کر سنایا، تو اس نے کلمۂ استرجاع زبان پر جاری کیا، اور دعائے مغفرت کی، اس کے بعد ولید نے اصل معاملہ میں مشورہ چاہا اور کہا کہ تمہاری رائے میں ہمیں کیا صورت اختیار کرنا چاہئے اس نے کہا میری رائے یہ ہے کہ اسی وقت تم ان لوگوں کے پاس آدمی بھیجو اور انھیں بیعت کرنے اور حلقۂ اطاعت میں داخل ہونے کی دعوت دو، اگر وہ ایسا کریں تو خیر، ان سے پھر تعرض نہ کرو، لیکن اگر انکار کریں، تو معاویہ کے انتقال کی خبر ہونے سے پہلے ہی ان کی گردنیں ماردو اس لئے کہ اگر ان کو معاویہ کے انتقال کی خبر ہوگئی، تو ہر ایک ایک طرف جست کر کے کھڑا ہوجائے گا، اور اختلاف کا اعلان کردے گا، اور لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کردے گا، پھر کیا جانیئے کیا نتیجہ ہو۔ بس ابن عمر کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ جنگ کا ارادہ نہ کریں گے، اور نہ خود سے حکومت حاصل کرنے کا ارادہ کریں گے، ہاں مگر یہ کہ وہ ان کے سر خواہ مخواہ منڈھ دی جائے اس گفتگو کے بعد عبداللہ بن عمر بن عثمان کو جو ایک کمسن لڑکا تھا ان دونوں کے پاس بلانے کے لئے بھیجا گیا اس نے دیکھا کہ دونوں مسجد میں بیٹھے ہیں، اور بلانے ایسے وقت آیا تھا، جس وقت عموماً ولید لوگوں سے ملاقات کے لئے نہیں بیٹھتا تھا اور نہ لوگ ایسے وقت ملاقات کے لئے جاتے تھے، اس نے کہا امیر نے آپ دونوں کو بلوایا ہے دونوں نے جواب دیا کہ جاؤ ہم ابھی آتے ہیں، پھر ایک نے دوسرے کی طرف رخ کیا اور عبداللہ بن زبیر نے امام حسینؑ سے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے، ہم کو ایسے بے وقت کیوں بلایا گیا ہے، امام نے فرمایا، میرا خیال تو یہ ہے کہ ان کا ستمگار حاکم ہلاک ہوگیا اور ہم کو اس لئے بلایا گیا ہے کہ خبر پھیلنے کے پہلے ہم سے بیعت حاصل کرلی جائے، انھوں نے کہا کہ میرا ابھی یہی خیال ہے اب آپ کا کیا ارادہ ہے، فرمایا کہ میں ابھی اپنے خاندان کے جوانوں کو یکجا کرتا ہوں اور پھر ولید کے پاس جاؤں گا۔ جب دروازہ پر پہنچوں گا تو انھیں وہاں ٹھہرادوں گا اور پھر خود اندر داخل ہوں گا۔ عبداللہ نے کہا کہ اگر آپ وہاں جائیں گے تو مجھے آپ کے متعلق خطرہ ہے۔ حضرت نے فرمایا

میں جارہا ہوں تو اسی وقت کہ جب اپنے تحفظ پر قدرت رکھتا ہوں، پھر حضرت اسی صورت سے تشریف لے گئے، یہاں تک کہ ولید کے دروازے تک پہنچے، اور اپنے ساتھ والوں سے فرمایا کہ میں اندر جاتا ہوں، جب میں تمہیں پکاروں، یا تم ولید کی آواز کو سنو کہ بلند ہوگئی، تو سب کے سب اندر داخل ہوجانا، اور نہیں تو جب تک میں باہر نہ آؤں تم یہاں سے حرکت نہ کرنا۔

مذکورہ بیانات پر جب غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ متفق علیہ ایک واقعہ ہے جو ان سب کے پیشِ نظر ہے، ان میں آپس میں اختلاف کوئی بھی نہیں ہے۔ بس بیان کرنے میں کسی نے اختصار سے کام لیا ہے اور کسی نے تفصیل سے، سب سے زیادہ اختصار شیخ مفید رحمہ اللہ نے کیا ہے، مگر ایک بات کی تصریح ان کے یہاں زیادہ ہے، جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں ہے، وہ یہ کہ ولید نے امامؑ کے پاس آدمی رات کے وقت بھیجا۔ دینوری اور طبری کسی کے یہاں رات کی تصریح نہیں ہے، مگر یہ ہے کہ وہ وقت ایسا تھا جس میں عموماً ولید سے ملاقات نہ ہوتی تھی۔ طبری نے کہا ہے، نہ ولید اس وقت کسی کو بلاتا تھا، نہ کوئی اس وقت اس کے پاس جاتا تھا۔ اب یا تو اسی سے یہ تصور پیدا ہوا ہو کہ وہ رات کا وقت تھا یا شیخ مفید رحمہ اللہ کے پیش نظر کسی ایسے راوی کا بیان ہو جس نے رات ہونے کی تصریح کی ہو۔

ولید اور مروان کی باہمی نزاع کا اجمالی تذکرہ دینوری اور طبری نے کیا ہے، مگر طبری نے اس نزاع کا ابتدائی سبب بھی بیان کردیا ہے، جو بالکل قرین قیاس ہے، اس نزاع کے باوجود ولید کا مروان کو مشورہ کے لئے بلانا، انتہائی اضطراب ہی کا نتیجہ ہوسکتا ہے، اور اس سے ظاہر ہے کہ یزید کا خط ولید کے لئے بڑی پریشانی کا باعث بن گیا تھا، اور بالخصوص ان افراد سے بیعت کا مطالبہ جن کے نام اس خط میں درج تھے اور پھر اس سلسلہ میں جو کچھ اسے ہدایت کی گئی تھی وہ اسے اپنی طاقت سے باہر چیز سمجھ رہا تھا، جب ہی اسے اتنی تشویش لاحق ہوئی اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، سوا اس کے کہ وہ مروان سے مشورہ لے، اس لئے بھی کہ مروان کافی جہاندیدہ آدمی ہے، اور اس لئے بھی کہ جو

کچھ میں طرزِ عمل اختیار کروں، اوراس کا جونتیجہ ہواس کی ذمہ داری میں مروان بھی شریک ہوجائے۔ کیونکہ یہ میرا بدخواہ تو ہے ہی، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میری نسبت حکومت وقت کے اس تعمیل حکم میں کوتاہی کا کوئی الزام عائد کرسکے، اور چونکہ یزید خود ایک الھڑ، جوشیلا، اور بے خود وسرمست شخص تھا، لہٰذا ولید کو شاید یہ توقع بھی ہو کہ مروان اپنی تجربہ کاری کی بدولت کسی ایسے اقدام کا مشورہ نہ دے گا، جو حالات کی پیچیدگی میں اضافہ کرے، اور نتیجہ میں حکومت اموی کے لئے مضر ثابت ہو، اس کے ساتھ ممکن ہے صحابیِ رسولؐ ہونے کے تخیل میں اسے مروان کی نسبت یہ خوش گمانی بھی ہو، کہ اس کے دل میں اتنا خوفِ خدا ہوگا کہ وہ مجھ کو کوئی ایسا مشورہ نہ دے گا جو بدیہی طور پر غضب الٰہی میں گرفتار بنانے کا باعث ہو، مگر افسوس ہے کہ اس کے یہ توقعات پورے نہیں ہوئے، مروان نے اسے ایسا مشورہ دیا، جو اموی خاندان کی فرد ہونے کے باوجود اسے ناقابل عمل محسوس ہوا، اوراس پر عمل نہ کرنے کی بنا پر مروان نے بالآخر خود یا کسی اور ہواخواہ کے ذریعہ سے اس کی شکایت مرکز تک پہنچائی اوراس کے نتیجہ میں اسے مدینہ کی حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

مروان کا یہ مشورہ دینا کہ اگر یہ دونوں بیعت نہ کریں، تو فوراً ان کا سر قلم کردو۔ اس کی دلیل ہے کہ یزید نے مطالبہ بیعت کے ساتھ پہلے ہی خط میں ولید کو امام حسینؑ کے خلاف ہر متشدد اقدام یہاں تک کہ قتل کا حکم دے دیا تھا، ورنہ مروان کو یہ مشورہ دینے کی ہرگز جرأت نہ ہوتی اور اگر وہ ایسی حماقت سے کام لیتا بھی تو ولید اس کے جواب میں کہتا کہ یہ تم مجھے کیسا مشورہ دے رہے ہو۔ مجھے تو صرف سوال بیعت پیش کرنے، اوراس پر اصرار کرنے کی ہدایت ہے، میرے اصرار کے بعد جو جواب مجھے ملے اس کی اطلاع مجھے مرکز میں بھیجنا چاہئے۔ اور پھر وہاں سے جو ہدایت ہواس پر عمل کرنا چاہیئے۔ میں بطور خود اتنا بڑا قدم کیونکر اٹھا سکتا ہوں کہ فرزند رسولؐ کا سر قلم کردوں، مگر ولید نے مروان کے جواب میں یہ قانونی عذر پیش نہیں کیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسے اس خونریزی میں یزید کی طرف سے کسی عتاب کا اندیشہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ خود خوفِ خدا سے اپنے کو اس سے قاصر

محسوس کررہا تھا۔ جس کے نتیجہ میں اسے حکومت مدینہ سے برطرف ہونا پڑا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مروان کے مشورہ پر عمل کرتا تو معتوب نہ ہوتا، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے اسے معتوب ہونا پڑا۔ اس سے ان لوگوں کے خیال کی بالکل رد ہوجاتی ہے جو ایسا گمان کرتے ہیں، یا سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یزید بذاتِ خود امام حسینؑ کے قتل کا خواہاں نہ تھا، اور یہ ابن زیاد کا بطور خود ایک اقدام تھا، جس کے متعلق یزید کی کوئی ہدایت موجود نہ تھی۔

ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ شروع سے یزید نے طے کرلیا تھا کہ بیعت نہ کرنے کی صورت میں، امام حسینؑ کی زندگی کا خاتمہ ہونا چاہئے۔ جس کی تعمیل ولید نہ کرسکا۔ اس لئے معتوب ہوا۔ اور ابن زیاد نے اس کی تعمیل کردی، اوراس لئے اس کے رسوخ اور اثر میں اس کے بعد اضافہ ہوگیا۔

❁❁❁

نفس مطمئنّہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

اطمینان کی صفت مقابل اضطراب ہے۔ اضطراب دماغ میں بھی ہوتا ہے، اور دل میں بھی، اور ان دونوں کے نتیجہ میں پھر عمل میں۔

اضطراب دماغ کا یہ ہے، کہ انسان کی رائے ڈانواڈول ہو۔ کبھی کچھ سونچے اور کبھی کچھ، اور دل کا اضطراب یہ ہے کہ صحیح فیصلہ تک پہنچ جانے کے بعد اس کی ہمت ہچکولے کھا رہی ہو، کبھی اسے جوش آتا ہو، اور کبھی نتائج کے خطرے سے اس کی ہمت پست ہونے لگتی ہو۔

اور اس سب کے نتیجہ میں عمل میں جو اضطراب ہوتا ہے اس میں داخل ہیں: عاجلانہ اقدامات، گھبراہٹ کی باتیں، اقوال وافعال میں تضاد، اور اقدامات میں تذبذب وغیرہ کے علامات۔

اضطراب کے جتنے پہلو ہیں۔ ان کے بالمقابل اطمینان کے پہلو ہیں۔

رائے میں استقلال، پھر ارادہ میں استقلال، عمل میں ٹھہراؤ اور ہر کام کا مناسب وقت پر بغیر کسی جلد بازی کے انجام دینا اور خطرات کی شدّت سے قدم میں تزلزل پیدا نہ ہونا۔

درحقیقت صبر، استقلال اور ثبات قدم، سب اسی اطمینان نفس کے مختلف اعتبارات سے تعبیرات ہیں۔

اب اطمینان اور اضطراب کے ان پہلوؤں کے لحاظ سے جب ہم مجاہد کربلا حضرت امام حسینؑ کے کردار پر از اوّل تا آخر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں اطمینان کا ہر رخ اتنا مکمل نظر آتا ہے کہ 'نفس مطمئنہ' کی لفظ جیسے اس مصداق سے مخصوص معلوم ہوتی ہے۔

آیئے! ان میں سے ایک ایک پہلو کو لیں اور اس کے اعتبار سے سید الشہداء سلام اللہ علیہ کی

سیرت کا مطالعہ کریں۔

'اطمینان دماغ'، یعنی رائے کی یکسوئی اور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس محل پر جب رائے کی لفظ کا ہم استعمال کرتے ہیں، تو عام انسانی زبان میں ان 'عقائد و مسلّمات' سے قطع نظر کرتے ہوئے جن پر بنائے دلائل قطعیہ حضرت امام حسینؑ کی منصبی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے۔ مگر ایک بلند مرتبہ انسان کی حیثیت سے ہر مذہب وملت کے انسان سے امام حسینؑ کا جب تعارف کرانا ہو تو اس وقت 'رائے' ہی کے لفظ استعمال کرنا پڑتی ہے۔

رائے کا استحکام نمایاں کس وقت سے ہوتا ہے؟ جب سے وہ قریبی حالات نمایاں ہوئے، جو کشاں کشاں تاریخ کی رفتار کو واقعۂ کربلا تک لائے۔ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی صلح اور خاص شرائط کے ماتحت آپ کا حکومت ظاہری سے دستکش ہونا اور امیر شام کے قبضہ کا تمام ممالک اسلامیہ پر بلا استثنائے عراق وحجاز قائم ہو جانا ہے۔

معلوم ہے کہ حضرت امام حسنؑ کی فوج کے کثیر التعداد افراد اس صلح سے متفق نہ تھے۔ اور جیسے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلح پر جو آپ نے حدیبیہ میں مشرکین کے ساتھ فرمائی تھی بہت سے نام نہاد مسلمان برہم تھے، اسی طرح اس صلح سے جو امام حسنؑ نے امیر شام کے ساتھ فرمائی تھی بہت سے نام نہاد شیعہ برہم تھے۔ اور ایک حلقہ میں یہ پروپیگنڈا بھی تھا، کہ چھوٹے بھائی یعنی حضرت امام حسینؑ اپنے بڑے بھائی کی اس صلح سے اتفاق نہیں رکھتے۔ اس موقع پر طبری سے بھی زیادہ قدیم مورّخ ابوحنیفہ دینوری کی کتاب الاخبار الطوال کی یہ روایت بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ چند اہم سردار امام حسنؑ کی فوج کے امام حسینؑ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت امام حسنؑ کو اس صلح کا جو انہوں نے کی ہے پابند رہنے دیجئے اور آپ ہماری سربراہی کیجئے اور ہم ایک دم شام پر حملہ کر دیں، پھر دیکھئے گا کہ معاویہ کو کس طرح ہم شکست دیتے ہیں۔ حضرت امام حسینؑ نے اس کا جو تاریخی جواب دیا، اس کا مضمون یہ تھا کہ اب امیر شام کی حیات تک خاموش بیٹھے رہو، اس کے بعد

پھر مجھ سے کچھ کہنا۔

یہ ہے امیر شام کی زندگی کے اختتام سے بیس ۲۰ برس پہلے کی بات اور اب امیر شام کی زندگی کا خاتمہ رجب ۶۰ھ میں ہوتا ہے اور بس کارنامۂ حسینی کا، جو ۱۰ محرم ۶۱ھ کو آپ کی شہادت کی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچا، آغاز ہوجاتا ہے تو کیا حضرت امام حسینؑ کے اس جواب میں جو بیس (۲۰) برس پہلے دیا گیا تھا صاف اس مستقبل کی جو اُس کے بیس برس بعد آنے والا تھا خبر نہ تھی اور کیا یہ آپ کے غیر متزلزل استقلال رائے کا ناقابل انکار ثبوت نہیں ہے۔

پھر جب سے امیر شام نے بیعت یزید کے لئے کوشش شروع کی، آپ نے جو بیعت سے انکار فرمایا، کسی لمحہ بھی اس میں کوئی تذبذب نظر آیا؟ تذبذب کا ایک معمولی اثر یہی ہوسکتا تھا کہ آپ اپنے ہمدردوں کو جمع کر کے مشورہ ہی لیتے کہ مجھ سے بیعت کا مطالبہ ہو رہا ہے آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟ تب کسی حد تک یہ سمجھا جا سکتا تھا کہ آپ کو صورت حال کی نزاکت کی وجہ سے تردد ہے۔ مگر کوئی ضعیف سے ضعیف روایت بھی ایسا نہیں بتاتی۔

اس بنیادی مسئلہ کا کیا ذکر؟ انکار بیعت کے بعد جو طریقہ کار آپ نے اختیار فرمایا، اس میں بھی آپ نے لوگوں سے کبھی کوئی مشورہ نہیں کیا۔ کچھ لوگ سچی یا نمائشی ہمدردی سے خود ہی آ آ کر طرح طرح کی رائیں دیتے رہے، جنھیں آپ نے مختلف طرح کے جواب دے کر ٹال دیا اور جو طریق کار خود اختیار فرمالیا تھا اس میں ذرّہ بھر بھی تبدیلی نہیں فرمائی۔

اس سے دوسرا جزو دل کا اطمینان بھی نمایاں ہے، یعنی جو طریق کار طے کیا، اس سے نہ کسی دوست کی دوستی کے اثر سے ہٹے، اور نہ کسی دشمن کی دشمنی کے دباؤ سے اور اس کے نتیجے میں عملی استقلال واطمینان جو آپ سے ظہور میں آیا، وہ اپنی منفرد مثالی شان رکھتا ہے۔

اضطراب نفس کے علامات میں سب سے پہلا درجہ عاجلانہ اقدامات کا ہے۔

حضرت امام حسینؑ پہلے دن سے سمجھے ہوئے ہیں کہ مجھے موت کے دریا میں تیرنا ہے، مگر جو موت

کو یقینی طور سے دل میں ٹھانے ہوئے ہے، وہ حفظ حدود آئین شریعت وعقل کے لئے جان کے تحفظ کی صورتیں بھی اختیار کر رہا ہے کبھی مکہ میں پناہ لے کر اور کبھی عین موقع حج میں مکہ کو چھوڑ کر، اور کبھی کربلا پہنچنے کے بعد شرائط صلح پیش فرما کر، اور یہاں تک کہ روز عاشورا اتمام حجت کے لئے خطبے پڑھ کر اور اس وقت کا انتظار کر کے جب آغازِ جنگ ادھر سے ہو۔

عمل میں یہ ٹھہراؤ بغیر کامل سکون واطمینان نفس کے ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر 'گھبراہٹ کی باتیں' اور 'بیانات میں تضاد'، اس کی کوئی اموی مورخ بھی کبھی آپ کی جانب نسبت نہیں دے سکا۔

حالانکہ مصلحت جنگ کے ماتحت قانون شرع میں بھی کسی حد تک واقعات کو چھپانے کی اجازت دی گئی ہے مگر آپ نے دوست اور دشمن کسی کے سامنے بھی صحیح صورتِ حال پر پردہ ڈالنے کی کبھی کوشش نہیں فرمائی یہاں تک کہ حضرت مسلمؑ وہانی کی خبر شہادت جو عام ساتھیوں سے پردہ میں رہی تھی۔ آپ نے خود اپنی ایک تحریر (تقریر) کے ذریعہ سے سب پر ظاہر کر دی اور اپنے ساتھیوں کو اجازت دی، کہ وہ آپ کا ساتھ چھوڑ کر چلے جائیں جس سے آپ کے ساتھ کا مجمع جو راستے میں بہت ہو گیا تھا منتشر ہو گیا، اور وہی قلیل افراد رہ گئے، جو مکہ معظّمہ سے ساتھ آئے تھے، مگر آپ نہ پہلے اس سے ڈرے اور نہ بعد میں اس نتیجہ کے سامنے آنے پر پریشان ہوئے بلکہ گویا مزید اطمینان کی سانس لی، کہ اب میرے کارنامہ میں وہ جھول نہیں آ سکتا، جو ناقص ساتھیوں کی وجہ سے آ سکتا تھا، اور وہی کردار شبِ عاشور تک قائم رہا جب مخالف سمت سے حملہ ہو جانے کے بعد آپ نے ایک شب کی مہلت حاصل کر کے پھر اپنے ساتھیوں کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے جانے کی اجازت دی۔ یہ اور بات ہے کہ اب مجمع خالص افراد کا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس اجازت سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مگر بروایت طبری جب ایک شخص ضحاک بن عبداللہ مشرقی نے اس حد تک اس اجازت سے فائدہ اٹھایا، کہ انہوں نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ اس وقت تک رہوں گا جب تک

جنگ چھڑے، اور آپ کی نصرت بھی کروں گا۔ مگر پھر اس کے بعد جب سوا جان دینے کے کوئی منزل نہ رہے گی، تو میں جدا ہو جاؤں گا، تو آپ نے بکشادہ پیشانی ان کو اس کا حق دیا، اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔ روزِ عاشور آپ کی نصرت میں جنگ بھی کی، اور بعض دشمنوں کو تہِ تیغ بھی کیا، اور پھر حسبِ وعدہ آپ سے رخصت ہونا چاہا، تو آپ نے ایسے نازک وقت میں بھی ذرّہ بھر ان کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کردار ایک ایسے ہی 'نفس مطمئنہ' کا ہوسکتا ہے۔ جس کا نام تاریخ کی زبان میں حسینؑ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

اقدامات میں تذبذب رائے میں تحیّر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہاں جس طرح اصل معاملہ میں حضرت امام حسینؑ نے کبھی کسی سے کوئی مشورہ نہیں لیا، اسی طرح پورے کارنامہ میں طریق کار کے جزئیات تک میں کوئی ایک موقع کبھی ایسا نہیں آیا ہے کہ آپ نے دوستوں اور عزیزوں کو جمع کرکے پوچھا ہو، کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ یہاں تک کہ حملہ ہوجانے کے بعد بھی آپ کی طرف سے ہدایات ہی ہدایات، احکام ہی احکام ملتے ہیں اور اصحاب، انصار اور اعزا کی طرف سے تعمیل ہی تعمیل، گویا بہتر (۷۲) نفس سب تھے اعضا، اور ان میں کارفرما دل و دماغ صرف ایک تھا، جس کا نام ہے **حسین**، جس میں ذرّہ بھر کوئی اضطراب نہیں ہے، تاکہ اسے سہارا دینے کے لئے کسی اور دل و دماغ کے ہمّت وعزم کے کام کرنے کی ضرورت ہو۔

کربلا کے ایسے قیامت خیز ہنگامۂ مصائب میں اعزّاء وانصار میں سے ہر ایک کے ساتھ امام حسینؑ کا برتاؤ، ہر ایک کے حقوق کا لحاظ، حفظ مراتب کے ساتھ مساوات اسلامی کا تحفظ، حقوق اللہ اور حقوق الناس کے جزئیات تک کی مراعات، ترتیبِ شہداء، ہر ایک کی رخصت اور شہادت کے وقت اس کے شایانِ شان تاثراتِ غم کے مظاہرہ کے ساتھ جو درحقیقت اس شہید کے قدر و مرتبہ کے آئینہ بردار تھے، پھر آئندہ قربانی کے پیش کرنے پر مستعدی، یہ سب اسی اطمینانِ نفس کے شواہد و آثار تھے، جو آنکھوں کے سامنے آرہے تھے اور اب کتب مقاتل و تاریخ کے صفحات پر ہمارے

سامنے ہیں۔

یہی اطمینانِ نفس ہے جسے دشمن تک کی نگاہ نے محسوس کیا اس وقت جب آپ زخموں سے چور، بہتّر داغ دل پر، اور بے شمار تیر و نیزہ و شمشیر کے زخم جسم پر کھائے ہوئے میدان جنگ میں شہادت کی منزل سے قریب سے قریب تر ہو رہے تھے، تو دشمن نے اس وقت بھی کوئی ایسی امتیازی خصوصیت محسوس کی، جس کی گواہی طبری کی تاریخ میں اب تک محفوظ ہے۔ کہ "ما رأیت مکثوراً قط قتل اهل بیته وانصاره اربط جاشیا من الحسین علیه السلام" میں نے کوئی ایسا انسان نہیں دیکھا جو زخموں سے چور ہو اور جس کے عزیز وانصار قتل ہوچکے ہوں اور وہ حسینؑ سے زیادہ مطمئن نظر آتا ہو۔

یہ تھے حسینؑ جو بلاشبہ اس عظیم اطمینان نفس کے حامل تھے کہ جب ان تمام مشکلات ومصائب کے ہفت خوانوں کو طے کئے ہوئے وہ اپنے خالق کی بارگاہ کے سامنے پہنچیں، تو خود معبود خیر مقدم کے طور پر آواز دے۔ يَآ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔

جو سورۂ فجر کی آخری آیت ہے اور اسی لئے یہ سورہ سورۃ الحسینؑ کے لقب ہی سے ملقب ہوگیا ہے۔

یہ مقالہ امامیہ مشن، لکھنؤ کے سلسلہ اشاعت (نمبر ۵۳۵) میں محرم ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔

۞۞۞

امام حسینؑ کی شہادت اور دستور اسلامی کی حفاظت

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی و آیۃ اللہ العظمیٰ سیّد العلماء مولانا سیّد علی نقی نقوی طاب ثراہ

امام حسینؑ کی شہادت دستور اسلامی کی حفاظت کے لئے تھی امن کے زمانے میں شریعت موجود تھی لیکن دستور کی روح بدل دی گئی تھی شہادت امام پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ایک تقریر

(دعوت دہلی، ۱۰/جولائی ۱۹۶۰ء)

۲۶/جون کو ٹمپل روڈ (لاہور) پر واقع ایک کوٹھی میں، جس کے مکین ایک شیعی المذہب ایڈوکیٹ ہیں ایک مجلس منعقد ہوئی شامیانوں کے نیچے کوٹھی کے لان میں دریاں بچھی ہوئی تھیں، اور شیعہ حضرات سے زیادہ سنّی بیٹھے تھے کیونکہ اخباروں میں اعلان ہو چکا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ''مقصد شہادت'' کے موضوع پر تقریر کریں گے۔ اتفاق سے موسم بھی نہایت خوش گوار تھا۔ رات کو ہلکا سا ترشح ہو چکا تھا، اور صبح کے ساڑھے سات بجے آسمان پر ہلکا ہلکا سا ابر سایہ افگن تھا، جلسہ گاہ میں بجلی کے پنکھوں نے فضا کو مزید خنکی بخش دی تھی۔ ایسے عالم میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔

خطبۂ مسنونہ اور حمد و نعت کے بعد فرمایا:

''آج محرم الحرام کا آغاز ہے، اور میرے سامنے جو حضرات جمع ہیں، ان میں شیعہ اور سنی دونوں ہی ہیں، اور وہ اس وجہ سے یہاں آئے ہیں کہ انھیں اہل بیتؑ اور امام حسینؑ اور اسلام سے دلی محبت ہے اور وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کربلا میں جو واقعہ پیش آیا تھا، اس کے پیچھے وہ کیا مقصد

تھا جس کی خاطر امام عالی مقام نے، نہ صرف اپنی جان دے دی، بلکہ اپنے اہل و عیال کو بھی کٹوا دیا۔ سوال یہ ہے کہ آخر امام عالی مقام یہ قدم اٹھانے پر کیوں آمادہ ہوئے؟ کیا اس وقت ملت کا دین بدل گیا تھا، اس نے اسلام چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا؟ کیا لوگ خدا کو ایک ماننے سے منکر ہو گئے تھے؟ کیا وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے منکر ہو گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی۔ جو بات ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ملک کا دستور بدل دیا گیا تھا، اس کی روح بدل دی گئی تھی، اس کا مقصد بدل دیا گیا اور ترک کر دیا گیا تھا اور امام عالی مقام اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اٹھے تھے۔

جس دستور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست قائم کی تھی، اور جس پر خلافت راشدہ کے دور میں سلطنت کا انتظام چلتا رہا تھا اس کی بنیاد یہ تھی:۔

ملک خدا کا ہے، وہی قانون دینے والا ہے، وہی اصل مالک و آقا ہے اور حاکم، جس کے ہاتھ میں انتظام امور کی باگ ہے۔ وہ اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے پر مامور ہے ملک کا قانون اس لئے نہیں کہ حاکم اسے عوام پر نافذ کرے، بلکہ وہ اس لئے ہے کہ حاکم اور محکوم، رعایا اور راعی دونوں پر یکساں نافذ ہو۔'' اس کا دوسرا اصول یہ تھا کہ حاکم عوام کی رائے سے برسر اقتدار آئے لوگ اس کو اس حال میں اپنا امیر اور حاکم مقرر کریں، جبکہ ابھی وہ برسر اقتدار نہیں آیا ہے اور اس کے بعد اس کی بیعت کریں، وہ اس طرح لوگوں سے بیعت نہ لے کہ برسر اقتدار آ جائے اور پھر لوگوں سے ووٹ لے، ایسی حالت میں اس کی مخالفت کون کرے گا اور اس کی بیعت کون نہ کرے گا۔ ظاہر ہے کہ کوئی صالح اور متقی اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والا اقتدار کو اس طرح لپک کر نہ لے گا۔ بیعت کے ذریعہ برسر اقتدار آنا ایک شئے ہے، اور برسر اقتدار آ کر بیعت لینا دوسری شئے حضرت حسینؑ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ گاڑی کا رخ بدل گیا ہے، اب پہلے لوگ برسر اقتدار آئے، اور پھر انھوں نے لوگوں سے بیعت لی۔ اسلامی دستور کی تیسری بنیاد ''شوریٰ'' ہے

قرآن میں بھی **امرھم شوریٰ بینھم** کا ارشاد آیا ہے۔ اس کا صحیح اسلامی طریقہ یہ ہے کہ قوم میں جو لوگ اہل الرائے علم، امانت اور تقویٰ کے اعتبار سے معتمد علیہ ہوں، ان کو ساتھ لے کر کام کیا جائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا، لیکن شوریٰ کا ایک دوسرا غلط طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ ہاں میں ہاں ملانے والوں میں سے شوریٰ کا انتخاب کیا جائے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ صحیح طریقہ بدل کر غلط طریقہ اختیار کرلیا گیا ہے۔ اب شوریٰ تو موجود ہے، مگر اپنے ہی خاندان کے افراد سے، اپنے ہی متوسلین سے، اپنے ہی فوجی سالاروں سے، اپنے ہی مقرر کئے ہوئے حکام سے منتخب کی گئی ہے۔ یعنی کچھ صاحب غرض ہیں، جو برسرِ اقتدار آگئے ہیں اور انھوں نے صاحب غرض لوگوں کو اپنا مشیر بنالیا ہے ظاہر ہے کہ جب صاحب غرض برسر اقتدار ہوں اور صاحب غرض ہی مشیر، تو وہ امت کے خلاف سازش ہی کریں گے۔ پھر دستور میں بیت المال کا جو اسلامی تصور پیش کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مال سب خدا کا مال ہے اور قوم کی امانت، حاکم اور امیر بر سر اقتدار لوگ اس کے امین ہیں اور اس قوم پر صرف کرنے پر مامور اور اس کی پائی پائی کا حساب انھیں خدا کو دینا ہے۔ یہ حکمرانوں، عمال حکومت اور درباریوں اور خاندان کے افراد کا مال نہیں، اور نہ ان پر صرف کرنے کے لئے ہے۔ لیکن امام عالی مقام نے دیکھا کہ قوم کا خزانہ بادشاہ کے خاندان کی ملکیت قرار دیا گیا ہے گویا قوم ان کی باج گزار ہے۔ جو ان کو خراج دیتی ہے وہ ان سے حساب پوچھنے کا حق نہیں رکھتی۔ اس کے متعلق کہ یہ مال کہاں سے آیا، کیسے آیا، اور نہ صرف کے متعلق کہ کہاں صرف کیا اور قوم کی حیثیت دودھ دینے والی گائے کی ہے جس پر ظلم کرکے جتنا دودھ نچوڑ سکتے ہو نچوڑلو۔

علاوہ ازیں دستور میں عدالت اور قانون کا اسلامی تصور یہ تھا کہ:۔

''ہر شخص قانون کے تابع ہے، اس سے بالا نہیں کوئی خاندان، کوئی گروہ کوئی فرد ایسا نہیں جس پر قانون نافذ نہ ہوسکے۔ انصاف سب کے لئے یکساں اور بے لاگ ہو، اور سب پر نافذ ہو اور جج

جب مقرر ہوجائے تو وہ اپنے علم اور صواب دید کے مطابق فیصلہ کرنے میں بالکل آزاد ہو اس پر دباؤ ڈالنے والا کوئی نہ ہو۔''

اس سے قبل صورت حال ایسی ہی تھی مگر اب جو تغیر ہوا تھا وہ یہ تھا کہ قانون اور عدالت کے دو تصور پیدا کردیئے گئے اوّل(۱) یہ کہ بادشاہ، خاندان، اس کے متوسلین اور حکام قانون کے لئے ہے ان کے لئے نہیں۔

اور دوسرے یہ کہ ایسے جج مقرر نہیں کئے جاتے تھے۔ جو فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں تھے۔ ان کو اوپر سے چٹھیاں جاتی تھیں کہ فلاں مقدمہ میں اس طرح فیصلہ کیا جائے یعنی عدلیہ انتظامیہ کے ماتحت ہوکر رہ گئی تھی۔

یہ تھا وہ نقشہ جو دستور کے متعلق امام عالی مقام نے دیکھا کہ قائم ہو رہا ہے۔ اگر معاملہ اشخاص کا ہوتا تو صبر کیا جاسکتا تھا کیونکہ اشخاص کی عمر بہرحال تھوڑی ہوتی ہے، مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ نظام ہی بدل رہا ہے اور اگر غلط نظام قائم ہوگیا تو پھر اس کا بدلنا ناممکن ہوجائے گا اور حقیقت ہمیشہ کے لئے گم ہوکر رہ جائے گی۔

شہادت امامؑ اور دستور اسلامی

ازقلم آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲۶ / جون ۱۹۶۰ء کا واقعہ ہے کہ ٹمپل روڈ (لاہور) پر واقع ایک کوٹھی میں ایک مجلس منعقد ہوئی اور اس کی روئداد جماعت اسلامی ہندوستان کے ترجمان دعوت دہلی میں ۱۰ / جولائی ۱۹۶۰ء کو شائع ہوئی۔

جس کا خلاصہ جلی قلم کی ان سرخیوں سے ظاہر کیا گیا ہے جو مضمون کے اوپر درج ہیں:۔

(۱) یہ جملہ سمجھ میں نہیں آیا۔

پہلی سرخی: ''امام حسینؑ کی شہادت دستورِ اسلامی کی حفاظت کے لئے تھی''۔

دوسری سرخی: ''ان کے زمانہ میں شریعت موجود تھی لیکن دستور کی روح بدل دی گئی تھی۔''

اس کے تحت میں مولانا فرماتے ہیں:۔

''آخر امام عالی مقام یہ قدم اٹھانے پر کیوں آمادہ ہوئے؟ کیا اس وقت امت کا دین بدل گیا تھا؟ اس نے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا؟ کیا لوگ خدا کو ماننے سے منکر ہو گئے تھے؟ کیا وہ نبیؐ کی نبوت کے منکر ہو گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی، جو بات ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ ملک کا دستور بدل گیا تھا اس کی روح بدل دی گئی تھی، اس کا مقصد بدل دیا گیا اور ترک کر دیا گیا تھا۔ اور امام عالی مقام اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اٹھے تھے۔''

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ جناب مودودی صاحب نے ایک ایسے ماحول میں جہاں وہ سیاسیات پر کھلے ہوئے اسٹیج سے کوئی آواز بلند نہیں کر سکتے تھے، مجلس حضرت امام حسینؑ کو سیاسی نقطہ نظر کی تبلیغ کا ذریعہ بنایا ہے، اور کچھ شیعوں نے مقصد میں ان کے ساتھ متحد ہونے کی بنا پر، اور کچھ نے ''عشق امام مظلومؑ میں اس موقع کو غنیمت جان کر کہ مولانا مودودی بحیثیت ذاکر حسینؑ منبر پر آ رہے ہیں، ان کے ساتھ تعاون کیا، مگر ہم سمجھتے ہیں کہ مودودی صاحب کا مجلس امام حسینؑ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنا، اس فضا میں جہاں اس قسم کے نظریات کا اظہار خطرناک ہو، مجلس مظلومؑ کے ساتھ کوئی خیر خواہانہ رویہ نہیں ہے۔''

دوسرا ایک اصولی سوال جو مولانا کی اس تقریر سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ واقعہ کربلا میں اقدام حضرت امام حسینؑ کی طرف سے تھا، یا آپ کے خلاف حکومت دمشق کی طرف سے اقدام تھا، جس کا مقابلہ آپ نے اپنے صبر و استقامت سے فرمایا۔

جناب مودودی صاحب کے یہ الفاظ کہ:۔

''امام عالی مقام یہ قدم اٹھانے پر کیوں آمادہ ہوئے۔ پھر آخر میں یہ کہ:۔

ملک کا دستور بدل گیا تھا، اور امام عالی مقام اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اٹھے تھے۔''

کچھ ایسا تصور پیدا کرتے ہیں کہ پیش قدمی آپ کی طرف سے تھی، اور اس کے لئے مولانا کو یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے، کہ آپ اس پیش قدمی پر کیوں آمادہ ہوئے؟

تیسرا سوال۔ حضرت کے اقدام کی اس نوعیت سے قطع نظر کہ وہ ابتدائی تھا، یا جوابی، اور مقاومتی، یہ خاص بات ہے کہ جناب مودودی صاحب نے حضرت کے اقدام کی طرف مقابل عامہ اہل اسلام کو قرار دیا ہے اور اس لئے یہ سوال پیدا کئے ہیں کہ اس وقت ملت کا دین بدل گیا تھا اس نے اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا تھا؟ کیا لوگ خدا کے ماننے سے منکر ہو گئے تھے۔ یا وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے منکر ہو گئے تھے پھر ان تمام باتوں کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:۔

ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی نہیں تھی''۔

حالانکہ آپ کے مقاومت و مجاہدہ کی زد کوئی براہ راست عوام پر نہ تھی۔ آپ کی مقاومت تو حکومت دمشق کے مقابلہ میں تھی، جس کا عوام سے بس اتنا تعلق تھا کہ اس حکومت کی سیاہ کاریوں اور چیرہ دستیوں کے سامنے عوام میں جو بے حسی پائی جاتی ہے وہ دور ہو، اور احساس کے ساتھ ساتھ ان میں جرأت اظہار اتنی پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز کو اپنے دہن سے بلند کر سکیں۔

چوتھا سوال۔ ملک کا دستور بدل دیا گیا تھا اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی باقاعدہ دستور ملک کا موجود تھا۔ اب یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ملک کے لئے یہ دستور بر بنائے وحی قائم ہوا تھا، یا مسلمانوں نے دل بخواہ طور پر بنایا تھا، اور یہ دستور شروع سے برابر یکساں رہا تھا، یا اس کے پہلے بھی اس میں برابر تبدیلی ہوتی رہی تھی اور اگر تبدیلی ہوتی رہی تھی تو اب اس وقت اس میں وہ خاص تبدیلی کیا تھی، جو ناقابل برداشت تھی۔ جب تک ان امور کی وضاحت نہ ہو۔ واقعہ کربلا سے یہ سیاسی فائدہ اٹھانا کہ ملک کے دستور کا مسئلہ ایسی قربانی کا متقاضی ہوتا ہے جیسی حضرت امام حسینؑ نے کربلا میں پیش

کی تھی، اساسی طور پر کوئی مستحکم حیثیت نہیں رکھتا۔

پانچواں سوال: ملک کا دستور بدل گیا تھا۔ امام عالی مقام اس صورت حال کی اصلاح کے لئے اٹھے تھے۔

اس سے فرقہ وارانہ اختلاف کے سلسلے میں یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے، کہ اس سے پہلے جو ملکی دستور نافذ تھا، اسے حضرت امام حسینؑ اوران کے پیش رو صحیح سمجھتے تھے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد ہی اسلام کے نظام اجتماعی کا دستور بدل دیا گیا تھا، اوراس تبدیل کے نتیجہ میں برابر قربانیاں پیش ہوتی رہی تھیں۔ چنانچہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس سلسلہ کی پہلی قربانی خاتون اسلام بضعۃ الرسولؐ خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی تھی۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی پوری زندگی اس غلط نظام کے مقابلہ میں کشمکش میں بسر ہوئی۔ پھر اسی غلط نظام کے مضر اثرات کو محدود کرنے کی ایک امکانی کوشش تھی جو حضرت امام حسن مجتبیٰؑ نے صلح کی صورت میں انجام دی تھی، اوراب اسی غلط نظام کی چیرہ دستی کی انتہا تھی جس کے مقابلہ میں حضرت امام حسینؑ نے یہ آخری قربانی پیش فرمائی۔ جس نے اپنے دوررس اثرات سے اس نظام فاسد کی تمام مشکلوں کے بطلان پر ناقابل شکست مہر ثبت کردی سب سے آخر میں چھوٹی بات یہ ہے کہ آج سوا تیرہ سو برس کے بعد آپ حضرت امام حسینؑ کے اقدام کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شریعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی، اور ملت میں دین اسلام سے کوئی انحراف نہ ہوا تھا۔ بس دستور ملک کا بدل گیا تھا۔ اس لئے حضرت امام حسینؑ نے یہ قدم اٹھایا، مگر خود حضرت امام حسینؑ نے کربلا سے پہلے اور کربلا میں عصر عاشور تک کتنے خطبے ارشاد فرمائے ہیں۔ ان میں دیکھنا چاہئے کہ آپ نے اپنے طرز عمل کو کبھی بھی، اس سیاستی بنیاد پر مبنی قرار دیا؟ اگر ایسا نہیں ہے، اور یقیناً ایسا نہیں ہے، تو ماننا پڑے گا کہ یہ ایک غلط فائدہ ہے جو کچھ ہنگامی حالات کی بنا پر کارنامہ حسینی سے اٹھایا جارہا ہے، اور وہ کسی طرح حقیقت واقعہ کے مطابق نہیں ہے۔

۲۔ جناب مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

جس دستور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی ریاست قائم کی تھی، اور جس پر خلافت راشدہ کے دورسلطنت کا نظام چلتا رہا تھا، اس کی بنیاد یہ تھی:۔

ملک خدا کا ہے، وہی قانون دینے والا ہے، وہی اصل مالک وآقا ہے، اور حاکم جس کے ہاتھ میں انتظام امور کی باگ ہے، وہ اللہ کی حاکمیت کو قائم کرنے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے پر مامور ہے۔ ملک کا قانون اس لئے نہیں ہے کہ حاکم اسے عوام پر نافذ کرے بلکہ وہ اس لئے ہے کہ حاکم اور محکوم، رعایا اور راعی دونوں پر نافذ ہو اس کا دوسرا اصول یہ تھا کہ حاکم عوام کی رائے سے برسر اقتدار آئے، لوگ اس کو اس حال میں اپنا امیر اور حاکم مقرر کریں، جب کہ ابھی وہ برسر اقتدار نہیں آیا ہے، اوراس کے بعد اس کی بیعت کریں، وہ اس طرح لوگوں سے بیعت نہ لے کہ برسر اقتدار آجائے اور پھر لوگوں سے ووٹ لے۔ ایسی حالت میں اس کی مخالفت کون کرے گا اوراس کی بیعت کون نہ کرے گا؟ ظاہر ہے کہ کوئی صالح اور متقی اور ذمہ داری کا احساس رکھنے والا اقتدار کو اس طرح لپک کر نہ لے گا۔

بیعت کے ذریعہ برسر اقتدار آنا، ایک شئے ہے اور برسر اقتدار آکر بیعت لینا دوسری شئے ہے۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ گاڑی کا رخ بدل گیا ہے اب پہلے لوگ برسر اقتدار آئے اور پھر ان لوگوں سے بیعت لی۔

یہ سب کچھ جو ایک سانس میں مولانا فرما گئے ہیں اس میں کتنی چیزیں بحث طلب ہیں۔

اس سب میں جو مسلماً حق باتیں ہیں وہ اتنی ہیں کہ:۔ ملک خدا کا ہے وہی قانون دینے والا ہے، وہی اصل مالک وآقا ہے۔

مگر اس کا تقاضا کیا ہے؟ کیا جو اس کے بعد مولانا نے فرمایا ہے ملک اس کا ہے اور اصل مالک وآقا وہ ہے، تواب وہ حاکم جو اس قانون کو نافذ کرنے والا ہو کس کی طرف سے ہونا چاہئے؟ اس کی

طرف سے یا ان عوام کی طرف سے جن کو قانون کے ذریعہ سے درست کرنا ہے، ظاہر ہے کہ وہ عوام منتخب کریں گے تو اپنے ہی مطلب کا منتخب کریں گے، وہ ہرگز ایسا نہیں ہوسکتا جو حقیقی مالک ملک اور آقا کے منشا کی تکمیل کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مولانا کا پہلا اصول کہ اصل مالک وآقا خدا ہے ، اور ملک اس کا ہے، اور دوسرا اصول کہ حاکم عوام کی رائے سے برسر اقتدار آئے، دونوں آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔

اگر حاکم عوام کی رائے سے برسر اقتدار آنا چاہئے تو پھر کہئے "کہ ملک عوام کا ہے، دراصل حاکم عوام ہیں، جو آج کل کے نظام جمہوریت کی بنیاد ہے، اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ ملک خدا کا ہے، اور اصل حاکم خدا ہے، تو پھر جس کے ہاتھ میں زمام حکومت ہونے کا استحقاق ہے وہ وہی ہوگا جو اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا ہو۔ عوام کو حق تقرر دینا غلط ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:-

"لوگ اس کو اس حال میں اپنا امیر اور حاکم مقرر کریں جب کہ وہ ابھی برسر اقتدار نہیں آیا ہے، اور اس کے بعد اس کی بیعت کریں۔ وہ اس طرح لوگوں سے بیعت نہ لے کہ برسر اقتدار آجائے اور پھر لوگوں سے ووٹ لے"۔

بات تو بظاہر خوبصورت ہے، مگر کیا مولانا بتا سکیں گے کہ سوا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی اس خلافت کے جو جمہوری نقطہ نظر سے چوتھے مرتبہ پر تسلیم کی گئی کہ وہ اسی صورت سے تھی کہ آپ ظاہری طور پر پہلے برسر اقتدار نہیں تھے، باقی کوئی بھی خلافت اس کے پہلے کی کیا ایسی ہے، جس میں یہ شرط حاصل ہو، بلکہ ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ اقتدار کسی اور طرح پہلے قائم کرلیا گیا ہے، پھر بعد میں لوگوں سے بیعت حاصل کی گئی ہے، یعنی سوا درمیان کے ایک وقفہ مختصر کے برابر گاڑی یوں ہی چلی ہے، کہ پہلے لوگ برسر اقتدار آئے اور پھر انہوں نے لوگوں سے بیعت لی۔ اور اگر مولانا زیادہ آگے دیکھنے کی ہمت نہ بھی کریں تو خود یزید کے پیش رو امیر شام کو دیکھ لیں، کہ جس وقت سے

ان کی خلافت تسلیم کی جاتی ہے وہ اس کے پہلے سے برسر اقتدار تھے یا نہیں؟

اب اگر ان میں یہ شرط حاصل نہ ہو تو مولانا کو حریت ضمیر اور جرأت اظہار سے کام لے کر صاف اعلان کرنا چاہئے، کہ خود امیر شام ہی کی خلافت باطل تھی جنھوں نے یزید کو اپنا ولی عہد بنایا، تو اب یزید کی خلافت کے صحیح ہونے کا سوال ہی کہاں باقی رہتا ہے۔

بیشک اس کے بعد یہ سوال غیر حل شدہ رہ جائے گا کہ پھر یزید کے یہاں کیا خاص بات تھی، جو حضرت امام حسینؑ نے اتنی عظیم قربانی پیش فرمائی؟ میں نہیں سمجھتا کہ مولانا اس بنیاد کے غلط ثابت ہونے کے بعد، اب اس کا کیا جواب دیں گے۔ مگر میرے پاس اس کا یہ جواب ہے کہ قبل کی ایسی خلافتوں میں بھی ان محافظین دین نے، جو اسلام کے اصول کے محافظ تھے بیعت نہیں کی تھی، مگر اس دور کے با اقتدار افراد اس انتہائی اقدام کے لئے تیار نہیں ہوئے جس کے لئے یزید تیار ہو گیا، اور اس لئے امام حسینؑ کو وہ قربانی پیش کرنا پڑی جس کی یاد مثالی طور پر زندہ جاوید بنی ہوئی ہے۔

اس کے علاوہ یہ واقعہ ہے کہ پہلے شریعت کی مخالفت اتنی کھل کر نہ ہوتی تھی جس طرح اب یزید کھل کر سیاہ کاریوں میں مبتلا ہو گیا۔ لہٰذا اس مقولہ کے مطابق کہ "**حدی را تیز تر بر خواں چو محمل را گراں بینی**" اس وقت ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کے لئے ایک زیادہ نمایاں قربانی کی ضرورت تھی، جو ان کے ضمیر کو جھنجھوڑ دے۔

اس لئے واقعہ یہ ہے کہ اس غلط نظام کے مقابلہ میں قربانیوں کا سلسلہ تو پیغمبر اسلامؐ کے بعد سے جاری ہو گیا تھا۔ لیکن جتنا اقتدار باطل کے اقدامات میں شدت ہوئی، اتنا اتنا اس کے مقابلے میں دعوت حق کے تیز بنانے کی ضرورت تھی، یہاں تک کہ جب پانی سر سے اونچا ہو کر یزید کے نقطہ تک پہونچا، تو اس کے مقابلہ میں حسینی کردار کے سامنے آنے کی ضرورت پڑی، جس نے وہ مکمل قربانی پیش کردی، کہ یزیدیت ہمیشہ کے لئے رسوا ہوگئی، اور پھر کبھی ملوکیت کو یہ ہمت نہیں ہوئی کہ وہ نمائندہ شریعت کا سر اپنے سامنے جھکوانے کی کوشش کرے۔

آپ فرماتے ہیں کہ:۔

''اسلامی دستور کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے''۔

ہمیں اس سلسلہ میں یہ معلوم کرنا ہے کہ یہ دستور مرتب شکل میں قرآن یا حدیث میں کس جگہ درج ہے، بے شک ایک جگہ قرآن مجید میں یہ فقرہ ہے کہ **وامرھم شوریٰ بینھم**۔ مگر وہ تو آپس کے معاملات کو جو خود عوام کو اپنے درمیان طے کرنا ہیں کہا جا رہا ہے، اقتدار اعلیٰ پر اس کی پابندی کب اور کس طرح فرض ہے؟

آپ فرماتے ہیں کہ:۔

رسول اللہ کا یہی طریقہ تھا۔ کیا اس صورت میں آپ پر یہ بار ثبوت عائد نہیں ہوتا کہ آپ یہ دکھلائیں کہ حضرت پیغمبر خدا نے کہاں کہاں اور کب ''شوریٰ'' کی پابندی فرمائی؟ کیا نماز کی رکعتیں شوریٰ سے مقرر ہوئیں، کیا روزوں کی تعداد شوریٰ سے مقرر ہوئی کیا جہاد کے احکام شوری سے مرتب ہوئے پھر کیا حدیبیہ میں صلح شوریٰ کے بعد کی گئی اگر شوریٰ کے ساتھ کی گئی ہوتی تو اس پر عوام ہی نہیں بلکہ خواص میں بھی وہ بے چینی کیوں ہوتی، جو متواتر طور پر تاریخ اور حدیث میں درج ہے۔

کیا جیش اسامہ کی روانگی کا حکم شوریٰ سے تھا، جب کہ صحابہ اور بہت سے اکابر کی طبیعت پر اس حکم کی ناگواری اس سے ظاہر ہے کہ آپ بار بار اس کا حکم جاری فرماتے تھے، مگر کسی طرح اس کی تعمیل نہیں ہو رہی تھی، جس پر پیغمبر خداؐ کو انتہائی سخت الفاظ میں اپنی ناراضگی ظاہر فرمانے کی نوبت آئی۔ پھر اسامہ کا امیر بنانا یہ خود کیا شوریٰ پر مبنی تھا جب کہ اس پر دوسرے افراد کی برہمی کا اظہار کرنے کے لئے حضرت کے یہ الفاظ بھی محفوظ ہیں کہ تم لوگوں نے اس کے پہلے اس کے باپ (جناب زید بن حارثہ) کی امارت کو بھی ناپسند کیا تھا۔ اب تم اس کی امارت کو ناپسند کر رہے ہو۔ اور اس بارے میں تو جناب خلیفہ اول نے بھی خود اپنے دور میں شوریٰ کا کچھ لحاظ نہ فرمایا یہاں تک کہ آپ کے الفاظ یہاں تک وارد ہیں کہ اگر ازواج رسولؐ کی ٹانگیں پکڑ پکڑ کے کتے گھسیٹ کر لے

جائیں تب بھی میں اس لشکر کو بھیجے بغیر نہ رہوں گا۔

قتال مرتدّین، جمع قرآن، خالد ابن الولید کو باوجود اصرار حضرت عمر معزول نہ کرنا۔ غرض کتنی باتیں آپ کو نظر آئیں گی جن میں قطعاً شوریٰ نہیں کیا گیا، بلکہ دوسروں کی رائے کو نظر انداز کیا گیا۔

اور ایسا ہی ہر دور میں غالباً آپ کو مل جائے۔ یہاں تک کہ جناب عثمان کا خلافت سے دستبردار نہ ہونے پر اصرار مروان کے مشوروں پر عمل کرتے رہنے پر قیام واستقرار عمال کی معزولی سے انکار کتنی ہی باتیں ہیں جن میں شوریٰ پر کوئی عمل ہمیں نظر نہیں آتا پھر جناب مودودی صاحب کس طرح ارشاد فرما رہے ہیں کہ

''اسلامی دستور کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے۔''

بہرحال اس ذیل میں جناب مودودی صاحب کا ارشاد بڑی قدر و قیمت رکھتا ہے کہ ''جب صاحب غرض برسر اقتدار ہوں، اور صاحب غرض ہی مشیر تو وہ امت کے خلاف سازش ہی کریں گے۔''

اس کے ساتھ اس مزید اضافہ کی جسارت قبول ہونا چاہئے کہ جب صاحب غرض شوریٰ کر کے کسی کو برسر اقتدار بنائیں، تو اس میں بھی زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ امت کے خلاف ایک سازش ہی ہو۔

اور یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر اس سازشی نظام کی تشکیل ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں یزید ایسا شخص برسر اقتدار آیا اور جس کے خلاف امام حسینؑ کو یہ تاریخی قربانی پیش کرنا پڑی۔

[یہ مقالہ پہلے مجلہ 'پیام اسلام' لکھنؤ محرم نمبر ۱۳۸۴ھ میں شائع ہونے کے بعد امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ اشاعت نمبر ۴۵۴ کے طور پر رسالہ کی صورت محرم ۱۳۸۵ھ (۱۹۶۵ء) میں شائع ہوا۔]

۞۞۞

بین الاقوامی شہید اعظم حسین ابن علی علیہما السلام

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

اس مضمون کو محرم ۱۳۷۹ھ/ ۱۹۵۹ء میں امامیہ مشن نے اپنے سلسلہ اشاعت (نمبر ۱۷۰) میں تیسرے ایڈیشن کے طور سے شائع کیا تھا۔ اس کا پہلا ایڈیشن اس سے 'دو تین سال' قبل اشاعت پذیر ہوا تھا۔ عین ممکن ہے کہ امامیہ مشن کے ایڈیشن سے قبل یہ مضمون کسی رسالہ وغیرہ میں شائع ہو چکا ہو۔

آج جبکہ کانوں میں فرقہ وارانہ نعروں کی آواز گونجی ہوئی ہے، آنکھیں فرقہ پرستی کے مناظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اور دل و دماغ فرقہ بندی کے تخیلات سے پر ہیں، یہ کہنا کہ حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے بظاہر غلط معلوم ہوگا۔ جبکہ یہ ظاہر ہے کہ حسینؑ کی ذات کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے۔ بیشک حسینؑ کا تعلق ایک خاص فرقہ سے ہے، بایں معنی کہ حسینؑ اسلام کے پیرو تھے۔ بیشک حسینؑ کا تعلق ایک ہی فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسینؑ مسلمانوں میں پیدا ہوئے اور بیشک حسینؑ کا تعلق ایک ہی فرقہ سے ہے بایں معنی کہ حسینؑ پیغمبر اسلامؐ کے نواسے تھے لیکن جس طرح کوئی دریا باوجودیکہ کسی ایک ہی حصہ زمین سے نکلا ہوگا مگر جہاں جہاں تک پہنچتا ہے ہر قوم کو فیضیاب کرتا ہے، جس طرح سورج مشرق سے نکلنے کے باوجود مغربی حصوں کو بھی اپنی ضوفشانیوں سے منور کر دیتا ہے، جس طرح بادلوں کا ایک سمت سے اٹھنا دوسری طرف کی خشک زمین کو سیراب کرنے سے نہیں روکتا، اسی طرح حسینؑ کی شخصیت کا عرب قوم میں اور اسلام کے مذہب میں پیدا ہونا ان کو بلحاظ افادیت کسی ایک فرقہ تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کا بنی ہاشم کے

خاندان میں ہونا عرب ملک اور قوم کے دوسرے خاندانوں کو ان سے بیگانہ قرار دینے کا باعث نہیں ہوسکتا۔

دنیا میں مختلف مذاہب ہیں، لیکن باوجود تمام اختلافات کے کچھ اچھائیاں ایسی ہیں جن کو متفقہ طور پر تمام مذاہب اچھائیاں سمجھتے ہیں اور بہت سی برائیاں ہیں جو سب کے نزدیک برائیاں ہیں، یہاں تک کہ برے آدمی بھی برائیاں کرتے ہیں تو اچھائی کے نام کے ساتھ، ہر جھوٹ سچ کے نام سے بولا جاتا ہے۔ ہر بے ایمانی دیانت داری کے نام سے کی جاتی ہے اور یہ برائی کو اچھائی کہہ کے کرنا ہی اس کا ثبوت ہے کہ برا آدمی بھی اپنے اس عمل کو برا سمجھتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر دنیا میں ایک بین الاقوامی ادارہ ایسا قائم کیا جائے جس میں تمام مذاہب کے ذمہ دار افراد شامل ہوں اور اس کا مقصد نوع انسانی میں ان اچھائیوں کی تبلیغ ہو جن کے اچھے ہونے پر سب متفق ہیں اور ان برائیوں سے روکنا ہو جن کی برائی سب کے نزدیک متفق علیہ ہے تو یہ ایک بڑی انسانی خدمت قرار پائے گی اور اگر دنیا عملی طور پر اس پر کاربند ہو جائے تو باوجود اختلاف مذہب وملت کے یہ دنیا سب کے لئے اس دورِ حیات میں ایک جنت بن سکتی ہے۔

جس طرح عمدہ اخلاقی اصول کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں ہیں، اسی طرح کسی ایسے بلند اصول کی تعلیم دینے والے کی ذات ایک ہی فرقہ سے وابستہ نہیں ہوسکتی۔ امام حسینؑ نے ایک ایسا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے جو یکساں طور پر ہر فرقہ کے لیے مشعل راہ بن سکتا ہے اور وہ ہے حسینؑ ابن علیؑ کا وہ جہاد جو انہوں نے خود اپنی قوم کی خرابیوں کو دور کرنے کے لئے کیا، حسینؑ کی ذات فرقہ بندیوں سے بالاتر نہ ہوتی۔ اس وقت جب کہ وہ کسی دوسرے فرقہ کے خلاف جہاد کرنے اور نتیجتاً مخالف فرقہ کے افراد امام حسینؑ کے مخالف ہو جاتے لیکن امام حسینؑ نے جو جہاد کیا وہ اپنے ہی مذہب (اسلام) والوں کے ان افراد کے خلاف تھا جو اچھائیوں کے اصول سے ہٹ کر برائیوں کے پیرو ہو گئے تھے۔

موجودہ خلفشار اور ہنگامہ آرائیوں میں ہمارا اور آپ سب کا مشاہدہ ہے کہ ننانوے فیصدی لوگوں کا رجحان طبع اس طرف ہے کہ دوسری قوم کی خرابیوں کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جائے اور اپنی قوم کے مظالم کی پردہ پوشی کی جائے۔ یہاں تک کہ جو بڑے افراد اپنی قوم کی زیادتیوں کا ذکر کرتے ہیں انہیں بھی دو طریقوں سے ہلکا کرنے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔ایک یہ کہ ہماری قوم نے جو مظالم کئے وہ دوسروں کے مقابلہ میں کم ہیں، دوسرے یہ کہ پہل دوسروں نے کی تھی۔ادھر سے جو کچھ ہوا۔وہ جواب میں ہوا پھر لیڈروں کی یہ کوشش تو ظاہر ہے کہ عوام اس کے معنی کیا سمجھ سکتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر قوم کے افراد یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ اگرچہ برا ہوتا مگر اس لئے اب برا نہیں کہ جوابی طور پر کیا گیا یا یہ کہ جو کچھ کیا دوسرے فریق کی برائیوں سے وہ کم ہے، اس لئے اسے قابل اعتراض نہیں سمجھنا چاہیے۔اس ذہنیت کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام افراد تو ازن برابر کرنے کے لئے اور زیادہ تشدد اور بربریت کا ثبوت دیتے ہیں۔اس کے بعد منتقمانہ کاروائیاں دوسری طرف سے شروع ہوجاتی ہیں اس طرح قتل و غارت گری کا لامتناہی سلسلہ قائم ہوجاتا ہے۔

امام حسینؑ کی عملی تعلیم یہ ہے کہ تم غیروں کے عیوب دیکھنے کے بجائے خود اپنی جماعت کے نقائص پر توجہ کرو۔اور ان ہی کو سب سے زیادہ اہمیت دو۔حقیقی رہنما کا یہ فرض ہے کہ وہ عوام کو ان کی غلطیوں پر سختی سے متنبہ کرے اور دوسرے فرقہ کی بداعمالیوں کے تذکرے کو خفیف سمجھ کر ان کو اتنی اہمیت نہ دے تاکہ لوگوں کی نظر اپنی غلطیوں پر پڑے اور اپنی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔

کتنے غضب کی بات ہے کہ مذہب کے پرستار ایک ایک دوسرے کا برائیوں میں مقابلہ کرتے ہیں یعنی دوسرا برائی میں بڑھا نہ رہنے پائے۔ہماری طرف سے کمی ہوئی ہے تو ہم اس کو پورا کردیں، حالانکہ اگر مذہب کی روح دماغوں میں راسخ ہوتی تو اچھائیوں میں مقابلہ ہونا چاہیے تھا۔حقیقت یہ ہے کہ عوام مذہب کو بحیثیت ایک برحق اصول کے مانتے ہی نہیں، بلکہ وہ اس لئے مانتے ہیں کہ وہ

اس مذہب کے ماننے والے کے گھر میں پیدا ہوئے، اس لئے دل سے لامذہب ہیں۔

اپنے مذہب سے ان کو اس طرح کی محبت ہے جیسے اپنے وطن سے، اپنی اولاد سے، اپنے گھر سے اور اپنے کسی دوست سے، یہ اپنے ہونے کی بنا پر جو محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اپنی ذات کی محبت ہوا کرتی ہے، بس اس طرح سے ان کو اپنے مذہب کی محبت ہے۔اس لئے ان کی مذہبی جنگ بھی درحقیقت ایک ذاتی لڑائی ہے جیسے زر، زمین، زن کے اوپر لڑائیاں ہوا کرتی ہیں لیکن تصادم کی بنیاد تو یہ ہوتی ہے، کہ ہر دوسرے کو اس حق سے کچھ کم ہی دینا چاہتا ہے۔لہٰذا کش مکش فساد اور خونریزی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔مصلحین کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کی بے راہ روی اور گمراہی کے خلاف علم جہاد بلند کریں۔چاہے اس راستے میں ان کی جان بھی کام آئے، جسے انتہائی بلندی کی منزل پر امام حسینؑ نے اپنے عمل سے پیش کیا۔

مذہب نے جو اصول بتلایا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلندی حاصل کرنا ہو تو اپنے حقیقی عمل کو اس سے بلند رکھے۔اس طرح اگر مقابلہ بھی دو فریق میں ہونا چاہئے تو اس بات کا کہ دیکھیں کون دوسرے کے ساتھ احسان زیادہ کرتا ہے۔اس کے نتیجہ میں کبھی تصادم نہیں ہوسکتا۔اسلام نے جو تعلیم دی ہے اس کی ایک معمولی چیز پیش کرتا ہوں۔تجارت میں ترازو سے تولنے والی چیزوں کے متعلق حکم ہے کہ اگر تم خود تول کر بیچ رہے ہو تو کچھ زیادہ دینے کی کوشش کرو۔ اور اگر تم خریدنے جاؤ اور دوکاندار تم سے تولنے کے لئے کہہ دے تو کچھ کم ہی لینے کی کوشش کرو۔اس کے بعد کیا مول تول میں کوئی جھگڑا ہوسکتا ہے؟ اب اگر دو قوموں کے درمیان کوئی معاملہ ہوا اور وہ اسی نظریہ کے ماتحت زمین کی تقسیم کریں چاہے دوسری طرف زیادہ زمین چلی جائے مگر دوسری قوم کی حق تلفی نہ ہو تو پھر تصادم کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟

یزید نے حسینؑ سے بیعت چاہی اور حسینؑ نے انکار کیا۔حسینؑ کو بیعت سے اتنا انکار کیوں تھا؟ اس کا جواب اسی سے ملے گا کہ آخر یزید کو بیعت کے لئے اتنا اصرار کیوں تھا؟ بس جس لئے اسے

اتنا اصرار تھا، اسی لئے حسینؑ کو انکار تھا۔ یزید کا اصرار بیعت پر اس لئے تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اسلامی قوانین کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی ہے۔ اس نے تو اتنے موٹے موٹے اصولوں کی خلاف ورزی کی تھی جس کی بنا پر خود اسے یقین تھا کہ ادھر لوگوں کے دماغوں سے رشوت کا نشہ ذرا بھی کم ہوا، اُدھر چمکتی ہوئی تلواروں کی چمک نظر سے ذرا اوجھل ہوئی اور ہر موٹی نظر کا مسلمان بھی محض ایک نگاہِ غلط انداز سے یہ سمجھ لے گا کہ یزید خلیفۂ برحق نہیں ہوسکتا۔ ضرورت تھی کہ اپنے خلیفۂ برحق ہونے کے جواز میں شریعت اسلامی کے حقیقی پاسباں سے سند لے لی جائے تاکہ جب کبھی مسلمان بیدار ہو فوراً اس سے کہہ دیا جائے کہ اگر حکومت اس قابل نہ ہوتی تو رسولؐ کے نواسے حسینؑ کیوں بیعت کرتے؟ یہ یزید کی نادانی تھی کہ اس نے یہ تصور بھی کیا کہ حسینؑ بیعت کرلیں گے۔ حسینؑ اگر بیعت کر لیتے تو قیامت تک حقائق پر پردہ پڑ جاتا۔ اسی لئے ان کو بیعت سے انکار ضرور تھا۔ اسی طرح حسینؑ نے دو نتیجے حاصل کئے: ایک مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کے لئے مسلمانوں کے لئے۔ آپ نے یہ اصول اپنے خون کی سرخ روشنائی سے ثبت کردیا۔ کہ قانون شریعت خلیفۂ وقت کے عمل کا پابند نہیں ہے۔ اس لئے کبھی خلفائے وقت کے عمل سے احکام شرع کے سمجھنے کی کوشش نہ کرنا اور دوسرے فرقوں کے لئے یہ کہ اگر تمہیں اسلامی تمدن اسلامی تعلیم اور اسلامی اخلاق کا مطالعہ کرنا ہو تو کسی دمشق یا قرطبہ کے قصر خضراء یا قصر حمراء میں نہ جانا بلکہ مدینہ کے ان ٹوٹے ہوئے کھنڈروں پر نظر ڈالنا جہاں بوسیدہ پردے اور کچی دیواریں نظر آتی ہیں۔ اس طرح حسینؑ نے قیامت تک یزید اور یزید منش انسانوں کو ان کے اصلی رنگ روپ میں دنیا کے سامنے پیش کردیا اور غلط فہمی کے امکانات کو ختم کردیا۔ حسینؑ کا یہ جہاد جو اپنی قوم ہی کے مقابلہ میں تھا اپنی نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ تھا وہ اسلامی جہاد جو غیروں کے مقابلہ میں ہو اس میں کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاد اسی وقت کیا جائے گا جب غلبہ کا امکان ہو، تعداد کافی ہو، پھر سپاہیوں کی عمر کے لحاظ کی بھی ایک مقدار مقرر ہے کہ اس سے زیادہ عمر نہ ہو۔ اسی طرح اور بھی پابندیاں ہیں، مثلاً حسینؑ

نے جو جہاد کیا وہ اس جہاد سے بالکل مختلف تھا۔ قرآن میں حکم آیا ہے کہ ۲۰ مسلمان ۲۰۰ کا مقابلہ کریں لیکن جب یہ معیار عمل کی کسوٹی پر پورا نہ اتر سکا تو کہا گیا کہ اچھا سو(۱۰۰) اور دوسو(۲۰۰) کی نسبت سے مقابلہ کرو۔ وہ پہلا ہی معیار جو قرآن نے قائم کیا تھا جو عمل کی کمزوری کی بنا پر قابل قبول ثابت نہ ہوز یادہ سے زیادہ بیس اور دوسو یعنی دس گنے کی نسبت سے تھا، لیکن کربلا میں جو جہاد کیا گیا تھا اس میں ادھر بہتر (۷۲) دوسری طرف کم از کم تیس ہزار فوج۔ اس میں جو نسبت کا فرق ہے وہ بدرجہا زیادہ ہے۔ پھر جہاد میں تعداد کا کافی ہونا ضروری چیز ہے مگر کربلا کی جنگ میں تعداد کے بڑھانے کے بجائے گھٹانے کی کوشش ہوئی۔ راستے میں جتنے لوگ کچھ امیدوں کی بناء پر ساتھ ہو لئے تھے آپ نے شہادت مسلمؑ کی خبر سننے کے بعد ان سے کہا کہ میں کسی فوج کشی یا حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لینے کی غرض سے نہیں جارہا ہوں۔ وہ واپس جائیں اور اس طرح بہت سے لوگ چلے گئے۔ اس کے بعد کربلا میں بھی شب عاشور آپ نے اپنے ساتھ کے لوگوں سے فرمایا کہ تم میں سے جو جانا چاہے بخوشی چلا جائے۔

پھر عمر کی پابندیاں جہاد میں لازمی ہوتی ہیں۔ یہاں وہ بھی باقی نہیں رہیں ۸۰ برس کے حبیب ابن مظاہرؓ بھی ساتھ میں ہیں اور نابالغ بچے بھی۔ بلکہ چھ ماہ کا شیرخوار علی اصغرؑ بھی میدان جہاد میں ساتھ ہے۔

معلوم ہوا کہ غیروں کے ساتھ جہاد میں جو شرائط ضروری ہوا کرتے ہیں، دین خدا کی حفاظت کے لئے اپنوں کے ساتھ جہاد کرنے میں ان کا کبھی لحاظ نہیں کیا گیا۔ بلکہ تمام شدید ترین مصائب کو اس سلسلہ میں برداشت کیا گیا۔ امام حسینؑ نے دنیا کو مشترکہ انسانی حقوق کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ زمانہ میں بھولی ہوئی انسانیت کی یاد دلانے کے لئے کافی ہے۔ پانی رسد کا اہم ترین جزو ہونے کی حیثیت سے خود حسینؑ کے لشکر کے لئے ضروری اور بیش قیمت تھا اور دشمن کو پانی پلا کر تقویت پہنچانا بظاہر اپنے کو کمزور کرنے کے مترادف تھا۔ لیکن امام حسینؑ نے فوج حر کو پانی پلا کر ظاہر کیا کہ اگرچہ دشمن ہیں مگر نوع بشر کی فردیں ہیں اور پیاسے ہیں۔ لہٰذا پانی ان سے عزیز نہیں کیا

جا سکتا۔ یہ نہیں کہ محض حکم دے دیا ہو جیسا کہ اکثر لیڈر کرتے ہیں کہ زبانی تعلیم دے دیتے ہیں اور اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو یہ عذر پیش کر دیتے ہیں کہ ہم نے تو کہہ دیا تھا۔ جماعت نے ہمارا حکم نہ مانا بلکہ اس حقیقی رہنما کی شان یہ تھی کہ خود کرسی بچھا کر اپنے سامنے پانی پلوانے لگے۔ بخدا امام حسینؑ کے انصار وہی کرتے جیسا حسینؑ نے حکم دیا تھا لیکن امام حسینؑ نے خود اپنا فرض بھی ادا کرنا ضروری سمجھا۔

علی ابن طعان محاربی کا بیان ہے کہ میں بہت پیاسا تھا، حسینؑ نے محسوس کر لیا اور کہا: 'اے شخص فلاں اونٹ پر پانی ہے، پی لے، میں گیا لیکن فرط تشنگی سے دہانہ ٹھیک منھ تک نہ لگا سکا اور پانی گرنے لگا حسینؑ بہ نفس نفیس اٹھ کھڑے ہوئے اور خود مشک کا دہانہ ٹھیک کر کے مجھے سیراب فرمایا۔'

یہ اور اس کے مثل وہ حسینی تعلیم کے خط و خال ہیں جن کی وجہ سے ہم یہ کہنے کی جرأت کرتے ہیں کہ حسینؑ کی ذات تمام فرقہ بندیوں سے بالاتر ہے۔

شہید کربلاؑ کے خاندانی خصوصیات اور فداکارانہ روایات

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

یہ مقالہ سب سے پہلے ماہنامہ 'الواعظ' لکھنؤ محرم نمبر ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد 'پیام اسلام' لکھنؤ محرم نمبر ۱۹۵۷ء میں، پھر امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ نمبر ۳۷۴ کے عنوان سے علیحدہ رسالہ کی صورت میں (محرم ۱۳۸۳ھ/ ۱۹۶۳ء) اشاعت پذیر ہوا۔

یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے حضرت ابراہیم خلیلؑ سے۔ یہ بین الاقوامی حیثیت رکھتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس لئے حضرت سید الشہداؑ کے نسبی خصوصیات کو آپ کے تعارف کے لئے یہیں سے شروع کرنا مناسب ہے اور پھر واقعات قربانی کا سلسلہ بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو اسلام کا مورث اعلیٰ بھی سمجھنا چاہئے کیونکہ آپ ہی نے اس جماعت کا جو راہِ حق میں ان کے پیچھے آئی سب سے پہلے 'مسلم' نام رکھا۔ قرآن مجید میں اس کی تصریح موجود ہی ہے "هُوَ سَمَّاكُمُ الْمُسْلِمِينَ مِن قَبْلُ"، اور ان کی دعا بھی بارگاہِ الٰہی میں مذکور ہے "رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ"۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ اسحاقؑ یہ سلسلۂ انبیائے بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ ہیں اور اسمٰعیلؑ ہمارے رسول محمد مصطفیٰؐ کے دادا ہیں۔ یہیں سے ہمارے رسولؐ کا خاندان شرافت دوسرے سلسلہ سے الگ ہوا۔ آپ کو معلوم ہے کہ کچھ خاص داخلی اسباب کے ماتحت حضرت ابراہیمؑ نے اپنے فرزند اسمٰعیلؑ کو شیر خوارگی کے عالم میں ان کی ماں ہاجرہ کے ساتھ مکہ

کی سرزمین پر پہنچا دیا۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے۔ اس خانۂ کعبہ کی تعمیر ان ہی باپ بیٹے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے کی۔

خانۂ کعبہ بن کر تیار ہوا اور تمام اطراف ملک کے لوگوں کا نقطۂ اجتماع بن گیا۔ یہاں مرکزیت شروع ہوئی آل ابراہیمؑ ہی خانۂ کعبہ کے بانی، یہی خانۂ کعبہ کے محافظ، اور کعبہ کیا؟ تمام قبائل عرب کا مرکز۔

قدرت نے ان باپ بیٹے کا امتحان لینا چاہا۔ باپ مامور ہوگیا کہ بیٹے کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرے۔ یہی وہ ہے جس کی یادگار عید قرباں میں آج تک قائم کی جاتی ہے۔

گویا اس سلسلۂ شرافت کا آغاز ہی نفس کی قربانی سے ہوا، آگے بڑھئے، سلسلہ پہنچا نضر بن کنانہ تک، ان کی اولاد قریش کہلائی۔ جس طرح تمام دنیا میں آل ابراہیمؑ کو خاص امتیازات حاصل ہوئے۔ آل ابراہیمؑ میں اولاد اسمٰعیلؑ خاص خصوصیات کی حامل ہوئی۔ اب اولاد اسمٰعیلؑ میں قبیلۂ قریش کو امتیازی خصوصیات حاصل ہوئے۔ خانہ کعبہ کی ذمہ داری اس کی حفاظت سقایت اور تولیت سب قریش سے مخصوص تھیں، تمام عرب ان کی عزت کرتے تھے۔

قریش میں ہاشم پیدا ہوئے جو تمام خصوصیات کے حامل بنے۔ یہاں سے بنی امیہ کی شاخ الگ تھی ان کے مورث اعلیٰ نے ہاشم سے منازعت کی مگر شکست کھائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانۂ کعبہ کے حقوق تولیت، سقایت اور تمام انتظامات ہاشم کے پاس رہے اور بنی امیہ اس سے محروم ہوگئے۔ اس طرح آل ہاشم کا امتیاز آل امیہ کے مقابلہ میں تسلیم ہوگیا۔

ہاشم کے فرزند عبدالمطلب بڑی بلند شخصیت رکھتے تھے۔ 'سید البطحا' ان کا خطاب ہوا اور یہی لقب ہے جو ان کی اولاد میں رہ گیا جس سے آج تک آل رسولؐ سادات کہلاتے ہیں۔ ان کا اعتماد توکل اور خدا پر بھروسہ اس وقت پورے طور پر ظاہر ہوا جب ابرہہ نے یمن سے آکر کعبہ پر حملہ کیا۔ یہ اصحاب فیل کا مشہور واقعہ ہے۔ اس وقت عبدالمطلب بارگاہِ الٰہی میں دست دعا بلند کئے

ہوئے تھے۔ نتیجہ معلوم ہے کہ خدائی لشکر نے اصحاب فیل کو برباد کردیا۔ یہ تھے عبدالمطلب جو محافظ حرم بھی تھے اور حافظ حرم بھی ثابت ہوئے۔ عبدالمطلب کے کئی بیٹے تھے جن میں سے دو عبداللہ اور ابوطالب تھے، عبداللہ نے اسمٰعیل کا درجہ حاصل کرکے ذبیح کا لقب لیا یعنی ان کو بھی عبدالمطلب نے رضائے الٰہی کے لئے قربانی کے محل پر پیش کیا تھا اور وہ بھی فدیہ پاکر ذبح سے محفوظ ہوئے مگر ان کا انتقال باپ کے سامنے ہوگیا، اس لئے عبدالمطلب کے تمام امتیازات ابوطالب کو حاصل ہوئے۔

ابوطالب شیخ البطحا اور سردار قریش مشہور ہوئے۔ دیکھئے وہ خصوصیات جو بکھرے ہوئے تھے کس طرح سمٹے آتے ہیں ایک نقطہ پر۔ ابوطالبؑ حامل ہوئے تمام مواریث انبیاء تمام امانتوں کے جو ابراہیمؑ کی چھوڑی ہوئی تھیں جو اسمٰعیلؑ کی متروکہ تھیں، اور سب سے بڑی امانت وہ رسولؐ کی ذات تھی، اور اس طرح جتنی امانتیں رسولؐ کی ذات سے متعلق سمجھی جاسکتی ہیں ان سب کی حفاظت قدرت کی جانب سے ابوطالبؑ کے متعلق ہوئیں تاریخیں بتلاتی ہیں کہ ابوطالبؑ نے کس شان سے امانت داری کے فرض کو انجام دیا۔

اب آپ دیکھیں کہ یہ زمین شرف کس آسمان پر پہنچتی ہے آل ابراہیمؑ، آل اسمٰعیلؑ، نسل قریش، آل ہاشم کی جتنی عزتیں تھیں وہ ایک مرکز پر طواف کررہی ہیں۔ ابوطالبؑ نے حضرت محمد مصطفیٰؐ کی پرورش میں جان کو جان نہ سمجھا۔ انھوں نے اپنی اولاد کو رسولؐ پر جاں نثاری کی مشق کرائی۔

اس وقت جب یہ لوگ شعب ابوطالبؑ میں محصور تھے تو اس خیال سے کہ کہیں دشمن شب کو اچانک حملہ کرکے حضرت محمد مصطفیٰؐ کو قتل نہ کردے، ابوطالبؑ آپ کو ایک بستر پر رہنے نہ دیتے تھے بلکہ اپنی اولاد کو باری باری آپ کے بستر پر لٹاتے تھے اور آپ کو ان کے بستر پر منتقل کردیتے تھے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ محمدؐ کے بدلے جو بھی میرا فرزند قتل ہوجائے، کوئی پرواہ نہیں، مگر رسولؐ کی جان بچ جائے۔ اس ذوق قربانی کو بھی یاد رکھئے گا۔ یہ بھی کس کی خاطر ہے؟ چاہے کہئے محمدؐ کی خاطر اور چاہے کہئے اسلام کی خاطر۔

ابوطالبؑ کی آغوش میں حضرت محمد مصطفیؐ کی جب تربیت ہورہی تھی، ابھی آپ کی عمر نوجوانی ہی کی منزل میں تھی کہ آپ کی سچائی اور امانت داری کو تمام عربوں نے تسلیم کرلیا اور آپ کو صادق اور امین کا لقب دیا۔ یہاں تک کہ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھوانا شروع کیں۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے تصفیہ کو قابل قبول سمجھا۔ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے رکھے جانے کا قصہ مشہور ہے۔

محمد مصطفیؐ کی عمر ۳۰ برس کی تھی، اس وقت ابوطالبؑ کے یہاں وہ فرزند پیدا ہوا جس کا نام تھا علیؑ۔ ابھی علیؑ چار پانچ برس کے ہوں گے کہ مکہ میں قحط پڑا اور ابوطالبؑ اقتصادی تکالیف میں مبتلا ہوگئے آپ کے بار کو کم کرنے کے لئے محمد مصطفیؐ نے علیؑ کی پرورش اپنے متعلق کرلی۔ اب علیؑ محمدؐ کے آغوش تربیت میں تھے۔ وہ دس برس کے تھے جب حضرت محمد مصطفیؐ اس پیغام کے پہنچانے پر مامور ہوئے جس کا نام ہے اسلام۔ یہ پوچھنا صورت واقعہ کے لحاظ سے اصول فطرت کے خلاف ہے، کہ علیؑ نے اس پیغام کو کب قبول کیا؟ وہ تو رسولؐ کے ہر وقت ساتھ تھے اور آپ ہی کی تربیت میں تھے، اس لئے ہر ہر وقت جو رسولؐ کا راستہ تھا وہ علیؑ کا تھا۔

عمر کے لحاظ سے ابھی علیؑ بچہ ہی تھے اور تربیت سے بے نیاز نہیں تھے، اس لئے مجھے کہنے دیجئے کہ اب رسولؐ کی آغوش میں دو چیزیں پرورش پا رہی تھیں، ایک اسلام اور دوسرے علیؑ۔ علیؑ اور اسلام میں وہی وابستگی تھی جو ایک آغوش میں رہنے والے دو بچّوں میں آپس میں ہوتی ہے۔

رسولؐ کو اپنے پیغام کی اشاعت میں بڑی تکلیفیں دی گئیں۔ کوڑا کرکٹ سر پر پھینکا گیا۔ پتھروں سے جسم مجروح کیا گیا، اس سب کو آپ نے گوارا کیا، کاہے کے لئے اسلام کی خاطر۔ آخر میں سب آپ کے قتل پر آمادہ ہوگئے اور ایکا ہوگیا کہ رات کے وقت آپ کو قتل کرڈالیں گے۔

رسولؐ نے طے کرلیا کہ وہ اپنے مقاصد کی حفاظت کے لئے مکہ معظّمہ کی سرزمین کو چھوڑ دیں اور مخفی طور سے رات کے وقت نکل کر مدینہ چلے جائیں، اسی کا نام ہے ہجرت۔

اس موقع پر آپ نے اپنے چچازاد بھائی علیؑ ابن ابی طالبؑ کو مقرر کیا کہ وہ آپ کے بستر پر آپ کی چادر اوڑھ کر سو رہیں۔ علیؑ بستر رسولؐ پر سو رہے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں۔ کھنچی ہوئی تلواریں دشمنوں کی ارد گرد موجود تھیں۔ سب قتل ہی کے ارادہ سے آئے تھے۔ یہ تو اتفاق کی بات ہے اور قدرت کا انتظام ہے کہ علیؑ کی جان بچ گئی ورنہ سامان قتل کا مکمل تھا، اور علیؑ اپنی جان دے چکے تھے یہ کس کی خاطر ہوا؟ صرف اسلام کی خاطر۔

رسولؐ کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جنھیں آپ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ہجرت کے دوسرے سال آپ نے اپنی اس بیٹی کا عقد علیؑ بن ابی طالبؑ کے ساتھ کردیا۔

اب آپ جانتے ہیں فاطمہؑ کون ہیں؟ دختر داعی اسلامؐ، دختر پیغمبر اسلامؐ اور علیؑ کون ہیں؟ محافظ اسلام، مجاہد اسلام بلکہ فدیۂ اسلام۔ ان ہی دونوں علیؑ اور فاطمہؑ کے فرزند تھے حسینؑ۔ اب کیا حسینؑ بھلا سکتے تھے اپنے خاندانی خصوصیات اور قدیم روایات کو؟

حسینؑ نے دیکھا نہیں مگر کانوں سے تو سنتے رہے، کہ ہمارے مورث اعلیٰ ابراہیمؑ خدا کی رضا کے لئے بیٹے کے ذبح پر تیار ہوگئے، ہمارے پردادا عبدالمطلبؑ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو قربانگاہ عبودیت میں پیش کیا۔ حسینؑ نے سنا کہ پیغمبر اسلام کے سینہ سپر رہے میرے دادا ابوطالبؑ، پھر اسی اسلام کے لئے پتھر کھائے میرے نانا رسولؐ اللہ نے۔ حسینؑ نے سنا کہ جب اسلام کی حفاظت کا مسئلہ پیش تھا تو تلواروں کے حصار میں بستر پر کون لیٹا تھا؟ میرے باپ علیؑ بن ابی طالبؑ، پھر ہر سخت موقع پر اسلام کے لئے جہاد کس نے کیا؟ علیؑ بن ابی طالبؑ نے کیا۔ ان تمام واقعات اور قدیم روایات کے ہوتے ہوئے حسینؑ یہ نہ سوچتے کہ اب اسلام پر وقت پڑا ہے تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟

بچّے جب اپنے بزرگوں کے حالات سنتے ہیں، تو ان میں بچپن ہی سے ولولہ پیدا ہوجاتا ہے کہ ہم بھی ایسا ہی کر کے دکھائیں۔ حسینؑ بچپن سے ولولہ رکھتے تھے۔ منتظر تھے اور مشتاق تھے کہ اسلام کی خدمت کا کوئی موقع آئے تو میں بھی اسے کر کے دکھاؤں۔ آیا وقت اور ۶۱ھ میں حسینؑ کو اس

اسلام کی خاطر وہ سب کچھ نذر کر دینا پڑا، جو ان کے پاس سرمایہ تھا۔

انھوں نے اتنی بڑی قربانی پیش کر دی جس کی نظیر نہ اس کے پہلے نظر آتی ہے، نہ اس کے بعد۔

آج جبکہ اس واقعہ کو تیرہ سو سال پورے ہو رہے ہیں وہ اسی طرح ندرت اور عظمت رکھتا ہے جس طرح اپنے وقوع کے موقع پر رکھتا تھا۔ اور اسی لئے آج تک دنیا اسے یاد رکھتی ہے اور اس وقت تیار ہو رہی ہے کہ اس کی سیزدہ صد سالہ یادگار بڑے وسیع پیمانہ پر قائم کی جائے۔

آج جبکہ اسلام کو بڑی ضرورت قربانی کی ہے، اس یادگار کا قائم کرنا مسلمانون کے لئے حیات بخش ہے۔ دیکھنا ہے مسلمان اپنے اس فرض کو کس طرح انجام دیتے ہیں۔

✿✿✿

بنی امیّہ کے عداوتِ اسلام کی ایک مختصر تاریخ

اور میدانِ کربلا کا عظیم کارنامہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

رسولؐ اسلام کی آنکھیں بند ہونا تھیں کہ عالم میں فتنہ وفساد کی آندھیاں چلنے لگیں۔ اسلام کے مقابل میں وہ کینۂ دیرینہ، جو اب تک دلوں میں آتش زیر خاکستر کی طرح چھپے ہوئے تھے شعلہ ور ہو گئے۔ مولفۃ القلوب منافقین جن کو رسولؐ نے مصالح اسلامی کی بنا پر مال وزر کی بوچھار سے اب تک موافق رکھا تھا، رسوؐل کی وفات کے بعد اپنے دلی مقاصد کے سرانجام دینے کے لئے آمادہ ہو گئے، اور ایک طرف اسلام کو صفحۂ عالم سے محو کر دینے کے منصوبے بندھ گئے، دوسری طرف بنی ہاشم کو جن کی ممتاز فردیں جنگ بدر واحد کے کفار ومشرکین کے خون کی ذمہ دار تھیں، اور اب تک اسلامی ترقیوں کا سہرا بہت حد تک ان کے سر تھا، اس کی وجہ سے مقتول کفار کے ورثہ میں ظاہری اسلام لانے کے بعد بھی ان کا بغض وعناد جگہ کئے ہوئے تھا، حیات رسولؐ میں پوری کوشش کی گئی کہ ان افراد کی اہانت وتذلیل کی جائے، مگر وحی کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ اور رسولؐ کی نہ چپ ہونے والی زبان، ان کی مدح وثنا کے دفتر کھولتے ہوئے دشمنوں کی محنتوں پر پانی پھیرتی رہتی تھی۔

اہلبیتؑ سے بغض وحسد اور اس کے ساتھ اسلام کی دشمنی وعناد نے رسولؐ کے بعد عجیب عجیب صورتیں اختیار کیں، جن کے ساتھ ملک ودولت کی ہوس اور نظم ونسق عالم کی طمع نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اسلام اور اس کے خاموش محافظوں کے برخلاف مخالفت کا وہ طوفان برپا ہو گیا کہ العظمۃ للہ، مگر وہ حکیم الاسلام جو مدرسۂ قدرت میں سیاست مدن کا سبق حاصل کر چکا تھا، اس وقت

اپنے خاموش طرزِ عمل سے اسلام کی حفاظت کر رہا تھا، ورنہ اسلام اس وقت مٹ چکا ہوتا اور صفحۂ دنیا
اس وقت شریعت اسلامیہ کے نقش سے سادہ نظر آتا۔ بنی امیہ جن کی عداوت اسلام سے ضرب المثل
تھی، اور رسولؐ کو جن کے ہاتھوں سخت ترین مصائب کا مقابلہ کرنا پڑے تھے وہ بھی ابھی تک ایک
طرف اسلام کی قوت کے سبب دوسری طرف اس خیال سے کہ شاید رسولؐ کے بعد حکومت وسلطنت
انھیں نصیب ہو جائے۔ اسلام کی مخالفت سے ساکت تھے۔ لیکن زمانہ کا انقلاب کہ رسولؐ کے بعد
حکومت بنی ہاشم سے علٰحدہ ہونے کے بعد بھی بنی امیہ تک نہ آئی، تیم وعدی کے ہاتھ میں پہنچ گئی،
جس کی وجہ سے ان لوگوں کو ظاہر اسباب کے لحاظ سے کوئی امید باقی نہیں رہی۔

پہلے ہی دور میں اسلام کے مٹانے کے لئے مکر وتزویر کا جال پھیلا دیا، ابوسفیان جو اس وقت اس
گروہ میں بزرگ خاندان تھا، وہ امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کے پاس آکر کہنے لگا "عَلَيْكُمْ
عَلٰى هٰذَا الْاَمْرُ اَرْذَلُ بَيْتٍ فِيْ قُرَيْشٍ اَمَا وَاللهِ لَاَمْلَأُهَا خَيْلًا وَرِجْلًا" (یعنی بڑے
افسوس کی بات ہے کہ اس خلافت کے بارے میں تم لوگوں پر سب سے رذیل خاندان قریش کا
غالب آگیا، خدا کی قسم میں تمہاری مدد کے لئے زمین حجاز کو سوار و پیادہ سے بھر دوں گا۔)

(دیکھو 'استیعاب' مطبوعۂ دائرۃ المعارف، حیدرآباد، جلد اول ص ۳۴۵)

یہ وہ سمیت آمیز اور زہر افشاں کلام تھا کہ اگر چل جاتا تو اسلام کا خاتمہ تھا۔ وہ اعراب جو ابھی
تک اسلامی تعلیمات واخلاق سے پورے طور پر آشنا نہ ہوئے تھے، اور اس کو بار گراں سمجھتے تھے
کسی شدید خانہ جنگی کے بعد فوراً اسلام کو خیرباد کہہ دیتے۔ تھوڑے بہت مسلمان باقی رہتے وہ
طرفین کے جنگ وجدال میں کام آتے۔ اسلام کا دنیا میں نام لینے والا بھی آج کوئی نہ ہوتا۔ لیکن
امیر المومنینؑ کی بصیرت افروز اور ثاقب نظر متکلم کے کلام سے پہلے اس کے ضمیر کو دیکھ رہی تھی، جو
اب میں وہ سخت لہجہ اختیار کیا گیا کہ دوبارہ ایسے کلام کی جرأت نہ ہو۔ ارشاد ہوا کہ تو ہمیشہ اسلام کا
دشمن رہا جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی۔

یہ پہلا وار تھا جو رسولؐ کے بعد بنی امیہ کی طرف سے اسلام پر کیا گیا، اگرچہ ناکام ہوا مگر دل کی
عداوت کہیں جا سکتی ہے، وقتاً فوقتاً یہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی۔ ادھر سے مایوس ہو کر بنی امیہ کو
حکومت سے متوسل ہونا پڑا، اور اس طرف سے بمقتضائے وقت ان کی پوری دلجوئی اور مراعات کی
گئی۔ شام کی حکومت کا امیر معاویہ کے پائے نام ہونا بھی اسی وقت کا ایک کارنامہ ہے، خوش قسمتی یا
بدقسمتی سے حکومت کے تیسرے دور میں قرعۂ فال بنی امیہ کے نام نکلا، اور اس گروہ کو اسلام کے ساتھ
اپنی حسرتوں کے نکالنے کا پورا موقع مل گیا۔ چنانچہ اس عہد میں صحابۂ رسول اور سچے اسلامی فرزندوں
کے ساتھ جو شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے وہ تاریخ کے اوراق کو تاریک بنائے ہوئے ہیں۔

پانی سر سے اونچا ہو گیا، ظلم وستم کو سہتے سہتے دلوں کے پیمانے چھلک اٹھے، جس کا افسوسناک نتیجہ
قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا، تاریخ کے دیکھنے سے اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر
دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ نے اپنے ورق کو الٹا اور حق نے اپنے مرکز پر عود کیا۔ مدینہ میں بڑے بڑے صحابۂ رسولؐ
نے باتفاق امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیعت کی، مگر شام کہ جس کے اوپر معاویہ بن ابی سفیان
پورے طور پر قبضہ کر چکے تھے، اسلامی متفق فیصلہ کے سامنے سرنگوں نہ ہونا تھا نہ ہوئے، خون عثمان
کے بہانہ سے علی بن ابی طالبؑ کے مقابلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا۔ جنگ صفین کے سیکڑوں
معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہہ گیا اسلام کو کمزور بنانے میں بہت کچھ
دخل رکھتے ہیں۔ آخر اس جنگ کا فیصلہ ایک مکارانہ مصالحت کے ساتھ ہوا جو ساتھیوں کی کمزوری
اور بے ثباتی سے مجبور ہو کر امیر المومنینؑ کو قبول کرنا پڑی۔ اگر دیانت وامانت سے کام لیا جاتا تو
مسلمانوں کے درمیان سے اس ناگوار جھگڑے کا خاتمہ ہو سکتا تھا مگر افسوس کہ حرص وآز کے بڑھتے
ہوئے سیلاب نے اس ظاہری مصالحت کو فتنہ وفساد کا ایک عظیم پیش خیمہ کر دیا اور عمرو بن عاص نے
ابوموسیٰ اشعری کی سادہ لوحی اور کم ایمانی سے فائدہ اٹھا کر مسئلہ تحکیم کو بازیچۂ اطفال اور مکر وفریب کا

ایک کرشمہ بنادیا، جس کی وجہ سے اختلاف وافتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہوگئی، جنگ نہروان اورخوارج کے اسلام سوز حرکات کو بھی اسی جنگ صفین کا ایک شعبہ سمجھنا چاہئے۔لیکن یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کے ساتھ جم گئے تھے ادھر امیر المومنین علیہ السلام کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا، ادھر شام میں مخالفت اہلبیتؑ کا طوفان پوری قوت پر بلند ہوگیا۔امام حسن علیہ السلام کو انصار کی کمی اور دشمنوں کی کثرت کے سبب سے خانہ نشین ہونا پڑا، بنی امیہ کو پوری آزادی حاصل ہوگئی، دمشق بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کمال جرأت کے ساتھ اہلبیتؑ رسولؐ پر لعن وطعن کا بازار گرم ہوگیا۔

اہلبیتؑ رسولؐ کی مخالفت میں خزانوں کے دروازے، اور کیسہ ہائے زروجواہر کے منہ کھول دیئے گئے، رواۃ احادیث کو توڑے دیئے جاتے تھے کہ وہ امیر المومنینؑ کی مذمت میں وضع احادیث کریں ۔ابوالحسن علی بن محمد مداینی جو اسلامی مورخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اس نے 'کتاب الاحداث' میں اس زمانہ کی حالت کی عجیب وغریب الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ لکھتا ہے کہ:۔

معاویہ نے ایک فرمان اپنے تمام گورنروں کے پاس بھیجا کہ میں اپنی ذمہ داری کو ہٹاتا ہوں اس شخص کی حفاظت سے جو ابوترابؑ کی فضیلت میں کوئی روایت بیان کرے، بس پھر کیا تھا ہر شہر وقریہ میں اور ہر منبر پر خطباء واعظین علی بن ابی طالبؑ کے لعن کے لئے کھڑے ہوگئے، سب سے زیادہ مصیبت اہل کوفہ کے لئے تھی کیونکہ اس میں شیعہ اچھی خاصی تعداد میں تھے۔معاویہ نے وہاں زیاد بن سمیہ کو حاکم بنادیا، اس نے چن چن کر ان کو قتل کرنا شروع کیا، دست و پا قطع کئے، آنکھیں نکالیں، درختوں پر سولی چڑھایا، یہاں تک کہ کوئی مشہور ومعروف شخص ان میں سے باقی نہیں رہا، اس کے بعد صحابۂ کبار کے فضائل میں احادیث وضع ہونا شروع ہوئے یہاں تک کہ ہر خطہ عالم میں مشہور ہوگئے۔

علی بن ابی طالبؑ کی ذات سے اسلام کو جو ارتباط تھا اس کی وجہ سے محال تھا کہ علیؑ کی عداوت

اسلام کے حدود تک نہ پہنچتی۔اس فسق وکذب اور ظلم وجور نے عالم سے سچے اسلامی نقشوں کو فنا کردیا، اور دلوں سے اسلامی روح بالکل مفقود ہوگئی۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

امیر شام معاویہ اگرچہ صحابۂ رسولؐ میں محسوب کئے جاتے ہیں مگر ان کی حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو ہر اسلامی تاریخ میں جلی حرفوں میں نمایاں نظر آتے ہیں جن سے اسلام کے ضعف وکس مپرسی کا اندازہ ہوسکتا ہے:۔

(۱) جھوٹ اور خدا اور رسولؐ پر افترا پوری آزادی کے ساتھ عمل میں لایا جانے لگا، بلکہ حکومت وقت کی طرف سے اس پر جائزہ وانعام دیا جاتا تھا، جیسا کہ ابوالحسن مداینی نے 'کتاب الاحداث' میں لکھا ہے کہ "معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اس کا پورا نام مع پتہ کے میرے پاس لکھ کر بھیج دو اور پوری طرح جائزہ وانعام سے اس کو مالا مال کردو۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں بہت سے احادیث پیدا ہوگئے۔پھر تمام گورنروں کو لکھا گیا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہوگیا ہے، اب تم دیگر صحابہ کے بارے میں روایت احادیث کی طرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابوترابؑ کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے، اس کے مقابل دوسرے صحابہ کے لئے بھی بیان کرو۔علیؑ اور ان کے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے۔یہ فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا۔اور سیکڑوں حدیثیں صحابۂ کبار کے مناقب میں بیان کی جانے لگیں، جن کی کوئی اصلیت نہ تھی، واعظین ان کو منبروں پر پڑھتے اور معلمین مکتب بچّوں کو قرآن کی طرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں، عورتوں اور غلام وملازم تک کو یاد کراتے تھے۔"

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط ہوکر بے اعتبار بن گئے اور علمی تحقیق وتدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۲) سب وشتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکل آیا۔ دمشق وشام کے ممبروں پر چالیس برس تک یہ منحوس رسم ادا ہوتی رہی بلکہ سنت بنالی گئی۔ ابوعثمان جاحظ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے کہ ''کچھ لوگوں نے معاویہ سے کہا کہ اب تو آپ نے اپنے مقصود کو حاصل کرلیا، خدا کے لئے اب اس شخص (علی بن ابی طالبؑ) کی جان چھوڑ دیجئے۔ معاویہ نے کہا کہ ہرگز نہیں یہاں تک کہ اسی پر کمسن بچے تربیت پا جائیں اور سن رسیدہ لوگ آخر عمر تک پہنچ جائیں اور کسی شخص کی زبان پر کوئی فضیلت علیؑ کی نہ آئے۔''

سلطنت کی یہ کوششیں، مگر خدا کی شان! جس کو وہ عزت دینا چاہے اس کو کوئی ذلیل نہیں کرسکتا، اور جس کو وہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا، اسلامی تصانیف کی ورق گردانی کیجئے کوئی کتاب ایسی نہ ملے گی جس میں علیؑ کے فضائل کا دریا موج زن نہ ہو۔ ع

چراغے را کہ ایزد بر فروزد

(۳) بلاد اسلامیہ میں شراب بہت آزادی کے ساتھ استعمال کی جانے لگی، اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی، چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسولؐ) نے شراب کے بار سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو پھاڑ ڈالا۔ معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے۔ عبدالرحمن نے سنا تو کہا کہ خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے، مگر رسالتمآبؐ نے ممانعت فرمائی ہے، اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا ظرفوں میں رکھی جائے، اس واقعہ کو علامہ ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے۔

(دیکھو 'اسدالغابہ' مطبوعہ مصر جلد ثالث، ص ۳۱۹، نیز 'اصابہ' ابن حجر جلد ۲ ص ۴۰۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی درآمد مسلمانوں میں افراط سے ہوگئی تھی، اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرتا تھا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا۔

(۴) بے گناہ مسلمانوں کا خون بہت بے دردی سے بہایا جانے لگا، سیکڑوں کلمہ گویوں کی

گردنیں زیر تیغ ہوگئیں۔ سمرہ بن جندب اور بسر بن ابی ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سیہ کاریاں اسی عہد کا نامۂ عمل ہیں، عبداللہ بن عباس کے دو کمسن بچّے ماں کی گود میں ذبح کردیئے گئے، جس کی وجہ سے وہ مجنوں ہوگئیں۔

(ملاحظہ ہو استیعاب مطبوعۂ دائرۃ المعارف حیدرآباد، جلد اول، ص ۶۶)

اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ ''حکومت جس رنگ پر ہوگی زمانہ کا رخ اسی طرف پلٹ جائے گا۔ خصوصاً وہ زمانہ جب کہ بدوی عربوں کے دل میں اسلام کے نقش تازہ بیٹھے ہوئے تھے، پرانی عادتیں اور جاہلیت کی بو ابھی تک دماغوں میں بسی ہوئی تھی، وہ خدا سے چاہتے تھے کہ کسی طرح پابندی شریعت اور اسلامی قواعد کا جوا گردن پر سے اتر جائے۔ سلطنت کی نظر میں خود دیانت وامانت کا کوئی پاس ولحاظ نہ تھا' کھلم کھلا مخالفت اور اسلام فروشی کو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ (تصدیق کے لئے دیکھئے 'استیعاب' ابن عبدالبر)۔ حتات مجاشعی اور جاریہ بن قدامہ اور احنف بن قیس تینوں شخص جنگ میں گئے، حتات نے معاویہ کے پاس آکر شکایت کی کہ آپ نے ان دونوں شخصوں کو میرے اوپر ترجیح دی، اور ان کا مجھ سے زیادہ پاس ولحاظ کرتے ہیں۔ معاویہ نے جواب دیا میں نے ان کا مذہب مول لے لیا ہے، حتات نے کہا کہ پھر مجھ سے بھی میرا مذہب خرید لیجئے۔

(جلد اول، ص ۱۵۴)

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ان مورخین کے اقوال کی تکذیب کریں باوجودیکہ ان کو امیر معاویہ سے حسن عقیدت رکھتے ہوئے ایسے احادیث وضع کرنے کا کوئی باعث نہیں، یا ان واقعات کو تسلیم کرلیں تو ایسی ظاہری توہین اسلام کی توقع ایک فاسق وفاجر معمولی شخص سے بھی نہیں ہوسکتی، چہ جائیکہ ایک مدعی خلافت بڑے شخص سے! مگر تاریخیں بہت سے ایسے واقعات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں۔

دربارِ شام کا ایک حیرت انگیز واقعہ

اسلام کا مشہور ومعروف مسلم الثبوت مورخ طبری اپنی تاریخ میں ۶۰ھ کے واقعات لکھتے

ہوئے رقمطراز ہے کہ عمرو عاص اہل مصر کے ایک گروہ کے ساتھ معاویہ کی ملاقات کو آئے۔ (اس زمانہ میں عمرو عاص معاویہ سے کچھ برسر پرخاش تھے) انھوں نے ان لوگوں کو سکھلا دیا کہ تم معاویہ کے پاس جانا تو اس کی توہین کرنا اور خلیفہ کہہ کے سلام نہ کرنا۔ معاویہ کو جب ان لوگوں کی خبر معلوم ہوئی تو وہ عمرو عاص کی سازش کو تاڑ گئے، اور دربانوں سے کہا کہ نابغہ کے لڑکے (عمرو عاص) نے شاید ان لوگوں کی نظر میں میرے مرتبہ کو سبک کر دیا ہے۔ تم ان لوگوں کے ساتھ جتنی سختی وشدت کر سکتے ہو، وہ کرنا یہاں تک کہ یہ لوگ سمجھ لیں کہ ان کی جان خطرہ میں ہے۔ دربانوں نے بھی اس کی اطاعت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص دربار میں معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے کہا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ اور بقیہ لوگوں نے بھی اس کی پیروی کی۔ (تاریخ طبری، ص ۱۸۴) یہ واقعہ جب ہماری نظر سے گزرا تو حیرت وتعجب کی انتہا نہ رہی، شام کے اسلامی دربار میں خلیفۂ وقت کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا جائے اور ان لوگوں کو سزا تو سزا تنبیہ بھی نہ کی جائے۔ اس سے ضمیر کا پتہ صاف چلتا ہے اور حقیقی نصب العین بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے۔ خود حاکم وقت کو جانے دو! دمشق کے بھرے ہوئے دربار میں کسی ایک شخص کا بھی اس واقعہ پر چیں بجبیں ہونا تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اسلامی جذبات کس حد تک فنا ہو چکے تھے اور ایمان کی روحانیت کا چراغ کس درجہ خاموش ہو گیا تھا۔

بہرحال معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انھوں نے اپنی عمر گزار دی، مگر وہ مسلمانوں کے سر پر ظلم وستم کے ایسے دیوتا کو سوار کر گئے جس نے اسلام کے نظام کو بالکل درہم وبرہم کر دیا۔ یزید کے اخلاق و عادات سے امیر معاویہ واقف نہ تھے؟ یہ کس عقل میں آنے کی بات ہے؟ تاریخوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ علامہ ابن حجر مکی 'تطہیر اللسان والجنان' میں جو معاویہ کے مناقب وفضائل میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ ''ایک روز امیر معاویہ بیٹھے بیٹھے یکبارگی رونے لگے، مروان نے کہا کہ کیوں کیا ہوا؟

آپ کے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ دنیا میں کون سی راحت تھی جو میں نے نہ اٹھائی ہو اب سن زیادہ ہو گیا، ہڈیاں گھل گئیں جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھ پر یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں اپنے لئے راہ راست کو حاصل کر لیتا۔'' (حاشیۂ صواعق محرقہ، مطبوعہ مصر، ص ۵۶)

دوسرے مقام پر علامہ مذکور لکھتے ہیں کہ ''معاویہ نے پورے طور پر اقرار کر لیا کہ یزید کی محبت نے ان کو ہدایت کے راستوں سے اندھا بنا دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے بعد ایسے فاسق وفاجر کے ساتھ مبتلا کر دیا کہ جس نے ان کو ہلاک کر ڈالا'' (حاشیۂ صواعق، ص ۵۸)

اس کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال وعادات سے بے خبر تھے اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی؟ یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی، اور زر وجواہر کے خزانے اس کے لئے وقف کر دیئے گئے۔ یزید تخت خلافت پر متمکن ہوا اور اس کے فسق وفجور نے دنیا کو پر کر دیا۔ ہر طرف معصیت خدا اور مخالفت شریعت کا بازار گرم ہوا۔ مذہب بازیچۂ اطفال اور اسلام زینت طاق نسیاں بن گیا۔ یزید کے اخلاق وعادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو ملوث نہیں کیا جا سکتا، نہ اتنا موقع ہے کہ ان پر روشنی ڈالی جا سکے۔ اسلام کی مستند تاریخیں امانت داری کے فرائض کو ادا کرتے ہوئے ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔

واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویر کھینچی ہے، اس پر یہاں اکتفا کی جاتی ہے۔ ''حنظلہ غسیل الملائکہ (صحابیٔ رسولؐ) کے فرزند عبداللہ بن حنظلہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم یزید ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کی بیویوں (اپنی ماؤں) سے اور اپنی بہنوں، بیٹیوں تک سے نکاح کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔'' اس روایت کو علامہ ابن حجر نے 'صواعق محرقہ'، ص ۱۳۵ میں بھی لکھا ہے کیا اسلامی بادشاہ اور مجوس میں کوئی فرق ہوا؟ انتہائی فاسق وفاجر بھی اپنی ماں بہنوں، بیٹیوں پر تصرف حمیت وغیرت بلکہ انسانیت کے خلاف سمجھتا ہے۔

بادشاہ وقت کے ان عادات واخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ پکڑ لیا تھا اور اسلامیت بالکل فنا ہو گئی

۔لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ سرِ تسلیم خم کئے ہوئے تھے اور کسی کے ذہن سے صدائے اعتراض بھی بلند نہ ہوتی تھی۔ عبداللہ بن عمر ایسے صحابیِ رسول اور خلیفہ زادے جنھوں نے حضرت امیرالمومنینؑ علی بن ابی طالب علیہ السّلام کی بیعت مرتے دم تک نہیں کی انھوں نے یزید کے ہاتھ پر بخوشی بیعت کر لی تھی۔ (’فتح الباری‘، حافظ ابن حجر عسقلانی، جلد ۲، ص ۴۴۵)

سوائے تین شخصوں کے تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفۂ رسول تسلیم کر چکے تھے، وہ تین شخص حسین بن علی علیہ السلام، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر تھے۔ یزید کی طرف سے کوشش شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ السلام کے حلقۂ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا۔ گذشتہ تاریخ اور اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے ہر بابصیرت سمجھ سکتا ہے کہ علی بن ابی طالبؑ کا فرزند اور رسولؐ کے خاندان کا سب سے بزرگ شخص اگر ان حالات کی موجودگی میں یزید کی بیعت کر لیتا تو کیا اسلام کا نام بھی عالم میں باقی رہ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ حسینؑ کی غیرت و حمیت اور اسلامیت کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے رسولؐ کے دین کو برباد ہوتے ہوئے دیکھیں اور سکوت کریں۔ حسینؑ کا طرزِ عمل کتنے گہرے تدبر پر مبنی تھا، اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے۔ نافہم اور تاریخی اسباب و علل سے بے خبر افراد اعتراض کریں کہ حسینؑ نے خود اپنی جان کو معرضِ خطر میں ڈالا۔ اگر مدینہ میں قیام کرتے، اور یزید سے برسرِ پرخاش نہ ہوتے تو آپ کا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا مگر حقیقت شناس باخبر افراد، اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتے، بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علی بن ابی طالبؑ کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتے تھے اور ان کی خاموش ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسن مجتبیٰؑ ایسے صلح پسند جنھوں نے مسلمانوں کی جان بچانے کے لئے دنیاوی سلطنت کو ٹھوکر لگا دی اور جن کے خلقِ عظیم و حلم کا دشمنوں تک کو اعتراف تھا، باوجود امورِ سلطنت سے کنارہ کش ہونے کے اپنی زندگی کو دشمنوں سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ امام حسنؑ نے جس طرح معاویہ کے افعال سے درگزر کیا،

اور فتنہ وفساد کو خاموش کیا، اس کا بدلہ ان کی طرف سے کیوں کر ملا؟ اس کا جواب تمام انصاف پسند باطلاع مصنفین کی کتابوں سے چل سکتا ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب اپنی کتاب ’محرم نامہ‘، صفحہ ۴۷/ اور دوسری کتاب یزید نامہ ص ۸۳/ میں لکھتے ہیں:-

’’پہلا خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم وجدید محاکمۂ تاریخی وقانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کر سکتا۔‘‘

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کے لئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا، جس طرح حضرت امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا، اس صورت میں علاوہ اس بات کے کہ امام حسینؑ کی جان جاتی، عالم پر حقیقت کے آشکار ہونے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جس طرح حضرت امام حسنؑ کی وفات کے متعلق طرح طرح کے توہمات پیش کر کے اصل واقعہ کو پردۂ خفا کے نیچے لایا جاتا ہے، ویسے حضرت سیدالشہداؑ کی شہادت بھی ایک مشتبہ صورت میں ہوتی۔ وہ صاف سادہ صحابۂ رسولؐ یا امام حسینؑ کے ہمدرد جو آپ کو کربلا جانے سے روک رہے تھے اور کہتے تھے کہ جوارِ رسولؐ میں قیام کیجئے۔ اس نکتہ پر متوجہ نہ تھے، ان کو سیدالشہداؑ کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ ’’یہ لوگ مجھ کو کہیں چھوڑیں گے نہیں‘‘۔ اور واقعہ بھی یہی تھا، سیدالشہداؑ جو کچھ ہونے والا تھا اس سے باخبر تھے، اور آپ نے یہ خیال کر کے کہ ’’جان جائے تو اسلام کو زندہ کر کے جائے۔‘‘ اس سفر کو اختیار کیا تھا۔ کربلا کے واقعہ نے یزید کے کفر و فجور کو طشت از بام کر دیا، اور رسولؐ اسلام کے نواسے کے قتل نے عالم کی آنکھیں کھول دیں، کربلا میں مظالم کا خاتمہ ہوا، ایک طرف شام و کوفہ کے لشکر کی بے رحمی، وحشیت اور ننگِ انسانیت افعال، دوسری طرف حسینؑ بن علیؑ اور ان کے انگلیوں پر شمار کر لینے کے قابل رفقاء کا صبر و حلم، تحمل، ثباتِ قدم، وفاداری اس نے دنیا کے سامنے حق و باطل کو علیٰحدہ کر کے پیش کر دیا، غفلت ولاعلمی کے وہ گہرے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے ایک مرتبہ اٹھ گئے اور حقیقت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ شام اور اس کے اطراف

کے عرب جس فضا میں پرورش پائے ہوئے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ رسولؐ و آل رسولؐ کے نام سے بھی واقف نہ تھے، جو کچھ سمجھتے تھے وہ بنی امیہ کے جابر بادشاہوں کو، ان سے کوشش کر کے اہلبیتِ رسولؐ کا نام چھپایا جاتا تھا، ان کے سامنے حقیقت کے واضح ہونے کا کوئی ذریعہ نہ تھا، سوائے اس کے جو حسینؑ نے اختیار کیا، اور کربلا میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لانے کا بھی فلسفہ یہی تھا۔ اگر تنہا سید الشہداؑ کربلا میں قتل کر دیئے جاتے تو حقیقت کی وہ تبلیغ جو بصورت موجودہ ہوئی، نہ ہو سکتی تھی، لیکن اہلبیت رسولؐ کی اسیری اور ان کے ہر کوچہ و بازار میں پھرائے جانے اور اس پر ان کے صبر و ضبط، جلالِ عصمت و طہارت، اور جابجا معارف و حقائق سے مملو خطبوں نے، ہر گوشۂ عالم کو حسینؑ مظلوم کا مرثیہ خواں بنا دیا اور حقائق اسلام پر ایک عالمگیر روشنی ڈال دی۔

اے حسینؑ بن علیؑ! میرا اسلام آپ پر ہو، آپ نے آخر دم تک فرض شناسی اور سکون و تحمل کو ہاتھ سے نہیں (جانے) دیا، آپ نے جان و مال اور آبرو، ہر چیز کو اسلام پر فدا کر دیا، آپ نے اپنے نانا کی شریعت سے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔

آپ نے دنیا کو توحید حقیقی کا نہ بھولنے والا سبق یاد دلایا، آپ خود وقتی طور پر مٹ گئے، مگر اسلام کو زندہ کر گئے، آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر گر رہا تھا، شریعت میں ایک روح پھونک رہا تھا، مذہب آپ کا رہین منت ہے، اور اسلام آپ کے احسان سے سر نہیں اٹھا سکتا، خدا آپ کے سامنے ہماری طرف سے تحیۂ درود کے تحفے پیش کرے۔

یالیتنا معك فافوز فوزاً عظیما

اشاعت اول: سرفراز محرم نمبر ۱۳۷۴ھ بعدہٗ امامیہ مشن، لکھنؤ محرم ۱۳۸۳ھ

✡✡✡

حسینؑ حسینؑ ایک تعارف

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

یہ مقالہ بعض اخبار و رسائل میں شائع ہونے کے بعد امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ نمبر ۴۱۶ کے ذریعہ (محرم ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء) اشاعت پذیر ہوا۔

تعارف کی ضرورت ان کے لئے ہے جو محرم کے موقع پر حسینؑ حسینؑ کی آوازیں سنتے ہیں، اخباروں کے مخصوص شماروں پر محرم میں حسینؑ نمبر لکھا دیکھتے ہیں مگر جانتے نہیں کہ یہ حسینؑ کون ہیں؟ یا ان کے لئے جو کسی جلوس عزا کو ننگے سر، ننگے پیر سڑکوں پر دیکھتے، کسی گھوڑے (شبیہ ذوالجناح) کو اس شان سے دیکھتے ہیں کہ باگیں کٹی ہوئی ہیں، خون بہا ہوا ہے، جسم پر جابجا تیر پیوست ہیں، یا کسی تابوت کو خون آلودہ چادر سے ڈھکا ہوا دیکھتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس کی یاد تازہ کی جا رہی ہے۔

پہلی صورت میں اسم سے مسمی کی تلاش ہوتی ہے، اور دوسری صورت میں صفات سے موصوف کی جستجو، یا منسوبات سے منسوب الیہ کی طلب پیدا ہوتی ہے، اور یہی ان مظاہر عزا کا وہ افادی پہلو ہے جس کی بنا پر دوستدارانِ حسینؑ ان کی بقاء کو اپنی حیات کا خزانۂ عامرہ سمجھتے ہیں، اور مخالفین ان کے مقابلہ میں جارحانہ کوششوں کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے ہیں۔

یہ تعارف کا وہ سطحی پہلو ہے جس کے لئے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں، لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو جو حضرت حسینؑ ابن علی علیہ السلام کے نام کا ورد رکھتے ہیں، اور آپ کے ذکر کا دن

رات مشغلہ رکھتے ہیں، انہیں بھی اکثر و بیشتر آپ کی عظمت کا پورا تصوّر اور آپ کے اس کارنامۂ جاوید کی گہرائیوں کا کامل احساس نہیں ہے۔ اس لئے وہ خود محتاجِ تعارف ہیں۔ مگر یہ پہلو تعارف کا وہ ہے جس کا حق اسی وقت ادا کیا جاسکتا ہے جب تعارف کرانے والا خود اس حیثیت سے معرفت حسینؑ کا مدعی ہو اور یہ دعویٰ کرنا ماڈی ماحول میں گھرے ہوئے ایک شخص کے لئے کوئی آسان بات نہیں ہے۔ بہرحال یہ ایک مشکل مرحلہ ہے جس کے طے کرنے کی اس وقت میں اپنے آپ میں طاقت محسوس نہیں کرتا، نہ اس محدود مقالہ کو تنگ ظرف اس کی وسعت کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

سردست یہ تعارف انہی افراد کے لئے ہے جو اس ذات سے تقریباً بالکل ہی ناواقف ہے۔

ایسا تو شاید کوئی تعلیم یافتہ نہ ہوگا، جس نے اسلام کا نام نہ سنا ہو۔ مذہبی اعتبار سے دین اسلام ازلی ہے، اور سب پیغمبر، خدا کی طرف سے اسی دین کی اشاعت کے لئے آئے، مگر اس دین کا نام اسلام اور اس کے پیروؤں کا نام مسلم، سب سے پہلے خلیل خدا حضرت ابراہیمؑ نے رکھا، اور اس اعتبار سے وہ مسلمانوں کے مورثِ اعلیٰ سمجھے جاسکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو بیٹے تھے: اسحاقؑ اور اسمٰعیلؑ۔ حضرت اسحٰقؑ سلسلۂ بنی اسرائیل کے مورث اعلیٰ تھے، جن میں موسیٰ اور عیسیٰؑ مشہور انبیاء مبعوث ہوئے اور توریت اور انجیل اور زبور کتابیں نازل ہوئیں، اور دوسرے حضرت اسمٰعیلؑ تھے جنہیں حضرت ابراہیمؑ نے شیرخوارگی کے عالم میں آپ کی والدۂ گرامی ہاجرہ کے ساتھ مکہ کی سرزمین پر پہنچادیا جس میں خانۂ کعبہ واقع ہے اور کعبہ کی تعمیر بھی انہیں باپ بیٹے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ نے کی۔

اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند تھے، ان میں ثابت اور قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی۔ اور قیدار کی اولاد میں عدنان ہوئے، جن کی نسل میں نضر بن کنانہ اور ایک قول کے مطابق فہر بن مالک بن نضر اور بقولے قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر کی اولاد قریش کے لقب سے مشہور ہوئی۔

قصی بن کلاب نے بڑا نام پیدا کیا اور بڑے کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے دارالندوہ (محل مشاورت) کے نام سے ایک عمارت تیار کرائی، جس میں جمہور کے کام انجام دیئے جاتے

تھے۔ ان کے لئے معاشرت کے قوانین منضبط کئے، اور خراج کی وصولی اور حاجیوں کے خورد و نوش کا انتظام کرایا۔ انہوں نے شراب خواری کی مذمت کی اور اس کی مضرتوں کا اعلان کیا۔ قصی کے فرزندوں میں، عبدمناف اوصاف و کمالات میں اپنے بزرگوں کے حقیقی جانشین تھے اور ان کے فرزندوں میں ہاشم نہایت بااثر اور ممتاز تھے۔ کعبہ کی معزز خدمتیں حاجیوں کی سیرابی اور ضیافت ان کے سپرد کی گئیں جو انھوں نے بہت قابلیت سے انجام دیں۔ ان کے مقابلہ میں امیہ بن عبدالشمّس جو بنی امیہ کا مورثِ اعلیٰ تھا ناکام ہوکر جلاوطن ہوکر شام کی طرف نکلا اور وہاں اپنا مستقر بنایا۔

ہاشم ان کا لقب اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے قحط کے زمانہ میں اہل مکہ کو روٹیوں کے ٹکڑے شوربے میں بھگو کر کھلائے۔ عربی میں ہشم (ہاشم) چورا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب تھے جو شرف، عظمت، اور شہرت میں اپنے اکثر بزرگوں پر بھی فوقیت لے گئے اور سیدالبطحاء کے خطاب سے مشہور ہوئے جو ان کی اولاد میں باقی رہ گیا چنانچہ انہیں کی اولاد ہے جو سادات کہلاتی ہے۔

عبدالمطلبؑ کے دس بیٹوں میں سے دو بیٹے عبداللہ اور ابوطالبؑ تھے۔ عبداللہ کے فرزند پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ تھے جنھوں نے دنیا کو کامل توحید کا پیغام پہنچایا۔ اور بت پرستی، اقتدار پرستی، سرمایہ پرستی، غرض کہ غیراللہ کی ہر طرح پرستش سے مخالفت کی اور ابوطالب کے فرزند امیرالمومنین حضرت علی مرتضیٰؑ تھے جو اشاعت اسلام میں حضرت پیغمبر اسلامؐ کے ہمیشہ دست و بازو بنے رہے، یہاں تک کہ جب مخالفین اسلام نے فوجی طاقتوں کے ساتھ مسلمانوں پر چڑھائی کی اور بدر و احد، خندق و خیبر کی لڑائیاں ہوئیں تو ان تمام لڑائیوں میں حق و صداقت کی روحانی طاقت کے ساتھ حضرت علیؑ مرتضیٰ کی تلوار تھی جو ہر موقع پر اسلام کی فتحمندی کا سبب بنی رہی۔

حضرت پیغمبرؐ خدا کی ایک بیٹی تھیں فاطمہ زہراؑ جن کی ان کے بلند اوصاف کی بناء پر آپ اتنی عزت کرتے تھے کہ جب وہ آپ کے پاس آتی تھیں تو آپ تعظیم کے لئے کھڑے ہوجاتے تھے

،اور بکثرت حدیثیں آپ نے ان کی فضیلت کے بارے میں ارشاد کیں جن میں ایک یہ تھی کہ وہ سردار زنانِ جنت اور سردار زنانِ اہلِ ایمان ہیں، اور فرمایا کہ فاطمۃُ بَضعَۃٌ مِّنّی یعنی فاطمہؑ میرا ایک ٹکڑا ہے۔ ان کی شادی حضرت علیؑ مرتضیٰ سے ہوئی اور انہی دونوں مقدس اور بزرگ ماں باپ سے دو فرزند پیدا ہوئے ایک حسن مجتبیٰؑ اور دوسرے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا، جن کا نام حسینؑ حسینؑ کے الفاظ میں محرم کے زمانہ میں اکثر شہروں اور دیہاتوں میں اکثر مکانات اور تقریباً ہر رہ گذر پر سنائی دیتا ہے۔

حضرت امام حسینؑ پیغمبر اسلامؐ کے نواسے اور حضرت علیؑ کے بیٹے تھے، آپ کی زندگی اسلامی تعلیمات کا مکمل نمونہ تھی، اور شیعہ مسلمان آپ کو تیسرا امام یعنی پیغمبرؐ خدا کا تیسرا جانشین اور رسولؐ کے بعد خدا کی طرف کا مقرر کردہ تیسرا رہبر دین مانتے ہیں۔

شام کا حاکم یزید، جو آوارہ مزاج، شراب خوار اور بڑا ہی فاسق و فاجر تھا، آپ سے غیر مشروط طور پر اپنی اطاعت کا عہد لینا چاہتا تھا۔ اسے آپ نے گوارا نہ کیا۔ اسی بناء پر یزیدی فوج نے آپ پر چڑھائی کی اور ۱۰ محرم ۶۱ھ کو کربلا کی سرزمین پر تین دن کی بھوک اور پیاس میں آپ کے جاں نثار ساتھی اور جوان و کمسن بیٹے، بھائی، بھتیجے، بھانجے یہاں تک کہ شیر خوار چھ مہینے کا بچہ تک دشمنوں کی تلواروں، نیزوں اور تیروں کا نشانہ ہو گئے۔

آپ کے خیام میں آگ لگا دی اور آپ کے پسماندگان کو جن میں صرف ایک مرد یعنی بیمار فرزند زین العابدینؑ تھے اور جن میں پیغمبر اسلامؐ کی حقیقی نواسیاں تک موجود تھیں، قید کر کے انتہائی ظلم و بربریت کے ساتھ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام لے گئے۔

یہی دردناک اور دلدوز مثالی کارنامہ ہے جس کی یاد ہر سال ماہِ محرم میں تازہ کی جاتی ہے اور اس کی یادگار میں اخباروں کے مخصوص شمارے ''حسین نمبر''، یا ''محرم نمبر'' کے نام سے شائع کئے جاتے ہیں۔

❁❁❁

نجات دہندہ امت۔۔۔۔۔ حسینؑ

آپ کی عظیم قربانی شریعتِ اسلامیہ کا احیاء ہے

سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

رسول کی آنکھیں بند ہونا تھیں۔ کہ اسلام پر مصائب کا ہجوم ہو گیا۔ اس کے روحانی خصوصیات اور اصلی خط و خال بگاڑے جانے لگے۔ اسکے احکام میں تغیر و تبدل اور اسکے رسوم و قوانین میں کانٹ چھانٹ کی جانے لگی۔ حقیقی جانشین رسول کہ جو ان کے تعلیمات کا عملی نمونہ اور مکمل نقشہ تھا۔ وہ گمنامی و انزداء کے پردۂ غیبت میں مستور ہونے پر مجبور ہوا۔ اور کارفرمایان تختِ اسلامی نے مصالح وقت اور سیاستِ حاضرہ کی علمبرداری اختیار کر کے اسلام نہیں، بلکہ مسلمانوں کے ظاہری جاہ و حشم کی فراوانی کو مقدم قرار دیا۔ یہ سب کچھ ہوا۔ لیکن قانون اسلامی کا ظاہری احترام اور شریعت کی رسمی پابندی اور احکام شریعہ کا پاس و لحاظ انتہائی سختی کے ساتھ جاری تھا۔ اور اسلئے ان اشخاص کیلئے جو اسلامی تعلیمات سے صحیح طور پر اثر پزیر ہوں۔ ان پر مذہب ہی پر قائم رہنے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نیز پابندیٔ شریعت کے بلند بانگ دعویٰ سے فائدہ اٹھا کر حقیقی رہنمائے اسلام کو پردہ ہی پردہ میں رہ کر ذمہ داران سلطنت سے مفادِ اسلامی کے تحفظ اور احکام شرعیہ کے اجرا کرانے کا بھی موقع مل جایا کرتا تھا۔ جس کے نظائر و امثال سے تاریخ کے اوراق مملو ہیں کہ کس طرح بیشمار مواقع پر امیر المومنینؑ نے غلطیوں پر متنبہ کیا، جاتی ہوئی جانوں کو بچایا اور مظلوموں کی امداد کی اور پامال ہوتے ہوئے احکام شریعت کی حفاظت میں کامیاب ہوئے۔

یہ نتیجہ کس بات کا تھا، صرف اسکا کہ اسلامی تختِ حکومت کی جانب سے اسلامی شریعت کی پابندی طرہ امتیاز اور سرمایۂ افتخار سمجھی جاتی تھی اور اس کی کھلم کھلا مخالفت آئینِ قانون کے تحت میں

جائز قرار نہ دے دی گئی تھی۔ عام افراد امت سے بھی شریعت کی پابندی قانونی حیثیت سے لازم تھی۔ بلکہ سلطنت کا قانون شرع ہی کے نام سے رائج تھا۔ اگر چہ پردہ، پردہ میں اسکے اندر تراش خراش کردی گئی ہو۔

بیشک یہ صورتِ حال ایسی تھی۔ کہ جس کی بدولت دنیا میں اسلام اور اس کی شریعت کا نام باقی رہے۔ اور چاہے اس کا اصلی جواہر روحانیت مفقود ہو جائے۔ لیکن اسکے نقش سے صفحۂ ہستی سادہ نہ ہونے پائے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ صورت بھی باقی نہیں رہی۔ زمانہ کی آفتاد نظام تدریج کی پابند ہے۔ اور ہر چیز ابتدا میں کم اور انتہا میں زیادہ ہوتی ہے۔ روز وشب کی آمد ورفت اور زمانہ کا امتداد سابق کے ہر نقش کو زیادہ مدہم کرتا جاتا ہے اور شورش انگریزی ومفسدہ خیزی کی آگ کو ہوا دیتا ہے۔ بیشک اسلامی آئینہ پر اگر اس دور میں صرف غبار آیا تھا۔ تو کچھ عرصے کے بعد وہ غبار جم گیا۔ اور تیسرے دور میں اس نے زنگ کی صورت اختیار کی اور آئینہ کے صفا وضیا کو مفقود ہی کر دیا۔

اس زمانہ میں مخالفت شریعت کی آگ اگر سلگی تھی تو پھر وہ دھکی اور آخر میں شعلہ اٹھنے لگے۔ اسلامی مملکت میں بنی امیہ کا دوردورہ ہوا۔ اور رسولؐ اسلام کا سرمایۂ زندگی ان خون کے پیاسے دشمنوں تک پہونچایا کہ جو اپنے اقتدار وطاقت کے آخری رمق حیات تک اسی سرمایہ کے تباہ کرنے کیلئے جنگ کرتے رہے تھے۔ اور آخر تمام قوتیں ختم ہو جانے کے بعد بیکس وبے بس ہو کر سر تسلیم خم کیا تھا۔ اب آج حالات کی دستیاری اور قسمت کی یاوری نے انہی کو اس سرمایہ کا نگراں ومتولی بلکہ مالک وخداوند بنا دیا ہے۔ پس پھر کیا تھا۔ وہ تلواریں کہ جو بدر واحد وخندق میں کھینچ کر کند ثابت ہوئی تھیں۔ اور آخر ناکام ہو کر فتح مکہ میں ایک طویل عرصہ تک کیلئے ہزاروں مجبوریوں کے ساتھ نیام میں چلی گئی تھیں۔ اب دوسرے لباس میں نیام سے باہر نکل آئیں۔ اور بیدردی سے احکام اسلامی کا گلا کاٹا جانے لگا۔ اس وقت پردہ تھا اور نہ کوئی حجاب، علانیہ شریعت کی مخالفت ہوتی تھی۔ اور اسپر ناز تھا۔ اسلام کو پامال کیا جاتا تھا۔ اور اس پر فخر تھا۔ اسلامی رہنماؤں کی زبانوں پر پہرے

بیٹھے تھے۔ اور دہنوں میں قفل لگے ہوئے تھے۔ اور اگر وہ ان تمام موانع کے باوجود رہنمائی کے فرض کو آنجام دیتے بھی تو بیکار اس لئے کہ دوسری طرف والوں پر قفل تھے۔

بے ساز وسامان ہدایت، مظلومی وبے بسی کے ساتھ ہدایت، حجاب خفا میں مخفی رہ کر ہدایت، جس کا سلسلہ پہلے دور میں جس کا حوالہ سابق میں گذر چکا، جاری تھا۔ وہ اس زمانہ میں ناممکن تھی اسلئے کہ اب تو احکام شریعت کا زبانی بھی پاس ولحاظ نہ تھا۔ بلکہ اسلام وشریعت اسلام کی مخالفت میں طاقت واقتدار کا مظاہرہ تھا۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ

عوام کے خلاق وحالات پر بالا دست طاقتوں کا بجلی کی روک سے زیادہ تیز اثر پڑتا ہے۔ حکام وقت کے احکام مذہب سے مخالفت بلکہ اعلان جنگ کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام عالمِ اسلامی میں مذہب کی طرف سے بے توجہی اور احکام مذہبی میں تساہل وبے اعتنائی اور معارف صحیحہ سے بے خبری وبے تعلقی کا دور دورہ ہو جائے۔ اور مسلمان اسلام سے ہزاروں اور لاکھوں کوس دور جا پڑیں۔ جسکا لازمی نتیجہ ہلاکت ابدی ہے۔ اور چونکہ اخلاف اسلاف کے قدم بقدم ہوتے ہیں۔ خشت اول کے کج ہو جانے کے بعد ستارہ ثریا تک دیوار کج ہی ہو جائے گی۔ اسلئے ایک عصر میں اسلام کی فنا اور افراد اسلام کی ہلاکت قیامت تک کیلئے امت رسالت مآب کی ہلاکت کے مترادف ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس زمانہ میں اسلام کی حیات وموت کا سوال درپیش تھا۔ اور امت اسلامیہ کے افراد کی قیامت تک کیلئے ہلاکت کا مرقع سامنے آگیا تھا۔ اور امت محمدیہ تیزی کے ساتھ آتش جہنم کی طرف قدم بڑھاتی تھی بے شک ضرورت تھی اس وقت ایک نجات دہندہ کی، ایک ایسے شخص کو جو امت رسولؐ کو آتش جہنم سے چھٹکارہ دے۔ اور ہلاکت کے خوفناک سمندر میں غرق ہونے سے بچالے۔

اس ضرورت کا احساس کیا حقیقی رہنمائے اسلام حسین ابن علیؑ نے، حسینؑ اس بات کا بیڑا اٹھا کر اٹھے۔ کہ جان جائے مگر امتِ رسولؐ کو عذاب الٰہی سے نجات دیدوں۔ اسلام کو زندہ کروں۔ اور مسلمانوں کو ہلاکتِ ابدی سے بچاؤں۔

انھوں نے اس مقصد کیلئے دنیا کے عظیم ترین مصائب کو برداشت کر کے کربلا کے دل دوز مرقع کو اپنے اور اپنے اعزا و اقارب کے خون سے ہمیشہ کے لئے رنگین کر دیا۔ اور تاریخ عالم کے ورق کو اپنی مظلومیت کے تذکرہ سے قیامت تک کو مرقع ماتم بنا گئے۔

انھوں نے یہ سب کس کے لئے کیا، ہمارے لئے، لیکن کن معنی سے؟ اس معنی سے کہ وہ اپنی اس عظیم قربانی کے ذریعہ سے شریعت اسلامیہ کا احیاء کر رہے تھے اور احکام شریعت کی تجدید ظلم واستبداد کی طاقتوں کو جو اسلام کی مٹانے والی تھی۔ فنا کر رہے تھے۔ اور احساسات اسلامی کو بیدار اور اسطرح وہ ہمیشہ کیلئے ایک قوم کی تشکیل کر رہے تھے۔ یعنی حیات ثانیہ دے رہے تھے۔ کہ جو نجات کی مستحق اور جنت میں جانے کے لائق ہو۔ اور شریعت اسلامیہ کی پاندی اور احکام مذہبی کی نگہداشت کا باعث، حقیقی طور پر امت مرحومہ کہنے کے قابل ہو۔ اسی اعتبار سے حسینؑ نجات دہندۂ امت تھے۔ اور اسی معنیٰ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ ہمارے لئے شہید ہوئے انکا مقصد یہ تھا کہ افراد اسلام سچے معنی میں مسلمان اور تعلیمات اسلام کا مکمل آئینہ اور پابندیٔ احکام شریعت اور اطاعت الٰہی کا نمونہ بن جائیں۔ ان کے نجات دہندہ ہونے کا کوئی ایسا مفہوم قرار دینا درست نہیں جو ان کے مقصد کو پامال کر دے اور افراد ملت میں پابندی احکام شریعت کے جذبہ کو فنا کی حدتک پہونچائے۔

توحید اور امام حسینؑ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

کارنامۂ حسینی یعنی مجاہدۂ کربلا کا اصل سرچشمہ وہی کلمہ توحید ہے جس کی اشاعت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں جسم مبارک پر پتھر کھائے اور اس کے تقاضوں کی تعمیل میں ان کے فرزند حسینؑ نے کربلا میں جسم اقدس پر تلواریں کھائیں۔

یہ لا الٰہ الا اللہ فقط ایک ورد اور وظیفہ تھوڑی تھا جو مسلمانوں کو سکھایا گیا ہو کہ وہ زبان پر جاری کر لیں اور بس۔ بلکہ اس کے معانی یہ تھے کہ اللہ کے مقابلے میں کسی دوسرے اقتدار کے قائل نہ ہو۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے کے سامنے سر نہ جھکاؤ اور اس کے قانون پر عمل کر کے معاہدے کے بعد جواز روئے فطرت بھی تم پر عائد تھا اور اب اقرار اسلام کے بعد اس نے رسمی شکل بھی اختیار کر لی ہے، اب کسی دوسرے کو غیر مشروط اطاعت کا عہد و پیمان جس کا نام ''بیعت'' ہے نہ کرو۔ کسی خطا کار کا کسی اللہ کے بندے سے بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ اس عہد و پیمان کی نفی ہے جو خالق کی جانب بر بنائے توحید عائد ہوتا ہے اور جس کی تعمیل ہر مسلمان یعنی ہر سچے انسان کا لازمی فریضہ ہے۔

وہ توحید ہی کا ایک تقاضہ ہے جس کے تحت یہ اصول قائم ہوا ہے۔ **لاطاعۃ للمخلوق فی معصیۃ الخالق**۔ یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے یہاں تک کہ قرآن مجید میں پیغمبرؐ خدا کی اطاعت کا بھی حکم دیا اور کہہ دیا گیا کہ ''**من یطع الرسول فقد اطاع اللہ** ۔ یعنی جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ یعنی مرکز اطاعت درحقیقت ایک ہی ہے۔ یہ تمہیں تصور نہ ہونا چاہئے کہ ہم اللہ کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کر رہے ہیں اور اسی سے

مسلمانوں کو سمجھنا چاہئے کہ وہ اولی الامر بھی جن کی اطاعت بعد رسولؐ فرض قرار دی گئی ہے ایسے ہی افراد ہو سکتے ہیں جن کا کوئی حکم خالق کے حکم سے کبھی متصادم نہ ہوتا ہو بلکہ جن کا ارادہ ومشیت بھی ہمیشہ مشیتِ خالق کا پابند رہتا ہو۔ اس لئے ان کی اطاعت اطاعتِ خالق سے الگ نہ ہو۔

اس بنا پر حضرت امام حسینؑ کے سامنے یزید کی بیعت کا سوال پیش، یہ فقط کوئی سیاسی مسئلہ نہ تھا بلکہ یہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعلیمِ توحید کی روشنی میں اسلام اور نفی اسلام کا سوال تھا۔ حقیقت میں یہ ایک یزید نہ تھا جو امام حسینؑ سے طلبگارِ بیعت ہو، بلکہ حضرت کے مقابل میں نمرود اور فرعون اور پھر ابوجہل وابوسفیان وغیرہ سب کی روحیں تھیں جو یزید کے پیکر میں بیعت یعنی غیر مشروط اطاعت کے عہد و پیمان کی طلبگار تھیں اور حسینؑ ابن علیؑ، ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور حضرت محمد مصطفیٰؐ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے نمائندہ ہوتے ہوئے غیر اللہ کی اس اطاعت سے انکار کر دینا اپنا فرضِ عین سمجھتے تھے، جس فرض کو انہوں نے ناقابلِ تصور مشکلات کے باوجود پورا کیا، اور اس طرح توحیدِ الٰہی کے اس پرچم کو بلند رکھا جسے ان کے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اونچا کیا تھا اور جس کے ان کے آباواجداد اور اب یہ خود محافظ تھے۔

ماخوذ از شہید اعظم نمبر سالانہ میگزین پیغام منشورۂ انجمن ہاشمی جائس، ۱۹۸۴ء، ص ۹

حکومت الٰہیہ کا سربراہ

اور نام نہاد حکومت اسلامیہ کا تاجدار

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جمہور مسلمین نے شروع سے حکومت کا رشتہ اللہ العالمین سے جدا کر کے اپنے ہاتھ میں لیا، اس لئے ان میں ''حکومت الٰہیہ'' کا تو تصور پیدا ہی نہ ہونا چاہئے تھا مگر اس دور میں بعض مصلحین ''حکومت الٰہیہ'' کا نام لے رہے ہیں۔ پھر بھی ان کا معیارِ تخیل آج تیرہ سو برس کے بعد اتنا اونچا نہیں جا سکتا کہ وہ اپنے دیرینہ روایات کو ٹھکرا کر حکومت الٰہیہ کا کوئی ایسا تصور کر سکیں جو اس کے پہلے ان کے دماغ میں کبھی جگہ حاصل نہیں کر سکا۔

ان لوگوں کے خیال کے مطابق حکومت الٰہیہ کی تشکیل کیوں کر ہوگی؟ اس طرح کہ مسلمانوں کے انتخاب سے ان کی حکومت کے ارکان مقرر ہوں۔ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب پر اصرار اسی لئے تھا کہ اس صورت میں جو مسلمان مجالس قانون ساز میں جائیں گے وہ دوسری جماعتوں کے خوش رکھنے پر مجبور نہ ہوں گے، بلکہ ہر معاملہ میں اسلامی مفاد کو ملحوظ رکھیں گے۔ مگر ان کے انتخاب کا طریقہ کیا ہوگا؟ وہی رائے شماری یعنی اجماع، یا کسی سلیکٹ کمیٹی کا انتخاب یعنی شوریٰ۔ یہ وہی طریقہ کار ہیں جو پہلے آزمائے جا چکے۔ یہ اور ان کے ساتھ دو اور طریقے استخلاف یعنی نامزدگی اور قہر وغلبہ انہی کو مسلمانوں کے بڑے بڑے دماغوں نے تقریباً پچاس برس کے الٹوں پلٹوں کے بعد آئین حکومت کی تشکیل کے لئے مقرر کیا ہے۔ اسی معیار پر اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں اور ان پر ایمان لانا اطاعت اولی الامر کے ذیل میں ضروری سمجھا گیا، مگر ان تمام طریقوں کو شکستہ کر دیا۔ ۶۱ھ میں حکومت الٰہیہ کے حقیقی سربراہ حسینؑ بن علیؑ نے جب کہ یزید کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے اور

اپنی بے پناہ مظلومیت سے تمام جمہور مسلمین سے تسلیم کرالیا کہ حسینؑ حق پر تھے اور یزید باطل پر تھا۔ تاریخی مطالعہ کا متفقہ نتیجہ یہ ہے کہ یزید میں وہ تمام طریقے مجتمع تھے جو اس کے پہلے ایک ایک کر کے حصول خلافت کے لئے کافی سمجھے گئے تھے۔

اجماع شوریٰ

کون نہیں جانتا کہ یزید کی بیعت تمام عالم اسلام میں ہر ہر ملک کے اندر کی جا چکی تھی۔ ہر ہر مرکزی مقام پر کوئی محدود کمیٹی نہیں بلکہ بڑی سے بڑی کانفرنس منعقد کر کے اقرار لیا گیا اور انصاف تو یہ ہے کہ عملی طور پر اتنا بڑا اجماع اس سے پہلے کسی خلافت پر بھی نہ ہوا تھا۔

استخلاف

وہ بھی ظاہر ہے کہ جب امیر معاویہ خلیفۂ جائز مانے جا چکے تھے تو ان کا نامزد کر دینا یزید کو سوا استخلاف کے اور کچھ نہیں ہے اور اس لئے اگر کوئی کانفرنس منعقد نہ ہوتی اور بیعت عام بھی نہ لی جاتی تو بھی صرف ان کا مقرر کر دینا کافی تھا۔

قہر وغلبہ

اس کا پوچھنا ہی نہیں کہ شام کی قہار شہنشاہی اس وقت روم وفارس کی سلطنتوں کا مذاق اڑا رہی تھی۔

پھر حسینؑ کا یزید کے مقابلہ میں کھڑا ہو جانا کیا ان تمام اصول کی مخالفت نہیں ہے جن کو خلافت کے جواز کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنے اقدام سے ثابت کر دیا کہ اجماع، شوریٰ، استخلاف اور قہر وغلبہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اصل چیز حکمراں کی ذاتی اہلیت اور اس کا استحقاق ہے۔ اگر یہ ہے تو حکومت جائز ہے، ورنہ نہیں۔

یزید کے افعال کیا تھے؟ وہ جن سے آج تک تاریخ اسلام کی پیشانی عرق انفعال سے تر ہے۔ تمام مورخین نے اس کی سیرت کی تصویر نہایت تاریک خط وخال میں کھینچی ہے۔ مغربی مورخین میں سے ایڈورڈ براؤن نے 'لٹریری ہسٹری آف پرشیا' ص ۲۲۶ میں لکھا ہے: ''وہ ایک بدویہ

ماں کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ صحرا کی کھلی ہوئی ہوا میں اس نے پرورش پائی۔ شکار کا بڑا ماہر و شیفتہ، ایک بلیغ شاعر اور عاشق جانباز، شراب اور دیگر لہو ولعب کی باتوں کا شیدا اور رقص وسرود کا دلدادہ، مذہب سے کوسوں دور تھا۔''

آسبرن نے لکھا ہے کہ تخت نشین ہونے سے قبل ہی یزید نے مومنین کی بڑی تذلیل کی تھی، وہ علانیہ شراب پیتا تھا، کتوں کا بہت شوق رکھتا تھا اور اسی طرح باز اور دوسرے اس طرح کے جانوروں کا بڑا شوقین تھا۔

ارونگ نے لکھا ہے کہ ''خوبیوں کے اعتبار سے وہ بہت ناقص تھا۔ اس میں شعریت کا خداداد مادہ موجود تھا۔ شام کے عیش ونعم میں رہنے کا اثر اس کے ریشمی لباس اور رقص وسرود کے اشتیاق سے ظاہر تھا لیکن وہ بہت ذلیل تھا۔ اس لئے کہ اس میں پست خیالی، کمینہ پن اور لالچ موجود تھی۔ وہ انتہائی شہرت پسند اور شراب اور فسق وفجور کا اس حد تک عادی تھا جو انسان کو ذلت کے انتہائی درجہ تک پہنچا دیتی ہے۔

جسٹس امیر علی لکھتے ہیں کہ یزید ظالم اور غدار تھا۔ اس کی خبیث طبیعت رحم وانصاف جانتی ہی نہ تھی۔ اس کی دلچسپیاں ویسی ہی پست تھیں جیسا کہ اس کے ساتھی پست اخلاق اور اوباش تھے۔ وہ مذہبی رہنماؤں کی یوں تذلیل کرتا تھا کہ وہ بندر پکڑ کر اسے علماء وفقہا کا لباس پہنا کر خوبصورت اور سجے ہوئے گدھے پر بٹھا کر جہاں خود جاتا وہاں لے جاتا۔''

علامہ دمیری نے بھی '**لغت فهد**' میں لکھا ہے کہ سب سے پہلے اس کو گھوڑے پر سوار یزید بن معاویہ نے کیا ہے (**حیوٰۃ الحیوان جلد ۲، صفحہ ۱۸۶**) دوسرے مقام پر لکھا ہے۔

''یزید نے ایک بندر کو گھوڑے پر بیٹھنے کی مشق کرائی تھی اور گھوڑ دوڑ میں بڑے بڑے شہسواروں سے مقابلہ کرایا جاتا تھا اور ایک مرتبہ وہ تمام شہسواروں سے سبقت لے گیا۔ یزید نے اس بارے میں شعر کہے جن کا مضمون یہ ہے کہ کوئی میری طرف سے کہہ دے اس بندر سے کہ اے ابوقیس جو ایک

گدھی کی پشت پر بیٹھ کر گھوڑوں سے آگے نکل گیا۔ تو جب اس پر سوار ہوا کر تو اس سے لپٹا رہا کر۔
کیونکہ اگر تو گر کر مر گیا تو اس گدھی سے کوئی باز پرس بھی نہ ہو سکے گی۔ (حیوٰۃ الحیوان جلد ۲ ص ۲۰۱)

ابن الفوطی نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ یزید نے اپنے بندر کی کنیت ابوقیس قرار دی اور اپنے ساغر کی بچی ہوئی شراب اسے پلایا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ بنی اسرائیل کا ایک بزرگ ہے جس نے گناہ کیا تھا اور مسخ ہو گیا۔ وہ اس کو ایک گدھی پر سوار کرتا تھا جو اسی مقصد کے لئے سدھائی گئی تھی اور گھوڑ دوڑ کے میدان میں اسے گھوڑوں کے ساتھ چھوڑ دیتا تھا۔ ایک روز وہ گدھی آگے بڑھ گئی تو یزید بہت خوش ہوا اور یہ شعر پڑھے......

''اے ابوالقیس اس مہار سے لپٹا رہا کر، کیونکہ اگر تو گر پڑا تو اس پر کوئی ذمہ داری نہ ہوگی۔ اس گدھی نے یہ کارنمایاں کیا ہے کہ وہ تمام گھوڑوں سے آگے بڑھ گئی۔''

یہ تو اس کے لغو افعال تھے۔ اس کے علاوہ شراب خواری اس کی ضرب المثل تھی۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے نام ہی اس کا 'سکران' یعنی بدمست رکھ لیا تھا۔ (الاخبار الطوال، ص ۲۶۱)

وہ کسی موقع پر مصلحتاً بھی اس عادت کو ترک کرنے پر تیار نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ جب ولی عہدی کے دور میں معاویہ کے حکم سے وہ مکہ اور مدینہ میں اپنا اثر و رسوخ جمانے کے لئے حج کو گیا تو دینداروں میں پہنچ کر بھی مصاحبوں کے جمگھٹوں میں شراب کا دور ضرور چلا۔ (کامل جلد ۴، ص ۶۳)

واقدی نے عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ خدا کی قسم ہم کو یزید کی حکومت میں یہ خوف ہو گیا تھا کہ اب کی آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ وہ ایسا شخص تھا کہ جو اپنی ماؤں اور اپنی بیٹیوں اور بہنوں تک کو نہ چھوڑتا تھا اور شراب آزادی سے پیتا تھا اور نماز کو ترک کرتا تھا۔

(صواعق محرقہ، ص ۱۲۵، مطبوعہ مصر)

اتنا ہی نہیں کہ وہ عملی حیثیت سے ایک لاابالی اور گنہگار شخص ہو بلکہ اس کے خیالات بھی ایسے تھے۔ وہ اپنے افعال پر منفعل نہ ہوتا تھا بلکہ ان پر نازاں تھا۔ اس کا مظاہرہ اس کے دیوان کے ان

اشعار سے ہوتا ہے جن میں اس نے احکام شریعت کا مذاق اڑایا بلکہ قرآن و حدیث اور خدا و رسولؐ کے ساتھ بھی تمسخر کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر دو خط شروع میں اس طرح چلیں کہ ان میں آپس میں ذرا ایک دوسرے سے انحراف ہے تو بالکل ابتدا میں بہت ممکن ہے کہ اکثر نگاہوں کو اس کا احساس نہ ہو کیونکہ فرق کم ہے لیکن جب یہ بڑھتے بڑھتے اس حد تک پہنچے کہ فاصلہ درمیان کا بہت زیادہ ہو جائے تو ہر ایک کو مان لینا پڑے گا کہ بیشک یہ خط دوسرے کے رخ سے بالکل جدا ہے۔

یونہی سمجھئے کہ وہ نظام جو رسولؐ کے بعد حکومت اسلامی کا قرار دیا گیا اور جس کا تعلق اللہ سے سمجھا جاتا تھا شروع میں کم نظروں نے محسوس کیا کہ یہ شریعت اسلام اور اصول حق سے منحرف ہے لیکن وہی خط جب آگے بڑھ کے تیسری منزل پر پہنچا تو انحراف اتنا ہوا کہ مسلمانوں کے اندر کھلی ہوئی بغاوت پیدا ہوئی جو قتل خلیفہ تک منجر ہوئی اور وہی بڑھ کر جب معاویہ تک پہنچا تو انحراف اتنا نمایاں تھا کہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم میں خود دو گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو معاویہ کی تعریف کرتا ہے اور ایک وہ جو نجات میں بھی شک رکھتا ہے، اور کم از کم یہ دور خلافت راشدہ کے حدود سے تو متفقہ طور پر ہی خارج رہا، اور جب وہی نظام بڑھ کر یزید تک آیا تو سب مسلمان اسے متفقہ طور پر غلط سمجھنے لگے اور جمہور کے لئے اب یہ ممکن نہ رہا کہ وہ اس کو صحیح سمجھیں اور اس کی ظاہر بظاہر حمایت کریں۔ کیا اس کے بعد بھی اس میں شبہ رہ جاتا ہے کہ یہ نظام شروع ہی سے غلط تھا؟

حسینؑ نے کربلا میں اپنے زندۂ جاوید کارنامہ سے تمام خود ساختہ خلافت کے اصول کو یک قلم شکست دے دی اور ثابت کر دیا کہ صحیح حکومت اسلامیہ وہی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہو اور وہی ہوگی جو غلطیوں سے بری یعنی معصوم ہوگی۔

(ماخوذ از 'سرفراز' لکھنؤ مارچ ۱۹۷۰ء، محرم نمبر ۱۳۹۰ھ، صفحہ نمبر ۸۹)

خلافت یزید کی خشت اول

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ابو جعفر محمد بن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ نے اپنی تاریخ الامم و الملوک،، میں جو تاریخ طبری کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۶ھ کے حوادث میں لکھا ہے: وفیھا وما معاویۃ الناس الیٰ بیتہ ابنہ یزید ومن بعد ولا وجعلہ ولی العھد۔ اس سال معاویہ نے لوگوں کو اپنے فرزند یزید کی بیعت کی طرف دعوت دی اور اسے اپنا ولی عہد بنایا۔

پھر عنوان قائم کیا ہے، ذکر السبب فی ذالک، اس کا سبب کیا ہوا تھا؟ اس ذیل میں وہ کہتے ہیں: حدثنی الحارث قال حدثنا علی بن محمد قال حدثنا ابو اسمٰعیل الھمدانی وعلی بن مجاھد ، قال قال الشعبی قدم انعیرۃ علی معاویۃ واستعفاہ وشکا الیہ الضعف فاعفاہ وراد ان یولی سعید بن العاص و بلغ کاتب لمغیرۃ ذالک فاتیٰ سعید بن العاص فاخبرہ وعندہ رجل من اھل الکوفۃ یقال وبیعۃ او الربیع من خزاعۃ فاتی المغیرۃ فقال یا مغیرۃ ما اریٰ امیر المومنین الا قد قلاک رایت ابن خنیس کاتبک عند سعید بن العاص یخبرہ ان امیر المومنین۔ ان الکوفۃ قال المغیرۃ افلا یقول کما قال۔

ام غاب ربک فاعترتک خصاصۃ ولعل وبک ان یعود موید ا رویدا ادخل علیٰ یزید فدخل علیہ فعوض لہٗ بالبیعت فادذالک یزید الیٰ ابیہ فردمعاویۃ المغیرۃ الی الکوفۃ فامرہٗ بعمل فی بیعتہ یزید تشخص المغیرۃ الی الکوفۃ فاتاہ کاتبہ ابن خنیس فقال واللہ ما غششتک وخنتک ولا کرھت

ولا یتک ولکن سعید کانت لہ عندی ید ویلاءٍ فشکرت ولک لہ فرضی عنہ واعادہ الی کتابتہ وعمل المغیرۃ فی بیعۃ یزید وانہ ذالک وفداً الیٰ معاویۃ۔

مغیرہ بن شعبہ کی شخصیت تاریخ اسلام میں کوئی اجنبیت نہیں رکھتی۔ احکام شرعیہ کی پابندی سے جو ان کی بے نیازی تھی وہ زمانہ خلیفہ دوم میں ان الزامات سے ظاہر ہے جو ان پر قائم کئے گئے تھے۔ وہ تو کہئے کہ چار میں سے ایک گواہ خود حاکم کے اشارہ سے متزلزل ہو گیا، ورنہ وہ سنگسار کئے جا چکے ہوتے اور خلافت یزید کی داغ بیل ڈالنے کے لئے زندہ نہ ہوتے۔ اس کے ساتھ سیاستدانی میں ان کی شخصیت مسلم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں دھاۃ العرب یعنی کامل سیاستداں عرب کے چار تھے: ایک امیر شام معاویہ بن ابی سفیان، دوسرے عمر بن العاص، تیسرے مغیرہ بن شعبہ یہ تینوں ایک طرف تھے اور چوتھے قیس بن سعد بن عبادہ انصاری یہ ایک حضرت علیؑ بن ابی طالب کی طرف تھے۔

مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کے حاکم تھے۔ طبری کا بیان ہے کہ مجھ سے حارث نے بیان کیا ان سے علی بن محمد نے ان سے ابو اسمٰعیل ہمدانی اور علی بن مجاہد نے اور ان دونوں سے شعبی نے بیان کیا کہ مغیرہ معاویہ کے پاس آئے اور ضعف پیری کا عذر کرتے ہوئے حکومت سے معافی طلب کی۔

صورت واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ استغاثہ حقیقتاً نمائشی طور پر ایک سیاسی نازکی کی حیثیت رکھتا تھا جیسے اکثر قومی لیڈران اداروں سے کہ جن میں ان کا اقتدار ہوتا ہے کبھی کبھی صرف اس لئے استعفیٰ دے دیا کرتے ہیں کہ ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو جائے۔ مغیرہ کا اندازہ بظاہر یہ تھا کہ امیر معاویہ ان کے استعفے کو سنتے ہی پریشان ہو جائیں گے اور خوشامد کرنے لگیں گے کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لے لیجئے اور حکومت کوفہ کو ترک نہ کیجئے مگر یہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔، امیر شام جیسے پہلے سے منتظر تھے اور موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ انہوں نے ان کا استعفیٰ فوراً منظور کر لیا اور ارادہ کیا کہ سعید

بن عاص کو حاکم کوفہ بنادیں۔ظاہر ہے کہ جب شہنشاہ وقت کی نظر کسی سے برگشتہ ہوجائے تو پھر اس کے دست و بازو بھی اس کے ساتھ وفاداری پر قائم نہیں رہتے۔ چنانچہ یہ آثار ظاہر ہونا تھے کہ مغیرہ کے مخصوصین کا بھی رنگ بدل گیا یہاں تک کہ ان کا خاص کاتب ابن خنیس سعید بن عاص کے پاس مبارک باد دینے کے لئے گیا۔اس وقت وہاں اہل کوفہ میں سے ربیعہ یا ربیع نامی قبیلہ خزاعہ کا ایک شخص موجود تھا۔وہ مغیرہ کے پاس آیا اور کہا مجھے ایسا معلوم ہوا ہے کہ خلیفہ اسلام آپ سے ناراض ہوگئے ہیں۔کیونکہ میں نے آپ کے کاتب ابن خنیس کو سعید بن عاص کے پاس دیکھا ہے۔وہ انہیں خوشخبری دے رہا تھا کہ خلیفہ نے انہیں کوفہ کا حاکم قرار دیا ہے۔پس یہ سننا تھا کہ مغیرہ کو اپنے اقتدار کے قائم رکھنے کی فکر ہوئی اور اس کے لئے وہ پہلے سے اپنے ذہن میں منصوبہ بنا چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے تو ایک شعر پڑھا جس کا مطلب یہ تھا کہ خدا مالک ہے شاید وہ اس کے بعد اپنی تائید شامل حال کردے۔اور پھر کہا کہ ٹھہرو ذرا مجھ کو یزید کے پاس ہو آنے دو۔اس کے بعد وہ یزید کے پاس گئے اور وہاں جا کر معاویہ کی ولیعہدی کے سبز باغ دکھائے یزید نے اس کا ذکر اپنے باپ سے کیا۔اور کہا کہ مغیرہ اس مہم کی کامیابی کا ذمہ لے رہے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ معاویہ نے مغیرہ کو کوفہ کی حکومت پر واپس کردیا اور انہیں یزید کی بیعت کے لئے فضا کو سازگار بنانے کا کام سپرد کیا اور مغیرہ کوفہ کی طرف واپس آگئے۔مغیرہ کے کاتب نے آکر معافی مانگی اور قسمیں کھا کر کہا کہ مجھے آپ کی بدخواہی منظور نہ تھی اور نہ میں نے آپ کی خیانت کی۔نہ میں آپ کی حکومت کو ناپسند کرتا ہوں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ سعید بن عاص کا مجھ پر پہلے سے ایک احسان ہے۔میں نے ان کے اظہار تشکر کے طور پر یہ خوشخبری ان تک پہنچائی تھی۔مغیرہ اس سے خوش ہوگئے۔اسے کاتب کے عہدے پر بحال کردیا۔اور پھر یزید کی بیعت کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔اور اس بارے میں معاویہ کے پاس ایک وفد روانہ کیا۔

اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ یزید کی ولیعہدی کی ابتدائی تحریک مفاد دینی کے ساتھ کسی مفاد ملکی

کے لحاظ سے بھی نہ تھی بلکہ صرف ایک شخص کی طرف سے اپنے ذاتی مفاد کے لئے ایک چال کے طور پر اس کا آغاز ہوا جس کے نتائج کی لپیٹ میں قیامت تک کے لئے تمام امت اسلامیہ کو آجانا پڑا۔ اسی بنا پر حسن بصری کا قول تھا جسے حافظ جلال الدین سیوطی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا معاملہ دو آدمیوں نے خراب کیا ایک عمرو بن العاص جب اس نے معاویہ کو قرآن نیزوں پر بلند کرنے کا مشورہ دیا اور دوسرے مغیرہ بن شعبہ۔

(تاریخ الخلفاء مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۳۹)

[ماخوذ از پیام اسلام لکھنؤ، محرم نمبر ۱۳۷۹ھ/جولائی ۱۹۵۹ء]

مقتلِ ابومخنف کا تفتیشی مطالعہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

ابومخنف لوط بن یحییٰ بلاشبہ واقعۂ کربلا کی تاریخ کا قدیم ترین مصنف ہے چنانچہ چوتھی صدی ہجری کی قدیم کتاب ''فہرست ابن ندیم'' میں بھی اس کے تصانیف میں ''کتاب مقتل الحسین علیہ السلام'' کا ذکر موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی اسلامی تاریخ کے اہم واقعات پر اس کے کثیر التعداد تصانیف کا ذکر ہے، جن میں واقعہ کربلا اور اس کے اسباب ونتائج کے سلسلہ میں حسبِ ذیل کتابوں کے نام ہیں:

کتاب الجمل، کتاب صفین، کتاب مقتل علیؑ، کتاب مقتل حجر بن عدی، کتاب مقتل محمد بن ابی بکر والاشتر ومحمد بن ابی حذیفہ، کتاب الشوریٰ فی قتل عثمان، کتاب وفاۃ معاویہ وولایۃ ابنہ یزید ووقعۃ الحرّہ، کتاب المختار بن ابی عبید، کتاب سلیمان بن صرد وعین الوردۃ، یہ کتابیں تیسری اور چوتھی صدی تک بلاشبہ موجود تھیں، چنانچہ مسعودی، طبری اور ابوحنیفۂ دینوری ایسے سنی مورخ اور اسی دور کے جناب شیخ مفید علیہ الرحمہ شیعہ مورخ سب نے ابومخنف سے واقعات نقل کئے ہیں۔

ابومخنف کا نام ونسب ''لوط بن یحییٰ بن سعید بن مخنف بن سلیم ازدی'' ہے۔ یہ مخنف بن سلیم جو ابومخنف کے پردادا ہیں، صحابۂ رسولؐ میں سے جناب امیر علیہ السلام کے اصحاب میں تھے جیسا کہ ابن الندیم نے لکھا ہے:

كَانَ مُخْنَفُ بْنُ سُلَيْمٍ مِنْ أَصْحَابِ عَلِيٍّ - وَرَوَىٰ عَنِ النَّبِيِّ ۔

مخنف بن سلیم حضرت علی ؑ کے اصحاب میں سے تھے اور انھوں نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی روایت کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ قسم اول میں ان کا نسب اس طرح لکھا ہے: مخنف بن سلیم بن حارث بن عوف بن ثعلبہ بن عامہ بن ذہل بن ماذن بن ذبیان بن ثعلبہ ازدی غامدی۔

عوام کے ایک طبقہ میں ابومخنف کے متعلق یہ عجیب افواہی روایت رہی ہے کہ وہ واقعہ کربلا میں ابن زیاد کی فرستادہ فوج میں واقعہ نگار کی حیثیت سے شامل تھا، اس کی قطعاً کوئی اصلیت نہیں ہے بلکہ وہ واقدی اور مدائنی وغیرہ کی طرح کا ایک مورخ ہے۔ چنانچہ ابن ندیم نے ان ہم پلہ مورخین کے موازنہ میں علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابومخنف عراق اور اس کے حالات وفتوحات میں دوسروں سے امتیاز رکھتا ہے، اور مدائنی خراسان اور ہندوستان اور اس کی تاریخ میں بڑھا ہوا ہے اور واقدی حجاز اور سیرت نبویؐ کے حالات میں اور شام کے فتوحات کے بارے میں، یہ سب یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔

اس کے دوسرے بعض معاصرین کی بھی واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں کتابیں ان کے حالات میں درج ہیں لیکن جیسا کہ لکھا گیا ابومخنف نے اس واقعہ اور اس کے اسباب ونتائج کے متعلق متعدد تصانیف سپردِ قلم کئے اور بلاشبہ واقعہ کربلا کے کسی بھی تاریخ نگار کے لئے اس کے تصانیف کی وہ اہمیت ہے جو اس کے بعد کی لکھی ہوئی تاریخوں کی نہیں ہوسکتی، مگر دست بردِ زمانہ نے اس کے کثیر التعداد تصانیف میں سے جو واقعات اسلامی پر تھے، ایک کو بھی ہم تک پہنچنے نہ دیا۔ اور ہمارے علم میں اس وقت روئے زمین پر کہیں اس کے ان تصانیف کا پتہ نہیں ہے۔

صرف ایک کتاب ''مقتل ابومخنف'' کے نام سے خاص واقعۂ کربلا کے متعلق دنیا میں پائی جاتی ہے اور اگر وہ واقعی مقتل ابومخنف ہے جو اس کے قلم سے معرض تحریر میں آیا تھا تو اس کی عظیم تاریخی اہمیت ہوگی، چنانچہ اس کی اسی شہرت کی وجہ سے اسے کئی مرتبہ ایران میں طبع کیا گیا۔ علٰحدہ بھی اور بحار الانوار علامہ مجلسی جلد عاشر کے ضمیمہ کے طور پر بھی۔ اور ایران میں کسی آقا محمد طاہر بن محمد باقر الموسوی نے بھی اس کا فارسی ترجمہ کیا جس میں دو چار جگہ کچھ مختصر سا نقد وتبصرہ بھی ہے اور حاشیہ پر

اصل متن بھی درج ہے۔ یہ ۱۳۲۲ھ میں طبع ہوا۔ اس کا نام "مِفْتَاحُ الْبُکا" ہے۔

حیدرآباد کے جناب سید حسن علی صاحب فغاںؔ مرحوم نے اس فارسی ترجمہ کو سامنے رکھ کر اس کا اردو میں ترجمہ کیا، جو غالباً ابھی طبع نہیں ہوا ہے۔

مگر سب سے پہلے چونکانے والی یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کے جن مورخین نے ابومخنف کے حوالہ سے جو واقعات درج کئے ہیں، وہ اس مقتل ابومخنف میں نہیں ہیں اور اس مقتل میں جو باتیں ہیں وہ اس دور کے مورخین نے اپنی کتابوں میں درج نہیں کی ہیں۔

اس پہلو پر گذشتہ صدی میں جب کہ یہ مقتل رائج ہو چکا تھا بعض مولفین کو توجہ ہوئی، چنانچہ ملا آقا دربندی نے اسرار الشہادت میں اس مقتل سے کچھ روایات کو درج کرنے کے بعد لکھا:

مَا نَقَلْنَا اَوَّلاً عَنِ الْكِتَابِ الصَّغِيْرِ لِاَبِي مَخْنَفٍ اَمَّامَا نَقَلَهٗ عَنْهُ هٰؤُلَاءِ الْفُضَلَاءِ فَلَعَلَّهٗ هُوَ الْمَذْكُوْرُ فِي كِتَابِهِ الْكَبِيْرِ وَلَمْ يَحْضُرْنِي الْاٰنَ۔

جو روایات ہم نے پہلے درج کئے وہ ابومخنف کے چھوٹے مقتل سے ماخوذ ہیں، اور سابق کے حضرات نے جو روایات درج کئے ہیں وہ شاید اس کی بڑی کتاب میں ہوں گے، اور وہ اس وقت میرے سامنے نہیں ہیں۔

حالانکہ اول تو جن مصنفین کی کسی موضوع پر دو کتابیں ہوتی ہیں چھوٹی اور بڑی، ان کے حالات میں فہرست تصانیف میں اس کا ذکر موجود ہوتا ہے جس کی نظیریں بہت ہیں۔ مگر ابومخنف کے حالات میں کسی نے نہیں لکھا ہے کہ اس کی مقتل الحسینؑ کے نام سے دو کتابیں ہیں، ایک مختصر اور ایک طولانی۔

پھر یہ کہ مختصر اور طولانی کا فرق صرف اتنا ہونا چاہئے کہ جو واقعات ان علماء نے درج کئے، ان میں سے بعض اس مختصر میں نہ ہوتے، نہ کہ اس مختصر میں ایسی بہت سی باتیں درج ہوتی جو اس بڑی کتاب میں نہیں ہیں، اور اس لئے دوسرے علماء نے اپنی کتابوں میں انھیں نہیں لکھا ہے جیسا کہ ہمارے بعد کے تفتیشی جائزہ سے ظاہر ہوگا۔

پھر یہ کہ چونکہ ملا آقا دربندی کے زمانہ میں دنیا کے باہمی مواصلات کے ذرائع کم تھے، اس لئے انھوں نے بنظر احتیاط اپنی کوتاہی معلومات کا اندیشہ کرتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ وہ بڑا مقتل میرے سامنے نہیں ہے، لیکن اب جب کہ ذرائع مواصلت اطراف دنیا کے درمیان اتنے ہو گئے ہیں کہ تقریباً تمام بڑے بڑے کتب خانوں کے موجودہ ذخیروں کا علم ایک مصنف کو اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب کہاں موجود ہے مگر ہمارے علم میں اس مقتل ابومخنف کے علاوہ جو ہاتھوں میں موجود ہے دنیا میں مقتل ابومخنف نام کی اس بڑی کتاب کا کہیں بھی پتہ نہیں ہے۔

اسی بناء پر ہمارے مشائخ روایت میں سے آقا حاج شیخ قمی علیہ الرحمہ نے جو اپنے استاد علامہ نوری کے بعد کے ان گنے چنے وسیع النظر محدثین میں سے تھے جنھیں اس دور کے مجلسی کی حیثیت حاصل تھی، یہی رجحان ظاہر کیا ہے کہ اس مقتل ابومخنف کی جو اس وقت رائج ہے کوئی تاریخی حیثیت نہیں ہے۔

میں بھی شروع سے یہی خیال رکھتا ہوں جسے اپنی بعض کتابوں میں لکھ بھی چکا ہوں۔

کچھ عرصہ قبل غور سے بالاستیعاب اس مقتل کو شروع سے آخر تک پڑھا تو اس خیال میں مزید قوت پیدا ہوگئی کہ وہ مقتل ابومخنف جس سے قدیم مورخین نے روایات نقل کئے کوئی اور تھا اور اسے اب بس اُن تاریخوں کی مدد سے کسی حد تک مرتب کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا کتابی صورت میں اس وقت کہیں پتہ نہیں ہے۔

اور یہ جو مقتل ابومخنف کے نام سے موجود ہے، بالکل بے اصل چیز ہے۔ اور جیسا کہ ابھی اس کے مندرجات کے سامنے آنے سے ظاہر ہوگا۔ اسے قبول عام بھی حاصل نہیں ہوا ہے اور بعض اجزا اس کے دین یا تاریخ کے قطعی حقائق سے متصادم ہیں جنھیں رد کرنا لازم ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے مندرجات:

[۱]

سلیمان بن صُرد خزاعی، مسیب بن نجبہ اور سعید بن عبداللہ حنفی کا بعد تکمیل صلح امام حسنؑ کے پاس

آنا اور آپ کے طرزِ عمل سے اختلاف ظاہر کرنا۔ اس کے بعد ہے خود اُن اشخاص کی زبانی:

فَخَرَجْنَا مِنْ عِنْدِهٖ وَدَخَلْنَا عَلٰی اَخِيْهِ الْحُسَيْنِ علیہ السلام وَهُوَ يَاْمُرُ غِلْمَانَهُ بِالْخُرُوْجِ اِلَی الْمَدِيْنَةِ ثُمَّ جَائَنَا وَجَلَسَ مَعَنَا سَلَّمَ عَلَيْنَا فَرَدَدْنَا عَلَيْهِ السَّلَامَ فَرَاٰی فِیْ وُجُوْهِنَا الْكَاٰبَةَ وَالْحُزْنَ فَسَبَقْنَا بِالْكَلَامِ وَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ كَمَا هُوَ اَهْلُهٗ اِنَّ اَمَرَاللّٰهِ كَانَ قَدَرًا مَقْدُوْرًا اِنَّهٗ كَانَ اَمْرًا مَقْضِيًّا وَاللّٰهِ لَوِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَی الَّذِیْ كَانَ اَنْ لَّا يَكُوْنَ لَمَا اسْتَطَاعُوْا وَلَقَدْ كُنْتُ طِيْبَ النَّفْسِ اَنْ لَّا يَكُوْنَ الَّذِیْ كَانَ حَتّٰی عَزَمَ عَلٰی اَخِی الْحَسَنِ علیہ السلام وَنَاشَدَنِیْ اللّٰهُ اَنْ لَا اَنْفُذَ اَمْرًا اَوْ لَا اُحَرِّكَ سَاكِنًا فَاَطَعْتُ وَكَاَنَ يَجْدَعُ جَادِعٌ اَنْفِیْ بِالسَّكَاكِيْنَ وَيَشْرَحُ لَحْمِیْ بِالْمَنَاشِيْرِ قَاطِعَةً كُرْهًا وَقَدْ كَانَ صُلْحًا مَيْشُوْمًا وَبَيْعَةٌ كُنْتُ لَهَا كَارِهًا۔

اس کے بعد ہم آپ کے پاس سے باہر نکلے اور اب آپ کے بھائی امام حسینؑ کے پاس آئے درآنحالیکہ آپ اپنے غلاموں کو مدینہ کی طرف روانگی کے متعلق ہدایات فرما رہے تھے، جس کے بعد آپ ہمارے پاس تشریف لائے اور سلام وجواب سلام کے بعد ہمارے پاس بیٹھے تو آپ نے ہمارے چہروں سے رنج وملال محسوس کیا، تو خود کلام میں ابتدا فرمائی۔ اور کہا کہ بہر حال اللہ کے لئے حمد ہے جو اس کے شایان شان ہے، اللہ کا حکم فیصلہ تقدیر کی حیثیت رکھتا ہے اور جو کچھ اس وقت ہوا ہے وہ بھی قضائے الٰہی کا نتیجہ ہے۔ بخدا تمام آدمی اور جنات مل کر کوشش کرتے کہ جو ہوا وہ نہ ہو تو وہ ایسا نہ کر سکتے، اور میری خوشی یہ تھی کہ جو ہوا یہ نہ ہو مگر بھائی حسنؑ نے مجھے قسم دی کہ میں کوئی بات نہ کروں اور ذرا بھی جنبش سے کام نہ لوں تو میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی، حالانکہ مجھے محسوس یہ ہوتا تھا کہ کوئی میری ناک چھریوں سے کاٹ رہا ہے اور میرے گوشت کو کوئی آروں سے چیر رہا ہے، پھر بھی میں نے مجبوراً ان کا کہنا مانا اور یہ بڑی بدبختیانہ صلح تھی اور ایسی بیعت تھی جسے میں قطعی ناپسند کرتا تھا۔

ہم نے اپنی کتابوں میں قطعی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ امام حسینؑ بھی صلح امام حسنؑ سے متفق

تھے، چنانچہ آپ وفات امام حسنؑ کے بعد بھی دس برس تک اسی صلح کے جادے پر قائم رہے۔

[۲]

معاویہ کی موت کے وقت یزید شکار کے لئے گیا ہوا تھا اور اسے شکار گاہ میں اس کی اطلاع ہوئی۔ مگر اس مقتل میں ہے کہ:

كَانَ يَزِيْدُ غَائِبًا عَنْهُ وَذُكِرَ اَنَّهٗ كَانَ وَالِيًا عَلٰی حِمَّصٍ۔

یزید وہاں موجود نہ تھا اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ حمص کا گورنر تھا۔

اس کے بعد لکھا ہے:

وَدَخَلَ يَزِيْدُ دَارَهٗ لَمْ يَخْرُجْ اِلَی النَّاسِ اِلَّا بَعْدِ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الرَّابِعُ خَرَجَ اَشْعَثُ اَغْبَرُ فَجَلَسَ فَلَمْ يَدْرُوْا يُعَزُّوْنَهٗ اَمْ يُهَنِّئُوْنَهٗ۔

اور یزید اپنے گھر میں چلا گیا اور تین دن سے پہلے گھر کے اندر سے نہیں نکلا۔ جب چوتھا دن ہوا تو وہ نکلا اس طرح کہ بال پریشان تھے اور گرد وغبار پڑا ہوا تھا۔ لوگوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ تعزیت ادا کریں یا مبارکباد دیں۔

اس کے بعد ہے:

ثُمَّ دَخَلَ عَلَيْهِ الضَّحَّاكُ بْنُ قَيْسٍ دَفَعَ الْوَصِيَّةَ فَلَمَّا اَتٰی اِلٰی اٰخِرِهَا بَكٰی حَتّٰی غُشِّیَ عَلَيْهِ۔

پھر ضحاک بن قیس اس کے پاس آیا اس نے معاویہ کا وصیت نامہ دیا۔ اسے پورا پڑھ لیا تو وہ اتنا رویا کہ اسے غش آ گیا۔

یہ تمام باتیں تاریخی حیثیت سے عجائبات میں داخل ہیں۔

[۳]

ولید نے جب بیعت یزید کا مطالبہ امام حسینؑ کے سامنے پیش کیا تو اتنا درست ہے کہ حضرت

نے فرمایا کہ میری خفیہ بیعت پر تو راضی نہ ہوگے جب تک اس کا اعلان نہ ہو، اس نے کہا بیشک۔ آپ نے فرمایا ''پھر ابھی کیا ہے؟ جب مسجد میں لوگوں کو جمع کرنا اور سب سے بیعت کا مطالبہ کرنا تب مجھ سے بھی کہنا۔ پھر جو مناسب جواب ہوگا، وہ جواب دیا جائے گا۔''

مگر اس مقتل میں یہاں پر یہ فقرہ زائد ہے کہ:

اِنْ خَرَجْتَ اَيُّهَا الْاَمِيْرُ اِلَى النَّاسِ وَدَعَوْتَهُمْ اِلَى الْبَيْعَةِ كُنْتُ اَوَّلَ مُبَايِعٍ۔

جب باہر نکلئے گا اے امیر! تمام لوگوں کے مجمع میں اور انھیں بیعت کی دعوت دیجئے گا تو میں سب سے پہلے بیعت کرنے والا ہوں گا۔

اس فقرہ کی نسبت امام کی طرف قطعاً درست نہیں ہے۔

[۴]

جناب مسلمؑ سے بیعت کرنے والے اٹھارہ ہزار مشہور ہیں۔ بعض کتابوں میں بارہ ہزار کی تعداد ہے۔ مگر اس مقتل میں ہے:

بَايَعَهُ فِيْ ذٰلِكَ الْيَوْمَ ثَمَانُوْنَ اَلْفَ رَجُلٍ۔

اسی دن اسّی ہزار آدمیوں نے ان کی بیعت کی۔

[۵]

ص ۱۴ جناب مسلمؑ جب ہانی کے مکان میں تھے تو برابر لوگوں کی بیعت کا سلسلہ آپ سے جاری تھا اور تمام لوگ اس وقت تک بیعت پر قائم تھے جب تک کہ ہانی گرفتار ہوئے ہیں۔ اور آپ ابن زیاد سے جنگ کے لئے نکلے ہیں۔ لوگوں کا آپ کی بیعت سے انحراف کرنا اور آپ کو تنہا چھوڑنا ایک دن کی جنگ کے بعد ہے۔

مگر اس مقتل میں ابن زیاد کے کوفہ میں داخلہ کے بعد ہی ہے کہ ابن زیاد نے پہلا خطبہ پڑھا:

فَلَمَّا سَمِعَ اَهْلُ الْكُوْفَةِ جَعَلُوْا بَعْضُهُمْ يَنْظُرُ بَعْضًا وَيَقُوْلُوْنَ مَالَنَا وَالدُّخُوْلُ عَلَى السَّلَاطِيْنِ فَنَقَضُوْا بَيْعَةَ الْحُسَيْنِ عليه السلام وَبَايَعُوْا يَزِيْدَ بِلَا دِرْهَمٍ وَلَا دِيْنَارٍ قَالَ اَبُوْ مِخْنَفٍ وَكَانَ مُسْلِمُ بْنُ عَقِيْلٍ قَدْ اَصْبَحَ کی دار القوم مو کو عالم يَخْرُجُ لِلصَّلٰوةِ فَلَمَّا كَانَ وَقْتُ الظُّهْرِ خَرَجَ اِلَى الْمَسْجِدِ فَاَذَّنَ وَقَامَ وَصَلّٰى وَحْدَهٗ وَلَمْ يُصَلِّ مَعَهٗ اَحَدٌ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ صَلٰوتِهٖ فَاِذَا هُوَ بِغُلَامٍ فَقَالَ يَا غُلَامُ مَا فَعَلَ اَهْلُ هٰذَا الْمِصْرِ فَقَالَ يَا سَيِّدِيْ نَقَضُوْا بَيْعَةَ الْحُسَيْنِ بَايَعُوْا يَزِيْدَ فَلَمَّا سَمِعَ كَلَامَ الْغُلَامِ صَفَّقَ يَدًا عَلٰى يَدٍ وَخَرَجَ يَخْتَرِقُ الشَّوَارِعَ حَتّٰى بَلَغَ مَحَلَّةَ بَنِيْ خُزَيْمَةَ فَوَقَفَ هُنَاكَ بِاِزَاءِ بَيْتٍ شَاهِقٍ فَخَرَجَتْ مِنْ ذٰلِكَ الْبَيْتِ جَارِيَةٌ فَقَالَ لَهَا لِمَنْ هٰذِهٖ فَقَالَتْ لِهَانِىْ بْنِ عُرْوَةَ۔۔۔الخ

تو جب اہل کوفہ نے سنا، ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور کہنے لگے ہمیں بادشاہوں کے معاملات میں واقعی دخل دینے کی کیا ضرورت! اور سب نے امام حسینؑ کی بیعت توڑ دی۔ اور بغیر کسی روپے پیسے کے یزید کی بیعت کر لی اور مسلمؑ بن عقیل ان لوگوں کے گھر میں جن کے یہاں تھے، بیمار ہو گئے تھے، اس لئے نماز کے لئے برآمد نہیں ہوئے تھے اب جو ظہر کا وقت آیا اور وہ مسجد کی طرف نکلے تو اذان دی اور اقامت کہی اور اکیلے نماز پڑھی اور کسی نے ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھی، تو جب وہ اپنی نماز سے فارغ ہوئے، تو ایک لڑکا سامنے آیا، انھوں نے پوچھا ارے بچے، یہ اس شہر والوں نے کیا کیا؟ کہا حضور! سب نے حضرت امام حسینؑ کی بیعت توڑ دی اور یزید سے بیعت کر لی۔ اس لڑکے سے یہ بات سن کر مسلمؑ ہاتھ ملنے لگے۔ اور نکلے سڑکوں کو طے کرتے ہوئے یہاں تک کہ محلہ بنی خزیمہ میں پہنچے تو وہاں ایک عالیشان مکان نظر آیا، جس کے سامنے وہ ٹھہر گئے، تو اس مکان سے ایک کنیز باہر نکلی، انھوں نے پوچھا کہ یہ مکان کس کا ہے؟ اس نے کہا ہانی بن عروہ کا۔

اس طرح جو صورت حال طوعہ کے گھر تک پہنچنے کی تھی، وہ ہانی کے گھر تک پہنچنے میں درج کی گئی ہے۔ حالانکہ پھر اس کے بعد مسلم بن عوسجہ کا لوگوں سے آپ کی بیعت لینا اور معقل کا پہنچنا اور ابوثمامہ صائدی کا اسلحہ کی خریداری کے کام کو انجام دینا، اس سب کا ذکر ہے، جس کی گذشتہ بیان کے بعد کوئی گنجائش معلوم نہیں ہوتی۔

[۶]

ہانی کا دربار ابن زیاد میں جانا اور گفتگو کے بعد ابن زیاد کی سخت کلامی اور چھڑی سے ان پر ضرب لگانا تو بہت تاریخوں میں ہے مگر اس مقتل میں ہانی کا ابن زیاد پر حملہ آور ہونا اور دربار کے تقریباً پچیس اشخاص کو قتل کر دینا مذکور ہے جو بالکل نئی چیز ہے۔

ہانی کے قتل کے بعد جناب مسلمؑ کا ان کے مکان سے نکلنا مذکور ہے اور چونکہ صاحب مقتل جناب مسلمؑ کا تنہا رہ جانا پہلے ہی لکھ چکا ہے، اس لئے اب وہ جناب مسلمؑ کی کوئی جنگ درج نہیں کرتا، بلکہ لکھتا ہے:

خَرَجَ مِنَ الدَّارِ الَّتِيْ كَانَ فِيْهَا يَخْتَرِقُ الشَّوَارِعَ وَالْمَحَالَّ حَتّٰى خَرَجَ مِنَ الْكُوْفَةِ وَاَتٰى اِلَى الْحِيْرَةِ۔

وہ اُس گھر سے جس میں تھے نکلے، سڑکوں اور محلوں سے گزرتے ہوئے، یہاں تک کہ کوفہ سے باہر نکل گئے اور حیرہ کی طرف پہنچ گئے۔

اور اب وہ طوعہ کے گھر پر پہنچے ہیں۔ طوعہ سے صبح کو جناب مسلمؑ نے اپنا خواب بیان کیا کہ:

اِنِّيْ رَقَدْتُ فَرَاَيْتُ عَمِّيْ اَمِيْرَالْمُؤْمِنِيْنَؑ وَهُوَ يَقُوْلُ لِيْ اَلْوَحَا اَلْوَحَا اَلْعَجَلَ اَلْعَجَلَ۔

میں سویا تو میں نے اپنے چچا جناب امیرؑ کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں جلدی آؤ، جلدی آؤ۔

[۷]

عام طور سے معلوم تو یہ ہے کہ جناب مسلمؑ کے قاتلوں میں بکر بن حمران خاص شخص تھا مگر اس مقتل

میں جناب مسلمؑ کی جنگ میں ہے:

فَاخْتَلَفَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ بِكْرِ بْنِ حَمْرَانَ ضَرَبَاتٌ وَطَعَنَاتٌ فَعَاجَلَهُ مُسْلِمٌ فَضَرَبَهُ عَلٰى اُمِّ رَاْسِهٖ فَقَتَلَهُ ثُمَّ عَطَفَ عَلٰى اٰخَرَ فَقَتَلَهُ۔

ان میں اور بکر بن حمران میں تلوار اور نیزہ کے کئی واروں کی ردّ و بدل ہوئی تو مسلمؑ نے تیزی سے کام لے کر اس کے سر پر تلوار ماری اور اسے قتل کر دیا، پھر ایک اور کی طرف مڑے اور اسے قتل کر دیا۔

[۸]

ابن زیاد کے دربار میں عمر سعد سے جو وصیتیں جناب مسلمؑ نے فرمائیں، اس وصیت کا اس مقتل میں یہ جز ہے کہ:

اَنْ تَكْتُبُوْا اِلٰى سَيِّدِي الْحُسَيْنِ اَنْ يَرْجِعَ عَنْكُمْ فَقَدْ بَلَغَنِيْ اَنَّهُ خَرَجَ بِنِسَائِهٖ وَاَوْلَادِهٖ۔

میرے آقا حسینؑ کو تم لوگ یہ خط لکھ دو کہ وہ واپس جائیں کیونکہ مجھے خبر معلوم ہوئی ہے کہ وہ اپنے اہل حرم اور بچوں کو لے کر روانہ ہو گئے ہیں۔

یہ اس لئے درست نہیں کہ جناب امام حسینؑ تو مکہ معظّمہ سے عین اسی تاریخ یا صرف ایک دن کے فرق کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ جناب مسلمؑ کو اس کی خبر کیونکر پہنچ سکتی تھی؟

[۹]

امام حسینؑ کی مکہ سے روانگی جس طرح لکھی ہے، وہ بھی عجیب ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ جناب مسلمؑ و ہانی کی خبر نہ آنے سے گھبرا کر مکہ سے روانہ ہوئے اور پھر مدینے تشریف لے گئے، وہاں قبر رسولؐ سے رخصت ہوئے اور محمد بن الحنفیہ سے گفتگو فرمائی اور انھوں نے کہا کہ مکہ پھر واپس جائیے مگر آپ عراق کے ارادہ پر قائم رہے اور وجہ اس کی فقط مسلمؑ کی خبر نہ آنے سے پریشانی۔ یہ

باتیں سب غیر مقبول حیثیت رکھتی ہیں۔

[۱۰]

ابن عباس نے جو گفتگو کی تھی وہ مکہ معظّمہ میں تھی مگر یہاں ابن عباس بھی مدینہ ہی میں آئے اور انھوں نے اپنی رائے دی اور پھر عبداللہ بن زبیر بھی مدینہ ہی میں پہنچ گئے اور گفتگو کی، یہ باتیں بالکل غلط ہیں۔

[۱۱]

اس مقتل میں بھی مثل دیگر کتب کے یہ تصریح ہے کہ مسلمؑ اور ہانی کی شہادت کے بعد:

اَنْفَذَ بِرُؤُسِهَا اِلَىٰ يَزِيْدَ۔

اُن کے سر یزید کے پاس بھجوادیئے۔

مگر اس کے بعد کوفہ سے جناب مسلمؑ وہانی کی خبر شہادت امام کے پاس پہنچنے کے حال میں دونوں کوفہ سے آنے والوں کی زبانی ہے:

رَاَيْنَا رُؤُسَهُمَا فِي الْاَسْوَاقِ يَلْعَبُ بِهِمَا الصِّبْيَانُ۔

ہم نے ان دونوں کے سر بازاروں میں دیکھے کہ بچے ان سے کھیل رہے ہیں۔

جو نا قابل قبول ہے، اس روایت کے راوی کا نام بھی بالکل نیا ہے۔ عدی حرملہ بن عبدربہ۔

[۱۲]

فوج حر کو پانی پلانے کے ذیل میں یہ ندرت ہے کہ جب فوج حر سامنے آئی تو حر نے کہا:

يَا اَبَا عَبْدِ اللهِ اِسْقِنَا الْمَاءَ۔

اے ابوعبداللہ! ہمیں پانی پلوائیے۔

اس پر حضرت نے فرمایا:

رَحِمَ اللهُ مَنْ سَقَاهُمْ وَاَسْقَىٰ خُيُوْلَهُمْ۔

اللہ رحمت اتارے اس پر جو انھیں سیراب کرے اور ان کے گھوڑوں کو بھی سیراب کرے۔

ہمیں جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ خود حضرت نے ان کی تشنگی کی حالت دیکھ کر اپنی جماعت سے فرمایا:

اِسْقُوا الْقَوْمَ وَرَشِّفُوا الْخَيْلَ تَرْشِيْفًا۔

ان لوگوں کو پانی پلادو اور گھوڑوں کو بھی ایسا سیراب کرو جو سیراب کرنے کا حق ہے۔

اسی روایت کے ذیل میں علی بن طعان محاربی کا نام بھی محفوظ ہے جس سے امام نے فرمایا تھا: انخ الرّاویۃ ''شتر آب کش کو بٹھالے'' اور پھر حضرت نے خود اسے پانی پلایا تھا۔ مگر اس کتاب میں اس کا نام علی بن یقطان درج ہے۔ یہ ممکن ہے چھاپہ کی غلطی ہو۔

[۱۳]

کوفہ سے آکر چار آدمی راستے میں امام حسینؑ سے ملحق ہوئے، ان کے ساتھ طرماح بن عدی تھے، ہمیں معلوم ہے کہ وہ یہ رجز پڑھ رہے تھے:

يَا نَاقَتِيْ لَا تَذْعَرِيْ مِنْ رَجْزٍ...الخ

یاناقتی کے معنی ہیں ''اے میری اونٹنی'' اس میں مخاطب خود اپنے ناقہ کو بنایا ہے جو عربوں کے رجز کے طریقے پر ہے، مگر اس مقتل میں ہے:

اَخَذَ بِزِمَامِ نَاقَةِ الْحُسَيْنِؑ وَاَنْشَأَ يَقُوْلُ: يَا نَاقَتِيْ لَا تَذْعَرِيْ مِنْ رَجْزِيْ...الخ

انھوں نے امام حسینؑ کے ناقہ کی مہار ہاتھ میں لی اور کہنے لگے: ناقہ! میری ڈانٹ ڈپٹ سے گھبرانا نہیں۔۔۔الخ

آخر امام کے ناقہ کی مہار تھام کر یہ کہنے کا کیا موقع تھا؟

[۱۴]

ہمیں تاریخ سے یہ علم ہے کہ ملک رے کی حکومت کا پروانہ ابن سعد کو پہلے مل چکا تھا اور جب

کربلا کی مہم درپیش ہوئی تو اس سے ابن زیاد نے کہا کہ پہلے اس مہم کا سرانجام کردو، پھر رے کی حکومت پر جانا اور ابن سعد نے اس کی تعمیل میں ٹال مٹول سے کام لیا تو اس نے کہا کہ پھر حکومت رے کا پروانہ واپس کردو۔ اس پر عمر سعد کربلا جانے پر تیار ہوگیا۔ مگر اس مقتل میں ہے:

ثُمَّ اِنَّ ابْنَ زِيَادٍ نَادٰى بِعَسْكَرِهٖ وَقَالَ مَنْ يَاتِيْنِيْ بِرَاْسِ الْحُسَيْنِ وَلَهٗ لَمُلْكُ الرَّيِّ عَشَرَ سِنِيْنَ فَقَامَ اِلَيْهِ عُمَرُ بْنُ سَعْدٍ فَقَالَ اَنَا اَيُّهَا الْاَمِيْنُ فَقَالَ اِمْضِ اِلَيْهِ۔

پھر ابن زیاد نے اپنی فوج میں اعلان کیا اور کہا کہ کون میرے پاس حسینؑ کا سر لائے گا اور اسے دس برس تک کے لئے رے کی حکومت ملے گی تو عمر سعد کھڑا ہوگیا اور کہا کہ میں اسے انجام دوں گا اے امیر۔ کہا اچھا پھر جاؤ ان کے مقابلہ کو۔

[۱۵]

ابن سعد کے اشعار: اَاَتْرُكُ مُلْكَ الرَّيِّ۔ الخ والے تو مشہور ہیں مگر اس مقتل میں ان کے بعد ہاتف کی زبانی ان کا جواب بھی مذکور ہے جو اس مقتل کے منفردات میں سے ہے۔

[۱۶]

عمر سعد کی طرف سے کثیر بن شہاب بحیثیت قاصد بھیجا گیا اس موقع پر تاریخ طبری وغیرہ میں ہے کہ ابوثمامہ صائدی نے کہا کہ میں تجھے تلوار لے کر نہ جانے دوں گا۔ مگر اس مقتل میں ابوثمامہ کا ذکر بس اتنا ہے کہ انھوں نے کہا: "هٰذَا مِنْ اَشَرِّ اَهْلِ الْاَرْضِ" یہ دنیا کے بدترین لوگوں میں سے ہے۔ مگر اس کے بعد ہے:

فَقَالَ لَهٗ زُهَيْرُ بْنُ الْقَيْنِ اَلْقِ سَلَاحَكَ وَادْخُلْ۔

زہیر قین نے اس سے کہا کہ اپنے ہتھیار کھول کر یہاں ڈال دو اور پھر اندر جاؤ۔

اس نے اس سے انکار کیا، اور واپس گیا۔ اس کے بعد پھر دوسرا قاصد خزیمہ کو بتایا گیا ہے، جو

آ کر انصار سید الشہداءؑ میں شامل ہوگیا اور شہید ہوا۔ اس کا کہیں دوسری جگہ ذکر نہیں ہے۔

[۱۷]

عمر سعد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ رات کو آیا کرتا تھا اور کافی رات گئے تک امام حسینؑ سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس پر خولی بن یزید نے شکایت کا خط ابن زیاد کو لکھا اور اس پر ابن زیاد نے عتاب نامہ بھیجا، جس میں بندش آب کا حکم تھا۔

[۱۸]

گھاٹ پر پہرہ دینے کے لئے عمرو بن الحجاج زبیدی مقرر ہوا تھا۔ اس میں پہلے حجار بن الجبر کا نام ہے کہ وہ چار ہزار سواروں کا سردار بنا کر گھاٹ پر معین کیا گیا، پھر شیث بن ربعی ایک ہزار سواروں کے ساتھ۔

[۱۹]

روز عاشور جو امام کا خطبہ ہے، اس کا بندشِ آب کے دوسرے دن یعنی ۸ محرم کو ذکر کیا گیا ہے۔ اسی طرح زہیر بن قین کی تقریر اور شمر سے ردوبدل اور اس کے بعد جناب عباسؑ کا ایک جماعت اصحاب کے ساتھ پانی لینے کو جانا اور جنگ اور شہادت کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جس میں وہ مشہور اجزاء بھی ہیں۔ یعنی فوج کو منتشر کر کے فرات پر آب کا پہنچنا، مشک بھرنا اور پانی چلو میں لے کر پینے کا ارادہ کرنا اور پھر امام حسینؑ کی پیاس یاد کر کے پانی کو پھینک دینا اور پیاسے نہر سے نکل آنا اور تیروں کی بارش ہونا۔ اور اس کے بعد داہنے ہاتھ کا قطع ہونا اور پھر بائیں ہاتھ کا قطع ہونا، اس کے بعد ہے:

فَانْكَبَّ عَلَى السَّيْفِ بِفِيْهِ وَحَمَلَ عَلَى الْقَلْبِ فَقَاتَلَهُمْ قِتَالًا شَدِيْدًا۔

انھوں نے تلوار کو اپنے منہ میں لے لیا اور قلب لشکر پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کی۔

اس کے بعد سر پر لوہے کے عمود کا پڑنا اور گھوڑے سے زمین پر گرنا۔ اس موقع پر لکھا ہے:

وَهُوَ يُنَادِيْ يَا اَبَاعَبْدِاللّٰهِ عَلَيْكَ مِنِّي السَّلَامُ ۔

وہ صدا دے رہے تھے اے ابوعبداللہ! آپ کو میرا اسلام قبول ہو۔

پھر خلاف مشہور یہ بات ہے کہ امام حسینؑ کے لئے لکھا ہے:

ثُمَّ حَمَلَ عَلَى الْقَوْمِ وَكَشَفَهُمْ عَنْهُ وَنَزَلَ اِلَيْهِ وَحَمَلَهُ عَلٰى ظَهْرِ جَوَادِهٖ وَاَقْبَلَ بِهٖ اِلَى الْجَنَّةِ وَطَرَحَهُ وَبَكٰى عَلَيْهِ بُكَاءً شَدِيْدًا حَتّٰى بَكٰى جَمِيْعُ مَنْ كَانَ حَاضِرًا ۔

پھر آپ نے اس فوج پر حملہ کر دیا اور اسے ہٹا دیا۔ اور گھوڑے سے اترے اور لاش کو پشت فرس پر رکھا اور اسے خیمہ کی طرف لائے اور رکھ دیا اور شدت کے ساتھ گریہ فرمایا یہاں تک کہ جتنے حاضرین تھے سب رونے لگے۔

اس کے بعد امام کے شبِ عاشور کے خطبہ کا ذکر ہے، یہ ترتیب بھی واقعات کی، مسلّمات کے خلاف ہے اور بعض اجزا درایۃً بھی درست نہیں ہیں۔ جیسے حضرت ابوالفضل العباسؑ کی لاش کا خیمہ میں لانا۔

[۲۰]

تاریخ میں انس بن حارث بن نبیہ کا ذکر ہے۔ اس مقتل میں اصحاب امام حسینؑ میں سے ایک انس بن کاہل کا ذکر ہے کہ انھیں امام حسینؑ نے نصیحت کے لئے ابن سعد کے پاس بھیجا۔ جب انس بن کاہل ابن سعد کا مایوس کن جواب لے کر واپس ہوئے تب حضرت نے خطبہ پڑھا:

اِنِّيْ لَسْتُ اَعْلَمُ اَصْحَابًا ... الخ جو مسلماً شب عاشور پڑھا گیا مگر اس مقتل میں اسے صبح عاشور درج کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ فقرہ اس خطبہ میں یہ درج ہے کہ:

هٰذَا اللَّيْلُ قَدْ اَسْوَلَ عَلَيْكُمْ ۔

یہ دیکھو رات کا پردہ پڑ گیا ہے۔

[۲۱]

ترتیب لشکر حسینی میں ہمیں یہ معلوم ہے کہ میمنہ پر زہیر بن قین تھے اور میسرہ پر حبیب بن مظاہر تھے، مگر یہاں پر ہلال بن نافع بجلی کو بتایا گیا ہے۔ حالانکہ تحقیق یہ ہے کہ ہلال کوئی شہدائے کربلا میں تھے ہی نہیں۔

[۲۲]

خندق میں آگ کو روشن دیکھ کر ایک شخص جو فوج شام سے نکلا ہے اور اس نے امام کو مخاطب کر کے گستاخانہ جملہ کہا ہے، اس کا نام جبیرۃ الکلبی لکھا ہے، یہ بالکل نیا نام ہے۔

[۲۳]

قَالَ مَرْوَانُ بْنُ وَائِلٍ لَمَّا رَأَيْتُ ذٰلِكَ مِنْ اَمْرِ الْحُسَيْنِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَشَانِهٖ رَجَعْتُ عَنْ قِتَالِهٖ فَقَالَ لِيْ عُمَرُ بْنُ سَعْدٍ مَالَكَ رَجَعْتَ عَنْ قِتَالِهٖ فَقُلْتُ وَاللّٰهِ اِنِّيْ رَأَيْتُ مَالَمْ تَرَوْا مِنْ اَهْلِ هٰذَا الْبَيْتِ وَاللّٰهِ لَا قَاتَلْتُ الْحُسَيْنَ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَاَصْحَابَهٗ اَبَدًا ۔

مروان بن وائل کا بیان ہے کہ جب میں نے امام حسینؑ کی یہ بات اور ان کا یہ مرتبہ دیکھا تو میں ان کی جنگ سے کنارہ کشی کر کے واپس ہو گیا تو مجھ سے عمر سعد نے کہا کیوں تم ان کی جنگ سے واپس آ گئے میں نے کہا بخدا میں نے ان اہلبیتؑ سے وہ دیکھا ہے جو تم لوگوں نے نہیں دیکھا تو بخدا میں حسینؑ اور ان کے اصحاب سے کبھی جنگ نہیں کروں گا۔

یہ مروان نام بھی بالکل اجنبی ہے اور یہ قصہ بھی اس مقتل کے منفردات میں سے ہے۔

[۲۴]

نماز ظہر کے قبل زہیر بن قین کی جنگ لکھی ہے جس میں انھوں نے پچاس آدمی فوج دشمن کے قتل کئے اور پھر نماز کی شرکت کے لئے جنگ سے واپس آ گئے۔ مگر جو تاریخی واقعہ مشہور و معروف ہے، یہ ہے کہ حضرت نے سعید بن عبداللہ اور زہیر بن قین کو اپنے سامنے کھڑا کر کے نماز ظہر ادا فرمائی۔

[۲۵]

نمازِ ظہر کے بعد امام کا اصحاب کو ترغیب وتحریص کرنا اور اس پر بیبیوں کا خیموں سے نکلنا اور جوش دلانا۔ یہ روایت جو بعض مقاتل میں ہے اس کا ماخذ غالباً یہی مقتل ہے۔ اس روایت پر ماضی میں کافی بحث ہو چکی ہے، اور ہمارے خیال میں اسے ناقابل قبول سمجھنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

[۲۶]

تقریباً بدیہیات تاریخ میں سے ہے کہ کربلا میں شہداء کی ترتیب اس طرح تھی کہ پہلے تمام اصحاب شہید ہوئے تھے اور جب اصحاب میں سے کوئی باقی نہ رہا اس وقت اعزا کی باری آئی، مگر اس مقتل میں وہب بن عبداللہ کلبی اور پھر طرماح بن عدی (جن کا وجود بھی کربلا میں ازروئے تحقیق نہیں تھا) کی شہادت کے بعد عبداللہ بن مسلم بن عقیل کی اور پھر عون بن عبداللہ (ابن جعفر) کی مبارزطلبی اور شہادت لکھ دی ہے، اور پھر اصحاب کا سلسلہ شروع کر دیا ہے اور کہا ہے:

وَبَرَزَ مَنْ بَعْدَهُ جَابِرُ بْنُ عُرْوَةَ الْغَفَّارِيُّ۔

ان کے بعد جابر بن عروہ غفاری میدان جنگ میں گئے۔

پھر مالک بن داؤد۔ ان کے بعد پھر موسیٰ بن عقیل اور ایک کوئی احمد بن محمد ہاشمی ہی ان کے بعد لکھا ہے کہ حضرت نے ادھر اُدھر نظر کی تو کوئی اصحاب وانصار میں نظر نہ آیا اور حضرت نے صدائے استغاثہ بلند کی، پھر آپ کے اشعار رجز کے لکھ دیئے ہیں۔ اس استغاثہ اور رجز کے بعد اب حر بن یزید ریاحی کا ذکر آتا ہے کہ انھوں نے جو حضرت کا کلام سنا وہ اپنے چچا کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اس سے کہا کہ اے چچا! تم سنتے ہو کہ حسینؑ استغاثہ کر رہے ہیں۔ اور کوئی جواب دینے والا نہیں ہے اور ان کے انصار اور بیٹے سب قتل ہو گئے، چچا نے ان کی بات ماننے سے انکار کیا تو وہ اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوئے، وہ تیار ہو گیا۔

یہ سب کتنا مسلّمات تاریخ کے خلاف ہے؟

حر آغاز قتال میں امام کے پاس آ گئے تھے، اس وقت ایک شخص بھی قتل نہیں ہوا تھا۔ پھر حر کے ساتھ کہیں کہیں کتب مقاتل میں ان کے بیٹے اور بھائی کا تو ذکر ہے حالانکہ معتبر وہ بھی نہیں ہے مگر یہ چچا تو ان کا بالکل ہی نیا ہے۔

[۲۷]

حر کی بعد توبہ میدان میں جا کر جو رجز لکھی ہے، وہ تو بالکل اس مقتل کے بعد میں ساختہ و پرداختہ ہونے کی دلیل ہے اور یہ بھی کہ اس کا جمع کرنے والا بالکل تاریخ سے بےخبر یا مغفل بھی تھا کیونکہ یہ رجز جو حر بن یزید ریاحی کی طرف منسوب کی گئی ہے، یہ وہ اشعار ہیں جو عبداللہ بن الحر الجعفی نے واقعہ کربلا کے بعد کہے ہیں، اس وقت جب ابن زیاد نے اس پر عتاب کیا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ واقعہ کربلا میں امام کے مقابلہ پر کیوں نہیں گیا تو اس کے جواب میں اس نے یہ اشعار کہے ہیں۔ خود ان اشعار کے مضامین بھی اس کا پتہ دیتے ہیں۔ اس نے کہا ہے:

''مجھے تو اس کی ندامت ہے کہ میں نے حسینؑ کی نصرت کیوں نہ کی۔''

یہ حر کیوں کہتے جو اس وقت نصرت ہی کے لئے میدان میں آئے تھے، پھر اس میں آگے یہ ہے کہ

''میں اب تمنا رکھتا ہوں کہ فوجیں لے کر حسینؑ کے خون کا بدلا لینے کے لئے تمہارے مقابلہ پر آؤں۔''

پھر شہدائے کربلا کو اس میں یاد کیا ہے، ان کی بہادری کی تعریف کی گئی ہے اور کہا ہے کہ میں ان کی قبروں پر کھڑا ہوتا ہوں تو میری آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ اس سب کہنے کا حر سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟

یہ روایت کی کمزوری نہیں بلکہ فاش غلطی ہے جس کے بعد اس مقتل کے بے اصل ہونے میں کوئی شک نہیں رہتا۔

[۲۸]

حر جب جنگ کر چکے اور ان پر تیر باری ہوئی جس سے وہ چور ہو گئے تو لکھا ہے کہ انھیں دشمنوں نے قید کر لیا اور سر کاٹ کے امام کے پاس بھیجا۔ یہ بھی تواریخ اور مقاتل کے خلاف ہے بلکہ امام

حسینؑ ان کی لاش پر گئے ہیں۔

[۲۹]

حر کے بعد اس مقتل کے موجد کے نزدیک اصحاب واعزاء میں تو کوئی اور تھا نہیں۔ اس لئے اب اس نے کہا ہے کہ پھر امام نے صدائے استغاثہ بلند کی اور اب امام حسینؑ کے دو بچے احمد اور قاسم میدان میں آئے۔

یہ سب باتیں وہ ہیں جنھیں واقعۂ کربلا کے سلسلہ میں درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ جناب قاسم کی رخصت اور شہادت مستقل طور پر نقل ہوتی رہی ہے، وہ ہنگامی طور پر کسی صدائے استغاثہ کے اثر سے مضطربانہ میدان میں نہیں آئے تھے، اور احمد بن الحسنؑ کا تو شہدائے کربلا میں وجود ہی محقق نہیں ہے۔

[۳۰]

رخصت امام حسینؑ کے وقت یہ کہنا کہ رُدَّنَا اِلٰی حَرَمِ جَدِّنَا اس کی نسبت جناب سکینہ کی طرف مشہور ومعروف ہے اور اسے جناب سکینہ کی کمسنی پر محمول کرکے درست سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر اس مقتل میں یہ قول جناب ام کلثوم کی طرف منسوب ہے۔ غالباً اسی کی بنا پر ملا محمد تقی برغانی نے بھی مجالس المتقین میں اس کی نسبت جناب ام کلثوم کی طرف دی ہے اس صورت میں یہ بالکل ناقابل قبول معلوم ہوتا ہے۔

[۳۱]

منہال کا ایک مکالمہ امام زین العابدینؑ سے دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے مگر ان میں یہ ہے کہ منہال کی ایک دن دمشق کے کسی راستے میں امام زین العابدینؑ سے ملاقات ہوئی اور اس وقت یہ گفتگو ہوئی مگر اس مقتل میں یہ عجیب چیز ہے کہ عین دربار یزید میں جب خطیب نے خطبہ پڑھا اور پھر امام زین العابدینؑ نے خطبہ کی اجازت چاہی اور بمشکل اجازت ملی اور آپ نے خطبہ پڑھا۔ اور یزید نے اثنائے خطبہ میں اذان کا حکم دے دیا اور اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ کی آواز پر امام

زین العابدینؑ نے یزید کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ میرے جد بزرگوار تھے یا تیرے۔ اس وقت اس مقتل میں لکھا ہے کہ:

فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ جَوَابًا وَدَخَلَ دَارَهُ وَقَالَ لَا حَاجَةَ لِيْ بِالصَّلٰوةِ۔

اس نے کچھ جواب نہ دیا اور اپنی حرم سرا میں داخل ہوگیا اور کہا کہ اب مجھے نماز کی ضرورت نہیں۔

اس سے متصل کرکے تحریر ہے:

قَالَ فَقَامَ الْمِنْهَالُ اِلٰی عَلِيِّ ابْنِ الْحُسَيْنِ فَقَالَ لَهُ كَيْفَ اَصْبَحْتَ۔۔۔ الخ

راوی کا بیان ہے کہ اس پر منہال کھڑے ہوکر امام زین العابدینؑ کے پاس آئے اور آپ سے کہا کہئے! آپ کا کیا حال ہے؟

حالانکہ یہ گفتگو اس وقت انتہائی بے جوڑ ہے، اور اس کے غلط ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

اتنی مثالیں ہمارے خیال میں اس مقتل کے مرتبہ ومقام کو نمایاں کرنے کے لئے کافی ہیں اور چونکہ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ اس مقتل میں درج ہونے کے باوجود ہمارے دوسرے مورخین اور علماء نے انھیں اپنی کتابوں میں درج نہیں کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اسے علمائے سلف نے قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ نہ اس کے زیادہ تر روایات کو شہرت عام کا درجہ حاصل ہوا۔

علی نقی النقوی

۱۳/ ذیقعدہ ۱۳۹۱ھ

''الحسینؑ'' کے تبصرہ کا علمی جائزہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

عبدالحق صاحب کے رسالہ ''اردو'' کے جنوری ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں ام۔اے۔ع (محمود احمد عباسی امروہوی) کے قلم سے عمر ابوالنصر کی کتاب ''الحسین'' کے ترجمہ مطبوعہ لاہور پر جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس پر ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ کے اخباروں میں کافی احتجاج ہو چکا ہے مگر اس احتجاج کی نوعیت اظہار کرب و تکلیف اور مظاہرہ رنج و ملال سے زیادہ نہیں ہے۔ضرورت ہے کہ اس تبصرہ کے مندرجہ مضامین کا علمی و تحقیقی جائزہ بھی لے لیا جائے۔اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر اس وقت قلم اٹھایا جا رہا ہے۔

(۱)

تبصرہ نگار کا پہلا اعتراض یہ ہے کہ ''مولف نے ایک خاص فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اس تالیف کو مرتب کیا ہے تحقیق و تفتیش سے مطلق سروکار نہیں رکھا۔ابومخنف وغیرہ شیعہ راویوں کے بیانات ہی پر حصر کیا ہے۔''

جبکہ واقعہ یہ ہے کہ مولف کتاب (عمر ابوالنصر) خود شیعہ فرقہ سے تعلق نہیں رکھتے جس کا خود ان کے نام سے ثبوت ملتا ہے کیونکہ یہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ کم از کم کئی سو برس سے شیعوں میں عمرؔ وغیرہ نام بالکل متروک ہو گئے ہیں اور کوئی شیعہ یہ نام نہیں رکھتا۔تو اس کے بعد یہ تصوّر کہ انہوں نے اپنی کتاب ایک خاص فرقہ کے نظریہ کے مطابق لکھی ہے مضحکہ خیز ہے بلکہ انصاف کی دنیا میں یہی نتیجہ صحیح سمجھا جا سکتا ہے کہ مؤلف کے جمہوری نقطہ نظر کے باوجود اگر اس کے مضامین میں کچھ اقلیتی نقطہ نظر کی جھلک پیدا ہو گئی ہے تو یہ مؤلف کی آزاد فکری، وسیع المشربی اور صفائے دل و دماغ کی دلیل

ہے۔اس کے معنی یہ ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی تالیف میں تنگ نظری کو صرف کر کے تعصب سے کام نہیں لیا ہے اور بہت حد تک حقیقت پسندی کو پیش نظر رکھا ہے خصوصاً جبکہ انہوں نے دیباچہ میں لکھ دیا ہے کہ اس کتاب میں وہ واقعات درج کئے جائیں گے جن کی ثقہ مورّخین اور مشہور و معروف مؤلفین نے تائید کی ہے۔چنانچہ اپنے ماخذوں میں گیارہ عربی اور پانچ یورپی مورخین اور مؤلفین کی فہرست دی ہے۔ظاہر ہے کہ یہ کتابیں اور ان کے مولفین جن میں ابن اثیر، بلاذری وغیرہ کے علاوہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام یا برٹینکا بھی شامل ہیں کسی حساب سے شیعہ نہیں ہیں۔اب یا تو تبصرہ نگار کو ثابت کرنا چاہئے کہ مولّف نے جو کچھ درج کیا ہے وہ ان ماخذوں کے خلاف ہے۔مگر ایسا نہ تبصرہ نگار نے ثابت کیا ہے اور نہ ثابت کر سکتا ہے اور یا پھر اس اعتراض کو غلط ماننا چاہئے کہ مولّف نے تمام تر ایک فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر کتاب تالیف کی ہے، جب کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ وہی ہے جس کے شواہد ان ماخذوں میں موجود ہیں اور یہ ماخذ کسی ایک فرقہ کے نظریہ کو پیش نظر رکھ کر نہیں لکھے گئے تو جو کتاب انہی ماخذوں سے ماخوذ ہے، اسے ایک فرقہ کے نظریہ کا ترجمان کیوں کر سمجھا جا سکتا ہے؟

(۲)

تبصرہ نگار کو دوسری شکایت یہ ہے کہ مؤلف نے کتاب کو ۱۴ رعنوانات کے تحت ترتیب دیا ہے جس میں پہلا ہی عنوان ہے ''خلافت پر اہل بیتؑ کا حق''

وہ کہتے ہیں کہ ''مؤلف کی یہ سراسر غلط بیانی ہے اور اس غلط بیانی کی پوری تکذیب خود اس کے ماخذ طبری کی روایتوں سے ہو جاتی ہے۔'' اس کے بعد انہوں نے ایک مفروضہ روایت درج کی ہے کہ حضرت عباس نے حضرت علیؑ سے قبل وفات رسولؐ کہا تھا کہ آؤ چلیں اور ان سے پوچھیں کہ یہ امر (خلافت) کن میں ہوگا۔''اس پر حضرت علیؑ نے کہا تھا ''واللہ اس بات کو ہم رسول اللہؐ سے ہرگز نہیں پوچھیں گے۔کیونکہ انہوں نے اگر منع کر دیا تو پھر کبھی ہمیں لوگ نہیں ہونے دیں گے اور واللہ

میں تو اس کے بارے میں ہرگز رسول اللہؐ سے نہیں پوچھوں گا'' وہ کہتے ہیں ''کیا ان روایتوں سے جو خود مولف ہی کے ماخذ میں موجود ہیں اس کے اس بیان کی کہ خلافت اہلبیتؑ کا حق تھا پوری تردید نہیں ہوجاتی۔''

مگر جو شخص احادیث وسیر پر مطلع ہو وہ اندازہ کرسکتا ہے کہ یہ روایت اس سے قوی تر بلکہ متواتر احادیث وروایات کے خلاف ہے جن سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم متعدد صورتوں سے اہل بیت طاہرینؑ اور بالخصوص حضرت علی بن ابی طالبؑ کے ولی امر ہونے کا اعلان فرماتے رہے تھے۔ پھر اس صورت میں جناب عباس کیوں کہتے کہ اسے رسولؐ اللہ سے پوچھ لینا چاہئے اور حضرت علیؑ کیوں یہ جواب دیتے۔

اس کے علاوہ اہلبیتؑ کا اس امر (خلافت) میں حق وہ خود طبری کی اس روایت سے ثابت ہے جو صفحہ ۲۰۲ پر درج ہے کہ حضرت علیؑ نے خلیفہ اول ابوبکر سے کہا: ''کنا نری ان لنا فی الامر حق فاستبددتم به علینا ثم ذکر قرابته من رسول الله صلی الله علیه وسلم وحقه۔''

(ہم برابر یہ سمجھتے رہے ہیں کہ اس امر (خلافت) میں ہمارا حق ہے مگر تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا۔ اس ذیل میں آپ نے رسول سے اپنی قرابت اور اپنے حق کا تذکرہ کیا۔)

فلم یزل علی یقول ذالك حتی بکیٰ ابوبکر۔

(برابر حضرت علیؑ اس بارے میں کہتے رہے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رونے لگے۔)

اس سے ظاہر ہے کہ اہلبیت کا حق وہ تھا جسے صراحت کے ساتھ حضرت علیؑ نے خلیفہ اول کے سامنے بیان کیا اور اس کا ان کے پاس کوئی جواب سوا رونے کے نہ نکلا۔

اب اس دور کے گواہ مدّعی سے زیادہ چست نکلے ہیں جو اہلبیتؑ کے حق ہی کو جھٹلانے کی جسارت کر رہے ہیں۔ اب جب تبصرہ نگار کی درج کردہ روایت کی تردید خود اسی ماخذ میں موجود

ہے۔ تو مولف ''الحسینؑ'' اس روایت کی طرف توجہ ہی کیونکر کرسکتے تھے۔''

اس ذیل میں لکھنؤ کے مشہور رسالہ ''نگار'' میں خلافت وامامت کے سلسلہ والے مضامین کا پڑھنا مفید ہوگا جن کا آغاز ''ہرنام'' ایک ہندو کے نام سے ہوا تھا اور ہرنام نے بدلائل ثابت کیا تھا کہ رسول اللہؐ کی جانشینی کا حق صرف حضرت علیؑ بن ابی طالب کو تھا۔

اس پر جناب نیاز فتحپوری کا محاکمہ ایک غیر جانبدار کی حیثیت سے (کیوں کہ موصوف چاہے سنّی نہ بھی سمجھے جائیں لیکن شیعہ تو بہرحال نہیں ہیں) خاص وقعت واہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے فروری ۱۹۳۶ء کے شمارہ میں لکھا ہے:۔

''ہرنام کا استدلال دو باتوں پر مشتمل تھا: ایک یہ کہ جناب امیر اپنے خصائل وعادات کے لحاظ سے بھی مرجح حق خلافت کا رکھتے تھے اور دوسرے یہ کہ خود رسولؐ اللہ نے بھی غدیرخم میں اور اس کے قبل وبعد متعدد بار اپنے بعد ولایت ووصایت علیؑ کی صراحت فرمائی تھی۔ اس سلسلہ میں فاضل مقالہ نگار نے تمام روایات واسناد وہی پیش کئے تھے جو اہل تسنن کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں اور اس لئے سنیوں کی طرف سے جواب کی دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ وہ سرے سے ان روایات کے وجود ہی سے انکار کریں یا یہ کہ وہ ان روایتوں کا مفہوم اور بتائیں۔ ظاہر ہے کہ اول صورت جواب کی اختیار نہیں کی جاسکتی کیونکہ وہ روایات تو کتابوں سے نکالی نہیں جاسکتیں۔ اس لئے عموماً دوسری صورت اختیار کی جاتی ہے یعنی بعض تو ان روایتوں کو ضعیف قرار دے کر نا قابل اعتناء خیال کرتے ہیں اور بعض الزامی جواب کے انداز میں ان احادیث کو پیش کرتے ہیں جو فضائل جناب شیخین میں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔

درآنحالیکہ ان دونوں میں سے کوئی طریقہ جواب کا مفید نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ جن روایتوں کو آج ضعیف کہہ کر نا قابل استناد قرار دیا جاتا ہے وہ قدماء کے نزدیک حدرجہ قابل وثوق سمجھی جاتی تھیں اور فضائل شیخین کو جناب امیرؑ کے حق ولایت وخلافت سے کوئی واسطہ نہیں کیوں کہ آپ کی فضیلت نہ

دوسرے کی فضیلت سے انکار کی مرادف ہوا کرتی ہے اور نہ اس سے کسی دوسرے کا حق محو ہوسکتا ہے۔''

پھر آخر میں ہر دلیل پر بحث کے بعد لکھا ہے:۔

''اس میں شک نہیں کہ ان روایات وواقعات سے نہ صرف یہ کہ جناب امیرؑ کی غیر معمولی فضیلت ثابت ہوتی ہے بلکہ بڑی حد تک یہ بھی کہ رسولؐ اللہ اپنے بعد آپ ہی کو جانشین بنانا چاہتے تھے۔''

پھر جولائی سنہ ۳۶ء کے شمارہ میں لکھا ہے:۔

''یقیناً حضرات شیعہ اس اعتقاد میں بالکل حق بجانب ہیں کہ رسول اللہؐ جناب امیرؑ کی خلافت چاہتے تھے اور اپنی اس خواہش کا آپ نے اظہار بھی فرما دیا تھا۔ اہلسنت دیگر خلفاء کے صرف فضائل بیان کرکے اس حقیقت کو مٹانے میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ کیوں کہ سوال خلافت کا ہے نہ کہ محض فضیلت کا۔ اسی کے ساتھ اہل سنت کا مناظرانہ پہلو اس لئے اور بھی زیادہ کمزور ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اسے شیعہ روایات سے ثابت نہیں کرسکتے اور شیعی حضرات خود اہل سنت کی روایات سے حضرت علیؑ کی وصایت وخلافت کو ثابت کردکھاتے ہیں۔''

اب ایک مسلمان کی نظر میں تو رسول اللہؐ کا منشا ثبوت استحقاق کے لئے کافی ہے، اس لئے مزید لکھنے کی ضرورت نہیں ورنہ اہلبیتؑ کے استحقاق کے لئے خود خلیفہ دوم جناب عمر اور ارکانِ شوریٰ (جسے خلیفہ دوم نے اپنے بعد کے لئے مقرر کیا تھا) کے بھی اعترافات موجود ہیں۔

(۳)

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ مؤلف نے جابجا حضرت معاویہ جیسے بزرگ صحابی پر سبّ وشتم کرنے سے بھی اجتناب نہیں کیا۔''

جہاں تک ہم نے ''الحسین'' کے انداز تحریر کو دیکھا ہے اس میں متانت وشائستگی کو ہاتھ سے نہیں دیا ہے۔ رہ گئی کسی کے افعال پر بحث اور اس پر نقد وجرح، اسے مطلقاً سبّ وشتم میں داخل کرنا

قرآن وحدیث کی روشنی میں قطعاً درست نہیں ہے۔

رہ گیا معاویہ کو ''بزرگ صحابی'' کہنا تو یہ افسوس ناک واقعہ ہے کہ موصوف کا اصطلاحی معنی میں صحابی ہی ہونا ثابت نہیں ہے، ''بزرگ صحابی'' ہونا تو بہت دور ہے جن پر علامہ محمد بن عقیل حضرمی نے اپنی کتاب ''النصائح الکافیہ لمن یتولی معاویہ'' میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

(۴)

تبصرہ نگار رقم طراز ہے کہ ''حضرت عبداللہ بن عمر نے ابن الزبیر اور حسینؑ دونوں سے فرمایا تھا کہ ''اللہ سے ڈرو اور مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ مت ڈالو''

ہم نہیں کہہ سکتے کہ عبداللہ بن عمر نے ایسا کہا تھا یا نہیں۔ بالفرض اگر کہا ہو تو چاہے تبصرہ نگار اپنے ''خلیفہ زادہ'' کی عظمت کے اظہار کے لئے ان کے قول کو بڑی اہمیت کے ساتھ درج کرے مگر ہم ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ خود جناب عبداللہ بن عمر کے عمل کی روشنی میں ان کے قول کا وزن باقی نہیں رہتا، کیوں کہ خود انہوں نے اس کے پہلے حضرت علی بن ابی طالبؑ ایسے مسلم الثبوت خلیفۂ راشد کی بیعت نہیں کی اور اس بارے میں اللہ سے نہ ڈرے اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں تفرقہ سے اجتناب کیا۔ پھر یہ واقعہ ہے خود بیعت یزید سے انکار کرنے والوں میں ابتداً یہ جناب عبداللہ بن عمر بھی تھے۔ اور معاویہ کی تمام کوششوں کے باوجود انہوں نے بیعت نہیں کی اور پھر یزید کے برسراقتدار آنے کے بعد بھی وہ بیعت سے کنارہ کش ہی رہے یہاں تک کہ امام حسینؑ شہید ہوگئے۔ جب حضرت کی شہادت ہوگئی اس وقت عبداللہ بن عمر نے بیعت کرلی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق وانصاف کے رُو سے وہ بیعت یزید کو باطل اور انکار بیعت کو حق ہی سمجھتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ شہادت امام حسینؑ کو دیکھ کر وہ دہشت زدہ ہوگئے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ انکار بیعت تو اللہ کے ڈر سے تھا اور جب جو بیعت فرمائی وہ تلوار کے ڈر سے۔ پھر کیا یہی کردار وہ ہوسکتا ہے جسے حضرت امام حسینؑ ایسے بطل جلیل کے سامنے بطور مثالی پیش کیا جائے؟

(۵)

تبصرہ نگار کا ارشاد ہے کہ

’’حضرت حسینؑ کے بزرگوں، عزیزوں، دوستوں اور ہمدردوں نے انہیں طرح طرح سمجھایا تھا، منع کیا تھا، خطرات سے آگاہ کیا تھا۔‘‘

ہم نہیں سمجھتے کہ یہ بزرگ کون ہیں، عزیز کون ہیں، دوست کون ہیں اور ہمدرد کون؟ جن لوگوں کے مشورے تاریخ میں مذکور ہیں وہ لے دے کر چند آدمی ہیں:۔

(۱) محمد بن حنیفہ (۲) عمر بن عبدالرحمن بن حارث بن ہشام مخزومی (۳) عبداللہ بن عباس (۴) عبداللہ بن زبیر (۵) عبداللہ بن جعفر

یہی گنے چنے اشخاص ہیں۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ تبصرہ نگار نے ان میں کس کو امام حسینؑ کا بزرگ قرار دیا ہے۔ کسے عزیز کسے دوست اور کسے ہمدرد............ بہرحال ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ رائے نہیں دی کہ یزید کی بیعت کر لی جائے بلکہ سوال صرف قیام مکہ، قیام مدینہ، سفرعراق یا کسی اور جانب توجہ کا تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یزید کی بیعت کو یہ سب ہی ناجائز سمجھتے تھے۔

(۶)

تبصرہ نگار نے بڑی جسارت کے ساتھ یہ ادعا کر دیا ہے کہ عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس

’’سن وسال کے اعتبار سے، رسول اللہ کے شرف صحبت کے لحاظ سے، اپنے علم وفضل، اتقاء و پرہیزگاری کے اعتبار سے حضرت حسین اور ابن الزبیر سے بدرجہا فائق تھے۔‘‘

معلوم نہیں تبصرہ نگار نے فوقیت کا پیمانہ کیا قرار دیا ہے؟ اور کیا معیار ہے جس سے فوقیت کی جانچ کرتے ہیں۔ صرف سن وسال تو ظاہر ہے کسی فریق نے معیار فوقیت نہیں قرار دیا ہے، ورنہ ابوقحافہ کی موجودگی میں خلافت ان کے فرزند کو کس طرح مل سکتی تھی اور گر شرف صحبت کو بھی سن وسال ہی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو بھی جناب ابوقحافہ کے شرف صحبت کو مافوق ماننا پڑے گا۔ رہ گئے دوسرے

اوصاف وفضائل ان کے لحاظ سے ہم نہیں جانتے کہ پیغمبرؐ خدا کے احادیث سے زیادہ کوئی معیار تفوق کسی مسلمان کی نظر میں ہو ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ ہر ایک کے مراتب واوصاف کی مقدار کو چودہ سو برس کے بعد پیدا ہونے والے عباسی صاحب سے زیادہ جانتے تھے۔ آخر آپ نے کچھ سمجھ کر فرمایا تھا: **الحسن والحسین سیدا شباب اھل الجنۃ**۔ اس کے بعد شیعوں کا ذکر نہیں جو عبداللہ بن عمر کے اہل الجنہ میں داخل ہونے ہی کو تسلیم نہ کریں گے۔ دوسرے فرقہ کے افراد جو انہیں جنتی تسلیم کرتے ہیں انہیں حضرت امام حسینؑ کے تحت سیادت تسلیم کرنے پر مجبور ہیں۔

(۷)

خیرالامہ عبداللہ بن عباس کے متعلق یہ حکایت کہ انہوں نے یزید کی معاذ اللہ بیعت کر لی تھی اور یہ کہ انہوں نے یزید کو ’’صالح ونیکوکار‘‘ بتایا ہے بالکل غلط ثابت ہوتی ہے۔ ان کے اس خط سے جو انہوں نے یزید کے نام لکھا ہے اور جسے ابن اثیر وغیرہ مورّخین نے درج کیا ہے، اس میں انہوں نے انتہائی اخلاقی جرأت سے کام لے کر خود یزید کو مخاطب کر کے لکھ دیا ہے کہ

’مجھے اپنی جان کی قسم ہے میں نے کبھی تمہاری تعریف نہیں کی۔ اور کبھی تم سے محبت کا دم نہیں بھرا۔‘

نیز اس خط سے اس کی بھی رد ہو جاتی ہے کہ ابن عباس معاذ اللہ تفرقہ پردازی کا ذمہ دار امام حسینؑ کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے صاف یزید کو مخاطب کر کے لکھا ہے۔

’’کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں اس بات کو بھلا دوں گا کہ تم نے حسینؑ کو قتل کیا۔ میں نہیں بھولوں گا اور کبھی نہ بھولوں گا۔ یہ کہ تم نے حسینؑ کو حرم خدا اور حرم رسولؐ سے نکالا اور تم نے ابن مرجانہ کو حسینؑ کے قتل کا حکم دیا۔ میں تو خدا سے امید کرتا ہوں کہ وہ منتقم حقیقی بہت جلد تمہاری گرفت کرے گا اور اپنے عذاب میں مبتلا فرمائے گا۔‘‘

یہ خط کافی طوالانی ہے۔ بنظر اختصار چند سطور کے نقل کرنے پر اکتفا کی گئی۔

علامہ سبط ابن جوزی لکھتے ہیں کہ جب یہ خط یزید نے پڑھا تو سخت برافروختہ ہوا اور ابن عباس

کے قتل کا ارادہ کیا مگر ابن زبیر کے ساتھ معرکۂ جنگ میں مشغول ہو کر قتل ابن عباس کی تدبیر نہ کر سکا۔

کیا اس خط کے بعد کسی سلطنت دمشق کے نمک خوار کا یہ حکایت تصنیف کرنا کہ ابن عباس نے یزید کی بیعت کی اور اسے صالح و نیکوکار" کہا صریحی جھوٹ نہیں ثابت ہوتا؟

(۸)

عباسی تبصرہ نگار کا ایک اموی (دمشقی شامی) مورخ کے یہاں سے ڈھونڈھ کر محمد بن الحنفیہ کی زبان سے یزید کی پابندی شرع، نیکوکاری اور دینداری کی تعریف نکالنے سے اس حقیقت پر کیوں کر پردہ پڑ سکتا ہے جو تواتر تاریخی سے ثابت ہے کہ مختار نے یزید کے مقابلہ میں خون امام حسینؑ کے انتقام کا علم بلند کیا تھا، وہ جناب محمد بن الحنفیہ کے نائب کی حیثیت سے۔ یہ ممکن ہے کہ اس خط کو صحیح تسلیم نہ کیا جائے جو محمد بن الحنفیہ کی طرف سے ابراہیم بن مالک اشتر کے نام لکھا گیا تھا لیکن پھر بھی یہ امر مسلّم ہے کہ محمد بن الحنفیہ کی امداد کے لئے ابن زبیر کے مقابلہ میں مختار ہی کی فوج گئی تھی اور جناب محمد بن الحنفیہ نے ان کی امداد قبول کی تھی اور ان کی ہمدردی کا شکریہ ادا کیا تھا۔ نیز وہ برابر مختار کے حالات کے جویا رہتے تھے۔

اگر یہ واقعہ ہوتا کہ محمد بن الحنفیہ نے معاذ اللہ یزید کی بیعت کی ہوتی اور وہ اس کے مداح ہوتے تو بھلا مختارؒ کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ وہ ان کی نیابت کے مدعی ہو سکتے اور پھر یزید کی طرف سے مختار کے پروپگنڈے کو غلط ثابت کرنے کے لئے کیوں نہ جناب محمد بن الحنفیہ کو دعوت دی جاتی کہ وہ کھلم کھلا مختار سے برأت کا اعلان کریں بلکہ مختار کے مقابلہ میں عملی سرگرمیوں میں شریک ہوں۔ یہ کچھ نہ ہوا اور کئی سال تک مسلسل جناب مختار کی سرگرمیوں کا بنام محمد بن الحنفیہ جاری رہنا اس کا ثبوت قطعی ہے کہ ان کی طرف یزید کی بیعت اور مدح کی نسبت صریحی بہتان اور عظیم افترا ہے جو یزید کے بعض پرستاروں کی طرف سے حرکت مذبوحی کے طور پر وجود میں آیا ہے۔ اور اسی لئے طبری، ابن اثیر، ابوالفداء، دینوری، ابن قتیبہ، ابن واضح، مسعودی، سیوطی وغیرہ کسی مورخ نے

اس کی طرف کوئی اعتنا نہ کی اور صرف دمشق کی سرزمین پر وہ حکایت تصنیف ہو کر وہیں کی لکھی جانے والی تاریخ میں محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن تیرہ سو برس کے مورخین نے اسے ہرگز قابل قبول نہیں سمجھا۔

(۹)

کسی کی یہ گواہی یزید کے حق میں کہ

"وہ نماز کی پابندی کرنے والا، نیک کاموں میں سرگرم، مسائل فقہ پر گفتگو کرنے والا، سنت نبوی کا التزام رکھنے والا ہے" کیا وزن رکھتی ہے جب کہ اس کے خلاف

(۱) خود یزید کے پدر مشفق جناب معاویہ کی گواہی ہے کہ **لولا محبۃ یزید لا بصرت طریق الرشد**

"اگر یزید کی محبت نہ ہوتی تو میں سیدھا راستہ اختیار کر لیتا" جسے علامہ ابن حجر مکی نے فضائل معاویہ کی کتاب (**تطہیر الجنان واللسان**) میں درج کرتے ہوئے اس کی تشریح کی ہے کہ یزید کی محبت نے انہیں راہ راست سے ایسا اندھا کر دیا تھا کہ انہوں نے اس فاسق و فاجر کو ولی عہد بنا کر مسلمانوں کے سروں پر مسلط کر دیا۔

(۲) یزید کے (ادّعا کردہ) چچا زیاد بن ابیہ کی گواہی ہے: **ان یزید صاحب مرسلۃ وتھاون مع ھنات وھنات**

"یزید لاابالی اور مطلق العنان، ناگفتہ بہ کردار والا ہے۔"

(۳) یزید کے بیٹے معاویہ بن یزید کی گواہی ہے جو اس نے برسر منبر دی کہ

"یہ منصب میرے والد کو پہنچا اور وہ بھی اس کے مستحق نہ تھے اب ان کی عمر ختم ہوگئی اور وہ قبر میں اپنے گناہوں کی قید میں پہنچ گئے۔

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لئے اس امر کا احساس ہے کہ ان کا انجام برا ہوا۔ انہوں نے اولاد رسول کو شہید کیا اور شراب کو مباح کر دیا اور کعبہ کو برباد کیا۔"

(۴) خود یزید کی گواہی ہے کہ جواس کے اشعار میں درج ہے اور اس کا وہ دیوان مصر میں طبع ہو چکا ہے اور ہمارے سامنے موجود ہے اس میں اس نے اپنی شراب خواری ہی کا پروپگنڈ کیا ہے۔ پرہیزگاری کا نہیں۔

(۵) صحابی رسولؐ عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ کی گواہی ہے کہ اس کا کوئی مذہب نہیں، وہ شراب پیتا ہے، طنبورہ بجاتا ہے، گانے والیوں سے گانے سنتا رہتا ہے اور کتوں سے کھیلتا ہے۔''

نیز یہ کہ ''وہ ایسا شخص تھا جو ماں بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا، شراب پیتا اور نماز ترک کرتا تھا۔''

(۶) منذر بن زبیر کی گواہی ہے کہ ''وہ شراب پیتا ہے اور مست ایسا ہوتا ہے کہ نماز ترک کردیتا ہے''۔

(۷) بنی امیہ کے خلیفۂ صالح عمر بن عبدالعزیز کی گواہی ہے جس کے سامنے کسی نے یزید کے نام کے ساتھ ''امیر المومنین'' کی لفظ کہہ دی تو انہوں نے اسے بیس (۲۰) تازیانوں کی سزا دی۔

(۸) اس کے علاوہ تیرہ سو برس کے تمام مورخین کی گواہیاں ہیں جنہوں نے اس کے فسق وفجور کے واقعات تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں۔ ان کے مقابل میں دمشق (دارالسلطنت یزید) کے ایک نفر لکھنے والے کی درج کردہ حکایت کا سہارا لینا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا نہیں تو اور کیا ہے؟

(۱۰)

عباسی تبصرہ نگار آج کل کے اپنے ایسے ایک مصری مورخ کے اس جسارت آمیز فقرہ کو بڑی اہمیت دے رہا ہے کہ ''حسین نے بڑی شدید غلطی اپنے خروج میں کی "نعوذ باللہ من ذالك"'' لیکن آخر وہ اس کے بالمقابل اسی دور کے اہل الرائے کے آراء کو کیوں نہیں دیکھتے اور ان کی روشنی میں کیوں فیصلہ نہیں کرتے مثلاً:۔

(۱) عبدالرحمن بن ابی بکر کی رائے:۔

''معاویہ کا یزید کو اپنے بعد حاکم بنانا کسریٰ اور قیصر کا طریقہ ہے۔ ہم ہرگز اس شرابی اور زانی کی بیعت نہ کریں گے۔''

(۲) ام المومنین عائشہ (معاویہ سے مخاطب ہوکر) کیا تم سے پہلے شیخین نے بھی اپنے بیٹوں کے لئے کبھی بیعت لی تھی؟ پھر تم کس کی پیروی کرتے ہو؟''

(۳) حسن بصری ''معاویہ کی چار باتیں وہ ہیں جن میں سے ایک بھی ہلاکت کے لئے کافی ہے۔ اول انہوں نے بزور شمشیر خلافت کو حاصل کیا درآں حالیکہ اس وقت اصحاب رسولؐ میں ان سے افضل لوگ موجود تھے۔ دوسرے اپنے بعد اپنے بیٹے کو جو شراب اور نشہ باز تھا اور خلاف شریعت محمدی ریشم پہنتا اور طنبور بجایا کرتا تھا، مسلمانوں کا خلیفہ بنایا۔ تیسرے زیاد کو اپنا بھائی ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا حالانکہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ بیٹا اس کا ہوسکتا ہے جو اصلی شوہر ہو اور زناکار کے لئے پتھر ہیں۔ چوتھے حجر اور اصحاب حجر کا قتل کرنا۔

(۴) یزید کا چچازاد بھائی ولید بن عقبہ بن ابی سفیان (حاکم مدینہ) ''جو شخص حسینؑ کے خون کی ذمہ داری لے کر خدا کے یہاں جائے گا اس کے اعمال خیر کا پلہ انتہائی سبک ہوگا''۔

(۵) تمام عالم اسلامی نے امام حسینؑ کے اقدام اور اس کے نتیجہ کو کس نظر سے دیکھا اس کے لئے خود یزید کی گواہی موجود ہے کہ قتل حسینؑ کے جرم کو سنگین سمجھ کر نیکوکار اور بدکار سب ہی آدمی مجھ کو دشمن رکھنے لگے ہیں۔''

(۶) اس بحث کے خاتمہ پر آخر میں پھر خیر الامۃ عبداللہ بن عباس کی شہادت درج کی جاتی ہے جس سے ظاہر ہوگیا کہ حضرت امام حسینؑ پر خروج کا الزام ہی غلط ہے بلکہ جب آپ مکہ میں پرامن طور پر مقیم تھے اسی وقت یزید نے آپ کے خون بہانے کا انتظام کردیا تھا۔ اسی خط میں انہوں نے یزید کے نام تحریر فرمایا تھا لکھا کہ تم نے اپنے آدمیوں کو حرم الٰہی میں خانہ کعبہ کے پاس بھیجا کہ حسینؑ کو حرم خدا میں، کعبۂ الٰہی کے پاس ہی قتل کرڈالیں اور تم برابر حسینؑ کو خوف دلاتے اور پریشان کرتے رہے یہاں تک کہ تم نے حسینؑ کو عراق جانے پر مجبور کردیا۔ یہ سب کچھ اسلئے کیا گیا کہ تمہارے دل میں عداوت الٰہی، دشمنی رسولؐ اور ان کے اہل بیت اطہارؑ کا جن کی شان میں خدا نے آیہ تطہیر نازل

فرمائی بغض بھرا ہوا ہے''۔

اس سب کے بعد حضرت امام حسینؑ کو موردالزام وہی سمجھ سکتا ہے جس کا سلسلہ نسب کسی طرح یزید اور آل یزید تک پہنچتا ہو یا ان نمک خواروں تک جن کا گوشت و پوست بنی امیہ کے یہاں کے حرام لقموں ہی سے روئیدہ ہوا تھا اور یہ انہی لقموں کا اثر ہے جواب تک کسی نہ کسی شکل میں سامنے آیا کرتا ہے۔

(ماخوذ از سرفراز لکھنؤ محرم نمبر ۱۳۷۶ھ)

کتاب شہید اعظم پر تبصرہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

یہ مضمون جریدہ 'رضا کار' لاہور کے 'سید الشہداء نمبر' ۱۳۶۴ھ/ ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد محرم ۱۳۷۹ھ (۱۹۵۹ء) میں امامیہ مشن لکھنؤ کے سلسلہ اشاعت نمبر ۲۸۵ کے تحت امامیہ مشن کی جانب سے اشاعت پذیر ہوا۔

مدینہ پریس، بجنور میں ایک کتاب طبع ہوئی ہے جس کا نام رکھا گیا ہے ''شہید اعظم'' اور جس کے سرورق پر مصنف کا نام لکھا گیا ہے ''حضرت مولانا ابوالکلام آزاد''۔ اس لئے شوق کے ہاتھوں نے کتاب کھول کر نگاہ تدبر کو دعوت مطالعہ دی مگر تعجب کی انتہا نہ رہی جب دیکھا گیا کہ کتاب اغلاط سے پر ہے۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس کمیٹی ایک بالغ نظر انسان ہیں۔ اسی لئے ایسی کتاب کا ان کے نتائج تعلمی میں سے ہونا خالی از تعجب نہ تھا۔ مگر ہمارے دوست الحاج نواب سید محمد عباس صاحب طالبؔ صفوی رئیس شمس آباد قابل مبارکباد ہیں اس انکشاف پر کہ یہ کتاب دہلی کے ایک غیر معروف ابوالکلام آزادؔ کی ہے جنھوں نے دلھن کی ڈائری وغیرہ بعض سوقیانہ اور نہایت مبتذل کتابیں بھی لکھی ہیں۔

بہر حال جن جن مقامات پر میری نظر اثنائے مطالعہ میں ٹھٹکی، ان کی ایک مختصر فہرست درج کی جاتی ہے بغیر اس لحاظ کے کہ یہ مضامین کس کے لکھے ہوئے ہیں کیونکہ غلط بات بہر حال غلط ہے چاہے وہ کسی ابوالکلامؔ کا کلام اور کسی آزادؔ کی آزادروی کا نتیجہ ہو۔

(۱) 'تمہید' میں واقعہ کربلا کے اسباب کو حسب ذیل چند سطور میں ختم کیا گیا ہے:

اہل بیت شروع سے اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔ امیر معاویہ بن ابی سفیان کی وفات کے بعد تختِ خلافت خالی ہوا۔ یزید بن معاویہ پہلے سے ولی عہد مقرر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور حسینؑ بن علی علیہ السلام سے بھی بیعت کا مطالبہ کیا۔

امیر المومنین علی علیہ السلام نے کوفہ کو دار الخلافت قرار دیا تھا اس لئے وہاں اہلبیتؑ کرام کے طرفداروں کی تعداد زیادہ تھی انھوں نے حضرت حسینؑ کو خط لکھا کہ آپ تشریف لایئے ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ نے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؑ کو اہل کوفہ سے بیعت لینے کے لئے بھیجا اور خود بھی سفر کی تیاریاں کرنے لگے۔

اس میں چند باتیں قابل تشریح رہ گئی ہیں اور چند باتیں گمراہ کن ہیں۔ اہلبیتؑ شروع سے اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حق دار سمجھتے تھے۔

یہ ہے تو صحیح مگر آخر پھر کیا خاص وجہ ہوئی کہ اس سے پہلے کوئی ویسا خونریز مقابلہ نہ ہوا، جیسا یزید کے عہد میں واقعۂ کربلا کی شکل میں ہوا۔ کیا یزید کے کردار میں کچھ ایسی باتیں تھیں جو اس کے قبل والوں میں نہ تھیں اور اسلام کو اس کے ہاتھوں کچھ ایسا نقصان پہنچ رہا تھا جو اس کے قبل نہیں پہنچا تھا، جب ہی اس کے دور میں کربلا کی ایسی خونریز مہم کی ضرورت ہوئی۔

اس تمہیدی فقرہ ''اہلبیتؑ شروع سے اپنے تئیں۔۔۔۔۔۔ الخ'' کے ذریعہ سے حقیقتاً یزید کے کردار اور اس کے خاص امتیازات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے جو تاریخ کے ساتھ ایک ناقابل معافی ظلم ہے۔

''حسینؑ بن علی علیہ السلام سے بیعت کا مطالبہ کیا'' تو انھوں نے کیا جواب دیا۔ اس کا تذکرہ چھوڑ کر کوفہ کے خطوط کا ذکر کرنے لگنا یہ سمجھانے کے لئے ہے کہ حضرت کا بیعت سے انکار اہل کوفہ کے بھڑکانے اور آمادہ کرنے سے تھا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مدینہ میں جب کہ بیعت کا مطالبہ ہوا ہے

ایک خط بھی کوفہ کے لوگوں کا نہیں گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضرت کا بیعت یزید سے انکار کرنا اپنی ذمہ داری احساس پر مبنی تھا۔ جس میں اہل کوفہ کو ذرہ برابر دخل نہ تھا۔

''انھوں نے حضرت حسینؑ کو خط لکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیلؑ کو اہل کوفہ سے بیعت کرنے کے لئے بھیجا اور خود بھی سفر کی تیاری کرنے لگے۔''

کہاں سے سفر کی تیاری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟ معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ ہی میں اہل کوفہ کے خطوط پہنچے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مدینہ ہی سے مسلم بن عقیلؑ روانہ کئے گئے اور پھر مدینہ سے امام حسینؑ سفر کی تیاری کرنے لگے۔۔۔۔۔!

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سفر آپ نے مطالبۂ بیعت ہونے کے بعد ہی فرمایا، مدینہ سے مکہ چلے گئے۔۔۔۔۔۔۔ کوفہ والوں نے خطوط اس وقت بھیجے، جب انھیں یہ اطلاع ہوئی کہ امام حسینؑ نے بیعت یزید سے انکار کیا ہے اور مدینہ سے نکل کر مکّہ چلے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ نے مسلمؑ کو ''اہل کوفہ سے بیعت کرنے کے لئے۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' اس کے تو کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔ صحیح الفاظ میں ''بیعت لینے کے لئے'' نہیں بھیجا۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اہل کوفہ کے حالات کا مطالعہ کر کے آپ کو اطلاع دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ بھی غلط ہے کہ آپ ان کو بھیجتے ہی خود بھی سفر کی تیاری کرنے لگے''۔

بلکہ جب آپ کو مکہ میں خونریزی کا اندیشہ پیدا ہوا، اس وقت وہاں سے روانہ ہوئے۔

(۲) دوستوں کے مشورہ کے ذیل میں لکھا ہے:۔

آپ کے دوستوں اور عزیزوں کو معلوم ہوا تو سخت مضطرب ہوئے۔ وہ اہل کوفہ کی بے وفائی اور زمانہ سازی سے واقف تھے۔ بنی امیہ کی سخت گیر طاقتوں سے بھی بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے اس سفر کی مخالفت کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔''۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت امام حسینؑ خود اہل کوفہ کی حالت سے واقف نہ تھے اور

کیا آپ بنی امیہ کی طاقتوں سے بے خبر تھے؟

یقینا آپ بھی اگر زیادہ نہ مانا جائے تو اتنا ہی اس سب سے واقف تھے۔ پھر آپ نے جو روانگی کا ارادہ کیا اور اس ارادہ پر قائم رہے تو کوئی تو اس کا ناگزیر سبب تھا۔ اس سبب کا پتہ لگانا تاریخ نویسی کا ایک اہم جزو ہے۔

مصنف کتاب نے ابن عباس کے مشورے، ان کے جوش میں بھرے ہوئے الفاظ، عبداللہ بن جعفر کا خط، والی کا خط، یہ سب کچھ تو لکھ دیا۔ مگر حضرت امام حسینؑ کے وہ جواب نقل نہ کئے جو آپ نے اپنے مشورہ دینے والوں کو دیئے تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کیونکہ ان جوابوں سے ثابت ہوجاتا کہ آپ کا سفر عراق کا ارادہ کسی خاص توقع کی بنا پر نہ تھا جس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں آپ پر ناعاقبت اندیشی کا الزام عائد ہوسکتا۔ بلکہ وہ کچھ وقتی خطرات سے بچنے کے لئے تھا جو آپ کے سامنے تھے اور جن سے آپ سفر کے ذریعہ سے محفوظ رہنے میں کامیاب ہوئے۔ مثلاً جب فرزدق نے کہا کہ آپ نے حج میں اتنی جلدی کیوں کی؟ تو امام نے فرمایا کہ اگر میں جلدی نہ نکلتا تو گرفتار ہوجاتا۔ (ابن جریر طبری، ج ٦ ص ۲۱۸)

ایک دفعہ فرمایا: میرا کعبہ سے باہر قتل ہونا اچھا ہے بہ نسبت کعبہ کے اندر قتل ہونے سے۔ خدا کی قسم اگر میں کسی جانور کے سوراخ میں داخل ہوں گا تو یہ لوگ مجھے نکال کر قتل کردیں گے۔ (طبری، ج ٦ ص ۲۱۷)

کبھی فرمایا: میرے باپ نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک مینڈھا کعبہ میں قتل ہوکر اس کی حرمت کو زائل کرے گا۔ میں وہ مینڈھا نہیں بننا چاہتا۔ (طبری، ج ۱ ص ۲۱۷)

اس سے ظاہر ہے کہ سفر آپ نے مکّہ کی حرمت کو برقرار رکھنے کے لئے مجبور ہوکر کیا تھا۔

(۳) کتاب میں چن چن کر صرف ان واقعات کی کڑیوں کو درج کیا گیا ہے جن کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت امام حسینؑ سفر عراق اختیار نہ کریں اور جن کی موجودگی میں آپ کا اپنے ارادہ پر قائم رہنا صرف یہ ثابت کرسکتا ہے کہ آپ ایک ضدی انسان تھے اور یہی مصنف کتاب کا مقصد ہے۔

اس لئے واقعات کی وہ کڑیاں نظر انداز کردی گئی ہیں جن کے نتیجہ میں آپ کو اپنے ارادہ پر قائم رہنا ضروری تھا۔

مثلاً آپ کے نمائندہ مسلم بن عقیلؑ کا خط آنا کہ کوفہ میں حالات سازگار ہیں۔۔۔۔۔۔۔ سب آپ کی اطاعت پر تیار ہیں۔ آپ کو جلد تشریف لانا چاہئے۔۔۔۔۔۔ (ابن جریر طبری)

جس کے بعد آپ کے پاس اہل کوفہ کی دعوت کو مسترد کرنے کی کوئی وجہ معقول نہ تھی۔ آپ کے مکّہ سے روانہ ہونے کے وقت حاکم مکہ کے سپاہیوں کا سدراہ ہونا اور جبراً آپ کو روکنے کی کوشش کرنا۔ (ابن جریر طبری)

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے لئے مکہ میں ایک نظر بندی اور حراست کی حالت ہوگئی تھی۔۔۔۔۔۔ اور اگر آپ مزید قیام فرماتے تو بہت جلد آپ کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہوجاتی۔

اس صورت حال میں جناب مسلمؑ کی خبر شہادت سننے کے بعد بھی آپ کے لئے پھر مدینہ یا مکہ کی طرف واپسی کہاں تک مناسب تھی۔

اس صورت میں مسلمؑ بن عقیلؑ کے عزیزوں کی ضد کو آپ کے ارادہ کے قائم رکھنے کا پورا سبب قرار دینا، جس کو مصنف کتاب نے اہمیت دی ہے، درست نہیں ہے۔

(۴) ترجمہ کی غلطیاں بھی موجود ہیں مثلاً بِخَيْرِ رُكْبَانٍ وَ خَيْرِ سَفَرٍ کا ترجمہ اچھے مسافروں کو لے چل۔ سب سے بہتر سفر پر چل۔ حالانکہ سفر کے معنی سفر نہیں، بلکہ جماعت مسافرین ہیں۔ دونوں کے معنی یہی ہیں بہترین سواروں کو لے چل اور بہترین مسافروں کو۔ 'سب سے بہتر سفر پر چل' کسی لفظ کے معنی نہیں ہیں۔

(۵) بعض جگہ سرخیاں بھی عجیب ہیں۔ جیسے امام حسینؑ کا وہ معرکہ آرا خطبہ جو اصحاب کو جمع کرکے شب عاشور ارشاد فرمایا ہے جس میں فرمایا تھا کہ تم سب لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھائے لیتا ہوں اور اصحاب کے جواب کہ ستر (۷۰) مرتبہ بھی اگر قتل ہوں تو آپ کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ ایسے بے نظیر تاریخی موقع کی سرخی

قرار دی ہے: 'آپ کی حسرت اور اصحاب کی وفاداری'۔ اس موقع پر حسرت کی لفظ کا مفہوم عربی، فارسی، اردو کسی محاورہ کے تحت میں ظاہر نہیں ہوتا۔

یہاں بھی نادانستہ یا مصلحتاً ترجمہ غلط ہوا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حضرت کے الفاظ یہ تھے کہ

"لَا اَعۡلَمُ اَصۡحَاباً اَوۡفٰی وَلَا خَیۡرًا مِنۡ اَصۡحَابِیۡ وَلَا اَهۡلَ بَیۡتٍ اَبَرُّ وَلَا اَوۡصَلُ مِنۡ اَهۡلِ بَیۡتِیۡ۔"

اس کا ترجمہ 'جو ہر عربی داں کی سمجھ میں آسکتا ہے' یہ ہے کہ میں کسی کے اصحاب کو اپنے اصحاب سے زیادہ وفادار اور بہتر نہیں جانتا ہوں اور کسی کے عزیزوں کو اپنے عزیزوں سے زیادہ باوفا نہیں جانتا۔

مگر اس کتاب میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ: "میں نہیں جانتا آج روئے زمین پر میرے ساتھیوں سے افضل اور بہتر لوگ موجود ہیں یا میرے اہلبیتؑ سے زیادہ ہمدرد و غم گسار اہلبیتؑ کسی کے ساتھ ہیں"۔ یہ اصل الفاظ کے مطابق نہیں ہے۔

زہیر بن قینؑ کی تقریر کا ترجمہ کیا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔ "بخدا اگر میں ایک ہزار مرتبہ بھی آرے سے چیرا جاؤں"۔ یہ بھی عربی کے الفاظ سے مطابق نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔ اصل ترجمہ یہ ہے کہ بخدا میری آرزو ہے کہ اگر میں قتل ہوں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل ہوں۔ اسی طرح ہزار مرتبہ ہو۔

(۶) امام حسینؑ کے اشعار کے سننے کے بعد جناب زینبؑ کی بیتابی اور حضرت کے توصیہ صبر کے موقع پر لکھا ہے۔

"حضرت امامؑ نے یہ حالت دیکھی تو فرمایا: "اے بہن یہ کیا حالت ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس وشیطان کی بے صبریاں ہمارے ایمان و استقامت پر غالب آجائیں۔" انہوں نے روتے ہوئے کہا: "کیونکر اس حالت پر صبر کیا جا سکے کہ آپ اپنے ہاتھوں قتل ہو رہے ہیں؟" آپ نے کہا "مشیت کا ایسا ہی فیصلہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس عبارت میں 'ایمان و استقامت' 'اپنے ہاتھوں' 'مشیت کا فیصلہ' سب طبعزاد الفاظ ہیں۔ اصل

عبارت میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۷) نام اکثر غلط ہیں۔ مثلاً لکھا ہے:۔

"جمعہ یا سنیچر کے دن دسویں محرّم کو نماز فجر کے بعد سعد اپنی فوج لے کر نکلا۔" حالانکہ کربلا میں سعد کوئی افسر نہ تھا۔ عمر بن سعد تھا۔ مگر شاید لفظ عمرؔ سے کسی غلط فہمی پیدا ہونے کے خطرہ سے بیٹے کے بجائے باپ کا نام لکھ دیا گیا ہے۔

(۸) بعض دشمن کی بدتمیزیوں کو اردو میں ایسے بیدھڑک طریقہ پر پیش کیا گیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کتاب کے دل پر بھی حضرت امام حسینؑ کی عظمت کا کوئی اثر نہیں ہے۔ مثلاً شمر فوج سے گھوڑا دوڑاتا ہوا نکلا اور اس نے چلا کر کہا: "اے حسینؑ! قیامت سے پہلے ہی تو نے آگ قبول کر لی؟ (معاذ اللہ) اس کے نقل کرنے میں بھی ایک باتمیز انسان ایک عظیم الشان انسان کے بارے میں اس طرح سے بدتمیزی کے الفاظ صرف نہیں کیا کرتا۔ امام حسینؑ کی تقریر میں جو رسولؐ اللہ کی حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے۔ الحسن والحسین سیدا الشباب اھل الجنّۃ اس کے ترجمہ میں بڑی دور اندیشی سے یہ محتاط الفاظ صرف کئے گئے ہیں "جنت میں نوعمروں کے سردار۔" حالانکہ حدیث میں لفظ جنت بطور ظرف نہیں ہے۔ حدیث کے معنی ہیں "جنت والے جوانوں کے سردار"۔

(۹) بعض غلطیاں صرف واقعہ کے صحیح تصور نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً دشمنوں کے میسرہ نے یورش کی۔ مگر حسینی میسرہ نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ ظاہر ہے کہ دشمن کا میسرہ اس طرف کی فوج کے میمنہ کے مقابل میں ہوگا۔ اس لئے میسرہ کا مقابلہ میسرہ سے نہیں ہوسکتا۔

(۱۰) عبداللہ بن عمیر کلبی کی زوجہ ام وہب کے بارے میں ابن جریر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "شمر نے اسے دیکھا اور قتل کر ڈالا۔" یہ غلط ہے بلکہ اسے شمر کے غلام رستم نامی نے گرز مار کر شہید کیا تھا۔

(ابن جریر طبری)

(۱۱) حوالوں کی بھی غلطی ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات میں ابن جریر کے ساتھ شرح نہج البلاغہ کا نام ہے حالانکہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ شرح نہج البلاغہ امیر المومنینؑ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے کلام کی شرح ہے۔ اس میں واقعہ کربلا کی تفصیلات نہیں مذکور ہیں۔

(۱۲) جناب قاسمؑ کے حال میں لکھا ہے:-

''میدانِ جنگ میں ایک جوان رعنا نمودار ہوا۔ وہ کرتہ پہنے اور تہہ بند باندھے اور پاؤں میں نعل پہنے تھا۔ بائیں نعل کی ڈوری ٹوٹی ہوئی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جناب قاسمؑ سن بلوغ تک نہ پہنچے تھے خود یہ شان کہ کرتہ پہنے، تہہ بند باندھے۔۔۔۔۔الخ میدانِ جنگ میں ایک جوان رعنا کی نہیں ہوتی۔

(۱۳) ''مولود تازہ کی شہادت'' کی سرخی سے ابن جریر کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ (جناب قاسمؑ کی شہادت کے بعد) حضرت حسینؑ پھر اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے کہ عین اس وقت آپ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ وہ آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے گود میں رکھا اور اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ اچانک ایک تیر آیا اور بچہ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔

ابن جریر کے یہاں ڈھونڈھنے سے یہ واقعہ نہیں ملتا۔ اس کے الفاظ یہ ہیں ''اِلٰی حُسَیْنٍ علیہ السلام بِصَبِیٍّ لَهٗ فَهُوَ فِیْ حَجْرِهٖ اِذَا مَاهُ الخ'' اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک بچہ حضرت کا حضرت کے پاس لایا گیا۔ وہ آپ کی گود میں تھا کہ ایک ظالم نے اسے تیر مارا۔ مگر وہ عین اسی وقت پیدا ہوا تھا۔ اور آپ کان میں اذان دے رہے تھے اور ''تیر اچانک'' لگا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

(۱۴) قتل امام حسینؑ کے بعد کے مظالم کو سبک کرنے کی مسلسل کوشش کی گئی ہے جس میں سب سے پہلے خیام کی غارت گری کے مواقع پر اتنا لکھا ہے کہ پھر آپ خیمہ کی طرف بڑھے۔۔۔۔۔۔

اسی اثنا میں عمر بن سعد بھی آ گیا۔ اور حکم دیا: ''کوئی عورتوں کے خیمے میں نہ گھسے، جس کسی نے خیمہ کا کوئی اسباب لوٹا ہو واپس کر دے''۔

یہاں ابن جریر کے یہ تصریحات مصلحتہً نظر انداز کئے گئے ہیں کہ مخالف لشکر حسینؑ کے اہل حرم اور آپ کے مال و اسباب پر ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حالت یہ تھی کہ عورتوں کے سروں پر سے چادریں کھینچی جاتی تھیں۔ وہ روکنے کی کوشش کرتی تھیں۔ مگر دشمن غالب آ کر چادر لے جاتا

تھا۔ نیز عمر سعد کی گذشتہ ہدایت کے بعد یہ فقرہ ''فَوَاللهِ مَا رَدَّ اَحَدٌ شَیْئاً'' کسی نے لوٹے ہوئے سامان کی کوئی چیز واپس نہیں کی۔

اس سے ظاہر ہے کہ عمر سعد کا حکم اگر تھا بھی تو فقط نمائشی تھا۔ فوج میں سے کسی شخص نے بھی اس کی تکمیل نہیں کی اور نہ عمر سعد نے اس کی تعمیل کرانے کی کوشش کی۔

(۱۵) ابن زیاد کے دربار میں سر امام حسینؑ سے چھڑی کے ساتھ بے ادبی کے تذکرہ کے بعد لکھا ہے 'بعض واقعات میں یہ واقعہ خود یزید کی طرف منسوب ہے، مگر صحیح یہی ہے کہ ابن زیاد نے چھڑی ماری تھی'۔

یہ فتویٰ صرف یزید کی صفائی کے لئے دیا گیا ہے۔ ورنہ جب کہ تاریخوں میں وہ بھی ہے اور تاریخوں میں یہ بھی تو یہی کیوں نہ مانا جائے کہ صحیح یہ ہے کہ یزید نے چھڑی ماری تھی اور حقیقت حال یہ ہے کہ دونوں درباروں میں یہ واقعہ پیش آیا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں زید بن ارقم نے ٹوکا اور یزید کے دربار میں ابو برزہ اسلمی نے (ابن جریر)۔

(۱۶) آخر تک کتاب میں تمام وہ بیانات درج کئے گئے ہیں جو یزید کے ہواخواہوں نے احساس شکست اور پشیمانی کے بعد سے یزید کے حسن وسلوک اور مراعات اہل حرم کے متعلق بیان کئے ہیں۔ مگر ابن جریر وغیرہ ہی کی وہ روایات بھی تو ہیں۔ جن سے یزید کا اظہار مسرت اور قتل حسینؑ پر نازاں ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مثلاً یہ کہ تمام اشراف اہل شام کو مدعو کیا اور پھر علی بن الحسینؑ اور خاندان رسالت کی خواتین کو بلایا۔ اس حالت میں کہ تماشائی تماشا دیکھ رہے تھے۔ (ابن جریر) کیا اس سے مقصود سوائے توہین کے کچھ اور ہو سکتا ہے؟

یا امام زین العابدینؑ سے کہنا کہ ''تمہارے باپ نے میرے حقوق کو نظر انداز کر دیا۔ اور مجھ سے منازعت کی۔ تو ان کے ساتھ خدا نے وہ سلوک کیا جو تم دیکھ رہے ہو۔'' (ابن جریر)

یا چھڑی سے لب و دندان امام حسینؑ سے بے ادبی جس کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے۔

وہ یزید کی سیاسی تاویلیں بعد کو تھیں، کہ وہ ابن زیاد کو حسینؑ کا قاتل قرار دے کر برا کہہ دیتا تھا۔ مگر اس کا طرز عمل خود ان بیانات کے غلط ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

جس جس عامل نے امام حسینؑ کے ساتھ ذرا بھی رعایت سے کام لیا، وہ معزول ہوا جیسے ولید بن عقبہ مدینہ کی حکومت سے اور نعمان بن بشیر کوفہ کی حکومت سے، مگر ابن زیاد جس نے حسینؑ کو قتل کیا تھا، وہ اس واقعہ کے بعد اپنے منصب سے برطرف نہیں کیا گیا۔ اگر یزید کی ناراضگی صرف نمائشی نہ ہوتی اور اس میں کچھ اصلیت ہوتی تو اس عتاب کا کچھ تو مظاہرہ ابن زیاد کی نسبت عملی طور پر ہوتا۔

یزید نے امام زین العابدینؑ یا جناب زینبؑ یا جناب سکینہؑ سے چاہے مصلحتاً کہا بھی ہو کہ مجھے نہایت افسوس ہے کہ ابن زیاد نے حسینؑ کو قتل کر ڈالا مگر ---------------- یہ کوئی تاریخ نہیں بتلا سکتی کہ اس نے ابن زیاد کو بھی کوئی عتاب نامہ لکھا ہو کہ تم نے یہ کیا کیا؟ حسینؑ کو قتل کر دیا؟

وہ لکھتا ہے جب کہ یہ حقیقت تھی کہ اس نے خود ابن زیاد کو مامور کیا تھا اور اس نے جو کچھ کیا وہ یزید کے حکم کے مطابق۔ اس کا اظہار خود ابن زیاد نے کیا ہے، اس وقت جب بعد ہلاکت یزید اس نے بصرہ سے فرار کیا ہے اور ایک شخص یساف لشکری اس کے ساتھ تھا اور ابن زیاد کچھ متفکر نظر آیا اور یساف نے کہا آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں نے حسینؑ کو کس لئے قتل کیا؟ ابن زیاد نے کہا نہیں یہ تو میں نہیں سوچتا اس لئے کہ بادشاہ وقت کے مخالف تھے اور بادشاہ وقت نے مجھے حکم دیا کہ انہیں قتل کردوں۔ تو اگر یہ گناہ تھا تو بادشاہ کا میرا نہیں تھا۔------- (ابن جریر)

گو یہ جواب ابن زیاد کا خود اس کے گناہ سے بچانے کے لئے ناکافی ہے مگر اس سے یہ تو ثابت ہے کہ جو کچھ ہوا تھا وہ یزید کے حکم سے۔---۔ اور خود یزید کا عمل جس کا تذکرہ ہو چکا ہے، اس کا گواہ ہے۔

(۷) اپنے مطلب کی باتوں میں بھی جہاں کوئی لفظ مصنف کو اپنے مطلب کے خلاف ملی ہے ترجمہ میں ادل بدل کر کے اسے ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً جناب سکینہؑ کی زبانی یزید کی

تعریف میں ابن جریر نے یہ فقرہ درج کیا ہے۔ مَا رَاَیْتُ رَجُلًا كَافِرًا بِاللّٰهِ خَيْرٌ مِنْ يَزِيْدِ۔ بن معاویہ ”کافر باللہ کے صاف معنی ہیں منکر خدا اور مخالف اسلام۔ مگر یہاں امکانی طور پر یزید کی بارگاہ میں حق خدمت یوں ترجمہ کر کے ادا کیا گیا ہے:۔

”میں نے کوئی ناشکرا انسان یزید سے زیادہ اچھا سلوک کرنے والا نہیں دیکھا“۔

قرآنی اصطلاح میں صرف شاکر کے مقابلہ میں جب کافر کی لفظ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ”ناشکرا“ ورنہ ہر جگہ کافر کے معنی غیر مومن اور غیر مسلم ہی کے ہوتے ہیں۔ والسلام

❀❀❀

جہاد اور جنگ......سیرت حسینی کے آئینے میں

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید باقر نقوی صاحب قبلہ لکھنوی مدظلہ، دبئی

اللہ جانے کاروان حیات بشر کہاں سے چلا ہے اور کس سمت کو راہ سپار ہے؟ ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے اور ہر آن ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ سیکڑوں اور ہزاروں سال قبل نوعِ انسانی کے وہ گروہ جو ریگستانوں، صحراؤں، جنگلوں، کوہساروں، پہاڑوں اور غاروں میں زندگی گزارا کرتے تھے آہستہ آہستہ چیونٹی ہی کی چال سے سہی، مہذّب، متمدن اور ترقی یافتہ ہوتے گئے۔ پہلے چھوٹی چھوٹی بستیاں بسائیں جو بڑھتے بڑھتے گاؤں اور قریہ کی شکل میں بدلتی گئیں۔ یہ قریے قومی سرداروں اور طاقتور سربراہوں کی قوت اور طاقت کے سہارے آس پاس کے کھیتوں، گردونواح کی چراگاہوں اور اطراف وجوانب کی شکارگاہوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے اور جنگ وجدال، خون خرابہ کرکے ان پر قابض ہوجایا کرتے تھے جس قریہ نے طاقت کے بل بوتے پر اپنی پڑوسی بستی کو زیر کرلیا اس کی آبادی، قوت اور ثروت بڑھ گئی۔ اسی طرح شہروں کا وجود منصۂ شہود میں آیا۔ یہ انسان مل جل کر رہنے کا عادی اور مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اشتراک عمل اور تعاون کے بغیر زندہ رہنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ جب چند گھرانے یکجا آباد ہوئے تو صنعت وحرفت نے جنم لیا اور مصنوعات کو خریدار تک پہنچانے اور ایک جگہ کی پیداوار کو دوسری جگہ لے جانے کے لئے کاروبار اور بیوپار کی زندگی کا آغاز ہوا۔

آدم زاد اپنی پیدائش کے وقت دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوتا ہے اس کے بعد سب سے پہلے اس کو اپنی ذات کا شعور حاصل ہوتا ہے۔ پھر اپنے خاندان، اعزا واقربا سے آشنا ہوتا ہے۔ آگے چل کر شہر کے رہنے والوں اور آس پاس کے بسنے والوں سے متعارف اور روشناس ہوتا ہے۔ عمر بڑھتی ہے شعور ترقی

پاتا ہے تو ملک کے جھگڑوں بکھیڑوں میں حصہ لینے لگتا ہے۔ علم اخلاق کی اصطلاح میں افراد کی اسی جدوجہد اور کوشش کو جو وہ اپنی ذات کی اصلاح کے لئے کرتے ہیں تہذیب نفس کہا جاتا ہے۔ اپنے خاندان اور گھریلو زندگی کے لئے جو اصلاحی اقدامات کئے جاتے ہیں ان کو تدبیر منزل کا نام دیا جاتا ہے۔ سوسائٹی اور سماج کے مفاد کی خاطر جو خدمات انجام دی جاتی ہیں ان کو حسن معاشرت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ملک وقوم، ریاست ومملکت کے لئے دوڑ دھوپ کو سیاست مدن کے مشہور نام سے پکارا جاتا ہے اور جب یہ افراد مختلف اقوام وملل کے حالات اور معاملاتِ نوعِ انسانی سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں تو ان کی سعی وکوشش کو تعلقات بین المللی کا نام دیا جاتا ہے بی سیاست فاضلہ کا سیدھا اور صحیح گُر تو یہی ہے کہ خداوند عالم خالق کائنات بھی ہے اور مختار کُل اور اقتدار اعلیٰ بھی اسی کے ہاتھ میں ہے اسی نے ہم سب کو پیدا کیا اور پیدا کرکے مطلق العنان چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہماری رہبری اور راہ نمائی کے لئے آئین وقوانین بھی بنا کر بھیج دیئے ہیں۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اس کی ملکیت ہے۔ ہم کو اس نے طاقت وقوت مرحمت فرمائی ہے اس کی بدولت ہم دولت کماتے اور مالدار بن جاتے ہیں۔ اس مال ودولت کے مالک نہیں بلکہ امین کی حیثیت سے اس کے معین کردہ قوانین کے مطابق صرف کرسکتے ہیں۔ انسان نے اس فطری اصول کو نظرانداز کرکے بڑی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ اللہ کی مملوکہ زمین میں اس کا امین اور نائب بننے کے بجائے خود ایک باغی اور مستقل حکمراں بن گیا اور ہر کام میں من مانی شروع کردی۔

شروع شروع میں تو سب لوگ برابر سمجھے جاتے تھے پھر مالدار اور نادار، کالے گورے کا فرق پیدا ہوا۔ ہوشیار اور چالاک لوگوں نے کمزوروں کو دبانا شروع کیا۔ مال ودولت، قہر وغلبہ اور دھوکا دھڑی کے بل بوتے، اپنی قیادت، امارت، حکومت اور شہنشاہیت کی بنیاد ڈالی اور سادہ لوح بنی آدم کو دھوکے میں رکھنے کے لئے جھوٹے فلسفے اور سیاست نامے مرتب کئے۔ وادی دریائے نیل، فرات ودجلہ کا دوآبہ، ایران اور توران کے میدان، سندھ اور اس کے معاون دریاؤں سے سیراب ہونے والی زمینیں، گنگا اور جمنا کے سرسبز وشاداب کنارے اور ہانگو ادر یانگ سی کیانگ کے زرخیز

ساحل غرض جہاں جہاں تمدن بشری نے جنم لیا اور ثقافت وتہذیب نے برگ وبار پیدا کئے، وہاں یہ بات تسلیم کی جانے لگی کہ جو بھی طاقت وقوت کے زور پر حکمراں بن جاتا ہے اس کے منھ سے نکلی ہوئی ہر بات قانون ہوتی ہے اور اس کا ہر عمل حق کا معیار اور ہر فعل قابل ستائش ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ بولے تو اس کو سچ سمجھو، وہ دن کو رات اور رات کو دن، تاریکی کو اجالا اور اجالے کو تاریکی بتائے تو اس کی تائید کرو۔ قانون فطرت میں خونریزی بُری چیز ہے۔ ناحق انسان کو موت کا نوالا بنا لینا گناہ ہے لیکن جب فرماں روائے مملکت خون بہاتا ہے اور ایک دو نہیں، ہزاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا ہے تو اس کا یہ کام پاپ نہیں پُن۔ برائی نہیں اچھائی سے بدل جاتا ہے بی عہد قدیم کے میدانِ سیاست کے قائدین بادشاہ کو راعی اور ملک کے باشندوں کو رعایا کے نام سے پکارتے تھے آج بھی اسی دستور پر عمل درآمد ہے۔ کیا مطلب؟ یعنی بھیڑوں کے گلے کو جو چرواہے سے نسبت ہے وہی نسبت ملک کے رہنے والوں کو وہاں کے بادشاہ سے ہے جس طرح چرواہا، بھیڑوں کا اون کاٹتا، ان کا دودھ پیتا اور ضرورت پڑنے پر ان کو ذبح کر کے ان کا گوشت بھی کھا جاتا ہے اسی طرح بادشاہ اپنی رعایا کے جسم وجان اور دین وایمان کا مالک ہے اور جب مالک ہے تو اس سے باز پُرس کیسی، عدل وانصاف اور رحم وکرم کا کیا سوال؟ جب وقت وبخت کا ہُما کسی کے سر پر سایہ افگن ہو کر اس کو چتر شاہی اور تخت حکمرانی کا مالک بنا دیتا تھا تو اس کی ہر نقل وحرکت سَند اور ہر قول وعمل قابل تقلید ہو جاتا تھا۔ وہ قانون کا سرچشمہ، اختیار واقتدار کا منبع اور حق وانصاف کا معدن بن جاتا تھا۔ اس کے دربار میں بولی جانے والی زبان ٹکسالی اور اس کے منھ سے نکلا ہوا ہر لفظ فصیح سمجھا جاتا تھا بی ہزاروں سال سے سیاست کی بنیاد مکاری اور فریب پر ہے لہٰذا وہی شاطر بساط سیاست پر کامیاب رہتا ہے جو سب سے زیادہ دھوکا دے سکتا ہو۔ کیا آپ کے ذہنوں سے یہ بات نکل گئی کہ عرب امیر شام کی سیاست کا لوہا مانتے اور حضرت علی ـ کی ملکی مصلحتوں اور دینی بصیرتوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ آخر حضرت کو اظہار فرمانا پڑا: "وَاللّٰهِ مَا مُعَاوِيَةُ بِاَدْهٰى مِنِّيْ وَلٰكِنَّهٗ يَفْجُرُ يَغْدِرُ وَلَوْ لَا

كَرَاهِيَةُ الْغَدْرِ لَكُنْتُ مِنْ اَدْهَى النَّاسِ۔"

ربع مسکون پر نسلِ انسانی کی تگ ودو، جدّ وجہد اور نقل وحرکت کا بیان تاریخ کہلاتا ہے اور اس کا سرسری مطالعہ کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ ابوالبشر سے لے کر اس وقت تک یہاں خیر وشر، نور وظلمت اور عدل وظلم میں مسلسل کشمکش رہی ہے۔ خداوند عالم خیر وبرکت کا سرچشمہ ہے، اس کے نائب خیر کو پھیلانے، اندھیرے کو اُجالے سے بدلنے اور ظلم واستبداد کو مٹا کر عدل وانصاف قائم کرنے کی جدوجہد میں ہمیشہ مشغول رہے مگر شر پسند اور فتنہ وفساد کی خوگر قوتیں ان کے سامنے صف آرا ہوتی اور نت نئے حربوں سے خیر کو پھیلنے سے روکتی رہیں۔ اس کرۂ خاکی پر کیا منحصر پوری کائنات میں منفی اور مثبت عنصروں کی کارفرمائی ہے۔ سارا نظامِ حیات مجموعۂ اضداد ہے۔ ایٹم کے اندر منفی اور مثبت ذرّات کی تگ ودو ہی بزم وجود کی آرائش وزیبائش کا سبب بنتی ہے اور نفس انسانی میں جذبات متقابلہ کی کشمکش اور دار وگیر ہی آدمی کو مطلق حیوان سے ممتاز کرتی ہے۔

یہ عجائب خانۂ فطرت جس میں انسان اشرف المخلوقات بنا بیٹھا ہے اضداد کا جلوہ خانہ ہے۔ یہاں چیزیں اپنی ضد کے بغیر پہنچانی ہی نہیں جاسکتی ہیں۔ "تعرف الاشیاء باضدادها" اندھیرا نہ ہو تو اجالے کی قدر کیسے ہو، تلخی کے بغیر شیرینی کا کیا لطف، جو دُکھ سے دوچار نہ ہوا وہ سُکھ کو کیا سمجھے؟ جب تک کائنات میں زندگی، شعور وادراک کے ساتھ موجود ہے حق وناحق، خیر وشر اور نور ظلمت کی کشمکش بھی باقی رہے گی بی کائنات میں چہل پہل اور دھوم دھام اسی کشمکش کی وجہ سے ہے اور حیات انسانی کا کارواں اسی تنازع للبقا کی بدولت رواں دواں نظر آتا ہے۔ راستہ میں بہت سے موڑ ایسے آتے ہیں جب اس کارواں کے قدم ڈگمگانے لگتے اور گھات میں لگے ہوئے رجعت پسند ڈاکو اور ظلمت خیز قزاق اس قافلہ پر چھاپہ مارنے پر تل جاتے ہیں مگر دیکھتے ہی دیکھتے ترقی پسند قوتیں میدان میں نمودار ہو کر کاروان کو تباہی سے بچا لیتی ہیں۔

۶۰ھ میں بھی یزید نے اپنے اعوان وانصار سمیت نسل بشری کی ترقی کی راہ روکنی چاہی تھی۔

رسول اکرمؐ نے آزادیِ فکر و بیان اور حریت عمل و ایقان کی جو شمعیں جلائی تھیں۔ عدل و مساوات کی جس شاہراہ پر نسل انسانی کو ڈال دیا تھا۔ یزید اس سے بنی آدم کو محروم کرنا چاہتا تھا۔ امام حسینؑ نے جو وارث رسالت مآبؐ ہونے کے ساتھ ساتھ وارثِ آدمؑ بھی تھے۔ آگے بڑھ کر اس کو للکارا اور اپنی حکمت عملی سے تمدن، تہذیب، ثقافت اور ترقی کے عمل کو تیز کر دیا۔ یزید اپنے آپ کو داعی انقلاب، مصلحِ اخلاق، پیغمبر عدل و انصاف کا جانشین کہتا تھا اور ان کا نام لے کر تاریخ کے عمل اصلاح کا رُخ موڑنا چاہتا تھا، امام حسینؑ نے اسے بے نقاب کر دیا اور مختصر سے گروہ کو ساتھ لے کر اس کی طاغوتی اور سامراجی طاقتوں کا اس بہادری سے مقابلہ کیا کہ سارے معاشرے کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے منصوبے خاک میں مل گئے۔ ہم ہر سال کربلا کی تاریخی جنگ کی یادگار مناتے ہیں۔ ایشیاء، افریقہ اور یورپ میں جہاں جہاں ظالم دشمن اور مظلوم دوست قومیں بستی ہیں وہاں یہ داستان غم بار بار دہرائی جاتی ہے اور حقوق انسانی کی طلبگار ہستیاں اس مختصر گروہ کی شجاعت، ہمت اور بے جگری کا ذکر سن کر عش عش کرتی ہیں جس نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل استبداد اور انسانیت سوز اقتدار کے خلاف مؤثر آواز بلند کی تھی۔ یہ بیسویں صدی ہے اور دنیا ایک دو نہیں بیسیوں ایسی جنگیں دیکھ چکی ہے جس میں لکھوکھا آدمیوں نے صف آرائی کی تھی اور نتیجہ میں شہر ہی نہیں بلکہ ملک کے ملک تباہ ہو گئے کربلا کی جنگ اس وجہ سے یادگار زمانہ نہیں ہے کہ اس میں اتنی فوجیں جمع ہوئی تھیں جتنی کسی جنگ میں جمع نہ ہو سکی تھیں یا ایسے اسلحہ استعمال ہوئے جس کی نظیر دوسری جگہ نہیں ملتی یا جنگ کربلا بے نظیر ہے اور ضرور بے نظیر ہے مگر وہ بے مثال اس لئے ہے کہ اس کے نتائج واضح، فیصلہ کن اور قطعی تھے۔ اس نے ایک طرف امام حسینؑ کے موقف کی وضاحت کر دی، ان کے مشن کو صاف طور پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور دوسری طرف یزید کو بے نقاب کر دیا اور اس سازش کو واضح کر دیا جو اس نے اور اس کے اعوان و انصار نے نوع انسانی کی آزادی چھیننے کے لئے کی تھی۔ یزید اور اس کے پیش رووں نے افرادِ انسانی سے جرأت اظہارِ حق و حقانیت کو سلب کرنے کی کوشش کی تھی، دین اور مذہب

کے نام پر لادینی اور لامذہبیت کو رواج دینا چاہا تھا۔ جنگ کربلا کا مقصد یزید یا امثال یزید کا فنا کرنا نہ تھا بلکہ یزیدیت اور مقصد یزید کو تہس نہس کرنا تھا۔ جس کو ہم دورانِ گفتگو میں واضح کریں گے۔

فرات و دجلہ سے سیراب ہونے والی سرزمین بڑی تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں کسی زمانہ میں کلدانیہ، بابلی اور اشوریہ کی تہذیب وثقافت قائم رہ چکی تھی۔ یہاں دنیا کا سب سے قدیم تحریری آئین تحریر کیا گیا تھا۔ یہاں بابل کا مشہور منارہ سربلند رہ چکا تھا۔ یہاں نینوا کی قدیم عظمت کے کھنڈر موجود تھے۔ یہاں کی سرزمین نے خلیلِ خدا ''ابراہیمؑ'' اور ذبیح خدا ''اسمٰعیلؑ'' کے قدم چومے تھے اور کفر و شرک کی گھنگھور گھٹا میں سراجِ توحید کی روشنی دیکھی تھی۔ اس وادی میں خدا پرست خلیل نے شاہی بُت کدہ کو ویران کیا تھا اور آتش نمرود کو گلزار بنایا تھا اور یہی زمین تھی جس پر حسینؑ باطل کو للکار رہے تھے۔ ان کے بہادرانہ تیور اور مصلحانہ انداز بتا رہے تھے کہ یزید لات و منات و ہبل کا پجاری، نمرود و فرعون و شداد اور ابولہب و ابوجہل کا جانشین ہے اور حسینؑ الوہی پرچم کے علمبردار، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے وارث اور اپنے نانا محمد مصطفیٰؐ کے دین کے داعی و محافظ ہیں۔ بھوک اور پیاس کے عالم میں جب میدانِ کارزار گرم تھا، تیر زَن زَن اِدھر سے اُدھر گزر رہے تھے، تلواروں کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔ گھوڑوں کا ہنہنانا اور اونٹوں کا بلبلانا گرج کا سماں پیش کر رہا تھا، سروں کی بارش ہو رہی تھی اور خون کا سیلاب اُمنڈ رہا تھا۔ قلب و جگر کے ٹکڑے، وفادار ساتھی اور قدر شناس دوست خاک و خون میں لوٹ رہے تھے۔ مگر نہ قلب میں آتشِ انتقام بھڑکی اور نہ لب پر حرفِ شکایت آیا۔ جوان بیٹے کی لاش نظر آئی تو شکر کا سجدہ ادا کیا۔ چہیتے بھتیجے کی میت اُٹھائی مگر تیوریوں پر بل نظر نہیں آئے۔ برابر کے بھائی کو دم توڑتے دیکھا لیکن صبر و ضبط کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ چھ مہینے کا بچہ تیرِ ظلم اپنے گلے پر لے کر جنت کو سدھارا اور آپ "رِضًا بِقَضَائِهٖ وَتَسْلِيماً لِاَمْرِهٖ" کا مجسمہ بنے رہے اور جب قاتل کا خنجر خشک گلے پر چلنے لگا تو امت کی نجات کی دعا اور اللہ کی عظمت و کبریائی کے اقرار کے سوا زبان پر کوئی ذکر نہ تھا۔ اب ذرا کوفہ کی دَل بادَل فوج کی طرف نظر اُٹھا کر

نہ دیکھئے۔ وہ ناحق شناس، احسان فراموش، سنگدل اور جفا پیشہ سپاہی کسی اُصول وآئین کے تحت نہیں بلکہ شاہی وظیفہ اور سرکاری انعام واکرام کی لالچ میں نبیؐ کے نواسے اور حامی حقوقِ نوعِ انسانی کا خون بہانے پر تلے ہوئے تھے۔ دونوں فریق کے اعمال وافعال، ارادوں اور عزائم کا جائزہ لینے گئے یہ واضح طور پر معلوم ہو رہا تھا کہ ایک طرف نور ہے اور دوسری طرف ظلمت، ایک طرف حق ہے دوسری طرف باطل ایک حق وحقانیت پر جان دینے والا اور دوسرا باطل وضلالت پر مر مٹنے والا۔

امام حسین علیہ السلام غیظ وغضب سے مغلوب اور غم وغصہ کی وجہ سے بے قابو ہو کر اقدامات نہیں کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک مرتب لائحۂ عمل اور پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ وہ کلمۂ حق کی سربلندی کے لئے اٹھے تھے اور اللہ کے بتائے اور رسولؐ اللہ کے آزمائے ہوئے اس کارگر نسخہ پر عمل کر کے فتح حاصل کرنا چاہتے تھے جس سے چھوٹے چھوٹے گروہوں کو بڑے بڑے لشکروں پر غلبہ حاصل کرنے کی توفیق مل جاتی ہے بی حسینؑ کی قائدانہ صلاحیت اور الٰہی سیاست کا کمال یہ تھا کہ پوری جنگ مُدافعانہ اُصول پر لڑی۔ حملہ میں کبھی پہل نہیں کی۔ بھاگتے کا تعاقب نہیں کیا اور حملہ آوروں کو حتی الامکان ان کے ناپاک عزائم سے باز رکھنے کی تلقین فرمائی۔ آپ کی سیرت اور کردار صاف طور سے اسلام کے نام پر عام جنگوں اور جہاد اسلامی کے درمیان حد فاصل قائم کرتا ہے بی عام طور پر جنگ، یہ ایک حریصانہ عمل یا انتقامی اقدام کا نام رکھ لیا گیا ہے جس میں حریف پر غلبہ پانے کے لئے جائز وناجائز کسی حرکت سے دریغ نہیں کیا جاتا ہے۔ اور جہاد اسلامی، یہ ایک عبادت ہے جس میں رضائے الٰہی حاصل کرنے اور اعلائے کلمۂ حق کا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ بات کی پیچ، خواہ مخواہ کی تباہی، توسیع مملکت اور تحصیل مال اس کی غرض نہیں ہوتی ہے۔

اسلام کی ساری عبادتوں کی طرح جہاد بھی لِوَجْہِ اللہ ہوتا ہے اس کے بھی آداب وقواعد وشرائط، ارکان اور واجبات ہوتے ہیں۔ یہ امام عدل کی قیادت میں، حق کی حفاظت وحمایت کے لئے ادا کیا جاتا ہے بی تلوار لے کر لڑنا مردوں کے لئے ہے اور گھر کے محاذ کی حفاظت اور زخمیوں کی

مرہم پٹی کا کام عورتیں بھی کر سکتی ہیں بی پرانے زمانے میں جنگیں زر، زمین اور زن کے لئے لڑی جاتی تھیں اور آج نسل انسانی اُسی محور پر گردش کرتی نظر آتی ہے، شاطر موقع پرست اور چالاک لوگ اپنے اقتدار کی خاطر گروہوں، جماعتوں اور قوموں کو لڑا دیا کرتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کاش مسلمان کی آنکھ کھل جائے اور مصلح ومفسد میں تمیز کرنے لگے۔ بے چارے عوام جذباتی ہوتے ہیں، ہمارے اقتدار دوست اسلامی قائدین بھولے بھالے عوام کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج کل کے فرقہ وارانہ فسادات میں خواہ شیعہ سنّی فسادات ہوں یا ہندو مسلم نزاعیں یا کوئی اور باہمی جھگڑا، استعماری غیر ملکی ہاتھ کے علاوہ ریاست کی خواہش، اقتدار کی چاہت اور رہ نمائی اور لیڈرشپ کی للک کارفرما ضرور ہے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگلے زمانے میں موقع پرست افراد اپنی قیادت وریاست کی خاطر قوموں کو لڑوا کر ملکوں پر قبضہ کر کے وہاں کی آبادی کو اتنا بے دست وپا بنا دیا کرتے تھے کہ ظلم وجور سہنے والی مخلوقِ خدا احتجاج بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سرکش اور بغاوت خو لوگوں کو رشوت کی خواب آور گولیاں دے دیتے تھے اور محنت کش ناداروں کو جبر وتشدد کے شکنجوں میں جکڑے رہتے تھے۔ حقوق انسانی کا شعور ابھی بیدار نہیں ہوا تھا اور رعایا کے اندر راعی کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ قہرمانِ دمشق نے جب اسلام کے عطا کردہ حقوق انسانی کو پامال کرنا شروع کیا اور معاشرے سے اظہار رائے اور آزادی عمل کی نعمت کو چھیننا چاہا تو پروردۂ آغوش رسولؐ حسینؑ نے چاہا کہ دنیا کو اس لعنت سے نجات دلائیں۔

یہ ذکر ہے اس وقت کا جب فرانس کے انقلاب کا خواب بھی کسی نے نہیں دیکھا تھا اور انقلاب رُوس کا کیا ذکر روس کے نام سے بھی دنیا آشنا نہ ہوئی تھی۔ مگر امام حسینؑ نے اس گھر میں پرورش پائی تھی جہاں سے منشورِ اسلامی شائع ہوا تھا، جس نے انسانی حقوق معین اور مقرر کئے تھے۔ رسولؐ مقبول کی تعلیم وتربیت اور قرآن کی حریت ساز تبلیغ اگر آج نہ کام آئی تو کس دن کام آتی یہ سمجھنا غلط ہے کہ امام حسینؑ خواہ مخواہ مخالفت مول لینے کے عادی اور سرکشی وبغاوت پر آمادہ تھے۔ صحیفۂ

کارنامۂ حسینی کے اوراق عجلت کے ساتھ نہ اُلٹئے ۔ ہر صفحہ پر غور کیجئے اور آپ کی زندگی کے تدریجی حالات پر رُک رُک کر نظر ڈالئے ۔آپ کی روش شروع سے لے کر آخر تک مصالحانہ رہی ہے ۔ جب بڑے بھائی امام حسن علیہ السلام نے امیر شام سے صلح کی تھی تو ایک گروہ نے آپ کو آمادہ کرنے کی سعیٔ ناکام کی تھی کہ ''آپ اس صلح کو نہ مانیے اور الگ ہو کر معاویہ پر حملہ کر دیجئے ۔ دیکھئے سارا عراق آپ کا ساتھ دیتا ہے یا نہیں ۔ایران وخراسان کے لوگوں کو اس صلح سے بہت مایوسی ہوگی ۔یمن کے بہادر بھی اس اقدام کو پسند نہ کریں گے اور یہ تازہ دم فوجیں آپ کے علم جہاد کے سایہ میں شامیوں سے لڑنے میں کوتاہی نہیں کریں گی ۔ حسینؑ مدبّر باپ کے دُور اندیش فرزند ،سیاست وقت کو تاڑ گئے آپ نے فرمایا: ''ہم وہ نہیں ہیں جو عہد کر کے توڑ دیں اور صلح وصفائی کی فضا کو فتنہ وفساد کے غبار سے تاریک بنا دیں ۔'' دستاویز صلح پر امیر شام نے کبھی پوری طرح عمل نہیں کیا اس لئے اہلبیتؑ کے جاں نثاروں اور علیؑ کے طرفداروں میں ہمیشہ غم وغصہ پھیلا رہا ۔ جب امام حسن علیہ السلام شہید کر دیئے گئے تو کوفہ کی باسی کڑھی میں پھر اُبال آیا ۔ بہت سے لوگ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے : ''عہد نامہ کرنے والا ہی نہ رہا تو معاہدہ کی پابندی کیسی ؟'' امیر معاویہ خود ہر شرط کی خلاف ورزی کر چکے ہیں اور زہر دینے کی سازش کر کے تو وہ بالکل معاہدہ کی توہین کر چکے ہیں ۔ بسم اللہ کیجئے اور معاہدہ کو کالعدم قرار دینے کا اعلان فرما دیجئے ۔'' حضرتؑ نے فرمایا: ''معاہدے عمل کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں ،معاویہ اپنے وعدے کے پابند ہوں یا نہ ہوں ،ہم نے جو وعدہ کیا ہے اس پر ہم کاربند رہیں گے ۔''

آخر وہ وقت بھی آیا جب موت کے فرشتہ نے امیر شام کے دروازے پر دستک دی اور ان کی روح وتن میں جدائی ہوگئی اور معاہدہ کے خلاف یزید مسند خلافت پر براجمان ہوا ۔معاویہ نے اپنی عمر کے آخری دنوں میں یزید کی خلافت کے لئے جدوجہد شروع کر دی تھی اور دھن ،دھونس ،دھاندلی اور دھینگا مشتی سے اس مسند نشینی کی راہ صاف کر دی تھی ۔ معاہدہ کی رو سے معاویہ کے بعد حضرت امام

حسینؑ کو تنہا مسند خلافت کا حق پہنچتا تھا ۔معاہدہ کی پوری مخالفت کے بعد امام حسین علیہ السلام پر کوئی پابندی باقی نہ رہ گئی تھی ۔ وہ چاہتے تو جائز طور پر اپنے حق کا مطالبہ کر سکتے تھے اور اس کے حصول کے لئے فوج کشی اور قبائل عرب کو خروج کو اوپر مائل کر سکتے تھے مگر انھوں نے کوئی پیش قدمی نہیں فرمائی ۔ معاہدہ کی رو سے ان کو یہ قانونی حق حاصل تھا کہ وہ حاکم مدینہ ولید کو گرفتار کر لیتے اور اپنی حکومت کا اعلان کر کے شہروں اور صوبوں میں اپنی طرف سے حاکم و گورنر مقرر فرما دیتے اور عرب قبائل سے بیعت کر لینا شروع کر دیتے ۔ یہ سب کچھ کر سکتے تھے اسی سابق عہد نامہ کے تحت مگر حسینؑ یہ اس وقت کرتے جب ریاست کے طالب ہوتے ،حکومت کا قیام اپنی قیادت میں مدّنظر ہوتا ۔امام حسینؑ نے یہ کچھ نہ کیا بلکہ صبر فرمایا اور صرف اس لئے کہ بات نہ بڑھے ،ملک میں فتنہ وفساد برپا نہ ہو ۔آپ مصالحانہ طور پر مدینہ چھوڑ کر مکہ کی طرف نکل گئے ۔ جو سارے عالم کے لئے دارالامن ہے اور جہاں بیٹھ کر آدمی نوعِ بشر کی سلامتی اور بہبودی کی تدبیریں تو سوچ سکتا ہے مگر ملک گیری اور دنیا طلبی کی ہوس میں مبتلا نہیں ہو سکتا ہے کم از کم پروردۂ آغوش تربیت رسالت حسینؑ سے تو کسی طرح یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ خانۂ خدا کو دنیوی سیاسی سازشوں کا مرکز بنائیں گے ۔ اگر حکومت وقت ان سے مزاحمت نہ کرتی اور حاجیوں کے بھیس میں فوجی دستوں کو ان کے قتل کے لئے نہ بھیجا جاتا تو شاید وہ کبھی اس مقدس مقام سے الگ نہ ہوتے مگر خانۂ خدا کی حرمت کا آپ کو اس قدر پاس ولحاظ تھا کہ جب یہ خبر ملی کہ لوگ یہاں بھی خونریزی سے باز نہ آئیں گے تو موسم حج کے قریب مکہ سے روانہ ہو گئے ۔ امام حسینؑ ہاشم وعبد مناف کے وارث عامر وعمران کے ورثہ دار اور رسول عربی وعلی بن ابی طالب کے فرزند تھے ۔ایسے لوگ موجود تھے جو آپ کو رسالت مآبؐ کے کاندھوں پر سوار اور سینہ پر آرام کرتا دیکھ چکے تھے ۔ اگر آپ چاہتے تو حج کے موقع پر جب سارے عالم اسلام کے لوگ جمع تھے تو یزید کے خلاف رائے عامہ استوار کر لیتے اور عربی قبائل کو دعوتِ جہاد دے کر ایک عظیم لشکر اکٹھا کر لیتے ،مگر یہ اس وقت کرتے جب حسینؑ کا مقصد حکومت کی داغ بیل ڈالنا ہوتی ۔ حسینؑ کا مقصد

حکومت نہیں تھا اصلاح امت تھا اسی لئے خاموشی کے ساتھ مکہ سے نکل آئے۔ جا بجا قبائل عرب کے مساکن سے ہو کر گزرے ان کے چشموں اور تالابوں پر قیام بھی کیا مگر کسی قبیلہ کو اپنی حمایت کے لئے دعوت نہیں دی اور نہ بھرتی کا کوئی دفتر کھولا اور نہ اپنے اغراض و مقاصد کی تبلیغ کے لئے سفیر بھیجے۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ حسینؑ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو ذاتی مفاد اور شخصی اقتدار کی خاطر تمام دنیا کو تباہی کے غار میں ڈھکیل دیتے ہیں بی ہمارا امام مکہ سے تو نکل آیا۔ اب کسی طرف جانا تو ضرور تھا۔ یزید جیسے ظالم و جابر کی طویل و عریض حکومت میں امام حسینؑ جس طرف جاتے، موت آپ کے سر پر مسلّط رہتی، کوفہ کے علاوہ کسی مقام سے دعوت نہیں ملی تھی۔ عراق کا یہ مرکزی شہر فوج کی چھاونی تھا، ان کے والد بزرگوار اور بڑے بھائی کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ یہاں کی آبادی میں ہزاروں افراد ایسے تھے جو حضرت امام حسینؑ کے خاندان کے علمی و دینی فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو چکے تھے جن کو ان کی قدر و منزلت کا اعتراف تھا اور اسی معاہدہ کے چشم دید گواہ کی حیثیت رکھتے تھے جو ان کے خاندان اور معاویہ کے درمیان ہوا تھا اور ان گفتگوؤں کے سننے والے تھے جو اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً ہوتی رہی تھیں۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے حضرت کوفہ نہ جاتے تو کدھر جاتے؟ امن و امان، تائید و امداد کی تھوڑی بہت جو امید ہو سکتی تھی کوفہ ہی سے ہو سکتی تھی۔ دوسرے شہروں نے تو جھوٹے منھ بھی آپ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت نہیں دی۔ مدینہ پہلے ہی چھُٹ چکا تھا۔ مکہ کی حرمت برباد ہوتے دیکھنا آپ کو گوارا نہ تھا۔ پھر ان دونوں شہروں کے باشندے انقلابی روح سے نا آشنا ہوتے ہوئے تقدس فروشی میں گرفتار ہو چکے تھے۔ ارتشی تنظیم اور فوجی ولولے کے بجائے ان پر مجاوری کی غشی طاری تھی، وہ پرانی روایتوں اور مذہبی عقیدوں میں زیادہ مصروف نظر آتے تھے۔ زندگی کے عملی مظاہروں اور مملکت و معاشرت کے نت نئے تقاضوں سے ان کو دور کا بھی کوئی لگاؤ نہیں تھا۔

حسینؑ حجاز سے عراق کی طرف بڑھے، کوفہ ان کی منزل مقصود تھا، عزم و ارادہ یہ تھا کہ شہری آزادی کو بحال کرائیں، اسلام نے مسلم کی جو تعریف کی ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے کسی کو کوئی گزند نہ

پہنچے اور ہر فرد دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو اور سلامتی کا ذمہ دار ہے اسی صفت کو معاشرے میں رائج کریں۔ چاہے اس کو رواج دینے میں بڑی سے بڑی قربانی ہی کیوں نہ دینا پڑے کوفہ میں میرے باپ اور بھائی نے حق آشنا اور صلح پسند لوگوں کی جو جماعت خلق کر دی تھی اس سے کام لے کر اندھیرے کو اجالے، تاریکی کو روشنی اور دورِ ظلم و استبداد کو عدل و داد گستری سے بدل دیں اور اگر کوفہ میں یہ اسلامی ماحول اور معاشی نظام قائم نہ ہو سکا تو اپنی جان کو قربان کر کے ایک ایسا منارۂ ہدایت نصب کر دوں کہ جو رہتی دنیا تک بنی آدم کو امن و آشتی کی راہ دکھاتا رہے۔ امام حسینؑ خوں ریزی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ انسانی جان کی حُرمت اور عظمت بشر کے قائل تھے۔ دوسروں کی شمع حیات گل کر کے اپنا چراغ جلانا نہیں چاہتے تھے اور نہ اوچھے ہتھیار استعمال کر کے غلبہ اور تسلط حاصل کرنے کے خواہش مند تھے بی جب یہ نظر آنے لگا کہ اموی حکومت ان کو چار جانب سے گھیر کر بیعت پر مجبور کرنا یا جان لینا چاہتی ہے تو انھوں نے مردانہ وار یہ چیلنج قبول کیا اور اسلام کے شریفانہ اصول جنگ کی پابندی کر کے دنیا کو بتا دیا کہ دشمن، مخالف اور حریفِ میدانِ وغا کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں جن پر کاربند رہنا ہر مہذّب اور شائستہ فریق جنگ کا فرض ہے حُر کے پیاسے لشکر کو جو آپ کو گھیر کر حاکم وقت کے سامنے پیش کرنے کے لئے آیا تھا، سیراب کیا۔ عمر سعد کو جو حکومت رَے کی لالچ میں آپ کے قتل پر آمادہ تھا، نہایت نرمی سنجیدگی اور شریفانہ طریقہ پر اس حرکت سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ آپ نے اسے سمجھایا کہ میرے قتل کے بعد یزیدی حکومت کے خلاف جو انقلاب برپا ہوگا اس کی وجہ سے تمہاری امیدیں پوری نہ ہو سکیں گی بلکہ جان تک خطرہ میں پڑ سکتی ہے۔ اگر مال و دولت کی تمنا ہے تو میں اپنی جائداد تمہارے نام منتقل کئے دیتا ہوں مزے سے زندگی گزارو اور آل محمدؐ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرو۔ تاریخ کے آئینہ سے وہ غمناک منظر بھی اوجھل نہیں ہے جب زخموں سے چور ہو کر آپ زمین گرم کربلا پر خاک و خون میں غلطاں تھے۔ عمر سعد لوگوں کو آپ کا سر قلم کرنے کے لئے بھیجتا تھا اور آپ قتل کا ارادہ رکھنے والے سے فرماتے تھے: ''میں زخموں سے چور ہوں، تین روز سے بھوکا

پیاسا ہوں، سیروں خون میرے جسم سے نکل چکا ہے اور دل کے ٹکڑے اور جگر پارے آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ کر دم توڑ چکے ہیں، زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکوں گا، تو کیوں اپنے نبی کے نواسے کو قتل کر کے وبال دنیا وآخرت مول لیتا ہے'' کئی آدمی یہ سن کر واپس چلے گئے مگر شمر جو بلا کا قسیُ القلب اور ظالم، انسان نما درندہ خصلت جانور تھا، آپ کی بات نہ مانی اور اس کے خنجر نے ہمارے امام کے سر وتن میں جدائی کر دی۔ قاتل خود نقل کرتا ہے کہ جب تک سانس کی آمد ورفت باقی رہی۔ آپ امت کی نجات کے لئے دعائیں کرتے رہے۔ لب پر شکوہ تھا اور نہ گلہ دل کی گہرائیوں سے حمد الٰہی اور بخشش اُمت کی التجا کی آوازیں آرہی تھیں۔

ہم امام حسینؑ کو اپنا قومی رہبر اور دینی پیشوا جانتے اور دو مہینہ آٹھ دن خصوصیت کے ساتھ ان کی یاد میں مجلسیں کرتے اور جلوس عزا نکالتے ہیں۔ اگر ان کے پاکیزہ کردار اور بلند افکار کو بھی اپنا لائحۂ عمل بنائیں تو نوع انسانی کی بڑی خدمت کر سکتے ہیں۔ آج جہاں جہاں بھی مسلمان آباد ہیں سیاسی حربوں کی بدولت نقصانِ مایہ اور شماتتِ ہمسایہ کے شکار ہیں۔

عشرۂ محرم رسمی طور پر نہ منایئے۔ یہ حسینی درسگاہ، اسلامی تعلیم کو از سر نو دہرانے اور زندگی کو اسی اخلاقی سانچے میں ڈھالنے کا موقع بہم پہنچاتی ہے جس نے بہتّر جانبازوں کو کم از کم تیس ہزار کی فوج پر غالب کر دیا تھا، جہاں حسینؑ کی بے مثل قیادت نے عرب وعجم، رومی اور ترکی اور حبشی نسل کے لوگوں کو نظریاتی وحدت کے ذریعہ شانہ بشانہ کھڑا کر دیا تھا۔ آج بھی فرزندان اسلام پر سخت وقت آتے ہیں اور عصر حاضر کی تخریبی قوتیں ان صلاحیتوں کو چیلنج دیتی ہیں۔ کیا آزمائش کی ایسی گھڑیوں میں ہم کاروان کربلا سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں یا نہیں؟

تذکرۂ حسینی کو زندہ رکھنا اور حسینی سیاست، شجاعت اور قائدانہ صلاحیت کو مثال کے طور پر اپنی موجودہ اور آئندہ نسل کے سامنے پیش کرنا اسلام اور مسلمانوں کی بقاء اور ترقی کے لئے ضروری ہے۔

❀❀❀

حسینؑ اور انسانیت

رئیس العلماء آیۃ اللہ سید کاظم نقوی، سابق ڈین آف تھیالوجی ڈپارٹمنٹ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

سمندر کے ٹھہرے ہوئے پانی میں جب کوئی پتھر پھینکا جاتا ہے تو اس کے پہنچتے ہی اس کے محل وقوع کے ارد گرد شروع میں پانی کی لہروں کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنتا پھر وہی وقت گزرنے کے ساتھ بڑا ہوتا رہتا ہے حضرت امام حسین علیہ السلام کے واقعۂ شہادت کی بھی تقریباً یہی شان ہے کہ اگرچہ تیرہ سو برس سے زیادہ کا عرصہ اس کو پیش آئے ہوئے گذر چکا ہے لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات کا دائرہ برابر وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

جہاں کہیں ظلم وباطل کے خلاف کوئی مظلوم اور حق پسند آواز بلند کرتا اور قدم اٹھاتا ہے تو اس کی نظر حضرت امام حسینؑ کے مثالی اقدام کی طرف جاتی ہے وہ ان کی ہمت، جرأت وشجاعت، حق پسندی، صاف گوئی، فداکاری، ثبات واستقلال اور سکون واطمینان کو اپنا راہنما قرار دیتا ہے۔

امام حسینؑ کی عظیم شخصیت کو صرف مسلمان قدر ومنزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں بلکہ وہ تمام اقوام وملل کے مذہبی عقائد کے انتہائی گہرے اختلافات کے باوجود سب کی عقیدتوں کا نہایت مقدس روحانی مرکز ہے، یقیناً گوناگوں وجوہ سے وہ اسی کی حق دار اور سزاوار ہے۔

۱۔ یہ دنیا خود غرضی کی گھنونی بستی کا نام ھے

اس دنیا میں اپنے دنیوی شخصی مفادات کے پجاری رہتے ہیں، عام طور پر لوگوں کو اپنے ذاتی مفاد سے سروکار ہے۔ یہاں خالص رفاہِ عام کے کاموں کے پیچھے بھی پست نفسانی اغراض کارفرما نظر آتے ہیں اکا دکا آدمی ملتے ہیں جو اپنے ذاتی فائدوں کو قربان کرتے ہوئے کسی ایسے کام کے لئے تیار نہیں ہوتے جو ان کے نزدیک غلط ہو، سیاست کی دنیا میں ایسے لوگوں کو عقل

مند، مصلحت اندیش اور کامیاب نہیں سمجھا جاتا ہے۔

آخر اس میں کیا مضائقہ تھا کہ حضرت امام حسینؑ بھی بہت سے عوام الناس کی طرح یزید کی بیعت کر لیتے، یقیناً اس صورت میں خود ان کی جان ان کے رشتہ داروں اور دوستوں کی جانیں بچ جاتیں، انہیں اپنا وطن مدینہ نہ چھوڑنا پڑتا، وہ دیار بہ دیار پناہ گاہ تلاش نہ کرتے پھرتے، انہیں گھیر کر تین دن کا بھوکا پیاسا کربلا کے تپتے ہوئے میدان میں تلواروں اور بھالوں سے ٹکڑے ٹکڑے نہ کیا جاتا، ان کی لاشوں پر گھوڑے نہ دوڑائے جاتے، ان کے وفادار جوان بھائی عباسؑ کے شانے نہ کاٹے جاتے ان کے سر پر گرز نہ مارا جاتا، ان کے کڑیل جوان بیٹے علی اکبرؑ کے سینے پر برچھی نہ لگائی جاتی، ان کے چھ مہینے کے بچے کو بھوک پیاس کی حالت میں تین بھال کے تیر کا نشانہ نہ بنایا جاتا لیکن حسینؑ نے تمام دنیا کے انسانوں کے سامنے بلاتفریق مسلک وملت عملی مثال پیش کر دی کہ آدمی یہ تمام مصیبتیں، تمام تکلیفیں، تمام ظاہری ذلتیں برداشت کر سکتا ہے، مگر جس کام کو اس کی عقل اور اس کا ضمیر غلط سمجھتا ہو اسے وہ ہرگز نہیں کر سکتا۔

یزید کی طرف سے جب مدینہ کے حاکم ولید نے امام حسینؑ سے خواہش کی کہ وہ یزید کی بیعت کر لیں تو انہوں نے ایک ایسا جواب دیا جس نے تمام دنیائے انسانیت کے سامنے یہ اصول بنا کر رکھ دیا کہ ضمیر فروشی کسی قیمت پر بھی نہیں کی جا سکتی۔

ان یزید رجل فاسق شارب الخمر قاتل النفس المحترمه معلن بالفسق ومثلی لایبایع مثله۔

(لہوف ابن سید طاؤسؒ)

''یزید ایک فاجر و فاسق شخص ہے۔ وہ شراب پیتا، کھلم کھلا خدا کے احکام کی نافرمانی کر کے ان کی توہین کرتا ہے، میرا جیسا آدمی اس جیسے شخص کی بیعت نہیں کرے گا۔''

امام حسینؑ چوں کہ خاندان رسالتؐ کے بزرگ ترین نمائندے تھے اس لئے جانتے تھے کہ

میرے بیعت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ میں نے یزید کو اس قابل مان لیا ہے کہ میرے جیسا انسان اس کی بیعت کرے، کوئی دوسرا ایسا کر سکتا تھا، لیکن حسینؑ جس بلند اور مثالیہ کیریکٹر کا نام ہے وہ ہرگز ایسا نہیں کر سکتے تھے، یزید کے سامنے ان کے سر جھکانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈال لیں، یزید کے لئے لوگوں سے جو بیعت لی جا رہی تھی وہ یہ نہیں تھی کہ حاکم وقت کتاب خدا قرآن مجید اور پیغمبر اسلامؐ کی سنت وسیرت کے مطابق عمل کرے گا، اگر ایسا بھی ہوتا تب بھی حسینؑ کا یزید کی بیعت کرنا شرعی اور قطعی طور پر صحیح نہیں تھا، کیوں کہ یزید کا گزشتہ اور موجودہ کیرکٹر اس کی اجازت نہیں دیتا تھا، اس کے کسی توبہ نالے کی نشر واشاعت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ ''**آزمودہ را آزمودن خطا است**'' کا اٹل اصول بھی اس کا روادار نہیں تھا، امام حسینؑ کی صلح کی شرطوں کا کیا ہوا؟ اس کو کون نہیں جانتا، تاریخ بتاتی ہے کہ جب مسلم ابن عقبہ اہل مدینہ سے یزید کے لئے بیعت لے رہا تھا تو اس کے پاس یزید ابن عبداللہ ابن ربیعہ کو لایا گیا مسلم ابن عقبہ نے ان سے کہا کہ میری بیعت کرو۔ انہوں نے کہا کہ میں تمہارے ہاتھوں پر بیعت کرتا ہوں بشرطیکہ کتاب وسنت پر عمل کیا جائے، مسلم ابن عقبہ نے کہا کہ اس طرح بیعت نہیں ہوگی، اس طرح بیعت کرو کہ تم امیر المومنین یزید کی ملکیت ہو وہ جو چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امام حسینؑ کی بیعت یزید کر لینے کا مطلب یہ تھا کہ آپ خدا سے اپنی بندگی کا رشتہ توڑ کر یزید کی بندگی اختیار کر لیں خدا نے تمام انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے لیکن یزید انھیں اپنا غلام بنانا چاہتا تھا۔

امام حسینؑ نے یزید کی بیعت سے انکار کر کے انسانی عزت وشرافت کا بھرم رکھ لیا تھا، معقول حدوں کے اندر آزادی انسان کا فطری حق ہے، تمام انسانیت کا دل اس لئے امام حسینؑ کی ذات کی طرف کھنچنا چاہئے کہ آپ نے اس کے اس فطری حق کو محفوظ کر دیا آپ وہ تھے جن کا مقولہ تھا کہ:

''اے انسان تو اپنے کو کسی دوسرے کا غلام نہ بنا، کیوں کہ تجھے خدا نے آزاد خلق کیا ہے۔''

امام حسینؑ اس لئے عزت واحترام کے حق دار ہیں کہ انہوں نے جو کہا تھا وہ کر کے دکھا دیا، اقوال کے میدان کے شہسواروں کی دنیا میں کمی نہیں ہے لیکن ایسے لوگوں کی بہت کمی ہے جن کا عمل ان کے قول کے مطابق ہو قول اور فعل کی ہم آہنگی ایک ایسی ممدوح صفت ہے جو ادیان و مذاہب کے افتراق سے بالاتر ہے، اس لئے حسینؑ کی ذات کو بھی ان جدائیوں سے بالاتر رکھنا چاہئے۔

۲۔ باطل اقتدار کے خلاف بغاوت قابل فخر ہے۔

یہ صدی دبی پسی قوموں کی سر اٹھانے کی صدی ہے۔ یہ صدی کمزوروں مجبوروں اور بے سہارا لوگوں کے ابھرنے کی صدی ہے، یہ صدی ظلم و استحصال کا جوا اتار پھینکنے کی صدی ہے۔ یہ صدی انانت ونخوت، غرور وتکبر کا سر کچلنے کی صدی ہے، یہ صدی فقر وتنگ دستی، غربت وفلاکت و افلاس و بے چارگی کے باغیانہ جذبات کے بروئے کار آنے کی صدی ہے۔ اس صدی میں حسینؑ اور حسینیت ضرور اس قابل ہیں کہ دنیا کی تمام ایسی قوتیں جو جابرانہ اقتدار سے چھٹکارے کے لئے قدم اٹھا چکی ہیں یا اس کی بابت سوچ بچار کر رہی ہیں انھیں اپنا رہنما اور سنگ میل قرار دیں، جنھوں نے اس وقت جب کہ وہ یزید کی بیعت کرنے سے قطعی انکار کر چکے تھے اور مروان ابن حکم نے انہیں سر راہ آمنا سامنا ہو جانے کے موقع پر مخلصانہ انداز میں یہ نصیحت کی تھی کہ میری رائے یہ ہے کہ آپ یزید کی بیعت کر لیجئے، اسی میں آپ کے دین و دنیا کی بھلائی ہے تو اس وقت امام حسینؑ نے جواب میں فرمایا تھا کہ:

’اگر تمہاری رائے کے مطابق میں یزید جیسے خدا کے کھلم کھلا نافرمان شخص کی بیعت کر لوں تو اسکے معنی یہ ہیں کہ دنیا سے خدا کی بندگی رخصت ہو جائے اور کوئی یہ نہ سوچے کہ اپنا سب کچھ اسکے سپرد کر دینا چاہئے پھر اس پوری قوم اور انسانیت کا خدا ہی حافظ ہے جس کی زمام اقتدار یزید جیسے شخص کے ہاتھوں میں ہو۔

حسینؑ نے تمام طاقت فرساء ناقابل برداشت خطروں کو نظر میں رکھتے ہوئے پورے ثبات

واستقلال اور بھر پور عزم وجزم کے ساتھ یزید کی بیعت سے انکار کر کے مظلوم عوام کے ذہنوں میں اس کی حکومت اور اس جیسی ہر حکومت کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور پیدا کیا۔

دنیا کے کروڑوں مظلوم عوام کے بے شمار درود وسلام ہوں باطل کے خلاف حسینؑ کی اس غیر معمولی جرأت وہمت اور ان کے اس مثالیہ عزم وارادے پر جس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ایک ہمہ گیر منارۂ ہدایت قائم کر دیا۔

۳۔ حسین کی مظلومی میں بے مثال دلکشی ہے

دنیا میں مظلوم انسانوں کی فہرست بہت طولانی ہے لیکن امام حسینؑ کسی ایک رخ سے نہیں بلکہ بہت سے رخوں اور بہت سی حیثیتوں سے مظلوم تھے وہ اتفاقی طور پر اچانک ظلم وتشدد کا نشانہ نہیں بنے، بلکہ انہوں نے ایک طے شدہ منصوبے کے ماتحت ہر قسم کے مظالم برداشت کئے ہیں، ان کی مظلومی میں سبق آموزی کا پہلو ہے ان کی قتل گاہ صرف قتل گاہ نہیں بلکہ انسانیت کیلئے بے نظیر درس گاہ بھی ہے ان کے موقف کا بس یہ تقاضا تھا کہ وہ یزید کی بیعت نہ کریں جس کا کردار اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں تھا وہ ان کے نزدیک بھی اس قابل نہیں تھا کہ ان کے روحانی اور غیر روحانی اقتدار کی باگ ڈور اسکے ہاتھوں میں ہو اس کے باوجود ہرگز انہوں نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے یہ پتہ چلتا ہو کہ وہ یزید کے تختہ حکومت کو پلٹ کر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ وہ اس طرح کا قدم اٹھانے میں بالکل حق بجانب ہوتے پھر بھی انہوں نے اول سے آخر تک مصالحت آمیز رویہ اختیار کیا، وہ جیو اور جینے دو، کے اصول پر کاربند تھے لیکن اسکے باوجود یزید اور اسکے ہواخواہوں نے شروع ہی سے آپ کے بارے میں تشدد سے کام لیا یزید نے معاویہ کی وفات کے بعد حاکم مدینہ کے نام جو ہدایت نامہ لکھا اس میں کھلم کھلا حکم دیا گیا کہ اگر حسینؑ میری بیعت نہ کریں تو انھیں قتل کر دیا جائے۔ اس طرح کی ہدایت ان کے علاوہ کسی ایسے دوسرے شخص کی بابت نہیں کی گئی تھی، جس سے بیعت لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیعت سے علیحدگی کی صورت میں

یزید امام حسینؑ کے خود وجود کو اپنے اقتدار حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ سمجھتا تھا، اس لئے نہیں کہ اسے اس بات کا شبہ تھا کہ امام حسینؑ حکومت حاصل کرنے کے لئے کوئی مہم چلا سکتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اسے وثوق تھا کہ حسینؑ کے بلند انسانی اخلاق اور کردار کی وجہ سے خود بخود لوگوں کے دل ان کی طرف کھینچ جائیں گے۔ وہ کبھی نہ کبھی ان کے بلند نظر اور مستغنی باپ کی طرح انھیں اقتدار حکومت قبول کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد امام حسینؑ نے جب مدینہ چھوڑ کر مکے میں پناہ لی جو تمام لوگوں کے واسطے ایک عمومی پناہ گاہ کی حیثیت رکھتا تھا تو وہاں بھی انہیں سکون واطمینان سے نہیں رہنے دیا گیا بلکہ خفیہ طور پر ان کی زندگی کے ختم کرنے کا انتظام کیا گیا انہوں نے مکہ عین زمانہ حج میں چھوڑ دیا ان کے اور ان کے ساتھیوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو حرابن یزید ریاحی کی مسلح فوجوں نے روک دیا۔ امام حسینؑ طاقت کا استعمال کر کے اس فوج کو تہس نہس کر سکتے تھے ان کے ساتھیوں نے اس طرح کا مشورہ بھی دیا، مگر حسینؑ اپنی طرف سے جنگ کی ابتداء نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آخر حُر نے کربلا کے میدان میں چھوٹے سے حسینی قافلے کو ٹھہرنے پر مجبور کر دیا وہ بھی سخت گرمی میں نہر فرات کے کنارے سے دور پھر ساتویں محرم سے حسینؑ اور ان کے چھوٹے بڑے ساتھیوں پر پانی بھی بند کر دیا گیا، کربلا پہنچ کر حسینؑ نے یزیدی فوج کے سردار پسر سعد سے کئی مرتبہ بات چیت کر کے چاہا کہ آپس میں لڑائی اور ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے، لیکن یزید کا مقرر کیا ہوا حاکم کوفہ ابن زیاد اپنی طاقت کے نشہ میں غلط فہمی کا شکار تھا وہ مظلومی کے ردعمل کو نہیں جانتا تھا، چنانچہ دسویں محرم کو جب لڑائی شروع ہوئی تو انھیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے دودھ پیتے بچوں تک کو بھوکا پیاسا تہ تیغ کر دیا گیا ان کے لاشوں پر گھوڑے دوڑائے گئے ان کے سروں کو نوک نیزہ پر بلند کیا گیا، ان کے خیموں میں آگ لگا دی گئی ان کے گھرانے کی خواتین کو قیدی بنایا گیا اور ان کی توہین وتذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی۔
امام حسینؑ کی یہ بے مثال مظلومی جس کے پیچھے انکار بیعت کا شریفانہ جذبہ تھا، پوری دنیائے

انسانیت کے دلوں میں ان سے محبت اور عقیدت پیدا کرنے کا زبردست محرک ہے۔ اسی لئے بلاتفریق مذہب وملت کے تمام لوگ ان کی عزت کرتے اور ان کی بارگاہ میں عقیدت واحترام کے ساتھ پھول چڑھاتے ہیں۔

۴۔ آج جبکہ دنیائے انسانیت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے

ہندوستان کا کیا ذکر کیا جائے اس کو تہذیب وتمدن کے لحاظ سے یوروپ اور امریکا کے برابر نہیں سمجھا جاتا، امریکہ اور یوروپ جنھیں تہذیب وتمدن کا نمونہ خیال کیا جاتا ہے وہاں رنگ اور نسل کے لحاظ سے جو افسوسناک طبقاتی تفریق ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہندوستان میں گاندھی جی کی قابل قدر کوششوں کے نتیجے میں کسی حد تک یہ تفریق دب گئی ہے لیکن ابھی تک اس نے ہندوستانی سماج سے اپنا بوریا بستر مکمل طور پر نہیں باندھا ہے۔ لیکن حضرت امام حسینؑ وہ وسیع القلب اور بلند نظر انسان تھے، جنہوں نے آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے اس طرح کی تفریق وامتیاز کو کربلا کی سرزمین پر بالکل نیست ونابود کر دیا، انہوں نے اپنے بھائی عباسؑ ابن علی اپنے بیٹے علی اکبرؑ اپنے بھتیجے قاسمؑ ابن حسن اپنے بچپنے کے دوست حبیب ابن مظاہرؑ اور سیاہ رنگ کے جونؑ غلام ابوذر غفاریؑ کے درمیان کسی قسم کا امتیاز نہیں قرار دیا۔ طبقاتی امتیازات کے ختم کرنے کے لئے امام حسین علیہ اسلام نے یہ جو قدم اٹھایا، اس نے تمام پسماندہ دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ انہوں نے طبقاتی تفریق کے خلاف یہ وہ قابل قدر اقدام کیا، جو آج بھی دنیائے انسانیت کے لئے ایک شمع راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

۵۔ ہندوستان کی اس زہریلی فرقہ وارانہ فضا میں

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان مختلف ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کا عظیم مرکز ہے، اگر چہ کوئی مذہب کسی دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے نفرت کرنے کا سبق نہیں دیتا ہے، لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ رقیبانہ سیاست وقت اکثر وبیشتر فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکا کر مختلف

مذاہب کے ماننے والوں کو لڑا یا کرتی ہے۔

کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ فرقہ وارانہ نفرت وعداوت ہرگز اس درجہ کی نہیں ہے جو اپنے کسی جانی دشمن سے ہوا کرتی ہے دشمن ہونے کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ ہمارے اور اس کے درمیان کوئی رشتہ باقی نہیں رہا، یقینا انسانیت کا وہ مشترک رشتہ ہے جو دوست اور دشمن دونوں کو شامل ہے ان کے درمیان صرف رشتہ نہیں بلکہ اس کے تقاضے اور مخصوص حقوق بھی برقرار ہیں۔

اس سرزمین ہندوستان کی فرقہ وارانہ مکدر فضا میں جہاں برابر ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے دست وگریباں رہتا اور تمام انسانی اقدار واخلاق کو خیر باد کہہ دیتا ہے۔حضرت امام حسینؑ کے اس بلند انسانی کردار کو یاد دلانے کی شدید ضرورت ہے کہ آپ کے سامنے جب حر ابن یزید ریاحی کی سرکردگی میں دشمن کا فوجی رسالہ اس طرح آیا کہ پیاس کی شدت نے اسے جاں بلب بنا دیا تھا تو آپ نے کسی گفت وشنید سے پہلے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ اس پوری پیاسی فوج کو سیراب کیا جائے۔

کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ ہندوستان کے اس فرقہ وارانہ ماحول میں مختلف فرقوں کے لوگوں کو برابر یاد دلایا جاتا رہے کہ تمھیں امام حسینؑ کے اس بلند کردار کو پیش نظر رکھنا چاہیۓ کہ کسی کے دشمن ہونے کا ہرگز یہ تقاضا نہیں ہے کہ اس کا کوئی انسانی حق تمہارے ذمہ نہ رہے، تم انسانیت کے مشترکہ حقوق اور فرائض سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتے، اگر ہمارے ملک کے مختلف فرقے امام حسینؑ کے صرف اسی ایک سبق کو یاد رکھیں اور اسکے مطابق عمل کریں تو کسی نہ کسی حد تک یہ عمومی اور مہلک فرقہ وارانہ تعصب ونفرت خود بخود گھٹتا چلا جائے۔ (مورخہ یکم اکتوبر ۱۹۸۶ء)

سجدہ اس اک تیغ تلے کا

مفکر اسلام ڈاکٹر مولانا سید کلب صادق صاحب قبلہ

قرآن مجید نے خدائے واحد کی پرستش وعبادت پر جس قدر زور دیا ہے اتنا زور اور کسی بات پر نہیں دیا۔اس نے شرک کو قطعی حیثیت سے نا قابل معافی جرم قرار دیا ہے۔اس معبود برحق کی پیدا کردہ لامحدود کائنات میں ہمارا پورا نظام شمسی ایک ذرے کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔اس مختصر سے نظام شمسی کے ایک ادنیٰ طفیلی سیارہ زمین کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں اگر ایک انتہائی کمزور وناتواں اور فانی مخلوق کسی غیر خدا کے سامنے سر عبادت جھکاتی ہے تو اس کی اس حرکت سے اس معبود حقیقی کی لا متناہی شہنشاہیت مملکت وجبروت کو کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے کہ وہ ہر جرم کو نظر انداز کرنے پر تیار ہو مگر شرک کو برداشت کرنے پر تیار نہ ہو۔

بات دراصل کچھ اور ہے شرک سے معاذ اللہ ذات خالق کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ شاہکار خلقت ومسجود ملائکہ انسان جب پتھروں کے سامنے اپنا سر زمین پر رکھتا ہے تو اپنے آپ کو جمادات سے بھی پست قرار دیتا ہے جس انسان کے قبضہ میں پوری دنیا قرار دے دی گئی ہے وہ جب اپنے آپ کو پتھروں تک کا محتاج سمجھنے لگتا ہے تو اپنے آپ کو "احسن تقویم" کی منزل سے گرا کر "اسفل السافلین" کی انتہائی پستی تک پہنچا دیتا ہے۔

تاہم انسان وانسانیت کو پست ترین منزل تک پہنچا دینے والی یہ بت پرستی خاص جہالت کی پیداوار ہوتی ہے۔وہی جہالت جسے رسولؐ نے انسان کی ساری خرابیوں کی جڑ قرار دیا ہے۔اس لئے آفتاب علم کے طلوع ہونے کے ساتھ ہی اس قسم کی بت پرستی کی لو ماند پڑ جاتی ہے۔

اس بت پرستی سے زاید خطرناک بت پرستی وہ ہوتی ہے جب پتھروں کے بت گوشت وپوست

کے بتوں کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور نمرود و فرعون کے ایسے خود پسند، نفس پرست، ظالم وجابر فرماں روا اپنی خدائی اور ربوبیت کا اعلان کر کے خلق خدا سے اپنی بندگی وعبادت کا اقرار لے کر ان کے تمام انسانی حقوق کو سلب وغصب کر لیا کرتے ہیں وہ ان کے مال وجان ہی کے مالک نہیں بن بیٹھتے ان کی عورتوں کی عزت وآبرو تک کے مالک ومختار بن جاتے ہیں اور اگر ان کی خدائی کو کسی پیدا ہونے والے بچے سے ادنیٰ خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہو تو اپنی حکومت بلکہ ربوبیت والوہیت کو بچانے کی خاطر وہ ہزاروں بچوں کو پیدا ہونے کے ساتھ ماں کے سامنے ہی ذبح تک کر دینے سے باز نہیں آتے۔

ہمارے کریم ورحیم خالق نے پہلی قسم کے بت پرستوں کو اکثر وبیشتر سنبھل جانے کا موقع بھی دیا ہے عذاب میں تاخیر بھی کی ہے مگر اس دوسری قسم کی بت پرستی کو تہس نہس کرنے میں اس نے کبھی تاخیر نہیں کی ادھر اس قسم کی بت پرستی نے سر اُبھارا، ادھر اس کی تلوار چلی، نمرود پیدا ہوا تو فوراً ابراہیمؑ۔ اس کو خاک چٹانے کے لئے مبعوث کر دیئے گئے اور فرعون نے اپنی خدائی کا اعلان کر کے بنی اسرائیل کو ظلم واستبداد کا نشانہ بنایا تو موسیٰؑ اپنا ڈنڈا سنبھالے اس کے دربار میں گھس گئے اور اس وقت تک قرار نہ لیا جب تک اس کی الوہیت کا بیڑا بحر احمر کی موجوں میں غرق نہ کر دیا اور کمزور وناتواں بنی اسرائیل کو چشم زدن میں فرعونی مملکت کا وارث ومالک نہ بنا دیا۔

لیکن خلق خدا پر سب سے بڑی مصیبت اس وقت آتی ہے جب یہی نمرودیت وفرعونیت یہی نمرودی وفرعونی نفس پرستی وجاہ پرستی "لا الہ الا اللہ" کا زبانی اقرار کر کے خدائے واحد کے حقیقی پرستاروں کی صفوں میں شامل ہو جاتی ہے اور دیندار افراد کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آہستہ آہستہ نیابت اور خلافتِ رسولؐ کے ایسے مقدس منصب کو ملوکیت وشہنشاہیت کی شکل دے دیتی ہے۔

اسلامی شریعت لوگوں کے جان، مال، عزت، آبرو، عقل، دینی آزادی اور نسل کی حفاظت کو

اپنے بنیادی مقاصد قرار دیتی ہے وہ دنیا میں صرف عدل، انصاف، مساوات اور آزادی کی حکمرانی دیکھنا چاہتی ہے اور صدرِ اول میں انھیں اقدار کو معاشرے میں نفاذ کے لئے جس مسلسل جہاد کا عہد مسلمانوں سے لیا جاتا تھا اس عہد کو اسلامی اصطلاح میں بیعت کہا جاتا تھا مگر جب خلافت نے ملوکیت کی شکل اختیار کر لی تو مسلمانوں سے جہادِ حق پر بیعت لینے کے بجائے بادشاہ سلامت کی غلامی پر بیعت لی جانے لگی اور مسلمانوں سے راہِ حق کے سپاہیوں کی وردی اتروا کر انھیں لباس غلامی پہنایا جانے لگا۔

لیکن چونکہ آزادی کے متوالوں کو غلام بنانے کا یہ سارا کھیل پرچم لا الٰہ کے زیر سایہ اور مسجدوں کی چھاؤں میں انجام دیا جا رہا تھا اس لئے اسلام کی محبت میں ڈوبے ہوئے مسلمان صرف ظاہر کو دیکھتے رہے اسی نمائشی اسلام کے پیچھے چھپے ہوئے فرعونیت ونمرودیت کے چہروں کو نہ دیکھ سکے۔

اس قسم کی نام نہاد اسلامی ملوکیت میں سب کچھ ہوتا ہے۔ دُلہن کی طرح پیراستہ مسجدیں ہوتی ہیں، مطلاّ ومذہّب قرآن ہوتے ہیں۔ مسجدوں میں حکومتوں کے تنخواہ دار امام ہوتے ہیں۔ شاندار حسین وجمیل منبر ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی حکومت کے وظیفہ یاب سہی مگر قاری بھی ہوتے ہیں اور منبروں پر قابل خرید وفروخت سہی مگر خطیب بھی نظر آتے ہیں یہ سب ہوتا ہے مگر وہ مقاصد واقدار کہیں نہیں دکھائی دیتے جن کو عام کرنے کے لئے اسلام آیا تھا۔ ظاہری چمک دمک طمطراق ہوتا ہی اس لئے ہے کہ مسلمان بس ان ہی چیزوں کے دیکھنے میں ایسا مگن رہے کہ کچلے ہوئے سماجی انصاف، پسی ہوئی اسلامی مساوات اور چور چور آزادئ بشر پر ان کی نظر نہ پڑ سکے۔ چنانچہ پرچم توحید کے بالکل نیچے اور مسجدوں کے زیر سایہ اسلامی دولت صرف چند خاندانوں میں سمٹتی رہی۔ حکومت کے خلاف ادنیٰ لب کشائی کرنے والوں کی زبانیں کھنچتی رہیں۔ حق وانصاف کی بات کرنے والوں کو سر دار لٹکایا جاتا رہا۔ ذرا ذرا سے شبہ پر افراد ہی نہیں خاندانوں کو تہہ تیغ کیا جاتا رہا، گھر، گھر والوں پر گرائے جاتے رہے مگر چونکہ یہ سب "لا الہٗ الّا اللہ" اور تکبیر کے نعروں کی گونج

میں ہو رہا تھا اس لئے لوگ اسی کو اسلام سمجھتے رہے۔

دراصل اسلام، قرآن، محراب اور منبر کی آڑ میں چھپے ہوئے نمرود اور فرعون کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے بصیرت بھی درکار تھی اور شجاعت بھی اس لئے ۶۰ھ میں جب وارث انبیاء نواسہ رسولؐ حسین ابن علیؑ سے یزید کی بیعت کا مطالبہ ہوا تو حسینی بصیرت یوں سامنے آئی کہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا بلکہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اِنّ مثلی لا یبایع مثلہ'' اس ایک جملہ میں صرف انکار بیعت نہیں ہے بلکہ انکار بیعت کی پوری تاریخ سمٹی ہوئی ہے۔ اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ میرے ایسوں نے یزید ایسوں کی بیعت تاریخ کے کسی دور میں نہیں کی ہے یعنی مجھ سے بیعت یزید کا مطالبہ کرنے والوں پہلے تاریخ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور خود حضورؐ کی سیرت کو دیکھ لو۔ اگر ابراہیمؑ نے نمرود کے سامنے سر جھکا دیا ہوتا، اگر موسیٰؑ فرعون کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے ہوتے، اگر عیسیٰؑ نے رومن امپائر کی غلامی کا اقرار کر لیا ہوتا اور اگر حضورؐ مشرکین مکہ کے سرداروں کے سامنے سر اطاعت جھکا دینے پر تیار ہو گئے ہوتے تو میں بھی یزید کی بیعت کر لیتا۔ حسینؑ کا جملہ خود بتا رہا ہے کہ امام وقت نے منبروں، مسجدوں اور سنہرے قرآنوں کے پیچھے چھپے ہوئے فرعون و نمرود کو پہنچان لیا تھا یعنی جب فرعونیت و نمرودیت ربوبیت کی کھلی ہوئی شکل ہوتی ہے تو معبودان باطل کے دعوائے خدائی کے جواب میں لا الٰہ کہا جاتا ہے اور جب یہی خباثتیں اسلام کے لباس میں ظاہر ہوتی ہیں تو ''لا یبایع مثلہ'' کا نعرہ بلند کیا جاتا ہے، حق کے نمائندوں کی تاریخ یہ ہے کہ وہ باطل کے سامنے کبھی سر نہیں جھکاتے نہ عبادت کی شکل میں نہ بیعت کی صورت میں۔

بصیرت کے بعد اب شجاعت کی نوبت تھی شجاعت شمشیر زنی کا ہی نام نہیں اس کی روح، صبر اور قوت برداشت ہے حسینؑ نے مطالبۂ بیعت کے جواب میں لا کہہ کر انکار بیعت کیا تو اپنے اوپر آنے والی مصیبت کو نظروں کے سامنے رکھ لیا تھا اور مقابلہ کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر چکے تھے۔ مدینہ میں نانا کا مزار، ماں کی لحد، بھائی کی قبر چھوڑنا پڑی، چھوڑ دی، جس نے متعدد حج پا

پیادہ کئے تھے اسے عین حج کے موقع پر حرمت کعبہ بچانے کے لئے حج کو چھوڑ کر مکہ کو خیر باد کہنا پڑا، خیر باد کر دیا۔ راہ کوفہ میں اپنے ابن عم حضرت مسلم بن عقیل کی کوفہ میں مظلومانہ شہادت کی اطلاع ملی، صبر و شکر کے ساتھ سُن لی پھر ابن زیاد کے لشکر نے حُر کی سر براہی میں حسینؑ کا راستہ بند کیا تو حسین نے دشمن کے پیاسے لشکر پر اپنے پاس موجود پانی کی سبیل کھول کر اسلامی اقدار کے پودوں کی آبیاری کی۔ دوسری محرم کو کربلا پہنچے، ساتویں محرم سے پانی بند کر دیا گیا۔ شب عاشور کو ایک رات کی مہلت لی جو صرف اس لئے تھی کہ ایک طرف جی بھر کر عبادت کر لیں تو دوسری طرف اپنے سپاہیوں کو کھلی آزادی دے دیں کہ جو جانا چاہے وہ جا سکتا ہے نہ کسی پر کوئی جبر ہے اور نہ کوئی پابندی جو ساتھ رہے وہ یہ سمجھ کر رہے کہ کل اپنی جان نہیں اسلام کے بچانے کا مرحلہ درپیش ہوگا۔ صبح عاشور ہوئی تو حسینؑ نے میدان جنگ سے شہیدوں کے جنازے اٹھانا شروع کر دیئے، اپنے ہوں یا غیر بنی ہاشم، آزاد ہوں یا غلام سب کے ساتھ ایک برتاؤ، ایک رویہ ایک طرح سے قدردانی۔ جس طرح اپنے دم توڑتے جوان بیٹے کے رخسار پر رخسار رکھا اسی طرح دم توڑتے ہوئے غلاموں جونؑ اور واضح کے رخساروں پر رخسار رکھا۔ زخم کھاتے رہے، لاشے اٹھاتے رہے، پیاس بھڑکتی رہی مگر چہرے پر سرخی ہی رہی۔ حسینؑ کیا بیعت کرتے جب کہ حسینؑ کی گود کی پالی چار برس کی معصوم بچی تک نے حسینؑ کی رخصتِ آخر کے موقع پر یہ معصومانہ فرمائش تو کی کہ ہمیں نانا کے روضے پر پہنچا دیجئے مگر اس بچی تک نے یہ نہ کہا کہ بابا یزید کی بیعت کر لیجئے کہ چین کی سانس لے سکیں۔

اپنی شہادت سے قبل حسینؑ ایک چھ ماہ کے پیاسے بچے کو گود میں لے کر میدان کربلا میں آ گئے۔ بظاہر اس لئے کہ بچے کے لئے پانی کا سوال کریں مگر درحقیقت اس لئے کہ فرعونیت کے چہرے پر پڑی ہوئی اسلام کی آخری نقاب کو بھی تار تار کر دیں۔ سوالِ آب پر بچہ کی کومل گردن کو تیر کا نشانہ بنا دیا گیا۔ یہ تیر بظاہر بچے کے گلے پر پڑا تھا مگر درحقیقت اس تیر نے یزیدیت کے چہرے پر

اسلام کی اس نقاب کو تار تار کر دیا تھا جس کے پیچھے فرعونیت کا مکروہ چہرہ پناہ لئے ہوئے تھا۔

عصر عاشور کی ساعتیں تھیں، کربلا کی جھلستی زمین تھی، جب زخموں سے چور چور پیاس کی شدت سے نڈھال رسولؐ کے نواسہ حسینؑ نے اپنا سر آخری مرتبہ معبود کی بارگاہ میں سجدہ بجالانے کے لئے زمین پر رکھا۔ اردو کے یگانہ شاعر میرؔ کی نظر میں یہی سجدہ تھا جب انھوں نے کہا:

شیخ پڑے محراب حرم میں پہروں دوگانہ پڑھتے رہیں
سجدہ اس اک تیغ تلے کا ان سے ہو تو سلام کریں

حسینؑ سجدہ سے خود سر نہ اٹھا سکے بلکہ کسی اور نے کاٹ کر نیزہ پر اس سر کو اٹھایا۔ ادھر ایک سورج نیزہ پر طلوع ہو رہا تھا ادھر کربلا کے افق پر آفتاب، گوشۂ مغرب میں ڈوب رہا تھا۔

یہ کہہ کے ڈوب گیا آفتاب عاشورہ
رہے حسین ؑ کی تا حشر روشنی باقی

خیمے جلا دیئے گئے۔ حسینؑ کی لاش یزیدیوں نے گھوڑوں سے پامال کر دی۔ ۱۱ رمحرم کو حسینؑ کے اہلبیتؑ اسیر کر کے شہدا کے کٹے ہوئے سروں کے ساتھ پہلے صوبائی دارالحکومت کوفہ میں ابن زیاد کے دربار میں لے جائے گئے پھر انھیں یزید کے پایۂ تخت دمشق کے سجے سجائے دربار میں لایا گیا۔ زر میں کمر غلام دست بدستہ کھڑے تھے۔ سندھ سے لے کر اسپین تک پر بنام اسلام حکمرانی کرنے والا ڈکٹیٹر کبھی فتح و کامیابی کے عارضی نشہ میں چور کبھی کٹے ہوئے سروں کو دیکھ کر مسکراتا تھا اور کبھی زنجیروں میں جکڑے حسینؑ کے بیمار بیٹے زین العابدینؑ کو اور رسیوں میں جکڑی بی بیوں کو دیکھ کر قہقہے لگاتا تھا۔

فتح کے باجوں کی آوازیں دربار کے اندر آ رہی تھیں۔ یزید نے رسولؐ کی نواسی، علیؑ و فاطمہؑ کی بیٹی، حسینؑ و عباسؑ کی بہن زینبؑ سے کہا یہ باجوں کی آوازیں سن رہی ہو، اب بتاؤ کہ کون جیتا اور کون ہارا۔ بہادر باپ کی شیر دل بیٹی نے انتہائی خود اعتمادی کے ساتھ جواب دیا کہ کون ہارا، کون

جیتا یہ اگر دیکھنا ہے تو ذرا ٹھہر جا۔ ابھی مسجدوں کے میناروں سے اذان کی آواز بلند ہوگی اللہ کی کبریائی اور اس کی وحدانیت کی آواز گونجے گی۔ ہماری جنگ اس آواز کو بچانے کے لئے تھی تھوڑی دیر بعد تیرے باجے بند ہو جائیں گے مگر آواز اذان اب صبح قیامت تک دنیا کے گوشے گوشے سے بلند ہو کر اللہ کی کبریائی اور وحدانیت اور رسولؐ کی رسالت کے اعلان کے ساتھ ہماری فتح کا بھی اعلان کرتی رہے گی۔

حسینؑ کی عظمت

عالیجناب سید کلب مصطفیٰ صاحب ایڈوکیٹ

انسان کی عظمت دراصل اس کی نسلی حیثیت، وراثتی خصوصیت، تعلیم وتربیت، ماحول ومعاشرت اورقول وعمل کے امتزاج کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ان عناصر میں سے ہر ایک کسی نہ کسی حد تک انسان کی عظمت کے درجات معین کرنے اوراس کی بلندیوں کو بڑھانے یا گھٹانے کا سبب ہوتا ہے۔ مگر جب تک اورعناصر بھی موجود نہ ہوں صرف ایک ہی عنصر معیار فضیلت انسانی نہیں بن سکتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک پڑھا لکھا شخص برا اور ایک جاہل اچھا ہو اور یہ بھی لازم نہیں ہے کہ اچھے والدین کی اولاد بھی اچھی ہو یا برے ماں باپ کے بچے برے ہی ہوں۔ اسی طرح بعض طینتیں تربیت کا اچھا اثر لیتی ہیں اور بعض اُلٹا البتہ قول وعمل انسانوں کی عزت کو بڑھانے یا گھٹانے کے لئے موثر آلات ہیں۔ انسان اپنے اقوال واعمال سے تعلیم وتربیت اور وراثتی آئینے پر جلا بھی کرسکتا ہے اوراس کو دھندلا بھی۔ نیک پیدا ہوکر بد بن سکتا ہے اور بروں کی آغوش میں پرورش پا کر اپنے گفتار وکردار کی بدولت اچھا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جس میں جوہر ذاتی بھی ہو اور وصف اضافی بھی، تعلیم بھی بے نظیر ہو اور تربیت بھی تو پھر وہ ہیرا ہی نکلے گا اور حسینؑ ایسے ہی تھے۔

عرب کے بہترین اور معزز ترین خاندان میں ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی۔ آپ رسولؐ خدا محمد مصطفیٰ کی باعزت بیٹی جناب فاطمہ زہراؑ اور محافظ اسلام حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے صاحبزادے تھے۔ نانا وہ جس نے انسانیت کو پیغام اسلام سنا کر زنگ آلودہ دماغوں کی جلا کی اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا نعرہ بلند کر کے مصنوعی خداؤں کی تکذیب صریح کردی جس نے عزم واستقلال اور صبر ورضا کی مشکل منزلوں کو آسانی سے طے کیا اور جس نے قابو پا کر بھی دشمن پر سختی نہ کی، جو مجسمۂ اخلاق، پیکر حلم ومروت، عین حق اور مظہر رحم وانصاف تھا۔ دادا وہ جس نے پیغمبرؐ اسلام کی حفاظت کے مقابلے میں اپنی اولاد کی جانوں تک کی پروانہ کی اور جس نے رہتی دنیا تک حق گوئی، حق دوستی اور یتیم پروری کا سکہ دلوں پر بٹھا دیا۔

ماں وہ جس کی تعظیم خود رسولؐ خدا کرتے تھے اور جن کے اعمال وکردار عورتوں کے لئے معاشرت یا تدبیر منزل کے منارے بنے ہوئے ہیں۔ حسینؑ کی ماں اس خاتون کی لخت جگر تھیں جس نے شجر اسلام کی آبیاری اور نشوونما میں کسی دوسرے سے کم حصہ نہیں لیا اور جو اس وقت رسالت کی گواہ بنی جب دنیا رسولؐ کو جھٹلا رہی تھی۔

باپ وہ جس کی تلوار کا احسان اسلام کی گردن پر ہے جس نے اسلامی غزوات میں سے دو ایک کے علاوہ سب ہی میں شرکت کی اور سب ہی کو سر کیا۔ جس نے راہ حق میں جاں فروشی وجاں سپاری کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ جس نے خود رسولؐ اسلام کی آغوش میں تربیت پائی تھی اور جو نہ صرف شجاع بلکہ رسولؐ کے بعد اعلیٰ ترین ادیب، حکیم، فلسفی اور مدبر تھا۔

ایسے ماحول، ایسے خاندان اور ایسے نانا اور ماں باپ کے گھر پیدا ہونا ہی حسینؑ کی بلندیٔ عظمت کے لئے کافی تھا چہ جائے کہ سینتیس سال تک یکے بعد دیگرے جو آغوش تربیت بھی ملی اسے نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ہی کہہ سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مدت علیؑ جیسے یگانۂ روزگار اور مظہر پروردگار کے زیر تربیت گذری اور تربیت بھی کیسی، جنگ کی بھی اور صلح کی بھی۔ فاقہ کشی کی بھی اور حق کوشی کی بھی۔ علم کا پھریرا بھی کھلتے دیکھا اور گلے میں رسیاں بندھتے بھی۔ ماں کو نانا کی وفات کے بعد ایذا پہنچتے بھی دیکھا اور باپ کے ساتھ نا قابل برداشت بدسلوکی بھی۔ علمی مسائل کی گتھیوں کو سلجھتے ہوئے بھی دیکھا اور اسلامی مسائل کو علیؑ کی مدد کے بغیر اُلجھتے ہوئے بھی۔ یہاں تک کہ ۴۰ھ میں باپ کا سایہ اُٹھ گیا۔ تو خلافت کو سلطنت بنتے بھائی کو مصالحت کرتے، لگن میں بھائی کے جگر ٹکڑے کٹ کٹ کے گرتے اور انجام کار بھائی کے جنازے پر تیر برستے بھی دیکھے اور ایسے عالم میں دیکھے کہ شجاعت

ارثی میں بلا کا تموج تھا۔ لیکن بھائی کی صلح جو سرشت کے لحاظ اور شر وفساد سے بچاؤ کے خیال سے باوصف امکان مدافعت تک نہ فرمائی اور بھائی کے جنازے کے رُخ کو روضۂ رسولؐ سے جنت البقیع کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح بھائی کی شہادت کے وقت یعنی تقریباً چھیالیس سینتالیس برس تک حسینؑ نے بہت سے نشیب وفراز دیکھ لئے تھے اور جنگ صفین وجمل اور صلح حسنؑ سے بڑے بڑے سبق لے چکے تھے۔ اس کے بعد دس برس کی طویل مدت تک محض عبادت وریاضت میں بسر کرنا اور ایسے قنوت(۱) اور اشعار(۲) کا ورد رکھنا جن سے انتہائے عبودیت کا پتہ چلتا ہو بجائے خود عظمت حسینؑ کی روشن دلیلیں ہیں۔ اگر حسینؑ کا صرف یہی عمل ہم تک پہنچتا تو واقعی ہم اس کو ایک مہتم بالشان کارنامہ سمجھتے۔ مگر حسینؑ نے تو کردار کا وہ مظاہرہ کیا کہ اس کے سامنے سارے مظاہرے ماند پڑ گئے۔ حسینؑ نے اپنی سیرت کو ایثار وقربانی کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ ان کی سیرت میں دلوں میں لرزہ ڈال دینے والا فداکاری وسرفروشی کا جذبہ اس قدر نمایاں طور پر مہیا ہوگیا تھا کہ اس کے مقابلے میں دنیوی حکومت اور اقتدار سب ہیچ نظر آتے تھے ان کی زندگی عبدیت خالص کی مکمل تفسیر تھی۔ اور غیر خدا کا کوئی دور کا بھی تصور ان کے ذہن وخیال میں نظر نہیں آتا۔

خدا کی طرف ان کے اس قدر مکمل کھچاؤ، دل ودماغ کا انتہائی جھکاؤ، تسلیم ورضا سے محیر العقول لگاؤ ماسوا المعبود سے کامل بے نیازی کے مشاہدے کے بعد بارگاہ حسن میں امکان کہاں تھا کہ کوئی دوسرا مدعی عشق باریاب ہو خواہ وہ کیسا ہی صاحب جبروت اور کتنی ہی قوت وطاقت کا مالک کیوں نہ ہو۔

خدا کی ربوبیت کے اس شدید احساس کے بعد ایسا بلند کردار اور صلح پسند انسان اپنی حق تلفی کو برداشت کرسکتا ہے۔ ایک غاصب بادشاہ کی انفرادی بے راہ روی اس کی شراب خواری اور اس کی حرام کاری سے غض بصر کرسکتا ہے لیکن نہیں کرسکتا تو یہ کہ انسان کو انسان کا رب مانے اور انسان پر کسی انسان کی خدائی کے قیام پر راضی ہوجائے۔

صورت حال زبان وضمیر کی آزادی کے اس فطری بنیادی حق کے لئے پیام اجل ہے جس کے

بغیر انسان انسان نہیں رہ جاتا۔ کارخداوندی کے انجام دہی کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جو بے غرضی، بے لوثی اور بے نیازی درکار ہے وہ عام انسانوں میں کہاں ہوسکتی ہے۔ اسی لئے انسانوں کے خدا بننے کا لازمی نتیجہ مطلق العنانی اور ظلم کا دور دورہ ہوتا ہے۔ وہ تو خدا بننے کا شوق ہی مطلق العنانی کے جذبے سے پیدا ہوتا ہے تو اب ظاہر ہے کہ انسانی مطلق العنان کی خدائی میں ضعیف کو کسمپرسی اور بے موت مرنے کے سوا اور کیا میسر ہوسکتا ہے۔

اس میں نہ تو بے لوثی ہوتی ہے نہ بے غرضی، نہ بے نیازی ہوتی ہے نہ صدق آگینی بلکہ کسی نہ کسی عنوان سے ظلم وعدوان، بے اعتدالی، بے راہ روی، غلط نگاہی، ناہمواری، ناحق اندیشی، مصلحت بینی، قابو پرستی اور نہ معلوم اور کتنی انسانی کمزوریاں عجیب عجیب عنوان سے دیکھنے میں آتی ہیں۔ نتیجہ میں انسانی جسم اعمال وکردار کے اعتبار سے نفس امارہ کا ایک غلام محض بن کر رہ جاتا ہے اور انسانی روح اپنی فطری آزادی اور ازلی حقوق سے محروم ہوجاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ دنیوی اعتبار سے بھی انسان نفس پرستیوں اور خودغرضیوں کے شکنجے میں دب کر کش مکش میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ آج کل جو یہ جنگ کی ہماہمی ہر طرف نظر آتی ہے وہ کسی اور بات کا نہیں اسی غلط نظری کا نتیجہ ہے۔

ایسی نازک صورت حال سے انسانوں کو بچانے اور اس کو قعر مذلت میں گرجانے سے محفوظ رکھنے کا ایک یہی علاج ہوسکتا تھا کہ کوئی مرد میدان کلمۂ لا الہ کو از سرنو زندہ کردے اس میں ایک لازوال قوت بھر دے۔ اور انسانوں کو اس غلامی کی جکڑ بند سے آزاد کردے۔ ایسا مرد میدان بس حسینؑ ہی تھا جو اس یزیدی ذہنیت کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے خدا کا نام لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

حسینؑ کو ولید حاکم کا پیغام ملاقات ملا۔ اس نے معاویہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ آپ نے کلمۂ اِنَّا لِلّٰہ جاری فرمایا۔ ولید نے پھر یزید کی بیعت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا ”تم یہ تو پسند نہ کروگے کہ مجھ سے چپ چاپ اور پوشیدہ طور سے بیعت لو۔ جب اور اہل مدینہ کو اس غرض سے بلوانا مجھے بھی اطلاع کردینا۔“ اس پیغام کے بعد اور زیادہ سوچنے یا غور کرنے کا موقع نہ تھا۔ حسینؑ

کے لئے یہ وقت بہت سخت تھا کہ انکار بیعت کو کس طرح ناقابل انکار کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائیں۔ غلبہ کا مقابلہ غلبہ سے کیا جائے ظلم کا سر ظلم سے کچلا جائے یا قوت کا مقابلہ استقامت سے اور ظلم کا مقابلہ مظلومی سے کیا جائے۔

یہ ممکن تھا کہ جماعتیں فراہم کی جائیں، مددگار اکٹھا کئے جاتے، عرب کے گوشے گوشے میں یزید کی بداعمالی و بدکرداری کو طشت از بام کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اس کی مخالفت پر آمادہ کیا جاتا اور آخر کار یزید کو شکست دے کر مسند خلافت قبضے میں کر لی جاتی لیکن یہ تو غلبے کو غلبے ہی سے ختم کرنا ہوتا جو دور و تسلسل کا مرادف بھی ہوتا اور جو اہل زمانہ کے شیوۂ فرسودہ کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ اور اس طور پر ممکن تھا کہ یہ عارضی کامیابی ابدی ناکامی کا پیش خیمہ بن جاتی لہٰذا حسینؑ نے ایک دوسرا راستہ ہی اختیار کیا۔ مادّی ہتھیاروں کے بجائے روحانی حربوں کو جمع کیا۔ ظلم کا مقابلہ مظلومی سے کرنا طے کیا قوت جماعت کے مقابلے کے لئے استقامت و بےکسی کو بہمیت کے مقابلے کے لئے انسانیت کو اور شیطنت کے مقابلے کے لئے حقانیت کو اپنا رفیق کار بنایا اور اس راہ حق میں قدم قدم پر جو گونا گوں مزاحم درپیش تھے ان میں سے کوئی ایک بھی حسینؑ کو ان کے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ کوئی وحشت انھیں روک نہ سکی اور کوئی قوت انھیں اس صراط مستقیم سے ہٹا نہ سکی۔

سر داد نداد دست در دست یزید

یہ تھی حسینؑ کی حقیقی عظمت جس نے ان کو بڑوں بڑوں میں بھی ممتاز اور ابتدائے عالم سے قیامت تک سرفراز کر دیا۔

* * *

حسینیت اور بین الاقوامی مفاد

علامہ سید مجتبیٰ حسن صاحب قبلہ کامونپوری

قدرت کی عظیم الشان سب نعمتیں تمام انسانوں کی ملکیت ہیں۔ سورج کی شعاعیں جس طرح ایک بادشاہ کے محل کو روشن کرتی ہیں، ایک گداگر کی جھونپڑی کو جگمگا دیتی ہیں۔ چاند تارے جس طرح کسی امیر کبیر کی رنگین محفل کو حسین بنا دیتے ہیں، اسی طرح ایک فقیر بینوا کے دل کی دنیا کو بھی مست مسرت بنا دیتے ہیں۔ نسیم سحر کے جھونکے ہر فرقہ اور ہر قوم اور ہر نسل کے انسان کے دماغ معطر کرتے ہیں۔ بہار کی تازگی ہر انسان کے دل سے رنج و غم کو دور کرتی ہے اور زندگی تازہ کی نوید لاتی ہے، اسی طرح بے نظیر شخصیت کے انسان جو انسانی ارتقاء کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیتے ہیں وہ بلا استثناء ہر انسان کے لئے باعث فلاح و نجاح بن جاتے ہیں۔ جس طرح ایک طبیب ایک ڈاکٹر، ایک شاعر، ایک مصور، ایک سائنس داں اپنی صلاحیتیں کسی خاص قوم کے لئے نہیں وقف کرتا بلکہ اس کے خدمات ہر انسان کے لئے ہیں جو اس سے فائدہ اٹھائے، اسی طرح روحانی امراض کے معالج معاشی و سماجی اصلاحات کے علمبردار ہر اس شخص اور قوم و نسل کے ہیرو ہیں جو اس سے فائدہ اٹھائیں اور ان کی نظر و فکر عمل و جہاد سے اپنی کمزوریوں کو دور کریں اور اپنی انسانیت کو معراج ترقی کو پہنچائیں۔ بے مثال مصلح اکبر امام حسینؑ ان انسانوں میں ایک امتیاز رکھتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک انسانیت کو بلند کرنے کے لئے وقف کر دی اور انسانیت کے ہر طبقہ اور گروہ و نسل کو زندگی میں انقلاب و تبدیلی کا پیام دیا، عوام و حکومت، غریب و امیر آقا و غلام، علما و اہل ادب جوان و پیر سب اپنے حدود میں امامؑ کے انقلاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، امامؑ نے زندگی کا مقصد نیکی کا قیام اور بدی کا استیصال رکھا، اس پر وہ ہمیشہ عامل رہے، اسی مقصد کے لئے وہ زندہ

رہے، اور اسی مقصد کی تکمیل میں آپ کی شہادت واقع ہوئی یہ اعلیٰ مقصد ہر قوم کے لئے مشعل راہ ہے، آپ کے طریق انقلاب سے سب نے فائدہ اٹھایا اور اٹھاتے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔

یزیدیت سب کے لئے قابل نفرت ہے

یزید نے عوام کو اپنی ملکیت سمجھ لیا تھا، وہ اپنے سوا سب انسانوں کو آرائش و آسائش ولذت کشی کا آلہ کار بنا چکا تھا۔ وہ روح کی طہارت، نفس کی بلندی، اعلی کردار وعدالت وعفت سے وحشت کرتا تھا، اور نفس کی مادی رغبتوں کے درپے تھا۔ معرفت وحکمت کے چرچے اس کے دور حکومت میں عبث سمجھے جانے لگے تھے، ادب وفن اس کے زمانہ میں شہوانی تقاضوں کے لئے وقف ہو چکے تھے، وہ پابندی قانون کا قائل نہ تھا۔ وہ اخلاقی حدود کو تسلیم نہیں کرتا تھا وہ حلال وحرام کا منکر تھا۔ عبداللہ ابن حنظلہ اسی عہد کے مشہور صحابی زادے نے یزید کی اصلاح کے لئے اور واقعات کے چشم دید مطالعے کے لئے ایک وفد کی شام تک رہنمائی کی تھی، واپسی کے بعد عبداللہ ابن حنظلہ، امیر وفد نے یزید کے متعلق کہا، أنا قدمنا من عند رجل ليس له دين يشوب الخمر ويعزف بالطنابار وتضرب عنه القيان ويلعب بالكلاب ويسامر الخراب والقيان۔۔۔ ہم ایسے شخص کے پاس سے آرہے ہیں جو کسی دین وملت کا پابند نہیں، وہ شراب خوار ہے، طنبور بجاتا ہے، گانے والی عورتوں کا صحبت نشین ہے، کتوں کے ساتھ کھیلتا ہے، رند مشرب لوگوں کے ساتھ قصوں افسانوں میں زندگی گزارتا ہے، علامہ ابنِ حجر تمیمی نے اپنی کتاب صواعقِ محرقہ میں یزید کے متعلق لکھا ہے کان رجلا ينكح أمهات الأولاد والبنات والأخوات ويشرب الخمر ويدع الصلوة، یزید ماں بہن بیٹی کی عصمت دری کرتا، شراب خوار اور تارک الصلاۃ تھا، ظاہر ہے کہ ایسے بد اعمال وخبیث فطرت انسان سے کسی قوم وملک یا شریف انسان کو دلچسپی نہیں ہوسکتی اور اس کے نتائج سے خلقِ خدا محفوظ ومصئون کرنے والے کے ساتھ سب کی ہمدردی ہوگی۔

امام حسینؑ نیکی کی ایک روشنی تھے

امام حسینؑ کی ذات نیکی وخیر کا ایک روشن منارہ تھی، یزید ان کی ہستی کو اپنی رندی اور مطلق العنانی کی راہ میں حارج سمجھتا تھا، اس لئے اس نے بیعت کو ذریعہ بنا کر ان کے قتل کی تدبیر کی۔ امامؑ اس کے نفسیات وعزائم سے پوری طرح واقف تھے، آپ فرماتے ہیں وأيم الله لو كنت في جحر هامة من هذا الهرام لاتنجر جوني حتى يقضوا احاجتهم، بخدا اگر میں حشرات الأرض کے سوراخوں میں پناہ لوں جب بھی یہ لوگ مجھے اس سے نکال لیں گے اور مجھے قتل کر کے رہیں گے۔ ایسے یاس انگیز ماحول میں امام نے شاداب عزم وکامیاب ارادہ اور آہنی کوششوں کے ساتھ اپنا نظام عمل مرتب فرمایا جس نے اصلاح عالم میں پوری کامیابی حاصل کی۔ امام نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ زندگی حق وخیر کے لئے ہے ورنہ ایک لعنت ہے، سر جسم پر اس لئے ہے کہ اس میں نیکی وفلاح کے خیالات موجزن ہوں، ورنہ وہ دیوانگی کا مقبرہ اور ہوس کا گنبد ہے، امامؑ نے ثابت کیا کہ راہ حق میں جو سر جدا ہوتا ہے وہ شمع کی طرح پھر زیادہ آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوتا ہے۔ امامؑ کی زندگی کے سیکڑوں تابناک رخ ہیں جن سے یورپ وایشیا مغرب ومشرق سب متمتع ہو رہے ہیں، کچھ شعوری سے ہیں کچھ غیر شعوری اور کچھ درس امامؑ کے ایسے ہیں، جن کا عکس لینے کے لئے ضمیر انسانیت اپنی لوح پر صیقل کر رہا ہے، امامؑ نے بتایا کہ دنیا میں وہ قوم کمزور نہیں ہے جس کے پاس عملی طاقت ہے۔ فتح مندی آدمیوں کی قلت وکثرت پر موقوف نہیں، معنوی فتح مندی ایک شخص کو کروڑوں مسلح انسانوں کے مقابلہ میں بھی حاصل ہوتی ہے اور دنیا اس ایک حق پرست کو فاتح کہتی ہے جو خاک وخون میں آغشتہ ہو کر قفس عنصری سے رخصت ہوجاتا ہے اور ان کروڑوں انسانوں کو شکست خوردہ کہتی ہے، جو ناحق پر ہوتے ہیں، بلکہ کبھی کبھی ظاہری عزم کی تنظیم سے ظاہری فتح بھی چند انسانوں کی ہم نصیب ہوتی ہے۔ جیسے سلیمان بن صرد اور مختار نے امام کے تعلیمات کی روشنی میں اپنی عزیمت سے کام لے کر اموی قید خانوں کے دروازے توڑے اور فضا کو بدلنے میں جو کام کیا، وہ تاریخ میں اب تک موجود ہے۔ طاقتور کی ثناخوانی سب ہی کرتے ہیں، لیکن اگر کوئی حق پرست مظلومیت کا جامہ پہن کر نمودار ہوتا ہے، تو وہ بھی مداح پیدا کر لیتا

ہے، بلکہ اس کے قصیدہ خواں زیادہ ہوتے ہیں اور ایسے انسان ہوتے ہیں جو بظاہر کوئی رشتہ و تعلق نہیں رکھتے۔ حسینؑ ایسے ہی مظلومؑ تھے کہ آج دینا کی ہر آنکھ ان کے لئے آنسوؤں کا صاف وشفاف چشمہ بنی ہوئی ہے۔ آج ہر گدا و شاہ مسلم و غیر مسلم سب ان کی عظمت کا ترانہ پڑھتے ہیں۔ قانون سیاست میں عوام اور غرباء کا کوئی وجود نہ تھا، یہ حسینؑ کا انقلاب تھا کہ حضرت جون اور فضّہ کو جو عظمت دلوں پر حاصل ہے، وہ شاہوں کو نصیب نہیں۔ کسی قوم کا کوئی انسان کیوں نہ ہو، اگر اسے حکمت وعفت، صداقت و مروت اور خدمت خلق سے عشق ہوگا تو وہ ضرور امام حسین علیہ السلام سے کسب ضو کرے گا۔ امامؑ کی ذات ایک مرکز اتحاد ہے، جہاں تمام قومیں مل کر اپنی اپنی کمزوریوں کا جائزہ لیتی ہیں اور اپنی فلاح و بقا اور نجات و کامرانی و جہاد عمل کے لئے جسم میں خونِ تازہ پیدا کرتی ہیں، حریت استقلال جماعتی تنظیم، جوش عمل، عزت نفس، صبر و شجاعت، ایثار و مواسات، صاف بیانی، رواداری کے لئے امامؑ کے نام نامی کو دنیا کی ہر باخبر قوم نے بطور ایک طغرا کے تسلیم کرلیا ہے۔

حسینؑ نام ہے حسنِ مآلِ خلقت کا
حسینؑ نام ہے انسان کی شرافت کا
جیے اسی کے لئے اور مرے اسی کے لئے
حسینؑ نام ہے اللہ کی محبت کا!
وہ شانِ مرگ کہ دشمن بھی شرمسار ہوئے
حسینؑ نام ہے دشمن پہ بھی حکومت کا
وہ قلت رفقا اور وہ عزم کے تیور
حسینؑ نام ردِ غرور و کثرت کا
یزید مٹ گیا ذلت کی زندگی کی طرح
حسینؑ نام ہے نقش دوام عزت کا

امام حسینؑ کی ساری زندگی دنیا کے لئے معجزہ بنی ہوئی ہے، سرمایہ حریت بنی ہوئی ہے۔ چودہ سو سال سے کوئی لمحہ ایسا نہ گذرا جس میں دماغوں نے حسینؑ پر غور نہ کیا ہو، خطیبوں نے مجمعوں کو مخاطب کیا، شاعر نے، فلسفی نے، حکیم نے، ادیب نے، مصلح نے سب نے امام کی زندگی کو پرکھا اور اس سے اپنی زندگی کے دشوار مواقع پر مدد لی، انسانی ترقیوں کے مختلف دور میں مثالیں سامنے آتی رہیں لیکن کامل ترین مثال حسینؑ کے واقعۂ شہادت سے ملتی ہے۔ آپ کی شہادت کے کل تفصیلات اور مقتل کے کل جزئیات کی ایک روح ہے اور اس کو مختصر لفظوں میں بتایا جاسکتا ہے اور وہ یہ کہ تمام انسانوں کے ساتھ محبت و عشق کیا جائے اور سب کا احترام کیا جائے، اور سب کے ساتھ ہمدردی و مہربانی سے پیش آیا جائے۔ یہ خلاصہ صرف آپ کے واقعۂ شہادت کا نہیں ہے بلکہ آپ کے اسلاف و اخلاف سب کا یہی جوہر ہے، واقعۂ شہادت اس جوہر حیات کو نمایاں کر کے پیش کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ امامؑ کی زندگی کا دوبارہ مطالعہ کیا جائے، اچھے رسائل اور عمدہ نظموں کی ضرورت ہے۔ فلسفۂ شہادت پر حکیمانہ بیانات کی ضرورت ہے کہ دنیا اپنے مصلح کو زیادہ سے زیادہ پہچانے، وہ انسانیت جس کو نسلی تعصب، فرقہ وارانہ عداوت اور لسانی اختلافات اور سیاسی اغراض نے ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے۔ ایک حسینؑ کی ذات ایسی ہے کہ ان کی زندگی کے اذکار اور ان کے تعلیمات سے اس پارہ پارہ انسانیت کے جسم میں رفو کر کے اسے دوبارہ اس کا حسن و جمال عطا کیا جاسکتا ہے، اور معزز انسانیت کو کمال و شرف کے اس مقام پر بٹھایا جاسکتا ہے جس جگہ کے لئے اس کے مصور، اس کے صانع نے اسے تخلیق کیا۔

زندہ باد اتحادِ انسانی

زندہ باد حسینیت

زندہ باد شرفِ بنی آدم

(اشاعت اول: امامیہ مشن لکھنؤ محرم الحرام ۱۳۸۸ھ)

۞۞۞

حسینؑ اور انسانیت

عالیجناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سابق صدر جمہوریہ ہند

آج دنیا کے ہر گوشہ میں ایک غمناک واقعہ کی یاد لوگوں کو آرہی ہے جسے ہوئے ۱۳۰۰/ برس سے اوپر گزر گئے۔ کیا یہ کسی خاص عصبیت کو قائم رکھنے کی خواہ مخواہ کی کوشش ہے؟ انسانی تاریخ کا دامن کیا المناک حوادث سے اتنا خالی ہے اور رنج والم اور درد وکرب کیا انسانی زندگی میں ایسے نادر تجربے ہیں کہ بس بعض المناک حوادث کو چن چن کر یاد رکھا جائے؟ میں سمجھتا ہوں کہ بات اس سے زیادہ گہری اور انسانیت کے لئے زیادہ اہم ہے۔ مجھے تو اس واقعہ میں انسانی ارتقاء کے اصل اصول کا راز چھپا نظر آتا ہے۔ اسے یاد کرکے، اسے یاد رکھ کر، انسانیت جو بھولتی بھی ہے، بھٹکتی بھی ہے، سیدھی شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر پگڈنڈیوں پر پڑی پھرا بھی کرتی ہے، اور آگے بڑھنے کی جگہ پیچھے ہٹتی رہتی ہے، وہ انسانیت اس واقعہ کو یاد کرکے سچ یہ ہے کہ اپنی صحیح راہ کو یاد کرتی ہے اور ایک دفعہ پھر منازل ارتقائی کو طے کرنے کا قصد کرتی ہے، چاہے یہ یاد دھندلی سی یاد ہو، چاہے یہ قصد بہت ہی کمزور سا ارادہ ہو۔

تاریخ کا ہر واقعہ کسی خاص سیاسی اور تمدنی ماحول میں ہوتا ہے اور بہت سے دوسرے واقعات سے مربوط ہوتا ہے۔ ربط کا یہ حلقہ اکثر بہت چھوٹا ہوتا ہے اور تاریخ انسانی کی وسعت میں یہ مربوط وحدت زیادہ عرصہ تک مؤثر وحدت کی حیثیت نہیں رکھ سکتی اور تاریخ اسے ہوتے ہوتے بھلا دیتی ہے لیکن بعض واقعات باوجود اپنی تاریخی، مکانی وزمانی پابندیوں کے، حیات انسانی کے کسی ایسے اہم اصول کے ترجمان ہوتے ہیں کہ جب تک وہ اصول کارفرما ہے ان کا بھلانا ذہن انسانی کے لئے دشوار ہوتا ہے، وہ ایک منفرد واقعہ نہیں ہوتا، سارے واقعات کی روح ہوتا ہے۔ ان واقعات کا

فہم حوادث تاریخ کے بے ربط و بے ترتیب سے انبار میں ربط و ترتیب پیدا کر دیتا ہے، ان سے تاریخ کی تاریکیوں کو روشنی نصیب ہوتی ہے اور اس کا بظاہر بے معنی سا سلسلہ واقعات بامعنی معلوم ہونے لگتا ہے۔ شہادت حسینؑ کا واقعہ اسی قسم کے واقعات میں سے ہے۔ یہ ایک مخصوص تاریخی چوکھٹے میں دراصل زندگی کے عالم گیر اصل اصول کو انسانیت کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔

قدرت نے انسان کے علاوہ ہر بے جان اور جاندار مخلوق کو اپنے وجود کا توازن پانے کے لئے اندرونی کشاکش سے بچایا ہے۔ کہیں مادی خواص کو کہیں فطری جبلتوں کو اس توازن کا ضامن بنا دیا ہے۔ داخلی تضاد کی کٹھن منزل جو انسان کے لئے، انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں میں مقدر ہے اس سے اور ساری مخلوق محفوظ ہے، پتھر بھی اس سے مامون ہیں، جانور بھی، فرشتے بھی۔ ایک انسان ہی ہے جس کے نصیب میں متضاد عناصر کی کشاکش سے ہم آہنگی پیدا کرنا ہے۔ یہ اپنا توازن کھو بھی سکتا ہے، پا بھی سکتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ انسان شاید ایک درمیانی عبوری مخلوق ہے۔ اس کے وجود کی سرحدیں ایک طرف حیوانی علاقے سے ملتی ہیں، ایک طرف الٰہی سے۔ اس کے سینے کو متضاد قوتوں اور میلانوں کا جولانگاہ بنا کر، کفر وشرک کی کشاکش میں ڈال کر، روح انسانی کو یہ سعادت ارزانی کی گئی ہے کہ وہ اسی مشکل میں ایک ہم آہنگ ومتوازن حیات طیبہ کی تعمیر کر سکتی ہے۔ مادی اشیاء کی دلفریب کشش سے بھی اسے واسطہ ہے اور مادیت سے دامن چھڑانے کا شدید ولولہ بھی اس میں کارفرما ہے۔ یہ خود غرضی وخود بینی کا مرکز بھی ہے اور محبت کی بے غرضی اور بے نفسی سے بھی اسی کا سینہ معمور ہے۔ یہ سفاکانہ تاخت وتاراج کے بے خیال اور برخود غلط جنون کا شکار بھی ہو سکتا ہے اور بے تھکے کٹھن سے کٹھن جماعتی تعمیر کے لئے اپنی قوت کا ایک ایک شمہ بھی وقف کر سکتا ہے۔ یہ تمرد اور نخوت وغرور کے نشے میں معصوم گردنوں سے خون کے دریا بہانے سے نہیں جھجکتا، اور تسلیم ورضا کا کشتہ بننا بھی اسی کو آتا ہے۔ یہی حریصوں کی طرح بٹورتا ہے۔ یہی بہار کی طرح لٹاتا ہے۔ یہی اوروں سے چھینتا ہے، یہی اپنا سب کچھ اوروں پر نثار کر دیتا ہے، یہی پلی پلی جوڑتا ہے، یہی کپے

ڈھلکاتا ہے۔ یہی ہر تغیر سے ڈرتا ہے اور سارے تغیر اس کے شرمندۂ احسان ہیں، یہی احتیاط کے مارے پھونک پھونک کر قدم اٹھانے سے بھی ڈرتا ہے اور پھر یہی سرفروشانہ دہکتی آگ میں کود پڑتا ہے۔ یہی زمین سے نگہ نہیں ہٹا سکتا، یہی ستاروں سے باتیں کرتا ہے، یہی غفلت میں اعلیٰ سے منھ موڑ کر ادنیٰ کا گرویدہ ہوجاتا ہے، یہی ہوشیار ہو کر ادنیٰ کی آلودگیوں سے دامن چھڑا کر اعلیٰ کی طرف بیتابانہ بڑھتا ہے، یہی زندگی پر جان دیتا ہے اور حیات بے شرف تک پر راضی ہوجاتا ہے، یہی جان دے کر زندگی کا چراغ روشن کرنا بھی جانتا ہے اور مرگ با شرف کو اصل حیات اور ضامن حیات مانتا ہے، یہی سرکشی کرتا ہے، یہی سر تسلیم خم کرتا ہے، یہی کافر ہے یہی مومن، یہی فرعون یہی موسیٰ یہی شرار بولہبی، یہی چراغ مصطفویؐ، یہی یزید، یہی شبیرؑ اور اس کے ارتقاء کا سارا راز، بہائم پر اس کی فضیلت کی اصل، اس کی انانیت کا سارا اشرف اس میں ہے کہ یہ ادنیٰ پر اعلیٰ کو ترجیح دینے کے لئے، اپنے ضمیر کی پکار، اپنے قلب کے حقیقی میلان، اپنی عقل سلیم کے سچے رجحان کی وجہ سے مجبور ہے۔ یہ اس پکار کو ٹالتا ہے اس میلان کو دباتا ہے، اس رجحان کو توڑتا مروڑتا ہے، لیکن ان سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہ برائیاں کرتا ہے مگر اچھائی سے ہمیشہ کے لئے روگردانی نہیں کرسکتا، ظلم کرتا ہے مگر عدل کے مطالبے اسے بیچین رکھتے ہیں باطل کی حمایت کرتا ہے مگر حق سے دامن نہیں چھڑا سکتا، بدنمائیوں پر قانع نظر آتا ہے مگر حسن کے جادو سے پوری طرح محفوظ کبھی نہیں ہوتا۔ اسفل کی گھاٹیوں میں رہتے ہوئے بھی ایک گوشۂ چشم سے اعلیٰ کی چوٹیوں کو تکتا رہتا ہے۔ جب برائیوں کا غلبہ ہوتا ہے، جماعتی زندگی مفاسد سے پر ہوتی ہے اور ضمیر کی انفرادی زندگی اس مسموم ہوا میں دم توڑتی ہوتی ہے، اس وقت اس کا کوئی نہ کوئی فرد اس کے حقیقی ضمیر کا ترجمان، اس کی اعلیٰ قدروں کا محافظ اور معلم بن کر اسے جھنجھوڑتا ہے، بیدار کرتا ہے، اور اپنے کو خطرے میں ڈال کر اسے اپنی حقیقی تقدیر کے فراموش کرنے یعنی روحانی خودکشی سے باز رکھتا ہے۔ کربلا میں شہادت حسینؑ کا واقعہ ارتقائے انسانی کے اس عمل کا ایک مہتم بالشان، غیر فانی، تاریخی مظاہرہ تھا۔ یہ باطل کے مقابلے میں حق کا، جماعتی

مفاسد کے مقابلے میں افراد صالحہ کے فریضہ انقلاب کا، حکومت کے ظلم کے مقابلے میں شہری کے مطالبۂ عدل کا، بیدینی کے مقابلے میں دین کا سینہ سپر ہونا تھا کہ کہیں سیاسی اقتدار و جبروت ضمیر انسانی کی چنگاری کو بالکل بجھا نہ دے اور کہیں مصلحت اندیشی، خوف تن آسانی انسان کو اقتدار مطلقہ کے مطالبوں سے بیگانہ نہ کردے۔

وہ قوت ارتقائی ہی جس کے حامل حسینؑ اس تاریخی واقعہ میں تھے انسان کی حیات طیبہ کی ضامن ہے۔ یہی اسے بہیمیت کے اسفل السافلین میں لوٹ جانے سے روکتی ہے اور اس کا طریق کار بھی یہی ہے کہ اس کے حامل اس کے تقاضوں کو اپنی زندگی میں پورا کریں کہ اس کے تقاضے، اس کے مطالبے، دلیلوں سے منوائے نہیں جاسکتے، نہ خالص عقلی مقولوں میں ثابت کئے جاسکتے ہیں۔ ان کو اپنی زندگی میں برت کر دکھانا ہوتا ہے، ان کے لئے آرام و آسائش کو تجنا ہوتا ہے، اپنے پرائے کا برا بننا ہوتا ہے، محبت کے پھول برسا کر پتھر کھانے ہوتے ہیں، دعاؤں کے جواب میں گالیاں سننی پڑتی ہیں، مخلصانہ خدمتوں کے عوض بدگمانیاں اور بے اعتمادیاں ملتی ہیں اور ان سب کو مسکرا کر سہنا ہوتا ہے اور ان کی خاطر جی سے جانا ہوتا ہے۔ مگر سب سے زیادہ وضاحت سے اور اپنی غیر مشروط مطلق شکل میں یہ اس وقت سامنے آتے ہیں جب ان کے لئے ناکامیوں کو کامیابوں پر اور محرومیوں کو کامرانیوں پر ترجیح دی جاتی ہے اور اپنی پوری شان اور رنگینی میں اس وقت جب ان کے لئے جان کی بازی لگائی ہوتی ہے۔ کربلا کے میدان میں اقدار مطلقہ کی یہ حمایت اپنی اسی صاف اور واضح اور بے میل شکل میں سب دنیا کے سامنے آئی اور ایک داستان سادہ و رنگین، سے تاریخ انسانی کو ہمیشہ کے لئے مالا مال کرگئی۔

کس سادگی سے فرمایا اس شہید انسانیت نے حق پر اپنی آخری شہادت سے ایک شب پہلے:

لوگو! دنیا نے اپنا رنگ کیسا بدل لیا ہے؟ نیکی سے خالی ہوگئی ہے! افسوس، دیکھتے نہیں کہ حق پس پشت ڈال دیا گیا ہے، اور باطل پر علانیہ عمل کیا جارہا ہے اور کوئی نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑے، اسے

سہارا دے! بس اب وقت ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے، یہ شہید حق تاج وتخت لینے نہیں نکلا ہے، تاج وتخت لینے والے لقائے الٰہی کی خواہش نہیں کیا کرتے، تاج وتخت چاہنے والے یکسوئی سے شہادت کا قصد کر کے نہیں نکلا کرتے، تاج وتخت کے طالب مٹھی بھر آدمیوں سے لشکر جرار کا مقابلہ نہیں کرتے۔ یہ شہید حق اس سستی کامیابی، کے لئے نہ نکلا تھا جو انسان کو اکثر سچائی اور اچھائی سے بے تعلق و بیگانہ کر دیتی ہے۔ کامیابی چاہنے والے اپنے گنے چنے ساتھیوں کو معرکے سے پہلے ساتھ چھوڑ سکنے کی رخصت نہیں دیا کرتے، وہ مقابلے سے پہلے کی شب میں ان سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا، میری رائے ہے کہ تم خاموشی سے نکل جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہید اپنی شہادت کو انسانیت کے لئے اتنا صاف اور واضح بنانا چاہتا ہے کہ کسی کو سمجھنے میں ذرا دشواری نہ ہو۔ پھر جب وفادار ساتھی ساتھ نہیں چھوڑتے تو قربان گاہ تسلیم و رضا پر اپنی آنکھوں کے سامنے کی قربانی پیش فرماتے ہیں۔ ایک ایک کر کے وفادار ساتھی قربان کئے جاتے ہیں، عورتوں اور بچوں کو بے وارث ہوتے دیکھا جاتا ہے، جوان بیٹے کو اپنے آگے راہی ملک بقا کیا جاتا ہے، شیر خوار پیاس سے بلکتے بچے کو اپنے ہاتھوں میں دم توڑتے دیکھا جاتا ہے اور پھر اپنی جان کا ہدیہ جان آفریں کی بارگاہ میں پیش کر دیا جاتا ہے۔ گویا حق کے لئے قربانی کا سبق دینے والا قربانی کی ہر دشوار سے دشوار اور دل شگاف سے دل شگاف شکل کی مثال بیک وقت پیش کر دینا چاہتا ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس راہ میں کوئی قربانی بھی ایسی ہے جو نہ کی جائے۔ قدرت کو بھی شاید اس سبق کی وضاحت منظور ہے۔ ادھر سے قوت و جبروت بھی اپنی سب عادتوں کا پورا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان بظاہر ناکام مخالفوں کے سر کاٹے جاتے ہیں، ان کی لاشیں روندی جاتی ہیں، ان کی عورتوں کے سروں سے چادریں اتاری جاتی ہیں، ان کے خیمے جلائے جاتے ہیں، رسیوں سے باندھا جاتا ہے، طوق پہنائے جاتے ہیں، ناکامی کی ہر ممکن شکل کا

ظہور ہوتا ہے تا کہ حق پرستی کا سب سے موثر سبق انسانیت کے ذہن نشیں ہو جائے۔ حق کا ساتھ دینا جب کامیابی، سستی وقتی کامیابی، اس کی جلو میں ہو کچھ بہت دشوار نہیں، اس کی راہ میں ناکامیوں کو سینہ سے لگانا اور اس کی آخری فتح پر ایمان رکھنا حق کی حقیقی قوت کو آشکار کرتا ہے، یہی انسانیت کی ضمانت ہے، یہی شہادت حسینؑ کا ماحصل۔ اسی سے حسینؑ انسانیت کے محسنین اعظم میں ہیں اور ان کی شہادت کی داستان تاریخ انسانیت کا ایک نہایت قیمتی رنگین ورق۔

(سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ نمبر ۳۶۶ محرم ۱۳۸۲ھ)

حسینؑ، سید الشہداء

ترجمۂ مضمونِ کتاب ''اسوہ ہائے جاوید'' (فارسی) مصنفۂ پروفیسر علامہ علی محمد نقوی، علی گڑھ

امام حسنؑ نے ''صلح'' کو جنگی حکمت عملی (اسٹریٹجی) بنایا تھا اور امام حسینؑ نے ''شہادت'' کو، مگر یہ دو الگ نقشے نہیں ہیں بلکہ انھیں ایک ہی نقشہ کے ''دو حصے'' سمجھنا چاہئے۔ ۶۱ھ میں حضرت معاویہ، یزید کی صورت میں نمودار ہوتا ہے اور امام حسنؑ کی ماہرانہ جنگی حکمت عملی کے نتیجہ میں ''نفاق'' کے چہرہ کو اپنی آڑ میں چھپانے والی نقاب پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ امام حسینؑ کے لئے یہی موقع تھا کہ براہ راست مقابلہ کر کے یزیدیت کو اپنے خون کے سمندر میں غرق کر کے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

امام حسینؑ نے مقابلہ کیوں کیا؟

اسلام کے خط مستقیم سے انحراف کم و بیش پیغمبر اسلام کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ ''امامت'' کو کنارے کر کے اس کی جگہ ''خلافت'' نے لے لی تھی مگر معاویہ کے زمانے سے ''خلافت'' بھی تبدیل ہو کر ''سلطنت'' کی شکل میں آ گئی تھی اور دنیائے اسلام میں قیصر و کسریٰ کا نظام رائج ہو گیا تھا اور یہ ابوسفیان کا خون اور تہذیب قیصر و کسریٰ کا وارث ''خلیفۃ المسلمین'' کے نام سے مسند خلافت پر قابض ہو کر ایک خطرناک تغیر کو جنم دے رہا تھا اور قالب اسلام میں جاہلیت کا زہر پھیلا رہا تھا اور اسے ''دین محمدی'' کے نام سے پیش کر رہا تھا۔ اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ چند ہی نسلوں میں اصل اسلام، طاقِ نسیاں کی زینت بن جائے گا اور بدکار حکمرانوں کا کردار نمونۂ اسلامی سمجھا جانے لگے گا۔

اس خطرے کے احساس سے معاشرہ قطعی بے تعلق تھا۔ اس پر حالات ایسے تھے کہ معاشرے کے اندر ''حق'' پر ''مکاری'' کو اور ''حقانیت'' پر ''سیاست'' کو فتح حاصل تھی، ''عرفان'' پر ''جہل''

غالب تھا۔ اسلامی قلمرو کے اکثر علاقوں کے عوام جو حجاز سے کافی فاصلے پر تھے حقیقت اسلام سے ناواقف تھے، دمشق کے محل میں تخت سلطنت پر ٹھاٹ سے بیٹھنے والے خلیفہ کو وہ مجسمۂ اسلام سمجھتے تھے اور اس کے خلاف کھڑے ہونے کو وہ ''رہبر اسلامی'' کے خلاف بغاوت سمجھتے تھے۔ حجاز، مکہ، مدینہ، عراق اور خراسان کے عوام نسبتاً زیادہ آگاہی رکھنے کے باوجود امتناعی حالات سے خوفزدہ تھے۔ ایک تنہا کوفہ بچا تھا مگر وہ شام کی منظم فوج سے مقابلہ کا متحمل نہ تھا۔ ''مرجئی''، ''صوفی'' اور ''جبری'' جیسے نئے نئے فرقے اور مسلک اپنے رنگا رنگ نظریات و قیاسات کے متعلق عوام کے سامنے طرح طرح کی توجیہیں اور جواز پیش کر رہے تھے۔ ۶۱ھ کے دوران تقریباً ایسے ہی حالات کا وجود تھا اور عوام کے ذہنوں کو سلا دینے کی کوشش کی جارہی تھی۔

امام حسینؑ ان حالات سے مقابلہ، دین کے مورچہ کی حفاظت، اسلام کی اصلیت کے تحفظ، ظلم اور استبداد کو مٹانے اور اسلام کو محل نشین خلیفہ کے پنجہ سے آزاد کرانے کے لئے حق پرستوں کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب پیروانِ حق کے لئے باطل کی قوتوں پر فتح پانا ممکن نہ تھا، ظلم کو اس طرح رسوا کرنا کہ وقت کی رفتار کے ساتھ اس کا نام و نشان مٹ جائے، جس وقت فوجی قوت سے بساط ظلم پلٹنا ممکن نہ ہو، اس وقت شہادت اختیار کرنا چاہئے۔ یعنی اپنی اور اپنے عزیزوں کی زندگی کو قربان کر کے ظلم کو رسوا اور ظالم کو بے نقاب کریں۔ لہٰذا امام حسینؑ نے اسی طریقہ کا انتخاب کیا۔

البتہ امام حسینؑ کے مقابلہ پر اس وقت تین قسم کے گروہ اور تین انداز کے طرزِ فکر تھے:

(الف) **یزیدی:** وہ لوگ جو حق کے مقابلہ میں مورچہ بند، بندۂ ظلم و جور، صاحبان زر و زور، خودسر اور ستمگر لوگوں کے نمکخوار تھے۔

(ب) **گروہ ناصحین و موافقین:** جو سمجھوتے، نرمی اور مصلحت اندیشی کے حق میں تھے۔

(ج) **عام لوگ:** جو ان معاملات سے بے خبر اور صرف ایک تماشائی کی حیثیت رکھتے تھے۔

تاریخ میں جب بھی حق و باطل کے درمیان جنگ ہوئی ہے، ہر بار ان تینوں گروہوں کا وجود بھی

ملتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ متذکرہ بالا گروہ دوم سے متعلق تھے انھوں نے امام حسینؑ کو نصیحت کی اور مشورہ دیا کہ وہ مصلحت اندیشی سے کام لیتے ہوئے یزید سے سمجھوتہ کرلیں، مگر امام حسینؑ شہادت اور قربانی کی راہ کا تعین کر چکے تھے لہٰذا وہ اسی راہ پر آگے بڑھے اور اپنی امامت کی خصوصیت کو انھوں نے برقرار رکھا۔

شکست میں فتح

بہ ظاہر کربلا کی جنگ آدھے دن میں ختم ہوگئی۔ تمام انقلابی شہید ہو گئے سوائے کربلا کے ان چند پیغامبروں کے جو پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری کا بار اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے تھے۔ حالانکہ انقلابی شہداء، کربلا میں اپنے خون میں غلطاں محوِ خواب تھے مگر انقلاب بیدار ہو چکا تھا۔ پیروانِ دین خاک وخون میں لت پت پڑے تھے مگر دین نجات پا چکا تھا۔ بہ ظاہر یزید کو فتح ضرور حاصل ہوئی تھی مگر تاریخ کی گہرائی میں وہ ایک بدترین شکست خوردہ انسان تھا اور حسینؑ کو شکستِ ظاہری کی صورت میں ایک عظیم ترین فتح حاصل ہوئی۔ موت نے اپنے ہاتھوں سے انھیں حیات ابدی کا تحفہ پیش کیا۔

کربلا میں حسینؑ اور حسینیوں کے کارہائے نمایاں کا نتیجہ کیا ہوا؟ حسینؑ نے شکست کھائی یا فتحیاب ہوئے؟

ہر تحریک اور اقدام کی شکست وفتح کو اس کے مقاصد (کی کامیابی اور ناکامی) کے لحاظ سے طے کرنا چاہئے۔ حسینؑ کی شہادت سے یزید کے تین مقاصد تھے۔ پہلا مقصد تھا آوازِ حق بلند کرنے والوں کا گلا گھونٹ کر صدائے حق کو دبا دینا، دوسرا مقصد تھا نظامِ اموی اور خاندان ابوسفیان کی ہر مخالفت کو کچل دینا، اور تیسرا مقصد تھا ابوسفیان کی نیابت میں ''اسلام محمدؐ'' سے انتقام لینا۔ مگر ان میں سے اس کا کوئی مقصد بھی پورا نہیں ہوسکا اور خون حسینؑ نے نقیبانِ حق کی فریاد واحتجاج کو پرزور بنا دیا۔ شہادت حسینؑ تختِ اموی کو متزلزل، اموی سیاسی طاقتوں کو سو سال سے بھی کم عرصہ میں فنا اور

تاریخ میں یزیدیت کو ذلیل وخوار کرنے کا موجب بن گئی اور صدائے حق بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔

اس کے مقابلے میں امام حسینؑ کا مقصد ''حقیقی اسلام'' کو ''حکومتی اسلام'' سے جدا کر دینا تھا تاکہ یزیدیوں کے عمل کو ایک فاسد حکمراں کا کردار ہی سمجھا جائے، اس پر اسلامی نمونہ کا دھوکا نہ ہو۔ امام حسینؑ نے اپنے ارادہ اور اپنے مقصد کو قوت بخشی اور سرحدِ اسلام پر اپنے ''خون'' کی گہری اور انمٹ لکیر کھینچ کر اسلام کو حکمرانوں کے کردار سے جدا کر دیا۔ بہت سے مسلمان یزید سے قبل کے خلفاء کے کردار کو ''اسلام کا نمونہ'' اور ''سند'' سمجھتے ہیں، مگر قربانیٔ حسینؑ نے یزید اور دیگر حکمرانوں کے کردار اور مثالی کردار اسلامی کے درمیان جو بعدِ مشرقین تھی اسے اظہر من الشمس کر دیا، یہاں تک کہ اہلسنت بھی یزید اور بعد کے خلفاء کے کردار کو مستند نہیں مانتے۔

امام حسینؑ کا مقصد تاریخ میں یزید کو رسوا کرنا، حقیقتِ اسلام کا تحفظ اور اسلام کے سچے پیغام کو بطور امانت تاریخ کے حوالے کر دینا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یزید اپنے کسی مقصد میں بھی کامیاب نہ ہوسکا جب کہ حسینؑ اپنی شہادت کے ذریعہ اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہے اور یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ کربلا کی جنگ میں جسے عظیم ترین فتح حاصل ہوئی، وہ حسینؑ تھے اور جسے بدترین شکست نصیب ہوئی اور جو نیست ونابود ہوگیا وہ یزید تھا نیز یزیدیت تھی۔ یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ جو فتحیاب ہوتا ہے، وہ پشیمان نہیں ہوتا اس کے برعکس جو شکست کھاتا اور نقصان اٹھاتا ہے وہ حسرت اور پشیمانی کا شکار ہوجاتا ہے۔ ہم تاریخ سے پوچھتے ہیں کہ پشیمان کون ہوا: حسینؑ یا یزید؟ یہ معرکہ صحرائے کربلا میں فتح وشکست کے تولنے کا ایک معیار ہوسکتا ہے۔

ابھی کربلا کی جنگ کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ یزید نے اسیران کربلا کو مدینہ واپس بھیج دینے کا فیصلہ کرلیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھ رہا تھا کہ دمشق اور جہان اسلام کے تمام اطراف وجوانب میں شہیدوں کے لہو کے قطروں سے انقلاب کے پھول کھلنے لگے ہیں۔ اسیرانِ کربلا کی واپسی یزید کی پشیمانی اور احساس شکست کی علامت ہے۔ زینبؑ وسجادؑ کی خواہش ہے کہ یادِ حسینؑ و یاد کربلا

ہمیشہ زندہ رہے جبکہ یزیدی چاہتے ہیں کہ ”کربلا“ جلد از جلد ذہنوں سے محو ہوجائے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ شہیدوں کے خون کی طغیانی میں انہیں اپنی فتح تنکے کی طرح بہتی اور خطرناک امواجِ شکست اپنی جانب بڑھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

واقعات کربلا کو ابھی پانچ برس بھی نہ گذرے تھے کہ یزید واصل جہنم ہوا اور اپنے باپ اور دادا کے تخت پر یزید کا بیٹا معاویہ آیا۔ اس کے برسرِ اقتدار ہوتے ہی خاندان ابوسفیان کی سلطنت ختم ہوگئی اور اس کی جگہ مروان اور اس کی اولاد نے زمام حکومت سنبھالی۔ مگر انہیں نئے انقلابات کا سامنا کرنا پڑا اور تمام تحریکوں کو لے کر اٹھنے والوں کا نعرہ تھا: ”انتقام خون حسینؑ“ چنانچہ انقلاب مختار، قیام ابراہیم، قیام توابین وسلیمان بن صرد خزاعی وزید ویحییٰ وغیرہ نے اموی حکومت کو لرزہ براندام کردیا یہاں تک کہ سو سال سے بھی کم عرصہ میں بنی امیہ کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ حسینؑ اور طلبگارانِ انتقامِ خون حسینؑ کے نام پر عباسی برسرِ اقتدار آگئے۔

امام حسینؑ کیوں شہید ہوئے؟

اس لئے کہ امت کو بیدار کریں۔ امام حسینؑ اپنی سچائی کے ذریعہ اور اپنا خون بہا کر اُمتِ اسلامی کو خوابِ غفلت سے چونکانا چاہتے تھے، کربلا کے واقعات سے پہلے لوگوں کی بے تعلقی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ جمعہ کی نماز خلیفہ نے بدھ کے روز پڑھوائی اور سبھوں نے پڑھی، مگر کربلا کے بعد یہ تمام انحرافات اور تحریکیں سو سال سے بھی کم عرصہ میں ختم ہوگئیں۔

کربلا میں خون کا ایک دھماکہ ہوا اور اس عظیم دھماکہ کی لہروں نے تمام قلمرو اسلامی میں پھیل کر ایک لرزہ پیدا کردیا۔ عرصۂ تاریخ میں یزید کو رسوا کیا یہی نہیں بلکہ اس عظیم دھماکہ سے تاریخ کے سنگلاخ سینہ سے ایک ایسا چشمہ پھوٹا جس کی روانی سے اسلام ہمیشہ ہمیشہ کسبِ حیات کرتا رہے گا۔

تاریخ میں کربلا کا دوام:

ہابیل اور قابیل کی طاقتوں میں تصادم

موسیٰؑ وفرعون وشبیرؑ ویزید
ایں دو قوت از حیات آمد پدید

(علامہ اقبالؒ)

اسلام جس کا اعتقاد توحید اور قیامت پر ہے دنیا کے سلسلے میں خالق کے شعور، ارادہ اور مقصد کا بھی قائل ہے اور ”وحدتِ تاریخ“ کو بھی مانتا ہے۔ تاریخ گذشتہ واقعات کا ایسا مجموعہ ہے جو اتفاقی طور پر پیدا ہو کر ختم نہ ہوجانے والی ہے بلکہ واقعات کا ایک تسلسل ہے جو پیہم رواں ہے جیسے ایک کارواں، ایک چشمہ جو انسان کی زندگی کے آغاز کے ساتھ جاری ہوا اور ایک مستقل روانی کے ساتھ مخصوص سمت میں بہتا چلا جارہا ہے۔ اس چشمۂ امروز وفردا میں ہر گذرا ہوا ”کل“ ایک ”آج“ کو جنم دیتا ہے۔ ہر حال ماضی کے پیٹ میں رہتا ہے اور ہر ماضی حال کی ”پیٹھ پر“ ہوتا ہے۔ روئے زمین پر تاریخ انسان کے ساتھ حرکت کرتی ہے اور جو قدریں تاریخ پر حکمرانی کرتی ہیں انھیں ”سنن الٰہی“ کہتے ہیں۔ ان ”سنن الٰہی“ میں ایک یہ بھی ہے کہ ”حق“ ہمیشہ ”باطل“ سے نبرد آزما رہتا ہے، ”علم“، ”جہل“ سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ ایمان کفر سے مصروفِ جنگ رہتا ہے اور انحراف سے بنیاد الٰہی کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہ جنگ آدمؑ سے شروع ہوتی ہے اور اس کے بعد سے تاریخ، کشاکشِ ہابیل وقابیل کے محور پر گھومتی رہتی ہے۔ ہر دور ہر عہد اور ہر جگہ میں حق انبیاء ومومنین کی سرکردگی میں باطل کے تاجداروں سے مصروف پیکار رہا ہے۔ ابراہیمؑ ونمرود، موسیٰؑ وفرعون، اور محمدؐ وابولہب وابوجہل وابوسفیان۔ یہ تمام مراحل ہمیشہ جاری وساری رہتے ہیں، یہ جنگ ایک گزر جانے والی جنگ نہیں بلکہ ایک تاریخی تسلسل ہے جو ہر دور میں دہرایا جاتا ہے۔

”حق“ و ”باطل“ کی یہ جنگ فلسفۂ تاریخ کا رخ اسلام کی سمت موڑتی ہے۔ چنانچہ کربلا اس جنگ کی ایک عظیم تجلی اور نمایاں میدان ہے۔ جس نے ”حق“ وباطل کی جنگ کے ایسے ایسے پہلو اجاگر کئے ہیں کہ اس کے بعد سے ہونے والی ہر جنگِ ”حق“ و ”باطل“ کو کربلا سے منسوب کیا جانا

چاہئے، کربلا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو تاریخِ بشر کے آغاز کے ساتھ جاری ہوا اور جو حال کو اپنی لپیٹ میں لیتا ہوا مستقبل کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے۔

حسینؑ، روانیِ تاریخ کے وارث

''زیارتِ وارثہ'' درحقیقت فلسفۂ تاریخ کے بارے میں شیعی نقطۂ نظر کا اعلان ہے۔ یہ زیارت پکار پکار کر کہتی ہے کہ حسینؑ ایک فرد نہیں بلکہ پیوستہ تاریخ کی روانی کے وارث ہیں۔ حسینؑ اس پرچم کے وارث ہیں جو تاریخِ بشری میں باطل، ظلم، زور، انحراف اور جاہلیت کی قدروں کے خلاف ہونے والی جنگ میں ہاتھوں ہاتھ ہوتا ہوا حسینؑ تک پہنچا ہے۔ وہ وارثِ آدم، وارثِ نوح، وارثِ ابراہیم، وارثِ موسیٰ، وارثِ عیسیٰ، وارثِ حضرت محمدؐ، وارثِ علیؑ اور وارثِ حسنؑ ہیں۔ اگر قرآنی صفحات کا مطالعہ کر کے دیکھا جائے کہ ہابیل، نوح، ابراہیم اور موسیٰ کن قدروں کے علمبردار تھے اور کن قوتوں اور قدروں کے خلاف مصروفِ وغا تھے تو معلوم ہوگا کہ ہر دور میں نسبتاً کمتر مگر ایک کربلا کا وجود تھا۔ زمانے کے آگے بڑھتے ہوئے قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے جب ہم قم کے عظیم مظاہرہ اور ۱۷ شہریور کی کامیابیوں اور خونین شہر و آبادان کے مناظر تک پہنچتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ''کل'' کی کربلا کھنچ کر ''آج'' کے حالات میں ڈھل گئی ہے اور ہم یہ مان لیتے ہیں کہ کربلا کبھی ختم نہیں ہو سکتی اور کربلا کی تکرار ہر دور میں ہوتی رہے گی۔

بظاہر ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور حسینؑ کے درمیان قرنوں کا فاصلہ ہے، مگر حسینؑ براہ راست آدمؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے وارث ہیں اور نمرود و فرعون صرف اپنی قوت کا استعمال کرنے والے ہیں جو ان انسانوں کو جنھیں صرف خدائے واحد کے آگے جھکنا اور اس کی عبادت کرنا چاہئے، اپنے آگے جھکانا چاہتے ہیں اور ان سے اپنی پرستش کروانا چاہتے ہیں۔ موسیٰؑ اسی اصول کے خلاف کھڑے ہوئے تھے اور فرعون سے ٹکرا گئے تھے تاکہ انسانوں کو طاغوت کی بندگی سے نجات دلائیں۔ لہٰذا موسیٰؑ نے دربار میں فرعون سے مطالبہ کیا:

''اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ'' (سورۂ دخان، آیت: ۱۸) [بندگانِ خدا کو مجھے واپس کر دے، میں تیری طرف بھیجا ہوا خدا کا امین ہوں۔]

''اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ'' (سورۂ شعراء، آیت: ۲۲) [تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے۔] حسینؑ بھی ظلم و جور، قوت و اقتدار کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور ایک عظیم حکومت کے خلاف تن تنہا کھڑے ہو گئے۔ گویا حسینؑ یہ کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارے پاس دین نہیں ہے تو کم سے کم دنیا میں تو آزاد رہو۔

آج بھی انسان کی مخالف طاغوتی طاقتیں، مشرقی اور مغربی سامراجیت کی شکل میں، ریگن، برژنف اور صدام کی صورت میں کمزور قوموں کو جو یزید کے زمانے کے مسلمانوں اور بنی اسرائیل کی مانند ہیں، اپنے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں اور حسینی طاقتیں یزیدانِ زمانہ سے برسرِ پیکار ہیں۔ پیروِ حسینؑ میں مائیں اپنے کمسن اور جوان یعنی غلامانِ علی اکبر و علی اصغر کو اسلام پر قربان کر رہی ہیں۔ آپ غور کریں کہ آبادان اور خونیں شہر میں حق و باطل کے درمیان محاذ جنگ پر کیا ہو رہا ہے؟

موسیٰؑ کے مقابلہ میں فرعون کا ردِعمل کیا تھا؟ مادی طاقتوں کے ذریعہ حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کرنا: ''ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ'' (سورۂ مومن، آیت: ۲۶) [فرعون نے کہا: ''چھوڑ دو میں موسیٰ کو قتل کر دوں، مگر میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ آیا وہ تم لوگوں کو نئے نظریات اور نیا عقیدہ دیتا ہے یا زمین پر فساد پھیلاتا ہے۔] امام حسینؑ بھی اسی ردِعمل سے دوچار تھے۔

ناسخ التواریخ کے مطابق:۔ یزید نے والیِ مدینہ ولید کو لکھا: ''اگر حسینؑ ابن علیؑ بیعت نہ کریں تو اس خط کے جواب میں ان کا سر میرے پاس بھیج دو'' جس وقت حسینؑ، یزید کے والی، ولید کے سامنے تھے، مروان نے کیا کہا؟ اس نے کہا: ''حسینؑ پر نظر رکھو تا آنکہ یا تو وہ بیعت کریں یا ان کا سر قلم کر دو''(۱) جواب میں امام نے کہا: ''وَيْلَكَ يَا ابْنَ الزُّرْقَا، اَنْتَ تَأْمُرُ يَضْرِبِ عُنُقِيْ

كَذَبْتَ وَلَوْمِتُّ“ یعنی ”اے ناپاک اور گندی اولاد! تو میری موت کا حکم دیتا ہے؟ خدا کی قسم تو نے جھوٹ کہا اور اس کے لئے تجھے ملامت بھگتنی پڑے گی۔“ (ناسخ التواریخ، حالات سید الشہداء، ص ۱۵۶)

یزیدوں، فرعونوں، ریگنوں، آریا مہروں اور صداموں کا یہی شیوۂ مشترک ہے کہ اسلحہ کے زور پر نقیبانِ حق کو خاک وخون میں غلطاں کر دیتے ہیں تاکہ وہ موجودہ حالات کو اپنے موافق نہ بنا سکیں اور اسے وہ فساد اور بغاوت کا نام دیتے ہیں۔ اس کی واضح اور آشکار ترین تصویر کربلا میں پیش کی گئی۔ حسینؑ نے خون کے طاقتور طوفان سے دشمن کے اسلحے اور ثروت، اقتدار اور خیرہ سری کی اس تاریخی منطق کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس حسینی مہم کو گذرے چودہ سو برس ہو گئے مگر آج بھی جب کبھی کہیں حق باطل سے ٹکراتا ہے تو باطل اسی اصول پر کاربند ہوتا ہے اور پاسبانِ حق بھی محاذِ جنگ پر شجاعت کربلا دہراتے ہیں اور خون کے زور سے شمشیر پر فتح حاصل کر کے پیرویِ حسینؑ کرتے ہیں۔ اس طرح تاریخ کے دھارے پر کربلا کا تسلسل قائم رہتا ہے۔

فرعون کے متعلق قرآن کہتا ہے: ”جَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ“ (سورۂ قصص، آیت: ۴)

”فرعون کے خاص جرائم میں ایک یہ بھی تھا کہ وہ انسانوں کو نسلی اعتبار سے تقسیم کرتا تھا اور گروہوں کو دبائے رکھتا تھا۔“

۶۱ھ میں امام حسینؑ اسی قسم کے حالات سے دوچار تھے۔ جاہلیت کی بنیادیں، قومی اور قبائلی عصبیتیں دوبارہ سر اُٹھا رہی تھیں۔ امتِ اسلامی کے کمزور افراد ظلم واستبداد کا شکار تھے۔ ایسی صورت میں امام حسینؑ بھی حضرت موسیٰ کی طرح اس صورت حال کو ختم کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

یہ حقیقت ہے کہ امام حسینؑ آدمؑ ونوحؑ وابراہیمؑ وموسیٰؑ کے وارث تھے۔ لیکن کیا آج امریکہ، روس اور ان کے نمک خواروں کی سامراجیت کا مجرمانہ طرزِ عمل کچھ مختلف ہے؟ ایسے موقع پر وارثانِ مشعل کربلا اور پیروانِ حسینؑ آج بھی خمینی یا ان کی طرح باطل قوتوں سے ٹکرا رہے ہیں۔ یہ ہے

تاریخ کے امروز پر کربلا کی تکرار اور کربلا کا تسلسل۔

یزیدوں، فرعونوں اور نمرودوں کے عمل کے جواب میں حسینؑ، موسیٰؑ، ابراہیمؑ اور ان کے پیروؤں کا رویہ کیا ہے۔ ان کا رویہ ایک ہی منطق سے ماخوذ رہا ہے یعنی ”لا“ اور ”الا“، ”ہاں“ اور ”نہیں“۔ ہر ”زور“، ”ستم“، ”باطل“ اور ”طاغوت“ کے مقابلے پر ”نہیں“ اور ”خدا“، ”حق“، ”انصاف“ اور ”سچائی“ کے سامنے ”ہاں“۔

حق کے انہیں علمبرداروں کی ”نہیں“ تاریخ کی جان اور قوت کا سبب رہی۔ یہی منطق ”نہیں“ اور ”ہاں“ تھی جو زندگی میں تحرک وروانی قوت کا سبب بن گئی۔ ان حق کے علمبرداروں کے ہاتھ میں ”نہیں“ وہ شمشیر تھی جس نے زندگی کے تمام سماجی، سیاسی اور مذہبی بدبختیوں کو جڑ سے ختم کر دیا...... پیغمبرانہ ”ہاں“ ہمیشہ ایک ”نہیں“ کے ساتھ ہوتی ہے۔

حسینؑ کا انکار اور ”نہیں“ موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کی ”نہیں“ ہے۔ یہ نہیں توحید کی گہرائیوں سے پھوٹتی ہے۔ اس میں ”ہاں“ بننے کا امکان نہیں پایا جاتا اس لئے کہ اگر یہ ”نہیں“ ”ہاں“ بن جائے تو جتنی چیزیں برائیوں کی نفی کرتی ہیں وہ سب اثبات میں بدل جائیں۔ ”نہیں“ تمام جھوٹے نقابوں کو تار تار کر کے اصل حقیقت کو جلوہ گر کرتی ہے۔ انسان اور عالم کا ارتقا بغیر اس ”نہیں“ کے ممکن نہیں ہے۔

آدمؑ کے وارثِ حسینؑ سے جب ابن زبیر نے پوچھا کہ اگر یزید بیعت کی دعوت دے تو آپ کیا کریں گے؟ آپ نے فرمایا: ”میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا۔“ (کامل ابن اثیر، ج ۱ ص ۷ طبع ۱۳۰۳ھ) آپ نے محمد حنفیہ سے مخاطب ہو کر اعلان فرمایا: ”يَا اَخِيْ وَاللهِ لَوْ لَمْ يَكُنْ فِي الدُّنْيَا مَلْجَاً وَّلَا مَأْوٰى لَمَّا بَايَعْتُ يَزِيْدَ ابْنِ مُعَاوِيَةَ“

[خدا کی قسم اگر میرے لئے ساری دنیا میں کہیں بھی امن اور پناہ کی جگہ نہ ہو تب بھی میں فرزند معاویہ کے ہاتھ پر ہرگز ہرگز بیعت نہ کروں گا۔]

حسینؑ کے اس انکار اور اس نہیں نے تاریخ کی بیکراں فضاؤں میں ابد تک کے لئے ایک گونج

پیدا کر دی ہے۔ ''نہیں'' یعنی باطل، طاغوت، انحراف اور ہر اس چیز، ہر اس قوت کے مقابلے میں احتجاج جو حقیقت اور خدا سے ٹکراتی ہے اس کے بعد ''ہاں'' یعنی صرف خدا کے حضور میں اور منشائے الٰہی کے آگے اقرار۔

''ہاں'' اور ''نہیں'' یعنی ''اقرار'' و ''انکار'' کی یہی منطق ہے جو زندگی کو الکٹران (electron) اور نیوٹران (neutron) کے ابتدائی مراحل سے لے کر روحانی اور معنوی مراحل کی بلندیوں تک انسان کی رہنمائی کرتی ہے اور حیات انسانی کی بقا کی ضامن ہے۔

واقعہ کربلا کے چودہ سو برس کے بعد آج بھی نسلِ حسینی کا ایک نائب امام و رہبر زمانے کے یزیدوں کے مقابلہ میں اسی ''نہیں'' کی تکرار کر رہا ہے۔ اس ''نہیں'' میں ایسا یقین ہے کہ جو بڑی بڑی جابر حکومتوں کا تختہ پلٹ سکتا ہے۔ حسینؑ کی پیرو ملت ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ''كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ'' ہے جو مشرقی و مغربی قوتوں کے مقابلہ پر کھڑی ''نہیں'' کی تکرار کر رہی ہے اور نسلِ حسینی کا اپنے قبیلہ کی سنت سے وفاداری کا یہ عالم ہے کہ کربلا پھر اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

قرآن بتاتا ہے کہ فرعون قسم کے لوگ علمبردارانِ حق کی محکم حکمت عملی اور ان کی کامیابیوں کے خلاف طرح طرح کے بہتان، تہمتیں اور الزامات تراشتے ہیں۔ موسیٰؑ کو فرعون نے کبھی 'ساحر کذاب' کہا، کبھی ''اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ'' یعنی دیوانہ اور کبھی بانیِ فساد ٹھہرایا۔ یزید بھی وارثِ موسیٰؑ حسینؑ کو باغی، فسادی اور ہنگامہ ساز وغیرہ مشہور کرتا ہے اور چودہ سو برس بعد آج بھی علمبردارانِ حق کو جن اتہامات والزامات کا سامنا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں باطل کے اصولِ جنگ، حربوں اور طریقہ کار میں سابقہ مماثلت باقی ہے اور زمانے کی تبدیلی بھی اس میں کوئی فرق نہ پیدا کر سکی۔

حالات کس قدر ملتے جلتے ہیں۔ یہ فرعونی حکمرانی کا دور ہے۔ اس کے قلمرو میں ہر ظلم وستم اور خود پرستی کی حکمرانی ہے۔ اس نے لوگوں کی آزادی سلب کر رکھی ہے اور نقیبِ حق موسیٰؑ کو مصر سے ہجرت

پر مجبور ہونا پڑا ہے۔

''فَخَرَجَ مِنْهَا خَآئِفًا يَّتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِىْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ۔''

(سورۂ قصص، آیت:۲۱)

اور اب یزیدی دور ہے، اسلامی قلمرو میں ایک بار پھر ظلم وستم، غصب اور غارتگری کا دور دورہ ہے، یزید حسینؑ سے بیعت کا طلبگار ہے اور حسینؑ چودہ سو برس پہلے ہی کے فیصلہ کن انداز میں ایک بار ''نہیں'' کہتے ہیں۔ یزید امام وقت کے قتل کا حکم صادر کرتا ہے اور امامِ وقت اپنی عورتوں اور معصوم بچوں کے ساتھ مدینہ چھوڑ کر مکہ آنے پر مجبور ہے۔

یزید نے کیا کیا؟

''فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِى الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَشِرْذِمَةٌ قَلِيْلُوْنَ وَاِنَّهُمْ لَنَا لَغَآئِظُوْنَ وَاِنَّا لَجَمِيْعٌ حٰذِرُوْنَ۔''

(سورۂ شعراء، آیات: ۵۳-۵۶)

انبیاء کی تحریک کے مقاصد میں ایک مقصد انحراف کے تسلط سے بچاؤ تھا۔ زمانہ میں جب مختلف مضرت رساں اسباب کے نتیجہ میں انسانیت کا قافلہ صراطِ مستقیم سے بھٹک جاتا ہے تو ایسے حالات میں خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے ایک جہاد کا آغاز کرتا ہے تاکہ دین الٰہی کے منور اور شفاف چہرے پر جو فساد اور انحراف کے داغ پڑ گئے ہیں انہیں دور کر دے۔

جس وقت امام حسینؑ نے تحریک کربلا کی ابتدا کی، اس وقت خدا کا آخری کامل ترین دین اسلام انحراف کے دہانے پر کھڑا تھا۔ مسندِ خلافت پر یزید کا قبضہ تھا، وہ ''خلیفہ'' کے نام سے مسلمانوں کا دینی رہنما تھا اور اس کا ہر عمل تمام مسلمانوں کے لئے مثالی اور نمونہ سمجھا جاتا تھا اور یہ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا کہ کسی وقت بھی صحیح اسلام کی صورت بدل جائے گی۔ ایسی صورت میں حسینؑ چاہتے تھے کہ اپنا خون، علی اکبرؑ، علی اصغرؑ، قاسمؑ و عباسؑ کا خون نیز زینبؑ و امّ کلثومؑ کی چادر دے کر، غرض کہ کسی بھی قیمت پر ''خلافت'' کے نام سے موجودہ حکومت کو اس طرح رسوا کر دیا جائے کہ اگر وہ مٹ نہ بھی

سکے تو کم از کم خلیفہ کو مسلمانوں کا ''دینی خلیفہ'' کسی طرح نہ مانا جائے اور خلیفہ کی شخصیت اسلامی تعلیمات سے قطعی الگ ہو جائے۔ حسینؑ کو اپنے اس مقصد میں زبردست کامیابی ہوئی۔ یزید سے پہلے جو خلفاء تھے حتیٰ کہ معاویہ تک مثالی اور نمونے سمجھے جاتے تھے، مگر یزید اور اس کے بعد کے خلفاء اسلامی تعلیمات سے اس قدر مختلف نظر آنے لگے کہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ بھی ایسا نہیں جو نگاہ احترام سے انھیں دیکھے۔ معرکۂ کربلا کا یہ ایک عظیم ترین کارنامہ تھا۔ حسینؑ نے حکومتی اسلام کے ہاتھ پر بیعت نہ کی تا کہ ''اسلام محمدیؐ'' محفوظ و مستحکم رہے۔

سر داد و نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسینؑ

کربلا کی برکت سے اس میدان میں حسینی کارنامہ کو دوام حاصل ہے۔ جس دور میں بھی یہ احساس ہوا ہے کہ اصل اسلام فراموش ہو رہا ہے، علمائے اسلام تحفظ اسلام کے لئے اپنی جان ہتھیلی پر لئے میدان میں آ گئے ہیں۔ آج بھی ملک خالد جیسوں کے اسلام کے ذریعہ سے بتدریج یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ اصل اسلام فراموش کر دیا جائے گا۔ ملک خالد جیسوں کے اسلام اور رابطہ العالم الاسلامی کو دنیا کے سامنے اسلام کے نام سے پیش کیا گیا مگر امام خمینی کی سربراہی میں ایران کے عظیم انقلاب نے اچانک اس طلسم کو توڑ دیا اور دنیا کو دکھایا کہ امریکی اسلام اس اسلام محمدی اور اصل اسلام سے مختلف ہے جس کے نگہبان حسینؑ تھے۔ ثروت و نخوت اور ریاکاری کا اسلام اسلام نہیں ہے، بلکہ اسلام وہ ہے جو کمزوروں کا حامی ہو اور مشرق و مغرب کی قوتوں سے مقابلہ کرنے والا ہو، ان کا خادم نہ ہو۔

سچ تو یہ کہ اثر کربلا ابھی باقی ہے............

حسینؑ کے مقصد سے متعلق محمد بن حنفیہ کے نام حسینؑ کی وصیت ایک زندہ اور بولتی سند ہے جس میں انہوں نے اپنے اصل مقصد کی تفصیل اور مکمل حکمت عملی کی تشریح کی ہے۔ وصیت نامہ یہ ہے:

"بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ هٰذَا مَا وَصّٰى بِهِ الْحُسَيْنُ بْنُ عَلِيٍّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ اِلٰى اَخِيْهِ مُحَمَّدٍ الْمَعْرُوْفِ بِالْحَنَفِيَّةِ اِنَّ الْحُسَيْنَ يَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ جَاءَ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِ الْحَقِّ وَاَنَّ الْجَنَّةَ وَالنَّارَ حَقٌّ وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيْهَا وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ وَاِنِّيْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّلَا بَطِرًا وَّلَا مُفْسِدًا وَّلَا ظَالِمًا وَّاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِيْ اُمَّةِ جَدِّيْ (ص) اُرِيْدُ اَنْ اٰمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَسِيْرُ بِسِيْرَةِ جَدِّيْ وَاَبِيْ فَمَنْ قَبِلَنِيْ بِقَبُوْلِ الْحَقِّ فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِالْحَقِّ وَمَنْ رَدَّ عَلَيَّ هٰذَا اَصْبِرُ حَتّٰى يَقْضِيَ اللّٰهُ بَيْنِيْ وَبَيْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِيْنَ۔"

[میں حسینؑ ابن علیؑ یہ وصیت اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے نام کر رہا ہوں۔ خدا کی یگانگی اور وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ بہشت اور دوزخ حق ہیں اور قیامت کے دن خدا سب کو اٹھائے گا۔ باطل کے مقابل میں قیام کا مقصد راحت طلبی یا آرام نہیں ہے بلکہ میرا مقصد امت کی اصلاح اور معاشرے کو انحراف سے بچانا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ''اچھائیوں'' کی ہدایت کروں اور ''برائیوں'' سے باز رکھوں، میرا شیوہ میرے نانا اور میرے والد علیؑ کی مانند ہے۔ لہٰذا جو میرے مقصد اور میرے لائحہ عمل کو جان لے اور میرے ساتھ تعاون کرے، وہ سعادت پائے گا اور جو اس کو رد کرے تو میں تحمل کروں گا یہاں تک کہ خداوند عالم میرے اور میری قوم کے درمیان صحیح فیصلہ کرے اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔] (بحار الانوار، ج ۱ ص ۱۷۴ لیتھو چھاپ، ۱۳۰۱ھ)

❁❁❁

کردار حسینی کا ایک ورق

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی صاحب قبلہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تاریخی راہوں کا ہر چلنے والا جانتا ہے کہ ابتدائے عمر سے امام حسین ۔کی تقریباً پوری زندگی ایک مسلسل اضطراب و کشمکش کا مجموعہ رہی۔

حسینؑ آغوش طفلی ہی میں تھے جب شفیق نانا، رسول اسلام محمد مصطفیؐ کا انتقال ہوگیا۔۔۔۔۔ رسولؐ کی آنکھ بند ہونا تھی کہ دنیا ہی بدل گئی۔ خانۂ اہلبیتؑ آفات دنیا، پریشانیوں اور بلاؤں کا گہوارہ بن گیا۔ وہ لوگ برسر اقتدار آگئے جن کا کیش ہی اہلبیت اطہارؑ کو اذیتیں دینا تھا۔

اب کبھی علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کے گرد لکڑیاں جمع کی جاتی ہیں۔ کبھی علیؑ کے گلے میں رسی ڈالی جاتی ہے۔ ان تمام مصائب و آلام میں اپنے باپ، ماں اور بھائی بہنوں کے ساتھ ساتھ حسین بن علیؑ بھی برابر کے شریک رہے۔

پچیس سال کی طولانی مدت اور قتل عثمان کے بعد اہلبیتؑ کو اطمینان و سکون کی ایک سانس لینے کا موقع مل سکتا تھا جب کہ امیر المومنین علی بن ابی طالبؑ کو مسلمانوں نے اپنا سربراہ منتخب کیا۔ مگر جمل و صفین اور نہروان کے فتنوں نے اس دور میں بھی اطمینان نصیب نہ ہونے دیا اور بالآخر ابن ملجم کی ضربت سے امیر المومنینؑ شہید ہوگئے۔ اب مسلمانوں نے امام حسنؑ کو خلیفہ مقرر کیا۔ مگر جلد ہی امیر شام معاویہ نے خلیفۃ المسلمین پر چڑھائی کردی۔ امام حسنؑ نے مسلمانوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے امیر شام سے صلح کرلی۔

اب اہلبیتؑ کے خلاف آندھیاں شدّت سے چلنے لگیں۔ مسجدوں میں منبروں پر علیؑ و حسنؑ پر دشنام طرازی عام ہوگئی۔ امیر المومنینؑ کے شیدائیوں کو قیدخانوں میں ڈال دیا گیا۔ اہلبیتؑ کا نام لینا

جرم قرار دے دیا گیا۔

یقیناً یہ دور امام حسینؑ کے لئے بہت پریشان کن ہوگا۔ مگر ابھی سر پر ایک سرپرست تھا۔ حسنؑ مجتبیٰ جیسے بھائی زندہ تھے۔ غم و الم میں حسینؑ کا ایک شریک موجود تھا۔ خاندان کا ایک بزرگ صفحۂ وجود پر باقی تھا۔ ذمہ داریاں ابھی حسنؑ پر تھیں، حسینؑ پر نہیں۔ ابھی محبان علیؑ کے لئے ''دستور عمل'' مرتب کرنے کا فرض حسنؑ کے کاندھے پر تھا، حسینؑ پر نہیں مگر ۵۰ھ میں امام حسنؑ کی شہادت کے بعد سے حسینؑ بن علیؑ کی زندگی کا انتہائی صبر آزما دور شروع ہوگیا، جو دس سال تک مسلسل قائم رہا۔ اس ''صبر شکن'' زمانہ میں اپنے فرض کا احساس ہر ہر لمحہ رکھنا اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہونا صرف حسینؑ جیسے سید الصابرین ہی کے بس کی بات تھی۔

اس امتحانی دور کی ابتدا اس وقت سے ہوگئی تھی جب امام حسینؑ، اور محبان اہلبیتؑ امام حسنؑ کا جنازہ لے کر مسجد نبوی میں دفن کرنے کی غرض سے جا رہے تھے۔ اور راستے میں مروان اور دوسرے لوگوں نے آکر جنازہ پر تیر باران شروع کردیا۔ اس وقت امام حسینؑ کی حالت کیا ہوگی۔۔۔۔۔؟ اس کا ہر انسان اندازہ لگا سکتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر قبل مشفق بھائی کا سایہ سر پر سے اٹھا ہے۔ یکبارگی نہ صرف خاندان بلکہ ایک پورے ''فرق'' کی رہنمائی کرنے کی ذمہ داری سر پر آگئی ہے۔ ہر طرف غمگین و گریاں فضا ہے اور ایک جماعت کی طرف سے بھائی کے جنازے پر تیر آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ اس وقت یقیناً اصحاب کو جوش آیا ہوگا۔ شاید محمد حنفیہ اور ابوالفضل العباسؑ نے تلواریں کھینچ لی ہوں مگر امام سب کو سمجھا کر جنازہ کو پلٹا کر جنۃ البقیع میں دفن کردیتے ہیں۔

اگر حسینؑ اس وقت تلوار کھینچ لیتے تو دنیا کو کہنے کا موقع مل جاتا کہ حسینؑ بھائی کے رویہ کے مخالف تھے۔ جیسے ہی ان کا انتقال ہوا۔ بہانہ تراش کر جنگ کے لئے آمادہ ہوگئے۔ مگر حسینؑ کو تو ثابت کرنا تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ ہم میں اختلاف ہو۔ ہم تو حکم خدا کے پابند ہیں۔ جب خدا کا حکم صلح کرنے کے لئے ہوگا ہم صلح کرلیں گے۔ جب اس کا حکم جہاد کے لئے ہوگا تلوار کھینچ لیں گے۔ جب تک اس

کا حکم رہے گا جنگ کریں گے اور جب اس کا حکم ہوگا سر کٹا دیں گے۔

اگر اس وقت حسینؑ تلوار کھینچ لیتے تو ان کی ''مظلومی'' معرض بحث میں پڑ جاتی۔ لوگوں کو کہنے کا موقع مل جاتا کہ حسینؑ نے تو خود معاہدۂ صلح کی خلاف ورزی کی۔ عامۂ خلائق کا امن غارت کرنے کی کوشش کی۔ اب اگر انھیں شہید بھی کر دیا گیا تو اعتراض کی کیا گنجائش اور حکومت شام کے لئے معاہدہ کی دوسری شرطوں کو توڑنے کا جواز بھی فراہم ہو جاتا۔ اس لئے حسینؑ نے طے کر لیا کہ جب تک حکومت شام معاہدہ کو بالکل پس پشت نہ ڈال دے گی میں اس کے خلاف کھڑا نہ ہوں گا۔

اس موقع کے بعد بھی نہ جانیں کیا کیا تکلیفیں برسراقتدار گروہ نے امام کو پہنچائیں۔ ایک اسلامی رہنما کے لئے یہی کیا کم تکلیف کا باعث ہے کہ خدا کے بنائے اور رسولؐ کے پہنچائے ہوئے قانون میں تبدیلیاں کی جانے لگیں۔ ''زکوٰۃ فطرہ'' کی مقدار بدل دی گئی۔ ''خلیفۃ المسلمین'' سونے کے زیورات پہننے لگا۔ درندہ جانوروں کی کھال فرش کے طور پر بچھائی جانے لگی۔ شریعت اسلام میں حکم تھا کہ پیخانے قبلہ رو نہ ہوں، شام میں تمام پیخانے قبلہ کی طرف بنوائے گئے، عرفہ کے دن تلبیہ کہنے کا حکم تھا، معویہ نے اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ حضرت محمد مصطفی اور علی مرتضیٰ اور اب تک تمام صحابہ کرام بھی بسم اللہ نماز میں باآواز بلند کہتے تھے، معاویہ نے آواز کے ساتھ بسم اللہ کہنے سے ممانعت کر دی۔ ''دینی مواخات'' ہونے کی بناء پر امیر شام نے ایک شخص حتات بن زید کی میراث پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ شرع محمدی میں میراث نسبی وارث کو ملتی ہے۔ غرض اس قسم کی نہ جانیں کتنی ''بدعتیں'' رواج پا گئیں۔

ان تمام واقعات کی اطلاع امام حسینؑ کو بھی یقیناً پہنچتی ہوگی۔ امام حسینؑ کے لئے تلوار اٹھانے کے واسطے صرف یہی ایک وجہ کافی تھی کہ اسلام کے وجود کو شامی حکومت سے خطرہ تھا مگر حسینؑ کو تو صبر و رضا کا نمونہ قائم کرنا تھا۔ ان کو تو ثابت کرنا تھا کہ خدا کے منتخب کئے ہوئے رہنما نہ موقع پرست ہوتے ہیں، نہ جلد باز بلکہ وہ تو وہی کرتے ہیں جو اس کی مرضی ہو۔ چاہئے اس سلسلے میں ان کو کتنے

ہی مصائب کا سامنا کرنا پڑے، کتنی ہی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔

اموی اہل اقتدار نے نہ صرف یہ کہ دین خدا میں تبدیلی کی بلکہ اس کے محافظوں کو تہہ تیغ بھی کیا۔ سیکڑوں حافظان قرآن اور صحابۂ رسولؐ بے درنگ قتل کئے گئے۔ ان ہی میں حجر بن عدی بھی تھے جن کی شہادت سے دنیائے اسلام میں تہلکہ پڑ گیا تھا۔ امیر شام معاویہ نے حجر کو ان کے وطن سے بلوا کر موت کی آغوش میں ڈال دیا۔ ان کی غلطی کیا تھا؟ بس یہ کہ وہ علیؑ اولاد علیؑ کے نام لیوا تھا۔ جمہور مسلمین کے چوتھے خلیفہ کے مدّاح تھے۔ یہ امیر شام کے نزدیک وہ سنگین جرم تھا جس کی سزا موت، اور بس موت، تھی حجر کے قتل پر مخالفین اہلبیتؑ تک تڑپ اٹھے تھے۔ خلیفہ اول کی صاحبزادی عائشہ کو جب اس المناک واقعہ کی اطلاع ہوئی تو وہ بلبلا کے کہہ اٹھیں کہ ''اگر معاویہ کو اہل کوفہ کی بیداری کو تھوڑا سا بھی احساس ہوتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔'' مگر جگر خوارہ کا فرزند جانتا تھا کہ عرب سے ''آدمی'' فنا ہو چکے ہیں۔ بخدا حجر اور ان کے ساتھی عرب کے سر اور دماغ کی حیثیت رکھتے تھے۔ خلیفۂ دوم کے صاحبزادے عبداللہ بن عمر کو جب حجر کے قتل کا حال معلوم ہوا تو وہ ڈاڑھیں مار مار کے رونے لگے۔ جب ان لوگوں کا یہ حال تھا تو امام حسینؑ پر اس واقعہ کا کتنا اثر ہوا ہوگا؟ اس کا ہر انسان اندازہ کر سکتا ہے۔

امامؑ نے اس حادثہ پر اپنے رنج والم کا اظہار بھی فرمایا جس کی اطلاع امیر شام معاویہ تک پہنچی اور ان کو خدشہ ہوا کہ کہیں امامؑ اپنے جاںنثاروں کو لے کر ان کے خلاف کھڑے نہ ہو جائیں۔ اس لئے انھوں نے امام حسینؑ کے نام ایک تہدیدی خط بھی لکھا۔ معاویہ کے اس خط کا حسینؑ نے جو تاریخی جواب دیا ہے اس نے بہت سے حقائق کے چہروں کو بے نقاب کر دیا۔ امامؑ جانتے تھے کہ ان کے والد کی خاموشی سے جو مفاد اسلام کے لئے اس وقت ضروری تھی غلط فائدہ اٹھا کر لوگوں نے کہہ دیا تھا کہ علیؑ اہل اقتدار کے مخالف نہیں تھے ورنہ وہ صدائے احتجاج کیوں نہ بلند کرتے۔ اس لئے حسینؑ نے اپنے اس خط میں امیر شام کی ان تمام غلطیوں کا ذکر کر دیا جن سے اسلام اور احکام

خدا اور رسولؐ کو گزند پہنچا تھا۔ حسینؑ کا یہ خط معاویہ کے ''اعمال نامہ'' کی حیثیت رکھتا ہے جس میں امیر شام کو ان کے تمام کرتوتوں سے آگاہ کر دیا گیا ہے۔

اس خط میں امام حسینؑ نے لکھا ہے کہ:

''میں ابھی تم سے دست و گریباں ہونے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور سکوت کو گلے لگائے ہوئے ہوں مگر میں خود اس خاموشی سے خوش نہیں ہوں اور نہ یہ خاموشی تم لوگوں کے لئے سند بن سکتی ہے۔''

امامؑ کا یہ جملہ بتاتا ہے کہ ان کو احساس تھا کہ امیر المومنینؑ کی خاموشی کو اہل باطل نے سند کے طور پر استعمال کیا اور حسینؑ نہیں چاہتے تھے کہ بنی امیہ کے بہی خواہ ان کی خاموشی کو بھی سند قرار دے سکیں اور کہہ سکیں کہ ''حسینؑ کو یزید سے اختلاف تھا۔ معاویہ سے نہیں۔''

آگے چل کر امام نے معاویہ کے جرائم کی فہرست اس طرح پیش کی ہے: ''کیوں معاویہ! کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے حجر بن عدی کو قتل کیا؟ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے ایسے نماز گزاروں اور خدا پرستوں کو قتل کیا جو ظلم و بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔امامؑ نے اس طرح معاویہ پر یہ واضح کر دیا کہ اموی خلافت ظلم و جور و بدعت کی خلافت ہے جس میں خدا پرستوں اور حق وصداقت کے پرستاروں کے لئے رحم و کرم کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے بعد حسینؑ نے لکھا ہے کہ:۔۔۔۔۔۔۔۔''اے معاویہ کیا تم ہی وہ نہیں ہو جس نے زیاد بن سمیہ کو جو بنی ثقیف کے غلام عبید راعی کا لڑکا تھا اپنا بھائی اور اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دیا۔ حالانکہ رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا کہ بیٹا اس کا سمجھا جائے گا جو عورت کا اصلی شوہر ہے اور زنا کار کے لئے بس پتھر ہیں اور کچھ نہیں، مگر تم نے رسولؐ اللہ کے اس حکم کو اپنے مقصد کی خاطر پس پشت ڈال دیا''۔۔۔۔۔۔۔۔حسینؑ کے جملہ نے ثابت کر دیا کہ ان کو اپنی حق تلفیوں سے زیادہ شریعت اسلام میں ہونے والی تبدیلیوں کا صدمہ تھا۔۔۔۔۔۔۔پھر امام نے تحریر فرمایا کہ۔۔۔''وہ تم ہی تھے جس نے حکم دیا تھا کہ جو علیؑ کا پیرو ہو اس کو مار ڈالو''۔۔۔۔۔۔خط کی آخری سطروں میں امام حسینؑ نے نہایت صاف گوئی سے

کام لیتے ہوئے اموی جابر پر واضح کر دیا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ میں تمہارے خلاف لوگوں کو ابھار کر امت محمدیؐ کے سفینہ کو فتنہ و فساد کی موجوں کے تھپیڑوں میں ڈال رہا ہوں۔'' امامؑ نے حق وصداقت کے چہرہ پر سے یہ تحریر فرما کر نقاب کھینچ لی ہے کہ:

''اس امت میں کوئی فتنہ تمہاری حکومت سے بڑھ کر نہیں ہے اور میں اپنے نفس، اپنے دین اور امت محمدی کے لئے کسی فائدہ کو اس سے بڑھ کر تصور نہیں کرتا کہ میں تمہاری مزاحمت کروں۔ اگر ایسا میں کروں تو یہ یقیناً قربت الٰہی کا موجب ہوگا۔''

اس خط نے ثابت کر دیا کہ امامؑ مدینہ میں مطمئن نہیں تھے۔ ان کو ہر لمحہ اس کا احساس تھا کہ شامی اقتدار نے اسلام کو تباہی و بربادی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اور اس سخت وقت میں اسلام کو حسینؑ کی ضرورت ہے۔ مگر وہ خاموشی کے ساتھ اس لمحہ کے منتظر تھے کہ جب ''معاہدۂ حسنؑ'' کی آخری سطر بھی صفحۂ وجود سے فنا کر دی جائے تاریخ اس ''فیصلہ کن'' موڑ کی طرف آہستہ آہستہ اس وقت سے بڑھنے لگی جب سے معاویہ کو اپنے بیٹے یزید کی خلافت مسلمانوں سے تسلیم کرانے کی دھن ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

معاویہ کو اس کا اچھی طرح علم تھا کہ یزید ایک فاسق و فاجر و بدکار جوان ہے جس کو مذہب سے کوئی دور کا بھی لگاؤ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں کہ عرب کے آدمیوں میں ''انسانیت'' نام کو بھی باقی نہ رہ جائے اور اس لئے یزیدی خلافت کے سامنے مسلمانوں کا سر خم کرا لینا سنگ خارا کی رگوں سے ''جوئے شیر'' برآمد کرنے سے کم نہیں تھا۔ مگر وہ اپنے بعض ''بلند ہمت'' مددگاروں کو لے کر اس مہم کے سر کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔

اس مقصد کے حاصل کرنے کی خاطر ہر وہ حربہ استعمال کیا گیا جس کا دنیا میں وجود تھا۔ کبھی طاقت کے بل پر لوگوں کی پیشانیاں خم کی گئیں، کبھی دولت کے جادو سے مسلمانوں کے دین وایمان

کوخریدا گیا، کبھی خطابت کی قلابازیوں سے لوگوں کو قائل کیا گیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر بعض ایسے من چلے اور بندگان دنیا کی نظروں میں ''سرپھرے'' اللہ کے بندے بھی عرب کی ریگستانی فضا میں موجود تھے۔ جو نہ طاقت سے مرعوب ہونا جانتے تھے، نہ پیسے سے دبنا اور نہ جاہلانہ دلیلوں سے خاموش ہوجانا۔

امیرشام کو ان چندنفوس کا سب سے زیادہ خوف تھا۔ ان میں سرفہرست حسینؑ بن علیؑ کی ذات تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ معاویہ جانتے تھے کہ حسینؑ حق کے علاوہ کسی طاقت سے دبنے والے انسان نہیں ہیں مگر پھر بھی انھوں نے اپنے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے وہ تمام ہتھیار استعمال کئے جن سے کوئی انسان دب سکتا ہے۔ کبھی دولت سے لالچ دلائی گئی، کبھی طاقت سے ڈرایا گیا مگر سب بے کار۔۔۔۔۔۔۔۔ حسینؑ کی ذات ایک اٹل پربت تھی جس کو اپنی جگہ سے ہٹادینا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔

اس موقع پر امام حسین ۔نے حکمت عملی کا وہ عدیم المثال نمونہ پیش کیا جس نے ثابت کردیا کہ دینی رہنما سیاست کے بھی ماہر ہوتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ حسینؑ یہ جانتے ہوئے کہ صلح نامہ کی آخری شرط بھی پیروں تلے روندی جارہی ہے تشدد سے کام نہیں لیا ورنہ دنیا حسینؑ کو جارح قرار دیتی۔ معاویہ بھی اپنے سالہا سال کے تجربہ کی بناء پر امامؑ کے خلاف تشدد کے حربہ کے استعمال سے کتراتے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اگر حسینؑ جیسا رہنما ان کے ہاتھ سے ظاہر بظاہر شہید ہوگیا تو دنیائے اسلام میں ان کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہوجائے گی اور مسلمانوں میں ایک ایسا آتش فشاں پھٹ پڑے گا جو اموی خلافت کو جلا کر راکھ کردے گا۔ وہ چاہتے تھے کہ تشدد کا حربہ استعمال کئے بغیر وہ کسی طرح حسینؑ سے یزید کی بیعت حاصل کرلیں مگر ان کی یہ خواہش دل کی دل ہی میں رہ گئی یہاں تک کہ رجب ۶۰ھ میں موت کے فرشتہ نے آکر ''اسلامی جابر'' کو اپنے آہنی پنجوں میں لے لیا۔

معاویہ کے مرتے ہی حسینؑ بن علیؑ کے لئے وہ دہ سالہ ''حوصلہ شکن'' اور ''صبر آزما'' دور ختم ہوگیا۔ جو امام حسنؑ کی شہادت سے شروع ہوا تھا۔

ان دس برسوں میں حسینؑ جس ذہنی اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہے شاید ویسی امتحانی کشمکش واقعۂ کربلا کے ذیل میں بھی حسینؑ کو نہیں جھیلنا پڑی۔ مگر یہ حسینی کردار تھا جس نے باطل کے تمام منصوبوں کو اس دور میں بھی خاک میں ملا دیا۔ اگر حسینؑ تشدد پر آمادہ ہوجاتے تو اموی مقصد حاصل ہوجاتا اور پھر شاید واقعۂ کربلا جیسا انقلابی کارنامہ دنیا میں رونما نہ ہوسکتا۔

حسینؑ نے خاموشی کے ساتھ اس دور میں جس طرح مسلمانوں کی رہنمائی کے فرض کو انجام دیا وہ صرف حسینؑ اور کسی حسینؑ، ایسے ہی کے بس کی بات تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

درحقیقت یہ دس سال واقعۂ کربلا کے مقدمہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور حسینؑ بن علیؑ کی یہ خاموشی فضا کے اس سکون کے مثل ہے جو کسی آنے والے غیر معمولی طوفان کا پتہ دیتا ہے۔

۞۞۞

حسینؑ اور اسلام

پروفیسر علامہ سید علی محمد نقوی صاحب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اسلام کوئی کاغذی مذہب نہیں بلکہ ایک ایسا نظریۂ حیات ہے، جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کو اپنے ذہن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا ایک پورا نظریاتی نظام ہے، ایک ایسا نظام جو انسانی وجود، اقدارِ حیات، تہذیبی، اور مذہبی نظریات، معاشی اور اقتصادی تصورات سب پر حاوی ہے اور سب کو ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔

ممکن ہے کہ مردم شماری کے رجسٹر پر جس اسلام کا اندراج ہوتا ہے وہ زبان پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمدؐ رسُول اللہ کہہ دینے سے یا کسی مسلم گھرانے میں پیدا ہوجانے سے حاصل ہوجاتا ہو، مگر واقعی مسلمان وہی ہے جس کا ہر بنِ مو کلمہ پڑھ رہا ہو۔ جس کا ہر ہر عمل مسلمان ہو، جس کی ذہنیت اسلامی سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہو۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمدؐ رسُول اللہ صرف چند عربی الفاظ کا مجموعہ نہیں، ایک خاص نظریۂ حیات ہے۔ جب ایک سچا مسلمان یہ کلمہ پڑھتا ہے تو وہ نہ صرف زبان سے اللہ کے علاوہ تمام خداؤں سے اظہار بیزاری کرتا ہے اور پیغمبرؐ کی رسالت کا اقرار کرتا ہے، بلکہ اس کا عمل اس کے قول کی تفسیر کرتا نظر آتا ہے وہ لات وعزّیٰ کے مجسموں کو ہی پاش پاش نہیں کرتا بلکہ ہر ہر ''بت'' کو توڑ کر رکھ دیتا ہے چاہے وہ کسی سومناتھ کی طلائی مورتیاں ہوں اور چاہے دل کی گہرائیوں میں جلوہ آرا بت۔

اگر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ صرف انھیں پتھر کے مجسموں کو توڑتا ہوتا تو شاید دنیا اس سے اتنا خطرہ محسوس نہ کرتی۔ کیوں کہ ان بتوں کا کیا ہے؟ یہ تو زلزلوں سے بھی گر جاتے ہیں، سیلاب کے بہاؤ بھی

ان کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ مگر اس کا کلمۂ حق صرف ان بتوں کو پاش پاش نہیں کرتا تھا بلکہ ان سے کہیں زیادہ طاقت ور خداؤں کی طاقت اور قوت کو چیلنج کرتا تھا اور وہ دل کی گہرائیوں میں جلوہ فرما دولت وطاقت کے احساس برتری کے بت تھے، قوم، قبیلے اور ذات پات کے بت تھے۔

ان خداؤں نے ایک مدت سے انسان کو اپنا غلام بنا رکھا تھا، دولت وطاقت کو سب کچھ سمجھ لیا گیا تھا۔ سونے چاندی کے چند کھنکتے ہوئے سکوں کے حصول کو انسان نے اپنا مقصدِ زندگی تصور کر لیا تھا، ہر دو کوڑی والا قارون وشدّاد کی طرح بھگوان بنا پھرتا تھا۔ ایک دوسرا طبقہ طاقت کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ اہل جاہ وثروت کو کمزوروں کے جان ومال، عزت وناموس سب کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ طاقت وروں کو کھلے عام اجازت تھی کہ وہ جب چاہیں بے دست و پا افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیں۔ اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں فرعون ونمرود جیسی شخصیتیں پیدا ہوگئیں جنھوں نے بے دھڑک خدائی کا اعلان کر دیا۔

دولت وطاقت کی طرح قبائل پرستی کی لعنت عام تھی۔ ہر فرد اپنے قبیلہ سے منسلک تھا جس کی وجہ سے عالم انسانیت لخت لخت ہوگیا تھا۔ بات بات پر قبائل میں جنگ چھڑ جاتی، جس کا سلسلہ برسوں چلتا رہتا تھا۔ عرب کی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ بھی ملتا ہے کہ دو قبیلوں کے افراد میں گھوڑ دوڑ کا مقابلہ ہوا، جس میں ایک آگے بڑھ گیا۔ اس پر اتنا اشتعال پیدا ہوا کہ دونوں قبیلوں میں جنگ چھڑ گئی جو چالیس سال تک چلتی رہی۔

یہ لعنت عرب سے مخصوص نہ تھی اس وقت کی مہذب دنیا بھی قوم وقبیلہ کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز تھی۔ فرق یہ تھا کہ عربوں میں قبائل کی تفریق تھی، یونان، روم اور فارس میں یہ ملکی سرحدوں کی تفریق کی صورت میں نمودار ہوئی تھی۔ اور یہ تفریق اتنی شدید ہوچکی تھی کہ مذہب تک کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ عیسائی مذہب اسی تفریق کے نتیجہ میں کئی دھڑوں میں تقسیم ہوچکا تھا۔ ''رومن چرچ'' الگ تھا۔ ''گریک چرچ'' الگ تھا۔ ایک چرچ والے دوسرے کو نہ صرف یہ کہ

عیسائی نہیں سمجھتے تھے بلکہ دائرہ انسانیت ہی سے خارج سمجھتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف ملکوں کی جنگیں نسل بعد نسل تک چلتی رہیں، غرض قوم وقبیلہ پرستی نے انسانی سفینہ کو خاک وخون کے ایک ایسے بھنور میں ڈال دیا تھا جس سے صحیح سالم نکل جانا بظاہر غیر ممکن نظر آتا تھا۔

طاقت و دولت، قوم وقبیلہ ہی کی طرح نسل پرستی اور ذات پات کے بت پوجے جا رہے تھے، دنیا میں بعض نسلیں اپنے کو برتر اور دوسری تمام نسلوں کو کمتر سمجھتی تھی۔ آریہ نسل ہندوستان کی دوسری نسلوں کول اور بھل وغیرہ کو شودر اور اچھوت سمجھتی تھی عرب دنیا کی تمام دوسری نسلوں کو پست سمجھتے تھے جس کے نتیجہ میں انھوں نے دوسروں کو عجم کہنا شروع کر دیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک اور تمام نسلیں گونگی اور غیر مہذب تھیں۔ یونان وروما کی عظیم سلطنتوں میں حبشی النسل افراد کو صرف غلام بنانے کے لئے مخصوص کر لیا گیا تھا۔ کالی چمڑی والوں کو دائرہ انسانیت سے ہی خارج قرار دے دیا گیا تھا۔ ہندوستان میں ذات پات کی تفریق عروج پر تھی۔ ابن آدم کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جن میں سے بعض پیدائشی طور پر عزت وحرمت کے مستحق سمجھے جاتے تھے۔ اور دوسرے اچھوت اور شودر قرار دیئے جاتے تھے، غرض انسان نہ جانے کتنے غیر فطری خداؤں کی پرستش کر رہا تھا جو لات وعزیٰ کے پتھر کے مجسموں سے کہیں زیادہ طاقتور تھے، اسلام نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا جو نعرہ دیا وہ ان تمام بتوں کی طاقت کو چیلنج کرتا ہے۔ ایک واقعی مسلمان جب زبان سے کہتا ہے کہا اللہ کے علاوہ کوئی خدا نہیں تو اس کا عمل اس کے قول کی نہ صرف تائید بلکہ تفسیر کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے عمل سے ثبوت دیتا ہے کہ اس کے نزدیک صرف ایک خدا ہے اور تمام انسان اسی ''ایک'' کے خلق کردہ ہیں۔ اس لئے وہ لازمی طور پر برابر ہیں۔ چاہے وہ نمرود و فرعون ہوں چاہے مفلس وکنگال ہوں، چاہے وہ ہیبت وطاقت کے مجسمے ہوں اور چاہے کمزوری اور ناتوانی کی تصویر، چاہے عرب ہوں چاہے غیر عرب، چاہے کالے ہوں چاہے گورے، چاہے پیدائشی طور پر کسی اونچی ذات سے تعلق رکھتے ہوں یا پست ذات سے۔

اسی طرح جب ایک واقعی مسلمان کہتا ہے کہ اللہ ہی خدا ہے تو اس کا ہر ہر عمل گواہی دیتا ہے کہ وہ اللہ کو اپنا خالق ومالک سمجھتا ہے۔ اب اگر وہ کسی کے سامنے دست سوال پھیلاتا ہے تو بس اللہ کے سامنے، کسی سے مدد طلب کرتا ہے تو وہ اللہ سے۔ کسی سے ڈرتا ہے تو اللہ سے۔ غرض وہ اپنے کو ہر طرح سے اللہ کا سمجھتا ہے۔

اسی طرح جب ایک سچا مسلمان کہتا ہے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه تو وہ صرف زبان پر یہ الفاظ جاری نہیں کرتا بلکہ اپنے اعمال سے، کردار وافعال سے اس کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ واقعی رسولؐ کو اس کا پیغامبر سمجھتا ہے۔ اب وہ پابندی کے ساتھ نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، خمس وزکوۃ دیتا ہے، حج کرتا ہے، موقع آنے پر اپنی جان اسلام پر نچھاور کر دیتا۔ تمام انسانوں خصوصاً مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ رسولؐ نے اس کا حکم دیا ہے۔ وہ ایثار کرتا ہے، قربانیاں دیتا ہے، ایمانداری کا مظاہرہ کرتا ہے، حق وانصاف کی پاسبانی کرتا ہے، کمزوروں کی مدد کرتا ہے، امن پسندی کا ثبوت دیتا ہے، اس لئے کہ حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تاکید کی ہے۔

وہ شراب، فواحش، چوری وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے، ظلم وتعدّی سے نفرت کرتا ہے، بے وجہ جنگ وجدل کو برا جانتا ہے اس وجہ سے کہ پیغمبر خدا نے ان باتوں سے منع کیا ہے اور وہ پیغمبرؐ کو دل کی گہرائیوں سے پیغمبرؐ سمجھتا ہے۔

غرض مسلمان بن جانا، صرف زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه مُحَمَّدٌ کہہ دینے سے ممکن نہیں بلکہ اس کے لئے اپنے ہر ہر عمل کو خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے سانچوں میں ڈھالنا پڑتا ہے۔

اسلام نہ صرف ایک مذہب ہے بلکہ ایک مکمل نظریۂ حیات ہے جس کو قبول کر لینے سے انسان فرائض کی ایک باقاعدہ زنجیر میں جکڑ جاتا ہے اس پورے نظریۂ اسلامی کی بنیاد لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰه ہے، یہ دو جملے نہیں ہیں، پورے اسلامی نظام کی روح ان چند الفاظ میں رکھ دی گئی ہے۔ پیغمبرؐ نے اپنی پوری زندگی ان جملوں کو مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے میں صرف کر دی۔ اس

کے لئے آپ نے مصائب اُٹھائے، مصیبتیں برداشت کیں مگر ان اقدار سے دست بردار نہ ہوئے۔

پیغمبرؐ کے بعد حضرت علیؑ نظریۂ اسلام کے عظیم ترین علم بردار بن کر ہمارے سامنے آئے آپ نے تختِ حکومت پر ٹھوکر ماردی۔ ہاتھوں میں رسی بندھوالی اور آخر کار سجدہ میں مہلک زخم کھالیا، مگر اسلام کے مخصوص کردار کی حفاظت کرتے رہے۔

لیکن ان دونوں دَوروں میں ایک طبقہ ایسا موجود رہا جو بظاہر تو کلمۂ پر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا کلمہ پڑھ رہا تھا مگر اندرونی طور پر اس اسلامی بنیاد کو ڈھانے کی فکر میں تھا، پیغمبرؐ نے عربوں میں ان چند الفاظ کے مجموعہ سے حریتِ فکر و آزادیٔ کردار کی روح پھونک دی تھی وہ اس گروہ کے مفادات پر ضرب کاری لگا رہی تھی۔ اس لئے یہ طبقہ مسلمانوں کے افکار و کردار کو معدوم کرکے اسلام کو دورِ جہالت کے سانچوں میں ڈھالنا چاہتا تھا۔ حضرت علیؑ کی خلافت تک پہونچتے پہونچتے یہ طبقہ اتنا مضبوط ہوگیا کہ صفین وجمل کی لڑائیوں میں اس نے کھل کر اسلامی طاقت کو چیلنج کیا، مگر تختِ خلافت تک رسائی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور زمام حلافت اسلامی اس گروہ کے ہاتھوں میں آگئی۔ اب کیا تھا؟ کھلے عام خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ قصرِ خلافت میں مغنّیوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ رقص و سرور کی محفلیں گرم ہونے لگیں۔ رسولؐ اور علیؑ نے مسجد کی چٹائی پر بیٹھ کر حکومت کی تھی، مگر اب خلافتِ اسلامی نے قیصر وکسریٰ کی سلطنتوں کی جگہ لے لی۔ بیت المال خلیفہ کا ذاتی خزانہ بن گیا۔ اموالِ غنیمت مسلمانوں کے بجائے قصرِ شاہی میں جانے لگے۔ غرض وہ سب کچھ ہونے لگا جو روم و فارس کی سلطنتوں میں ہوتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ دبے الفاظ میں خدا اور رسولؐ کی بے حرمتی بھی کی جانے لگی۔ یہاں تک کہ حاکم شام کو ''یا رسول اللہ'' کہہ کر خطاب کیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا مگر ابھی تک کھل کر اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ورزی کا اعلان نہیں ہوا تھا، لیکن ۶۰ھ میں جب یزید برسر اقتدار آیا تو اسلام کی یہ باریک نقاب بھی تار تار ہوگئی۔ اب

تختِ خلافت پر وہ متمکن تھا جو نہ صرف یہ کہ لہو ولعب کا دلدادہ تھا بلکہ مشہور زمانہ شراب خوار بھی تھا۔ چنانچہ عبداللہ بن زبیر نے اس کا نام ہی ''سکران'' یعنی بدمست رکھ لیا تھا۔ تاریخوں میں یہاں تک موجود ہے کہ جب یزید اہل مکہ کو ہموار کرنے کے لئے مصلحتہً حج کے لئے گیا تو اس کی محفل میں وہاں بھی جام و ساغر کے دور چلتے رہے۔ اس کے علاوہ ایسے ایسے جرائم کا مرتکب ہوتا تھا، جن کا کوئی مہذب انسان تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

واقدیؔ نے عبداللہ بن حنظلہ کی زبانی نقل کیا ہے کہ ''خدا کی قسم، یزید کے دورِ خلافت میں ہم کو اس کا یقین ہوگیا تھا کہ آسمان سے ہم پر پتھر برسیں گے وہ ایسا شخص تھا جو اپنی سوتیلی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتا تھا۔''

جب حاکم کا یہ کردار ہو تو ظاہر ہے کہ رعایا کا کیا عالم ہوگا۔ مثل مشہور ہے کہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ۔ ''لوگ اپنے بادشاہ کی پیروی کرتے ہیں مسلمانوں میں دورِ جاہلیت کے تمام خصوصیات تازہ ہوگئے۔ اسلامی احکام کی خلاف ورزی مسلمانوں کا شیوہ بن گئی۔ قرآن میں خالق نے ارشاد فرمایا تھا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ''تم میں بزرگ و برتر اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو، سب سے زیادہ صاحب کردار ہو۔'' مگر مسلمانوں میں ایک بار پھر دولت وطاقت، قوم وقبیلہ کو برتری و کمتری کا معیار سمجھا جانے لگا۔ ایک بار پھر نسلی تعصب نے سر اٹھایا۔ تاریخ کی مسلّم حقیقت ہے کہ اموی دور میں غیر عرب مسلمانوں کے ساتھ دوسرے درجے کے شہری کا سا سلوک ہوتا تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا تھا کہ ایک عرب کو غیر عرب پر کوئی برتری حاصل نہیں، مگر اس دور میں عربوں کو حکومت کرنے اور غیر عرب مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بننے کا حقدار سمجھ لیا گیا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سب کچھ ترک کیا جانے لگا، ظلم وستم، بے گناہوں کا خون بہانا، فتنہ وفساد برپا کرنا اسلامی حکومت کا دستور قرار پا گیا۔ یہی نہیں۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ خلیفۂ اسلام مذہب کے بنیادی اقدار کا مذاق اڑانے لگا۔ خدا اور رسولؐ کی شان میں نہ صرف گستاخیاں کی جانے

لگیں بلکہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ کا کلمہ پڑھنے والے خدا کے وجود اور رسولؐ کی رسالت میں ہی شک کرنے لگے۔ جب خدا اور رسولؐ ہی معرضِ بحث میں پڑ گئے تو قیامت اور سزا و جزا کس گنتی میں تھی۔

نام نہاد ''امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین'' یزید کے یہ شعر آج بھی تاریخ اسلامی کے دامن پر ایک بدنما داغ کی حیثیت سے موجود ہیں:۔

علّیته هاتی اعلنی وترنمی
بذلك انی لااحب التناجیا
حدیث ابی سفیان قدما سمابها
الی احد حتی اقام البواكیا
الاهات سقینی علی ذاك قهرة
تخیّرها لعنبی كرما شامیا
اذا مانظرنا فی امور قدیمته
وجدنا حلالا شربها متوالیا
وان مت یا ام الاحیمه فانكحی
ولاتاغی بعد الفراق تلاقیا
فان الذی حدیث عن یوم بعثنا
احادیث طسم تجعل القلب ساهیا
ولابدلی من ان ازور محمدا
بمشمولة صفراء تروی عظامیا

ترجمہ:۔ اے نازنین! مجھے بلند آواز سے سنا اور گا کر پڑھ مجھے چپکے چپکے گفتگو اچھی نہیں لگتی۔

سنا ابوسفیان کا وہ پُرانا قصہ، اُحد میں اس کا کارنامہ (پیغمبر اسلام کے خلاف چڑھائی) جہاں اس نے دشمنوں (مسلمانوں) کے گھر میں ماتم برپا کر دیا۔ ہاں اسی کے ساتھ مجھے شراب پلاتی جا۔ وہ شراب جس کو شام کے منتخب انگوروں سے تیار کیا گیا ہو۔ ہم جب قدیم عمل درآمد (دور جاہلیت) پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں اس کا پینا حلال ہی نظر آتا ہے۔ اور اگر میں مرجاؤں اے نازنین محبوبہ! تو کسی اور سے نکاح کر لینا۔ یہ امید نہ کرنا کہ اس جدائی کے بعد پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ دوسری زندگی کے بارے میں تو نے جو داستانیں سنی ہیں وہ پارینہ قصے ہیں۔ جو انسان کے دل کو نادانی میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ یقینی ہے کہ میں ایسی شراب میں مست رہ کر محمدؐ کا سامنا کروں گا جس کا اثر ہڈیوں تک اتر گیا ہوگا۔''

مسلمانوں کے ہاتھوں اسلام کی یہ دُرگت بن چکی تھی جب رسولؐ خدا کے نواسے علیؑ و فاطمہؑ کے بیٹے حسینؑ اسلام کی بنیادوں کی حفاظت کے لئے اپنی تمام بے سروسامانی کے باوجود اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسینؑ جانتے تھے کہ اگر مسلمانوں کو خواب غفلت سے نہ چونکایا گیا تو اسلام پر ''یزیدیت'' کا ملمع اتنا گہرا چڑھ جائے گا کہ پھر اسلام محمد مصطفی کا پہنچایا ہوا اسلام نہ رہے گا، بلکہ اموی اسلام بن جائے گا۔ ملوکیت کے طوفان میں گھر کردہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ محمّد رسول اللّٰہ کا سفینہ بے نام و نشان ہو جائے گا۔ شمع حق ظلمتِ باطل کی یورشوں میں بجھ کر رہ جائے گی۔ اموی زلزلے انسانی دل و دماغ سے ''اللہ اکبر'' کے مناروں کو گرا کر رکھ دیں گے۔ نقش اسلام میں یزیدیت کا رنگ بھر دیا جائے گا۔ اس لئے حسینؑ اپنے گنے چنے ساتھیوں کو لے کر اس عظیم مہم کے سر کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

بظاہر کتنا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے ایک ایسے بہاؤ کو روکنے کے لئے جس کی پشت پر عظیم اموی طاقت بآن ہیبت و جبروت موجود ہو، جس کی رَو میں تمام مسلمان بہہ رہے ہوں، بظاہر مدینے کی ایک گلی کا گوشہ نشین اپنے چند عزیزوں اور دوستوں کو لے کر اٹھے تا کہ اس بہاؤ کو روک کر عماراتِ اسلام کو زمین بوس ہونے سے بچا لے اور مسلمانوں میں انقلاب پیدا کر کے دوبارہ ان میں

روحِ اسلامی تازہ کردے، عام حالات کے تحت اس مہم کی کامیابی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اگر حسین علیہ السلام یزید کا تختِ حکومت الٹنے کے لئے اٹھتے تو سوچا بھی جا سکتا تھا کہ شائد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں، مگر لاکھوں، کروڑوں انسانوں کے ذہن میں انقلاب، صدیوں، نسلوں میں آیا کرتا ہے۔ اس لئے حسینؑ جس مقصد کے لئے اُٹھے تھے اس کا کامیاب ہونا عالم اسباب میں ناممکن نظر آتا تھا، مگر اس وقت والوں کے نزدیک اس مہم کی کامیابی ناقابل قیاس ہوسکتی تھی، لیکن آج ہم تو دیکھ رہے ہیں کہ حسینؑ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہو گئے اور مسلمانوں میں ایک ایسی روح پھونک دی جس کا اثر وقت کی گرد جمنے کے باوجود آج بھی مسلمانوں میں پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے۔

حسینؑ جس وقت میدان میں آئے وہ دور تھا جب جمعہ کی نماز چہارشنبہ کو پڑھا دی گئی۔ اور مسلمانوں نے پڑھ لی۔ ان کا احساسِ اسلامی اتنا مردہ ہو چکا تھا کہ کسی نے چوں وچرا کی ہمت نہ کی۔ مسلمانوں کے دست وبازو سے حاصل کیا ہوا مال ودولت قصر خلافت میں چلا گیا اور کوئی ایسا نہ نکلا جو احتجاج کر سکے، حالاں کہ اس وقت ایسے لوگ کثرت سے موجود تھے جو اپنی نظروں سے پیغمبرؐ کا عمل درآمد دیکھتے رہے تھے، مگر آج ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہ چودہ صدیاں گزرجانے کے باوجود مسلمان قرآن وشریعت کے بارے میں اتنا حسّاس ہے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ میں ''مسلم پرسنل لا'' میں تبدیلی کا ذکر آنے پر مسلمانوں کا بچہ بچہ بلبلا اٹھتا ہے۔ کوئی غیر مسلم ''رنگیلا رسول'' جیسی کتابیں لکھ کر پیغمبرؐ کے خلاف جسارت کرتا ہے تو مسلمان اتنا مشتعل ہوتا ہے کہ مصنف کو گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ پاکستانی حکومت کا کوئی اہم سے اہم فرد اگر قرآن کو رسولؐ کی ذاتی تصنیف کہہ دیتا ہے تو اسے استعفا دینے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مگر اس دور میں ''اسلامی حکومت'' کا سربراہ کھلّم کھلاّ خدا اور رسولؐ کی تحقیر کرتا تھا اور کسی مسلمان کی رگ حمیّت نہیں پھڑکتی تھی۔

تاریخ کی طبعی رفتار کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ مسلمان قرآن وشریعت کو فراموش کرتے چلے

جاتے، وہ وقت آجاتا جب اسلامی اقدار مسلمانوں کے لئے ''نقش ونگار طاق نسیاں'' بن کر رہ جاتے۔۔۔۔۔۔۔۔ آخر وہ کون سا جادو ہو گیا، جس نے تاریخ کے دھارے کو پلٹ دیا۔ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے ایسا چونکا دیا کہ وہ کبھی کبھی اونگھ کے باوجود پھر کبھی نہ سو سکے، اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم سمجھ سکتا ہے کہ وہ صرف حسینؑ کے خون کا چھینٹا تھا جس کی بدولت مسلمان کنمنا کر بیدار ہو گئے۔

۱۰ محرم کو صبح سے لے کر عصر تک حسینؑ اور ان کے ساتھی شہید ہو گئے مگر اسلام کو حیاتِ جاوداں مل گئی۔ مسلمانوں کے مذہب کے لئے ایثار وقربانی، باطل کے سامنے فولادی پہاڑی بن کر جم جانے اور حق وصداقت کی حفاظت کے لئے جان دینے کا وہ عدیم المثال نمونہ ہاتھ آ گیا جو ہمیشہ ان کے لئے چراغِ راہ ثابت ہوا اور ہوتا رہے گا۔

اپنی اس مختصر سی مہم کے دوران حسینؑ نے حقیقی اسلام کو دنیا کے سامنے اُجاگر کر دیا، حسینؑ نے ثابت کر دیا کہ اسلام کا کلمہ پڑھنے والے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے والے سخت سے سخت حالات سے دوچار ہو سکتے ہیں مگر غیر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتے، حسینؑ نے دنیا کو بتا دیا کہ دولت وطاقت کا بھرم ایثار وقربانی کے ذریعے کس طرح توڑا جا سکتا ہے، حسینؑ نے یہ ثابت کر دیا کہ اسلامی مساوات کیا ہے؟

ذرا غور سے حسینؑ کے چھوٹے سے قافلہ پر نظر ڈالئے اس میں سردارانِ عرب حبیب بن مظاہر، مسلم بن عوسجہ اور زہیر بن قین نظر آئیں گے تو غلام وکنیز سعد دغلام عمرو بن خالد، سالم غلامِ عامر بن مسلم، جون غلامِ ابوذر غفاری اور فضّہ یہ سب بھی ملیں گے۔ قریش کے جوان عباس وعلی اکبر ہوں گے، تو غیر قریشی حبیب بن مظاہر وغیرہ بھی دکھائی دیں گے۔ عرب ملیں گے تو غیر عرب بھی نظر آئیں گے۔ حبشی النسل غلام جون اور ترکی غلام واضح بھی شانہ بشانہ نظر آئیں گے اور پھر تاریخ کی روشنی میں ان لوگوں کے ساتھ امام حسینؑ کا برتاؤ دیکھا جائے تو اسلامی مساوات کی بے مثال

تصویر نظر آئے گی۔ تاریخ میں کوئی ایک موقع بھی ایسا نہیں ملتا، کوئی چھوٹی سے چھوٹی روایت بھی ایسی نظر نہیں آتی جس سے معلوم ہو کہ حسینؑ نے کسی قریشی کو غیر قریشی پر، کسی عرب کو غیر عرب پر، کسی سرمایہ دار کو مفلس پر کبھی کسی بات میں ترجیح دی ہو۔ کبھی کسی سے رنگ، نسل یا دولت کی وجہ سے امتیازی سلوک کیا ہو۔

حسینؑ نے نہ صرف مساوات اسلامی کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا بلکہ اسلامی ایثار کی بھی انتہا کر دی دشمن کی فوج کو پانی پلا کر حسینؑ نے واضح کر دیا کہ سچے مسلمان کا کردار کیا ہونا چاہئے۔ وہ لاکھ خون کے پیاسے دشمن ہوں ہیں تو انساں؟ اسلام نے ایک مسلمان کا فرض قرار دیا ہے کہ وہ انسانوں کے دکھ درد میں کام آئے۔ اسی لئے حسینؑ نے اپنے قافلے کا تمام ذخیرہ شدہ پانی دشمن کی فوج کو پلا دیا۔ حالانکہ وہ پانی جو ایک ہزار سواروں اور ان کے مرکبوں کو سیراب کر چکا تھا اگر رکھا جاتا تو کب تک کام آ سکتا تھا۔ شاید اس صورت میں سکینہ و رقیہ کی ''العطش، العطش'' کی صدائیں بلند نہ ہوتیں، علی اصغرؑ پیاس سے جاں بلب نہ ہوتے مگر دنیا اسلامی ایثار کا نمونہ نہ دیکھ پاتی۔

حسینؑ نے دنیا کو یہ بھی دکھا دیا کہ مسلمان حق و صداقت کی پاسبانی میں کس طرح اپنا سب کچھ لٹا سکتا ہے۔ سخت سے سخت قربانیاں پیش کر سکتا ہے علی اکبرؑ جیسے جوان رعنا فرزند اور عباسؑ جیسے شیر دل بھائی، حبیب جیسے جانثار دوست، قاسم جیسے چہیتے بھتیجے اور علی اصغرؑ جیسے شیر خوار کی قربانیاں پیش کی جا سکتی ہیں تین دن تک بھوک پیاس کی اذیت برداشت کی جا سکتی ہے دن بھر عزیز و اقارب کے لاشے لا لا کر گنجِ شہیداں میں رکھے جا سکتے ہیں اور آخر کار خود اپنا جسم تلواروں کی زد پر رکھا جا سکتا ہے مگر حق و صداقت کی منزل سے ایک قدم پیچھے ہٹنا ممکن نہیں۔

سید الشہداء علیہ السلام نے اسلامی امن پسندی اور رواداری کی تصویریں بھی دنیا کے سامنے پیش کر دیں۔ ۱۰ محرم تک حسینؑ صلح کی گفتگوئیں کرتے رہے، یہاں تک کہہ دیا کہ میں کسی دوسرے ملک جانے کے لئے تیار ہوں اپنے ساتھیوں کو تاکید کر دی کہ دیکھو لڑائی میں تم پہل نہ کرنا، خود حملہ نہ

کرنا، ہاں جب حملہ ہو جائے تو دفاع کرنا جو اسلامی قانون کی رو سے فرض ہے۔ اس لئے اس میں کوتاہی بھی غلط ہے مگر اپنی طرف سے کوئی جارحانہ کاروائی نہ کر کے حسینؑ نے صلح پسندی و رواداری کا وہ ثبوت دیا جس کا اقرار دشمنوں تک کو کرنا پڑتا ہے۔

اسلام کی بنیادی روح اللہ پر بھروسہ ہے کربلا میں حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کا ہر ہر عمل پکار کر کہتا محسوس ہوتا ہے کہ دیکھو! اللہ پر بھروسہ اسے کہتے ہیں، مالک حقیقی کی رضا کی طلب اور اس پر کامل یقین ہی تھا جس نے کربلا کے ہر ہر مجاہد کو عزم و ہمت کا پہاڑ بنا دیا تھا کربلا کا ہر مرنے والا یہ سوچ کر میدان میں جاتا تھا کہ ہم لاکھ بے بس سہی فوجِ مخالف کے پاس لاکھ شمشیر و سنان وگرز سہی مگر ہم حق کے راستے پر تو ہیں، اس لئے ہم کو ڈر کا ہے کا؟ جب تک اس کی مدد شاملِ حال رہے گی یہ اسلحہ اور ساز و سامان کوئی گزند نہ پہنچا سکیں گے اور جب اس کی مصلحت ہو گی تو منزلِ شہادت تک پہنچ کر اس کی دائمی رضا کے حقدار بن جائیں گے۔

اللہ پر یہ یقین کامل ہی تھا، جس نے کربلا کے ایک ایک بچہ کو ہزاروں پر بھاری بنا دیا تھا۔

حسینؑ نے جس طرح زندگی کے ہر ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے ان کو تازگی بخش دی اسی طرح اسلامی عبادات کو جتنی اہمیت کربلا میں حاصل ہو گئی کبھی اتنی نمایاں نہ ہوئی تھی۔

حسین علیہ السلام نے فوجِ مخالف سے ایک رات کی مہلت صرف اس لئے طلب کی کہ زندگی کی اس آخری رات میں جی بھر کے یادِ الٰہی کر لیں، حالانکہ فطری طور پر ایک شخص کو اپنی زندگی کی آخری رات میں کیا کیا تمنائیں ہونا چاہئیں۔ ایک باپ کو یہ تمنا ہونی چاہئے کہ وہ زندگی کی آخری رات اپنے بچوں کے ساتھ گزارے، ایک بیٹے کو یہ آرزو ہونی چاہئے کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات ماں کے پاس صرف کرے، ایک بھائی کو یہ فکر ہونی چاہئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بہن کے قریب رہے۔

کیا کربلا میں حسینؑ کی یہ آرزو نہ ہو گی کہ زیادہ سے زیادہ زینب کے قریب رہیں زیادہ سے زیادہ اُم لیلیٰ اور رباب کو تسکین دیتے رہیں، زیادہ سے زیادہ سکینہ کی دل جوئی کرتے رہیں، مگر

تاریخ کی مسلّم حقیقت ہے کہ حسینؑ نے یہ رات، جب یقین تھا کہ کل ضرور شہید کردیئے جائیں گے، خیام میں نہیں، یادِ الٰہی میں صرف کی۔ رات بھر حسین علیہ السلام اور ان کے ساتھی عبادت میں مصروف رہے، کوئی سجدہ میں تھا، کوئی رکوع میں، کوئی حالتِ قیام میں تو کوئی قعود میں حسینؑ نے زندگی کے آخری لمحات عبادت میں صرف کر کے مسلمانوں پر عبادت کی اہمیت واضح کردی، فطری طور پر حسینؑ کے چاہنے والوں کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس نماز کی کیا اہمیت ہے، اس سجدہ کی کیا حیثیت ہے، اس رکوع و سجود کی کیا منزلت ہے، جس کو ہمارا پیشوا مرتے مرتے نہ بھولا۔ اگر اب وہ سوچیں گے تو یقیناً ان کا ضمیر آواز دے گا کہ اگر تم محبت حسینی کے دعویدار ہو تو پہلے ان کی سیرت پر عمل کرو، فرائض سے عہدہ برآ ہو، عبادتوں کو انجام دو، ورنہ الفت شبیری کا دعویٰ کھوکھلا رہے گا۔ اس طرح مسلمانوں کے دل و دماغ میں عبادت کی اہمیت رچ بس جائے گی۔ اسی مقصد سے حسینؑ نے رات بھر عبادت میں صرف کی، اور اسی مقصد سے میدانِ جنگ میں برستے ہوئے تیروں کے درمیان مصلیٰ بچھا دیا ورنہ حسینؑ نماز ظہر خیمے میں بھی ادا کر سکتے تھے مگر حسینؑ تو یہ چاہتے تھے کہ واضح کردیں کہ اسلام کے سچے علمبردار ان کے لئے نماز کی کیا اہمیت ہے، اور دنیا کو دکھا دیں کہ یزید کے پیرو کار کس قسم کے مسلمان ہیں، جنہوں نے نہ صرف یہ کہ نماز کی مہلت نہ دی بلکہ نمازیوں پر تیر برسا کر اپنے اسلام کا الٹا ثبوت دیا اور حسین علیہ السلام نے اپنے کردار و افعال سے دنیا کو حقیقی اسلام سے روشناس بنا دیا۔

یک حسینے نیست کو گردد شہید
ورنہ بِسیارند در دنیا یزید

بوعلی شاہ قلندرؒ

حسینؑ آزادی کے علمبردار

نواب مظفر علی خان صاحب قزلباش تعلقدار نواب گنج علی آباد، بہرائچ

حسینؑ! انسانیت کا تجھ سے مستقبل ہوا روشن
تجھے ہم آفتاب صبح آزادی سمجھتے ہیں

واقعۂ کربلا، انسانی تاریخ میں ایک ایسی درخشاں مثال ہے، جو رہتی دنیا تک بلا امتیاز عقائد، نوع انسانی کو دعوت حق دیتی رہے گی۔ اور دنیا کے ہر طبقے کو حق و صداقت کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ترغیب کا موجب ہوتی رہے گی۔ اس واقعہ کو تیرہ سو برس سے زیادہ زمانہ گذر گیا، لیکن یہ داستان آج بھی تازہ اور نئی معلوم ہوتی ہے۔ جب کسی انسان کے سامنے کربلا کے سانحہ کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے، کہ حسینؑ نے بہتر بھوکے پیاسے مجاہدوں کی مختصر سی جماعت کے ساتھ کس عظیم مقصد، اور بلند نصب العین کے لئے یزید کے ساتھ ٹکرانے کا عزم کیا تھا؟ حسینؑ کے نانا ''رسول عربیؐ'' سے پہلے دنیا کی حالت بگڑ چکی تھی، قتل وغارت گری، لوٹ مار، جوا اور بدکاری کا دور دورہ تھا، انسان اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے معبودان باطل کے سامنے سر جھکانا کمال انسانیت سمجھتا تھا۔ وہ حجر و شجر، آفتاب و ماہتاب اور ستاروں کی پرستش کرتا تھا۔ فسق و فجور کی آندھیاں اٹھ رہی تھیں، جور و استبداد کا دور دورہ تھا، دختر کشی کی رسم عام تھی، خون انسانی سے ہولی کھیلنا دلچسپ مشغلہ قرار پا گیا تھا۔ مصر کی روشنی وہاں کے میناروں کے اندر دفن ہو کر رہ گئی تھی، روما کی تہذیب مٹ چکی تھی، یونان کا فلسفہ برباد ہو چکا تھا، ہندوستان اور چین کی ترقی کی داستانیں بھلائی جا چکی تھیں غرض کہ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ ضرورت تھی، کہ کوئی ایسا ہادی اعظم آئے کہ جو اس جہالت زدہ دنیا کی اصلاح کردے۔ انسان حجر و شجر آفتاب و

ماہتاب اور ستاروں کی غلامی سے نجات حاصل کر کے، اپنے منصب ومقام اور اپنی شان کو پہچانے۔ رحمت حق جوش میں آئی، فاران کی چوٹیوں پر نور رسالتؐ چمکا، اور اس نور مقدس کی ضیا سے کائنات کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا، رہزن رہبر بن گئے، جاہل عالم ہو گئے، اور درندے نما انسان مہذب ومتمدن نظر آنے لگے۔

داعی اسلامؐ نے اپنے اخلاق، اعلیٰ کیریکٹر، اور سچائی سے انسانی دلوں پر اپنا سکہ ایسا جمایا کہ دیکھتے ہی دیکھتے شرق سے غرب تک ان کا پرچم لہرانے لگا۔ ابھی رسولؐ اپنے مشن کی نشر واشاعت کرتے ہوئے ۲۳؍سال ہی ہوئے تھے، کہ آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ رسولؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی لوگوں کی ذہنیت میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اسلام مختلف منزلوں سے گذر کر ۶۱ھ میں یزید کی بدکرداریوں کی آماجگاہ بننے لگا یزید کے افعال اسلام کی تعلیمات کے سراسر منافی تھے۔ وہ اپنے کردار کو اسلامی تعلیمات ظاہر کر کے نائب رسولؐ بننے کے خواب دیکھ رہا تھا، لیکن وہ خوب سمجھتا تھا کہ میرا عمل و کردار اس وقت تک اسلامی لباس نہیں پہن سکتا تھا کہ جب تک امام حسینؑ اس پر مہر تصدیق ثبت نہ کر دیں۔ چنانچہ یزید نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی، سب سے پہلا جو فرمان جاری کیا، وہ یہی تھا، کہ نواسۂ رسولؐ، جگر گوشۂ بتول، امام حسینؑ سے بیعت لی جائے اور اگر وہ انکار کریں تو سر قلم کر لیا جائے، حسینؑ اور یزید کی بیعت؟ حسینؑ نے سوالِ بیعت کو ٹھکرا دیا، اور یزید پر واضح کر دیا کہ

ماسوااللہ رامسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

حسینؑ، علمبردار آزادی، محمد عربیؐ کا نواسہ اور علی مرتضیٰؑ جیسے بہادر باپ کا بیٹا تھا۔ حسینؑ نے اعلان کیا، کہ اگر راہ صداقت میں گھر لٹتا ہے، تو لٹ جائے اور بچے کٹتے ہیں تو کٹ جائیں، اہل حرم بے پردہ ہوتے ہیں، تو ہو جائیں، لیکن اسلام کے اصول پائمال نہیں ہونے دوں گا، اپنے نانا کے دین پر حرف نہیں آنے دوں گا، میں نے رسولؐ اسلام کی زبان چوس چوس کر پرورش پائی ہے، میری

رگوں میں خون فاطمی موجزن ہے، میرے بازوؤں میں خیبر شکن کی قوت موجود ہے، میرے سامنے میرے باپ علی مرتضیٰؑ کی روشن سیرت ہے، میرا یزید کے سامنے جھکنا، ایمان کا کفر کے سامنے جھکنا ہے، حق کا باطل کے آگے سرنگوں ہونا ہے، انسانیت کا حیوانیت کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ حسینؑ بیعت تو کر سکتا ہے لیکن اپنے سے افضل کی۔ حسینؑ نے جھکنا تو سیکھا ہے، لیکن صرف خدائے واحد کے سامنے، حسینؑ سر تسلیم خم کر سکتا ہے، مگر صرف اسلامی اصولوں کے آگے، حسینؑ کی گردن کٹ تو سکتی ہے لیکن یزید کے سامنے جھک نہیں سکتی۔ حسینؑ کے اس مجاہدانہ اعلان کو سن کر یزید زخمی سانپ کی طرح بل کھانے لگا۔ یزید نے پوری قوت کے ساتھ حسینؑ کے خلاف صف آرائی کی، اور ادھر حسینؑ بھی آزادی کا پرچم لہرانے کے لئے میدان عمل میں نکلے، لیکن عجب شان کے ساتھ۔ یزید باطل کا نمائندہ بن کر میدان میں آیا، اور حسینؑ حق کا پیکر بن کر۔ یزید کی طرف طاقت، ٹڈی دل لشکر اور سیم وزر تھا، سامان رسد تھا، تلواریں تھیں، نیزے اور تیر وتفنگ۔ حسینؑ کے ساتھ ۷۲؍مجاہد تھے، جن میں رسول عربیؐ کے اصحاب راویان حدیث، حافظان قرآن بھی تھے، اور چھ ماہ کے بچے سے لے کر سو سال کے بوڑھے بھی۔ حسینؑ کی طرف نہ مادی قوتیں تھیں، نہ سامان حرب وضرب، تین دن سے آب ودانہ بند، لیکن حسینؑ کا ایک ایک ساتھی ہزاروں پر بھاری تھا۔ ہر ایک نے توکل کی زرہ زیب تن کر رکھی تھی، حق وصداقت کا تاج سر پر، عروس شہادت سے ہمکنار ہونے کا ولولہ، جب ہر حسینی مجاہد اس سج دھج سے میدان میں اترا تو باطل کا دل دہل گیا۔ ادھر سے باطل بڑھا، ادھر سے حق، ادھر سے حیوانیت سامنے آئی، اور ادھر سے انسانیت جلوہ گر ہوئی، ادھر سے شر بڑھا اور ادھر سے مجسمۂ خیر نے پیش قدمی کی، دونوں طاقتوں کا تصادم ہوا بہتر لہو کے پیاسے مجاہدوں نے لاکھوں کے منہ موڑ دیئے۔

تیروں کی بارش ہونے لگی، تلواروں کی بجلیاں کوندنے لگیں، لیکن کیا مجال کہ علمبردار آزادی، حسینؑ کے قدموں میں لغزش پیدا ہو، یا استقلال میں فرق آئے، مصائب جوں جوں شدید ہوتے

جاتے تھے، حسینؑ کے عزم اور ارادہ میں پختگی اور ہمت و جرأت میں استحکام ہوتا جاتا تھا۔ مصائب طرح طرح کے بھیس بدل کر آئے، کبھی نوجوان فرزند کی موت کی شکل میں، کبھی شیر خوار بچے کی دردناک شہادت کی صورت میں، اور کبھی اہل حرمؑ کی بے پردگی کے روح فرسا انداز میں۔ باطل کے ترکش میں جس قدر تیر تھے، وہ سب ختم ہو گئے، لیکن حسینؑ کی جبین ہمت پر شکن نہ آئی۔ بظاہر یزید کو فتح ہوئی اور حسینؑ کو شکست، لیکن حقیقت میں یزیدیت کو ایسی شکست فاش ہوئی، کہ آج تک اس کا نام داخل دشنام ہو گیا، اور حسینؑ کو ایسی فتح حاصل ہوئی کہ تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی حسینی فتح کا ڈنکا بج رہا ہے۔ حسینؑ آج بھی حق وصداقت کے پرستاروں اور عدل وانصاف کے متلاشیوں کے لئے درس عمل بنے ہوئے ہیں۔

حسینؑ کی قربانی کو یہ عظمت حاصل نہ ہوتی اگر میدان میں جاکر سب سے پہلے اپنی جان کا تحفہ پیش کردیتے۔

حقیقت میں حسینؑ کی قربانی کو جو امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اپنے عزیزوں اور مخلص دوستوں کو اپنے ہاتھوں سے کمر باندھ کر موت کے سامنے پیش کیا۔ برابر کے بھائی، جوان بیٹے یتیم بھتیجے، شیر خوار بچے، ایک ایک کرکے آپ کے سامنے سے جدا ہوئے۔ بھتیجوں کا آنکھوں کے سامنے دم توڑنا، جوان بیٹے کا خاک پر ایڑیاں رگڑنا، بھائیوں کا جوانی کے عالم میں موت کی نیند سونا، یہ وہ مصائب تھے، جن میں سے ہر ایک موت سے زیادہ ناقابل برداشت ہے، مگر حسینؑ نے یہ سب قربانیاں یکے بعد دیگرے اپنے ہاتھوں پیش کیں، اور جس قدر مصائب زیادہ ہوتے جاتے تھے، آپ کا چہرہ زیادہ تابناک ہوتا جاتا تھا، اور آپ کے صبر واستقلال میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

(امامیہ مشن لکھنؤ اشاعت نمبر ۲۹۳ محرم ۱۳۸۰ھ)

سیاست حسینؑ کا ایک کامیاب نمونہ

محمد حنفیہ کے مدینہ میں قیام کا راز...... بھائی کی بھائی سے آخری باتیں

زبدۃ العلماء مولانا سید آغا مہدی صاحب

کربلا کا قیامت خیز حادثہ اور اولاد دین کی عظیم الشان قربانیاں دیکھ کر سوال پیدا ہوتا ہے کہ محمد بن حنفیہ شہادت سے کیوں محروم رہے؟ یزیدی چیرہ دستیوں کی روح فرسا خبریں سن کر امام حسینؑ کا عزم سفر بنی ہاشم میں بے چینی کی لہر دوڑا دیتا ہے اور اپنے پرائے بچے بوڑھے برابر سے ساتھ دینے پر تیار ہو جاتے ہیں اور کوئی رہ جاتا ہے تو برابر کا بھائی محمد حنفیہ۔

محمد حنفیہ اگر غیر معروف فرد ہوتے تو زمانہ ان کی بہادری کے خلاف آواز بلند کرتا اور مدینہ میں رُک جانے والا بھائی جامہ زیب ہوتا مگر محمد بن حنفیہ وہ نبرد آزما ہیں جن کی شمشیر زنی سے شامی لرزتے ہیں اور ان کی خون آشام تلوار کا لوہا مان چکے ہیں ان کے دست وبازو میں وہ طاقت آج بھی تھی جس کے صفین وجمل کے میدان گواہ ہیں یہ وہ مجاہد تھا جس کو شہسوار میدان ہل اتیٰ علی مرتضیٰؑ نے صفین کے میدان میں بار بار صف دشمن کی طرف بھیجا اور جب کسی سادہ لوح نے کہا: اِنَّكَ تَعْرِضُ مُحَمَّدًا لِلْقَتْلِ وَتَقْذِفُ بِهٖ فِيْ نُحُوْرِ الْاَعْدَاءِ دُوْنَ اَخَوَيْهِ۔ آپ محمد ہی کو جان دینے کے موقع پر بھیجتے ہیں اور انھیں کے ذریعہ سے دشمنوں کو قتل کرا رہے ہیں دوسرے بھائیوں کو نہیں بھیجتے یہ سن کر آپ نے محمد حنفیہ اور حسنینؑ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: هٰذَا يَدَيَّ وَهٰذَانِ عَيْنَايَ (محمد حنفیہ) میرا ہاتھ ہے اور وہ دونوں (حسنینؑ) آنکھیں ہیں۔ مَا زَالَ الْاِنْسَانَ يَذُبَّ بِيَدِهٖ عَنْ عَيْنَيْهِ۔ مطلب یہ تھا کہ جب آنکھ پر کوئی گزند پہنچنے والا ہوتا ہے تو انسان ہاتھ ہی سے روکتا ہے صفین وجمل کے میدان جس کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو چکے ہیں کیا وہ

نصرت سے پیچھے ہٹ رہا ہے یا پہلے جیسا جوش باقی نہیں رہا بعض لوگ کہتے ہیں کہ محمد بن حنفیہ کے ضعف پیری سے جسم میں رعشہ تھا اور گھوڑے پر سنبھل نہ سکتے تھے۔ جہاں تک کتب تاریخ وسیر سے مدد ملتی ہے محمد حنفیہ پر آخر عمر تک بڑھاپے کا اثر نہ تھا جس وقت اولادِ علیؑ و فاطمہؑ کا قافلہ مدینہ سے روانہ ہوا محمد بن حنفیہ نے بار بار جذبہ محبت سے مجبور ہو کر سفر سے روکا لیکن شہادت کا شوق دل میں رکھنے والے مسافر وطن میں کب ٹھہر سکتے تھے روکنے والے روکتے رہے اور حسینی قافلہ روانہ ہو گیا۔

بھائی کو بھائی سے جو سچی محبت ہونی چاہئے اس کا تقاضا یہ تھا کہ محمد بن حنفیہ کی نگاہ میں مدینہ سنسان معلوم ہوا اور دور افتادہ عزیزوں کی آخری ملاقات کے لئے مسافرت پر کمر باندھی چنانچہ امام نے مکہ میں جو آخری خطبہ پڑھا اور خدا کی حمد وثنا کے سلسلہ میں فرمایا كَاَنِّيْ بِاَعْضَائِيْ يَقْطَعُهَا عَسَالِيْقُ الْفَلَوَاتِ میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے جسم کے اعضا جنگل کے بھیڑئے (گرگ) پارہ پارہ کئے ڈالتے ہیں۔ اس وقت محمد بن حنفیہ مکہ میں پہنچ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح آقائے کونین نینوا کا رخ نہ کریں آخر میں جب قافلہ یہاں سے بھی روانہ ہونے لگا تو لجام فرس پر ہاتھ رکھ دیا اور خدمت میں عرض کیا کہ آقا آپ نے تو غور کرنے کا وعدہ کیا تھا جواب ملا (بھائی مجبور ہوں) پیغمبرؐ خدا نے خواب میں حکم دیا ہے کہ مکہ چھوڑ دوں۔ (ناسخ التواریخ)

اس جواب پر محمد حنفیہ خاموش ہو جاتے ہیں اور امام کا ساتھ نہ دینے پر اس شبہ میں اور قوت آجاتی ہے درد فراق سے بے تاب دل جو امام حسینؑ کے مدینہ چھوڑنے کے بعد وطن میں تنہائی کی مصیبت سے گھبرا کر مکہ تک آیا کیوں کربلا نہ گیا؟

کربلا کا خونچکاں حادثہ اس گفتگو کے کم وبیش ایک مہینہ کے بعد ظہور میں آتا ہے جو مدینہ سے مکہ تک سفر کر سکا ہو وہ مکہ سے کربلا تک بھی پہنچ سکتا تھا۔ محمد بن حنفیہ کے مدینہ میں ٹھہر جانے کا راز یہ تھا کہ فرزند رسول الثقلین بھائی کے ذریعہ سے مدینہ اور اہل مدینہ کے حالات سے باخبر رہنا چاہتے تھے اور محمد حنفیہ کو اپنے جاسوس کی حیثیت سے مدینہ میں چھوڑا تھا سپہر کاشانی مشہور مورخ رقمطراز ہیں کہ جب محمد

حنفیہ مکہ میں حاضر ہوئے اور آخری گفتگو شروع ہوئی جس کا خلاصہ (اور الفاظ کا ترجمہ) ملاحظہ ہو:

محمد حنفیہ: بھائی! آپ سب سے زیادہ مجھے عزیز ہیں اور میری جان وروح ہیں (خدا نے) آپ کو سردار جوانان بہشت بنایا ہے۔

امام: بھائی میں کہاں جاؤں؟ (آپ کی رائے کیا ہے)

محمد حنفیہ: مکہ میں قیام کیجئے۔ اگر یہاں کا قیام سزاوار ہو تو بہتر ہے ورنہ ملک یمن کی طرف تشریف لے جائیے وہاں آپ کے پدر وجد کے ناصر موجود ہیں اور اگر وہاں بھی سہولتیں نظر نہ آئیں تو ریگستانوں اور پہاڑوں کے دامن میں زندگی بسر کیجئے۔ (مگر کربلا کا سفر نہ فرمائیں)

امام: بھائی اگر ساری دنیا میں پناہ نہ ملی جب بھی یزید کی بیعت نہ کروں گا۔

محمد حنفیہ: اشکبار ہو جاتے ہیں اور امام حسین کو بھی رقت طاری ہوئی۔ رونے کی صدائیں بلند ہوئیں جب آنسو بہا چکے تو محمد حنفیہ سے فرمایا بھائی خدا آپ کو جزائے خیر دے آپ نے رائے تو ٹھیک دی لیکن میں مکہ سے نکلنے کا ارادہ کر چکا ہوں اور میں اور میرے بھائی بھتیجے اور شیعہ سب سفر پر تیار ہیں ان کا ارادہ میرا ارادہ ان کی رائے میری رائے ہے۔ وَاَمَّا اَنْتَ فَلَا بَاْسَ عَلَيْكَ اَنْ تُقِيْمَ بِالْمَدِيْنَةِ فَتَكُوْنَ لِيْ عَيْنًا عَلَيْهِمْ وَلَا تُخْفِيْ عَنِّيْ شَيْئًا مِنْ اُمُوْرِهِمْ۔ اب رہے آپ تو آپ پر کوئی بار نہیں مدینہ میں قیام کر کے ان لوگوں پر بجائے میرے نگراں رہئے تا کہ ان کے حالات مجھ پر پوشیدہ نہ رہیں۔ (ناسخ التواریخ، جلد ششم، ص ۱۶۵)

یہ امام حسینؑ کی سیاست کا ایک نمونہ تھا کہ آپ مدینہ کے حالات سے خبر حاصل کرنے کے لئے محمد حنفیہ کو مدینہ میں چھوڑ گئے علاوہ اس کے آپ کے سفر غربت اختیار کرنے کے بعد مدینہ میں بنی ہاشم میں ایک مرد کا رہنا ضروری تھا ازواج نبی میں جناب ام سلمہ آپ کی پھوپھیاں، حضرت ام البنین اور بروایتے فاطمہ ایسی محترم عورتیں موجود تھیں یہ وہ وجود تھے جنھوں نے محمد حنفیہ کو مدینہ میں رہنے پر مجبور کر دیا اور امام کی اطاعت کا قلادہ گردن سے اتار سکے۔

❀❀❀

بنائے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ (پاکستان)

حضرت امام حسینؑ نے اپنی عظیم قربانی کے ذریعہ سے جو کربلا کے میدان میں پیش ہوئی حق کو باطل سے پوری طرح الگ کر دیا۔ کسی دلیل سے وہ بات حاصل نہ ہوئی جو آپ کے اس عمل سے حاصل ہوئی۔

امام حسینؑ نے راہ حق دکھانے میں ہر وہ ممکن اقدام کیا جو کوئی انسان کر سکتا تھا اور ہر مصیبت پر انتہائی بہادری کے ساتھ ثابت قدم رہے۔ آپ نواسۂ رسولؐ تھے۔ حضرت علیؑ کے لخت جگر اور جناب فاطمہ زہراؑ کے نور نظر تھے۔ پیغمبرؐ اسلام نے اپنے اس نواسہ کو اپنی زبان چسا کر پالا تھا اور اپنی آغوش تربیت میں پرورش فرمایا تھا۔ حسینؑ اپنے نانا کی تصویر تھے۔ آپ کے اخلاق اور عادات پیغمبرؐ اکرم کا آئینہ تھے۔ اسلام پر وہ وقت بہت دشوار تھا جب اس کا رسولؐ کے ہاتھوں، مکہ میں آغاز ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں حضرتِ سرورِ کائنات کو جن تکالیف اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا وہ تاریخ کا ایک خونیں باب ہیں مگر اسلام کے لئے وہ وقت بھی کسی طرح اپنی دشواری اور ہولناکی میں کم اہمیت کا حامل نہ تھا جب رسولؐ اکرم کی تیئیس سال کی محنت و جانفشانی تباہی اور بربادی کے دروازہ پر پہنچ چکی تھی۔ جب اسلام کی نقاب ڈال کر اس کے بدترین دشمن اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ جب اسلامی روپ میں لات وعزّیٰ کے پرستار توحید کی بنیادوں کو ہلا رہے تھے جب دربار حکومت فواحش کا اڈا بن چکا تھا اور یزید کی جنسی ہوس سے اس کے محارم بھی محفوظ نہ تھے جب اذان کی صدائیں رقص وسُرور کے نغموں اور گھنگھروؤں کی آواز میں دب چکی تھیں ہدایت وارشاد اور پندو نصیحت کی محفلوں کے بجائے شرابِ ناب کی بزمیں آراستہ تھیں۔ اصحابؓ رسولؐ کی توہین کرنا، ان

کی تکذیب کرنا اور ان کا خون بہانا جائز بنا دیا گیا تھا۔ اہلبیتؑ کرام کے بے عزتی کی گئی اور جوان کو سخت تکلیفیں پہنچائی گئیں وہ کبھی فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ ان حالات میں ایک سچے موحّد اور ایک مخلص مسلمان کا کیا فریضہ تھا اور اعلائے کلمۃ الحق میں اس کو کیا کرنا چاہئے تھا۔ کیا ایسے وقت میں خاموش بیٹھا رہنا اور اپنی جان و مال اور اپنے گھر والوں کی حفاظت وسلامتی کو اسلام کی بقاء پر مقدم رکھنا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح تھا۔ ہرگز نہیں۔ حسین نے وہی کیا جو ان کا فرض تھا اور جو ایسے نازک وقت میں ان کو کرنا چاہئے تھا، کوفہ کے لوگوں نے آپ کے نام ہزار ہا خطوط روانہ کئے تھے جن میں نواسۂ رسولؐ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ وہاں تشریف لے جاکر مسلمانوں کی ہدایت فرمائیں اور ان کو یزید کی فحش کاریوں سے نجات دلائیں۔ بڑے بڑے مشہور مسلمانوں کے ان خطوط پر دستخط موجود تھے جن میں بعض اصحاب رسولؐ بھی شامل تھے۔ ان درخواستوں میں یہ الفاظ موجود تھے:

"اِنَّهٗ لَيۡسَ عَلَيۡنَا اِمَامٌ فَاَقۡبِلۡ لَعَلَّ اللّٰهَ اَنۡ يَّجۡمَعَنَا بِكَ عَلَى الۡحَقِّ وَالۡهُدٰى۔"

"ہمارے لئے یہاں کوئی ہدایت کرنے والا موجود نہیں ہے جو ہمیں صحیح اور درست راستہ دکھا سکے آپ تشریف لائیے۔ خدا آپ کی ذات کے ذریعہ سے ہم سب کو ہدایت اور حق پر جمع کر دے گا۔"

امام حسینؑ نے ان کثیر خطوط کا جو جواب دیا تھا اس میں یہ لکھا تھا:

"قَدۡ فَهِمۡتُ كُلَّ الَّذِيۡ اقۡتَصَصۡتُمۡ وَذَكَرۡتُمۡ وَمَقَالَةَ جُلِّكُمۡ اِنَّهٗ لَيۡسَ عَلَيۡنَا اِمَامٌ فَاَقۡبِلۡ وَاَنَا بَاعِثٌ اِلَيۡكُمۡ اَخِيۡ وَابۡنَ عَمِّيۡ وَثِقَتِيۡ مِنۡ اَهۡلِبَيۡتِيۡ مُسۡلِمَ بۡنَ عَقِيۡلٍ فَاِنۡ كَتَبَ اِلَيَّ اَنَّهٗ قَدۡ اَجۡمَعَ رَاۡيُ مَلَائِكُمۡ وَذَوِي الۡحِجٰى وَالۡفَضۡلِ مِنۡكُمۡ عَلٰى مِثۡلِ مَا قَدِمَتۡ بِهٖ رُسُلُكُمۡ وَقَرَاۡتُ فِيۡ كُتُبِكُمۡ فَاِنِّيۡ اَقۡدِمُ اِلَيۡكُم وَشِيۡكاً انشاء اللہ فَلَعَمۡرِيۡ مَا الۡاِمَامُ اِلَّا الۡحَاكِمُ بِالۡكِتَابِ الۡقَائِمُ بِالۡقِسۡطِ الدَّائِنُ بِدِيۡنِ الۡحَقِّ الۡحَابِسُ نَفۡسَهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لِلّٰهِ وَالسَّلَامُ۔"

"میں اس بات کو پوری طرح سمجھ گیا جو آپ لوگوں نے لکھی ہے کہ ہماری ہدایت کے لئے کوئی

امام اور حاکم موجود نہیں ہے۔ تو میں اس کے جواب میں اپنے بھائی اور اپنے چچا کے بیٹے اور اپنے خاندان کی ایک معتمد اور قابل وثوق فرد مسلمؑ بن عقیلؑ کو آپ کے پاس روانہ کرتا ہوں، اگر انھوں نے مجھے لکھا اور اس کی اطلاع دی کہ آپ کے صاحبان فضل اور اہل الرائے اس معاملہ میں پوری طرح متحد ہیں اور ان میں کسی قسم کا اختلاف موجود نہیں ہے جیسا کہ ان درخواستوں میں آپ نے ظاہر کیا ہے تو میں بہت جلد وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

بلاشبہ امام تو صرف وہی ہے جو کتاب اللہ کے مطابق احکام نافذ کرتا ہو، جو عدل وانصاف اور دین حق پر قائم ہو اور صرف خوشنودی خدا کے لئے احکام الٰہی کا پابند ہو۔

مکہ کے ایک بڑے جلسہ میں اپنی روانگی عراق سے ایک روز قبل امام حسینؑ نے جو خطاب فرمایا تھا اس میں یہ الفاظ بھی تھے:

"خُطَّ الْمَوْتُ عَلٰی وُلْدِ آدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الفتاةِ وَمَا اَوْلَهَنِیْ اِلٰی اَسْلَافِیْ اشتیاقَ یعقوبَ اِلٰی یُوْسُفَ وَخُیِّرَ لِیْ مَصْرَعٌ اَنَا لَاقِیْهِ کَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلٰی اَوْصَالِیْ یَتَقَطَّعُهَا عَسلانُ الْفَلَوَاتِ بَیْنَ النَّوَاوِیْس وَ کَرْبلَا فَیَمْلَئَنَّ مِنِّیْ اَکْرَاشًا جوفًا وَّاَجْرِبَةً سُغْبًا لَا مَحِیْصَ عَنْ یَوْمٍ خُطَّ بِالْقَلَمِ رِضَا اللهِ رِضَانَا اَهْلَ الْبَیْتِ نَصْبِرُ عَلٰی بَلَآءِهٖ یُوَفِّیْنَا اُجُوْرَ الصَّابِرِیْنَ وَمَنْ کَانَ بَاذِلًا فِیْنَا مُهْجَتَهٗ مُوَطِّنًا عَلٰی لِقَاءِ اللهِ فَلْیَرْحَلْ مَعَنَا فَاِنِّیْ رَاحِلٌ مُصْبِحًا اِنْ شَاءَ اللهُ تعالٰی۔"

"موت اولادِ آدمؑ کے گلے کا ہار ہے۔ مجھے اپنے اسلاف سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے اور یہ شوق ویسا ہی ہے جیسا یعقوب کو یوسفؑ کی ملاقات کا تھا۔ میرے لئے وہی خواب گاہ پسند کی گئی ہے جہاں میں جانے والا ہوں، گویا میں اپنے بدن کے حصوں کو دیکھ رہا ہوں جن کو نواویس اور کربلا کے درمیان درندہ خصلت وحشی اور ظالم دشمن ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔ اور اپنے اس عمل سے اپنے ظلم وجور کی بھوک کو دور کر رہے ہیں۔ جس کو قلم تقدیر سے لکھ دیا گیا ہے اس دن سے کسی کو چھٹکارا ممکن

نہیں۔ جو خدا کی مشیت ہے وہی ہم اہلبیتؑ رسولؐ کی مرضی ہے ہم کو مصیبتوں پر صبر کرنا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: جو شخص ہماری راہ میں اپنی جان فدا کرنا چاہتا ہو اور موت پر کمر کس چکا ہو وہ ہمارے ساتھ روانہ ہو جائے کیونکہ میں انشاء اللہ کل صبح کوفہ کے لئے روانہ ہو جاؤں گا۔"

امامؑ عالی مقام نے ایک خط اہل بصرہ کے نام بھی تحریر فرمایا تھا جس میں لکھا تھا:

"اَنَا اَدْعُوْکُمْ اِلَی اللهِ وَنَبِیِّهٖ فَاِنَّ السُّنَّةَ قَدْ اُمِیْتَتْ۔"

"میں آپ لوگوں کو خدا اور اس کے رسولؐ کی طرف دعوت دیتا ہوں کیونکہ سنت نبویؐ اب تباہ ہو چکی ہے۔"

حضرت امام حسینؑ نے دنیا ہر راحت کو دین کی تبلیغ اور اسلام کی بقاء کے لئے ترک کر دیا تھا اور وہ اس راہ میں ہر چیز یہاں تک کہ اپنی محبوب اولاد کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار تھے ان کا مقصد اصلاح تھا اور ہدایتِ خلق۔ ان کے دل میں ملک گیری کی ہوس نہ تھی وہ سلطنت وتاج وتخت کے خواہشمند نہ تھے اگر ان کی غرض دنیا ہوتی تو وہ یزید سے اختلاف نہ کرتے اور خاطر خواہ شرائط کے ساتھ اس کی بیعت کر لیتے جو بہت آسان امر تھا اور اس کے نتیجہ میں امام حسینؑ کو کثیر دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے۔ مگر آپ نے دین خدا کی حفاظت کی راہ میں کسی راحت وآرام کی پروانہ فرمائی اور کسی دھمکی سے مرعوب نہ ہوئے اور اس فرض کو پورا کیا جو اسلام اور دیانت کی طرف سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ آپ نے اپنے چھوٹے بھائی محمد بن حنفیہ کو چلے وقت جو وصیت فرمائی تھی۔ اس میں فرمایا تھا:

"اِنِّیْ لَمْ اَخْرُجْ اَشِرًا وَّلَا بَطِرًا وَلَا مُفْسِدًا وَلَا ظَالِمًا وَاِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّةِ جَدِّیْ اُرِیْدُ اَنْ آمُرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَنْهٰی عَنِ الْمُنْکَرِ وَاَسِیْرَ بِسِیْرَةِ جَدِّیْ وَاَبِیْ عَلِیِّ علیہ السلام بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ علیہ السلام فَمَنْ قَبِلَنِیْ بِقَبُوْلِ الْحَقِّ فَاللهُ اَوْلٰی بِالْحَقِّ وَمَنْ رَدَّ عَلَیَّ هٰذَا اَصْبِرُ حَتّٰی یَقْضِیَ اللهُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ الْقَوْمِ بِالْحَقِّ وَهُوَ خَیْرُ الْحَاکِمِیْنَ۔"

"یعنی میں عیش وراحت کی ہوس میں اور ظلم وفساد کی خواہش لے کر یہ سفر نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ میں اپنے نانا کی امت کی ہدایت کروں۔ انھیں برائیوں سے منع کروں اور وہی طریقہ اختیار کروں جو میرے نانا حضرت رسالت مآبؐ اور بابا علیؑ مرتضیٰ کا تھا اور ان کی سیرت پر چلوں اس کے بعد جو میری بات کو حق جان کر قبول کرے گا تو اس کو ہدایت حاصل ہوگی اور جو میری بات کو رد کرے گا تو میں اس پر صبر کروں گا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور اس قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرمائے گا۔"

عاشور کی صبح نزدیک ہے۔ شب کا ہیبت ناک سناٹا صحرائے کربلاء پر چھایا ہوا ہے۔ بچے پیاس اور بھوک سے بے حال پڑے ہیں۔ انصار واہلبیتؑ کے مقدس خیموں سے تسبیح وتہلیل کی صدائیں آرہی ہیں۔ ادھر ابن زیاد کی سفاک فوجیں ان چند مٹھی بھر پاکباز انسانوں کو محاصرہ میں لئے ہوئے ہیں اور ان کا پاک خون بہانے کے لئے بے چین ہیں۔ ایک طرف شوقِ ظلم ہے، خواہش اقتدار ہے، ہوس ملک ودولت ہے، نشہ وغرور سلطنت ہے، دنیا پرستی اور خدا فراموشی ہے اور دوسری طرف شوقِ شہادت ہے، خواہش خدمت ہے جذبۂ عبادت واطاعت الٰہی ہے۔ خدا پرستی اور دینداری ہے۔ ہر طرف سکوت ہی سکوت ہے۔ خوف ودہشت نے ساحل فرات کے ہر ذرہ کو گھیر لیا ہے۔

امام حسینؑ انسانی ضمیر کو بیدار کر رہے ہیں: اے میرے ساتھیو! اے میرے گھر والو! اے میرے وفا شعار دوستو! اس رات کو غنیمت سمجھو! اس اندھیرے اور سناٹے سے فائدہ اٹھاؤ! اور جہاں دل چاہے چلے جاؤ۔ میں تمہیں اپنی اطاعت اور بیعت سے آزاد کرتا ہوں کیونکہ میرے دشمن میری جان کے علاوہ کسی دوسرے کے طالب نہیں اور اگر وہ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو پھر ان کو کسی اور کی فکر باقی نہ رہے گی۔ اس لئے میرے عزیز دوستو! تم اپنی جان کیوں کھوتے ہو اور اپنے اقرباء اور ساتھیوں کو کیوں تکلیف میں مبتلا کرتے ہو مجھے تنہا

اس صحراء میں چھوڑ کر جدھر دل چاہے چلے جاؤ میں دشمن کی تلوار کا تنہا مقابلہ کروں گا اور اگر تم کو یہ خیال ہے کہ تمہیں جاتے ہوئے کوئی دیکھ لے گا اور سب کے سامنے واپس جانے پر تم کو شرم آتی ہے تو لو! یہ شمع بھی بجھائے دیتا ہوں۔ اب تو اندھیرا ہوگیا! ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا! کوئی کسی کو نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے عزیزوں کا ہاتھ پکڑو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ دنیا ایسے مواقع پر ساتھیوں کو تلاش کرتی ہے اور لشکر میں اضافہ کرتی ہے۔ مگر امام حسینؑ ساتھیوں کو رخصت کر رہے ہیں اور تعداد کم کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ سلطنت اور حکومت کے خواہاں نہ تھے، ان کی نظر دنیا طلبی پر نہ تھی۔ وہ دین کے طلب گار تھے وہ حق کو باطل سے الگ کرنا چاہتے تھے اور اسی لئے ساتھیوں کی اس کثرت کے خواہاں نہ تھے جس میں ایمان نہ ہو ایسے لاتعداد لشکر کی ان کو ہوس نہ تھی جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو اور جو آخرت وروز حساب پر یقین نہ رکھتا ہو۔ وہ چاہتے تھے کہ جو میدانِ شہادت میں جائے وہ دیانت وحقانیت کے سچے اور پاک جذبہ کو لے کر جائے وہ سچے اور پکے دینداروں کے طالب تھے خواہ ان کی تعداد کتنی ہی تھوڑی ہو یہاں تک کہ وہ اس پر بھی تیار تھے کہ ان کے تمام ساتھی انھیں تنہا چھوڑ کر چلے جائیں۔ مگر وہ ایسے ساتھی اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے جو کسی قیمت پر بھی خریدے جاسکتے ہوں۔ امام کا یہ ولولہ انگیز ارشاد سن کر انصار واقرباء نے چیخیں مار کر رونا شروع کر دیا۔ اور ہر ایک عرض کرنے لگا: یادگارِ رسول! فرزند فاطمہؑ! ہمیں آخر کس روز کے لئے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ سیکڑوں مرتبہ ہمیں قتل کیا جائے اور پھر زندگی ملے جب بھی ہم ہر مرتبہ حضور کے سامنے شرف شہادت حاصل کریں گے اور کبھی اس خدمت سے منہ نہیں موڑیں گے۔ امام نے دنیا کو دکھایا کہ ان کے ساتھی کیسے وفادار تھے کیسے مخلص تھے اور کیسے خدا ترس تھے:

"لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفٰی مِنْ اَصْحَابِیْ۔"

میں نے ایسے باوفا ساتھی نہیں دیکھے جیسے میرے ساتھی ہیں۔

آپ کا مشہور شعر ہے:

اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوْبِ الْعَارِ
وَالْعَارُ اَوْلٰی مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

ننگ وعار اختیار کرنے سے موت بہتر ہے۔ اور جہنم کی آگ میں جانے سے دنیا کی ذلت واہانت برداشت کرلینا افضل ہے۔

امام حسینؑ نے ہم کو انسان کے سر کی قیمت بتائی ہے۔ انھوں نے ہم کو احساس برتری کے طریقے سکھائے ہیں۔ نوعِ بشر کو تاریخ میں ایک لازوال جگہ دی ہے۔ نظم وضبط کے آئین سمجھائے ہیں۔ انھوں نے انسانی ضمیر سے موت اور اسیری کا خوف ہمیشہ کے لئے دور کردیا اور اپنے عمل سے دکھا دیا کہ دیانت اور حق کی حفاظت کے لئے بڑے سے بڑے اقتدار سے ٹکر کیونکر لی جاتی ہے۔

سرداد نہ داد دست در دست یزید لعہ
حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؑ

(خواجہ معین الدین چشتیؒ)

حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے

علامہ سید محمد رضی صاحب قبلہ (پاکستان)

موضوع بالا پر کچھ عرض کرنے سے پیشتر مقدمہ وتمہید کے طور پر اس کی توضیح ضروری ہے کہ انسانیت کا صحیح مفہوم اور معیار کیا ہے اور حقیقی معنوں میں انسان کہے جانے کا مستحق کون ہوسکتا ہے۔

موجودات عالم آب وگل میں سے کوئی شے خواہ نظر ظاہر میں کتنی ہی بے شعور بے حس اور قوت ادراک وتمیز سے محروم کیوں نہ دکھائی دیتی ہو، دراصل ایسی نہیں ہے جو خود فراموشی کے مرض میں مبتلا ہو اپنی حقیقت سے ناآشنا اور اپنے لوازم ذاتیہ وخصوصیات طبیعیہ سے غافل ہو۔ ہر شے میں حسب استعداد قوت ادراک وتمیز اور عرفان حقیقت موجود ہے۔ جو اس کے درجہ کمال فطری تک پہونچنے کے لئے مناسب وموافق یا غیر مناسب وغیر موافق ہوتے ہیں۔ ان کی تفریق وتمیز میں مطلق خطا نہیں کرتی اور اس سے غایت وجود اغراض خلقت کے پورا کرنے میں تقصیر وکوتاہی کچھ بھی واقع نہیں ہوتی۔

انواع عالم میں فقط انسان ہی ایک ایسی نوع ہے جس کے اکثر افراد خود فراموش اور اپنی حقیقت وغایات وجود وخصائص ذاتیہ کے صحیح تصور وحقیقی عرفان سے محروم ہیں انسان کی مختلف جماعتیں انسانیت اور اس کے کمالات حقیقیہ مناسبات فطریہ کے متعلق جداگانہ تخیل رکھتی ہیں اور اختلافات تخیل کی وجہ سے ہر ایک کی سعی عمل اور اس کے طریقوں میں شدید اختلاف نظر آتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے وہ ضعف خلقت ونقص فطرت جس کا تذکرہ کلام ربانی "خلق الانسان ضعیفا" میں ہے اس کے اجمالی ادراک واحساس سے کوئی انسانی دل ودماغ خالی نہیں۔ افراد انسانی اس احساس میں برابر کے حصہ دار ہیں مگر یہ ضعف ونقص کس قسم کا ہے، اس کا ازالہ کیونکر ہوسکتا ہے اس کا علاج

کس عنوان سے ممکن ہے، کس طرح کی قوت اور کس قسم کا کمال اس کا بدل قرار پا سکتا ہے اس کی تعیین و تشخیص میں شدید اختلاف خیال وافتراق رائے واقع ہوتا ہے ''فکر ہر کس بقدر ہمت اوست'' کے مطابق ہر انسانی دماغ کمال کا جداگانہ تخیل اپنے اندر قائم کر لیتا ہے اور اس کی سعی عمل انھیں افکار و تخیلات کے مناسب موقع ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس خیال وزعم ناقص میں مبتلا ہوتا ہے کہ کمال انسانی ملک بن جاتا ہے اور وہ اس خیالی کمال کے مرتبہ پر پہونچنے کے لئے رہبانیت اختیار کر کے دنیا و مافیہا سے منقطع ہو جانے کی سعی لاحاصل کرتا ہے اور وہ طرح طرح کی غیر فطری ریاضت کی جانب مائل ہو کر اپنی ہستی کو اغراض وجود کی تکمیل سے بے بہرہ اور اپنے قدرتی سرمایہ استعداد و قابلیت کو برباد کر دیتا ہے۔ اس کی پرواز تخیل اس حقیقت تک نہیں ہو سکتی کہ جس ملکیۃ کو وہ اپنے لئے منتہائے کمال تصور کرتا ہے وہ خود نقص وجودی سے خالی نہیں ہے۔ عالم ملکوتی کے موجودات و کمالات وجودی نے ایک مقام معلوم و مکان محدود میں لا کر ٹھہرائے گئے ہیں جہاں سے آگے بڑھنا ان کی فطرت کے خلاف ہے ان کا دامن ہستی مزید ترقی کے امکان واستعداد سے خالی ہے۔ اور اسی عجز و نقص کا احساس ان کو مخلوق انسانی کی ارتقائی شان کی طرف بنظر حسرت مُڑ مُڑ کے دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مقام انسانیت کو منزل ملکیۃ پر جو تفوق حاصل ہے اس کو ظاہر کرنے کے لئے یہ ارشاد ربانی کافی ہے:

"اولئك الذين يدعون يبتغوا الى ربهم الوسيلة ايهم اقرب"، ''یہی وہ لوگ ہیں جنھیں یہ تو پکارتے ہیں اور وہ خود اپنے پروردگار کے حضور میں تقرب حاصل کرنے کے لئے وسیلہ ڈھونڈھتے ہیں کہ ان میں سے کون زیادہ قرب باری رکھنے والا ہے''

اس جماعت کے مقابلہ میں دوسرا گروہ ہے جو انسانیت اور اس کا کمال مادی اسباب میں منحصر تصور کرتا ہے۔ اس کی غلط بین نگاہوں میں انسان اور کامل انسان وہی ہو سکتا ہے جس کے پاس زر و جواہر کی کثرت، مال واسباب، حشم و خدم کی فراوانی، زخارف دنیوی کی افراط ہو اس گروہ

کی پرواز تخیل مادیت کی فضا سے باہر نہیں ہو سکتی وہ زر و جواہر کے خزائن عامرہ، اطلس و زربفت کے ملبوسات فاخرہ سر بفلک عمارتوں اور پر تکلف غذاؤں کے مہیا کرنے میں اپنی روحانی و جسمانی قوتوں کا قدرتی سرمایہ صرف کرتا ہے اور یہی اس کے نزدیک معیار انسانیت و معراج کمال انسانی ہے اور بس۔ اسی قسم کا نظریہ رکھنے والے الٰہی منصب داروں کی حقانیت و سچائی تسلیم کرنے سے اس بنا پر انکار کرتے تھے کہ وہ مالی وسعت نہیں رکھتے تھے۔ سونے کے کنگن، موتیوں کے ہار اور ملبوسات فاخرہ سے آراستہ و پیراستہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ جناب امیر علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''جناب موسیٰ و ہارون علیہما السلام فرعون کے باہر آئے بالوں کا لباس پہنے اور عصا ہاتھ میں لئے ہوئے تھے انھوں نے فرعون سے وعدہ کیا تھا کہ اگر اسلام قبول کر لے گا تو اس کا ملک باقی اور اس کا اعزاز برقرار رکھا جائے گا۔ فرعون نے اپنی قوم سے کہا کہ تم لوگ ان دونوں کی باتوں پر متعجب نہیں ہوئے۔ یہ لوگ مجھ ہی سے بقائے ملک و عزّت کا وعدہ کر رہے ہیں حالاں کہ ان کی فقیری و ذلت کی جو حالت ہے وہ تم خود ہی دیکھ رہے ہو۔ کیوں نہ ان کو خدا کی طرف سے سونے کے کنگن عطا کئے گئے فرعون کا یہ کلام اس لئے تھا کہ سونے اور اس کے جمع کرنے کی عظمت اس کی نگاہوں میں تھی اور لباس صوف کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔

(۱) ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو خدا کی تسبیح حمد نہ پڑھتی ہو مگر تم ان تسبیح کو نہیں سمجھتے۔

(۲) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جتنے مخلوقات آسمانوں اور زمین میں ہیں اور پروں کو پھیلا کر اڑنے والے پرند سب کے سب کارگزار اور تسبیح خوان ہیں اپنی اپنی نماز اور اپنی اپنی تسبیح کو خوب جانتے ہیں۔

ایسے عرفائے الٰہیین ہر زمانہ میں کم ہوا کرتے ہیں جن کو حقیقت انسانیہ کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہو اور جو اس حقیقت کے عارف ہوتے ہوں کہ سورۃ انسانیہ اعظم صحیح الٰہیہ و خلاصہ کائنات و مجموعۂ موجودات و نقطۂ اتصال عوام روحانیہ و جسمانیہ و مقام ارتباط تجرد و مادیۃ و سدرۃ المنتہیٰ معراج جمادیۃ

ونباتیۃ حیوانیہ بنائی گئی۔ وہ مختلف آثار پیدا کرنے والی قوتوں یعنی بہیمیۃ وسبعیۃ وشیطانیہ وملکوتیہ و ربوبیۃ کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہے۔ ان چار قوتوں میں سے قوت ملکوتیہ، ربوتیہ، انسان کو مظہر اخلاق الٰہیہ وآثار واوصاف ربانیہ بننے کا امکان عطا کرتی ہے اور وہ اس کے ذریعہ سے علم وعمل اپنے خالق سے مشابہت ومناسبت حاصل کرسکتا ہے۔

جب عالم اصغر یعنی وجود انسانی میں اس قوت ملکوتیہ ربوبیۃ کی ریاست وحکومت قائم ہو اور باقی قویٰ اس کے محکوم وفرماں بردار ہوکر اس کی معیّن کردہ حدود میں اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہوں تو اس صورت میں فضائل وکمالات وسعادات کے وہ بلندترین درجات قائم ہوتے ہیں جہاں تک پہونچنے سے ملکیۃ بھی عاجز رہ جاتی ہے اور انسانیت کا صحیح مفہوم ومصداق اور مقصد تکوین عالم پورا ہوجاتا ہے۔

چونکہ انسان خود شناسی سے محروم تھا اپنی ہی معرفت کہنہ ذات اس کو میسر نہ تھی، مفہوم انسانیت کا تصور اس کے لئے مشکل اور قوۃ ملکوتیہ ربوبیۃ کو سرگرم عمل بنا کر انسان حقیقی بن جانا اس کے لئے مشکل تو تھا اسی لئے صانع حکیم ورب الکریم نے ایسے اعلیٰ نمونے بنی آدم کے پاس بھیجے جو خود کامل ترین انسان تھے اور ناقص افراد کو کمال انسانی کی بلندیوں تک پہونچانے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔

انبیاء ورسل کی بعثت اور ائمہؑ واوصیا کے تقرر کی علت غائی اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ اپنے اقوال واعمال، حرکات وسکنات سے انسانیت کا مکمل نمونہ بنی نوع انسان کے سامنے پیش کریں اور ان کو کامل انسان بن جانے کی سبیل بنائیں اور وہ صراط مستقیم جس پر منزل انسانیت تک پہونچنے کے لئے وہ خود چلتے تھے اور دوسروں کو اس پر چلنے کی قولی وفعلی دعوت دیتے تھے ''اسلام'' سے تعبیر کی جاتی ہے۔

اگر نظرِ عقل کو حقائق کی گہرائیوں تک پہونچنے کا موقع دیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ اسلام عالم

امکان کے ہر موجود میں کارفرما ہے، مخلوقات سماوی ہوں یا ارضی سب کے سب حلقہ بگوش اسلام نظر آتے ہیں اور اس اسلام کا حقیقی مفہوم بھی ہے کہ شے اپنی فطرت اصلیہ پر قائم اور حقیقت فطریہ پر ثابت رہ کر ان خواص وآثار واوصاف کو ظاہر کرنے والی ہو جو اس کے ایجاد وتکوین کا مقصد اصلی ہوں اسی معنی سے ''اسلام'' دین فطرت ہے جو عالم شہود کے ذرہ ذرہ میں جاری وساری ہے۔ ''**وله اسلم من في السموات والارض**،، کوئی موجود علوی یا سفلی ایسا نہیں ہے جو اپنی حقیقت سے ناآشنا، اپنی فطرت سے غافل اور اپنے خواص ذاتیہ وآثار فطریہ کے اظہار سے قاصر رہتا ہو یہ کمزوری فقط انسان کے لئے مخصوص ہے کہ خود اپنی ہی حقیقت کے پہچاننے سے عاجز رہتا ہے اور اگر اس کو عارف حقیقت ہونا میسر بھی ہوجائے تو عملی حیثیت سے انسانیت کا مصداق حقیقی بننا اس کے لئے دشوار تر رہتا ہے اور جس طرح وہ مفہوم انسانیت کے صحیح طور سے عاجز اور عملی طور پر مصداق انسانیت بننے سے عاجز رہتا ہے اسی طرح وہ اسلام حقیقی کے صحیح تصور اور حقیقی معنوں میں ''مسلم'' بننے سے عاجز رہتا ہے کیوں کہ حقیقت انسانیت وکہنہ اسلام اصل میں دونوں ایک ہیں جو مسلم حقیقی ہوگا وہ انسان حقیقی بھی ہوگا۔ جس طرح انسان نہ صرف روح کا نام ہے اور نہ فقط جسم کا بلکہ وہ ان دونوں کے مجموعہ کا نام ہے اور انسانیت کا تعلق جنبۂ روحانیت وجسمانیت دونوں سے ہے روح افعال روح کے ساتھ ساتھ اعضاء جو روح بدلیٰ وآلات جسمانی کو بھی انسانیت حقیقیہ کے مستحق ہونے میں خاص دخل ہے۔ اسی طرح اسلام کا تعلق بھی روح، بدن دونوں سے یکساں ہے۔ جب تک روح وبدن دونوں میں اتحاد وعمل نہ ہوگا اسلام حقیقی کا وجود نہیں ہوسکتا۔ اسلام فقط صورۃ خیالیہ وکیفیۃ نفسانیہ یا عقیدۂ قلبی کا نام نہیں ہے بلکہ اعضاء وروح جسمانیہ کو اسلام کے اسم ومسمی سے خاص تعلق ہے۔ جب تک وہ مصروف عمل نہ ہوں گے حقیقت اسلام کا وجود ممکن نہ ہوگا۔ جناب امیرالمومنینؑ کا ارشاد ہے:

میں اسلام کی حقیقت اس طرح بیان کروں گا جیسی مجھ سے پیشتر کسی نے بیان نہ کی ہوگی اسلام

تسلیم اور تسلیم یقین ہے اور یقین تصدیق خدا اور رسول ہے۔ اور تصدیق اقرار ہے اور اقرار نام ادا
ہے اور ادا عمل ہے۔ لہٰذا اسلام عمل کا نام ہے اور عمل ہے اس کی حقیقت۔

اگر چہ یہ تمہید کافی طویل ہوگئی مگر جن حقائق کی طرف ناظرین کو زحمت التفات دی گئی ہے۔ ان
سے اس سوال کے جواب کی راہیں بالکل صاف ہوگئیں ہیں کہ حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے؟ کربلا کے
یادگار زمانہ معرکۂ حق و باطل میں حقیقت اسلام و معلم انسانیت امام حسینؑ کی جنگ جارحانہ تو کیا
جنگ مدافعتی وحفاظتی بھی کہی جاسکتی کیوں حملہ آور کی طرح مدافعت کرنے والا حسب ضرورت و بقدر
اختیار اسباب مدافعت ومحافظت فراہم کرنے میں کمی نہیں کرتا۔ وہ اپنے ہمدردوں اور مددگاروں کی
بڑی سے بڑی جماعت اور حربی ساز وسامان کی زیادہ سے زیادہ مقدار جمع کرنے کی کوشش کرتا ہے
تا کہ اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں کامیاب مدافعت کرسکے اور جو موانع کامیاب مدافعت ومحافظت
میں مشکلات پیدا کرتے ہیں ان کو مٹانے کی جدوجہد کرتا ہے، ہر ممکن تدبیر سے لوگوں کو فتح وکامرانی
کا یقین دلا کر جذبات نفرت کا ابھارتا اور ہمتوں کو بلند کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی ہمت شکن خبریں نہیں
سناتا کہ میں اپنے بچوں کو اس غرض سے لیے جارہا ہوں کہ ان کو مقتول دیکھوں اور اہل حرم کو اس
واسطے لیے جاتا ہوں کہ قیدی بنائے جائیں۔ مگر حسینی سیاست اس معمول دنیا کے بالکل برعکس تھی۔
اسباب مدافعت اور اعوان وانصار کی طاقتور جماعت فراہم کرنے کے عوض جتنے رفقاء آپ کے
ساتھ جمع تھے آپ ان کو بھی منتشر ہوجانے کی ترغیب دے رہے تھے اور قدم قدم پر انجام سفر کو واضح
فرما رہے تھے کہ کوئی شخص آپ کے اصل مقصد سفر سے بے خبر نہ رہ جائے۔ صرف وہی حق پرست
وخدا شناس باقی رہ جائیں جن کے دلوں میں حوس دنیا وطمع زندگی کا ایک نقطہ بھی موجود نہ ہو کر مکہ
معظّمہ سے روانہ ہونے سے پیشتر آپ نے ایک خطبۂ مبارک میں یہ صاف اعلان فرمایا:

ترجمہ از عربی ’’اولاد آدم کی گردنوں میں موت کے پھندے کی لکیر اس طرح پڑی ہے جس طرح
لڑکی کے گلے میں گلوبند کا نشان میں اپنے بزرگوں سے ملاقات کا ایسا مشتاق ہوں جیسے یعقوبؑ

دیدار یوسفؑ کے مشتاق تھے اور میرے لئے ایک قتل گاہ منتخب کرلی گئی ہے جہاں میں پہونچنے والا
ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ صحراؤں کے درندے میرے اعضا وجوارح کو جدا کرتے اور ان سے
اپنی بھوکی انتڑیاں اور پیٹ بھرتی ہیں۔ جو دن قلم تقدیر نے لکھ دیا ہے اس سے مفر نہیں۔ ہم
اہلبیتؑ عصمت کی رضا وہی جو خدا کی خوشنودی ہو ہم اس کے امتحان پر صبر کرتے ہیں اور وہ ہم کو
صابروں کا اجر پورا پورا عطا کرے گا۔ جو شخص ہماری محبت کی راہ میں اپنی جان دینا چاہتا ہو اور بقاء
الٰہی کے لئے اپنے نفس کو مطمئن بنا چکا ہو وہی ہمارے ساتھ چلے۔ میں صبح انشاء اللہ یہاں سے کوچ
کروں گا۔‘‘

اس سے قبل مدینہ منورہ سے رخصت ہونے سے پہلے آپ نے ایک نوشتہ بنی ہاشم کے حوالہ
فرمایا تھا جس میں مندرج تھا۔ ’’امابعد فانه من بحق منکم استشهد.....
عورتوں اور بچوں کا ساتھ حفاظتی و مدافعتی پہلو کو کمزور کردیتا ہے اور ایسی مشکلات میں انسان کو مبتلا
کردیتا ہے جن سے وہ کمزور اور دشمن قوی ہوجاتے ہیں عیال واطفال کا ساتھ درحقیقت دشمنوں کی
بہت بڑی مدد کرتا ہے۔‘‘

ایک شاعر عرب کہتا ہے:

’’الهفی بقری سحبل یوم احلبت
علینا الولایا والعدو والمباسل

مگر حسینی طرز عمل یہ تھا کہ آپ نے تمام عیال واطفال اور شیرخوار بچوں تک کو نینوا کے اس چٹیل
میدان میں لاکر جمع کردیا جہاں ٹڈی دل یزیدی افواج کا محاصرہ ہونے والا تھا۔ یہاں تک کہ آخر
وقت میں خون کے پیاسے انسان نما درندوں کے سامنے اپنے ششماہہ بچے کو ماں کی آغوش سے
جدا کرکے پیش کردیا۔ پھر کیا حسینی جہاد کے متعلق کسی ایسے عقل مند کو جو حالات وواقعات سے نتائج
حاصل کرنے پر قدرت رکھتا ہو جہاد حسینی پر جنگ جارحانہ تو کیا حفاظتی ومدافعتی جنگ کا شبہ ہوسکتا

ہے؟ ہرگز نہیں۔ممکن ہے کہ کسی پست نظر ومحدود خیال شخص کے لئے میرا یہ دعویٰ باعث تعجب وتحیر ہو اور اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ کھٹک پیدا ہو کہ حسین جہاد کو جارحانہ تو کیا مدافعتی وحفاظتی جنگ بھی نہیں کہتا حالانکہ عموماً انسانی لڑائیوں کے یہی دو پہلو اور مقصد ہوا کرتے ہیں، مگر واقعات وحقائق پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنے والے اس نتیجہ تک پہونچ سکتے ہیں کہ جناب سید الشہدؑاء کا مقصد نہ یزیدی خلافت وحکومت پر حملہ کرنا تھا اور نہ اپنے ازلی دشمنوں کے مقابلہ میں جان ومال، عزت وناموس کی طرف سے مدافعت مقصود تھی بلکہ حضرت کے پیش نظر ایک ایسا مقصد جو ان دونوں سے ارفع واعلیٰ تھا اور جس کو آپ نے وصیت نامہ کے طور پر لکھ کر اپنے بھائی محمد بن حنفیہ کے حوالہ کر دیا تھا:۔

ترجمہ از عربی: ”مفصل وصیت نامہ بعد حمد وثنا اظہار واعتقاد توحید ورسالت ومعاد پر ہے کہ بہ تحقیق میں نہ کسی غرور وگھمنڈ سے چلا ہوں اور نہ فساد وظلم کے لئے جاتا ہوں۔میرے سفر کا مقصد اور مدینہ سے نکلنے کی غرض جد بزرگوار کی امت کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔میں چاہتا ہوں کہ نیکی کی ہدایت کروں اور بدی سے روکوں اور اپنے نانا اور باپ کی سیرت پر چلوں۔پس جو شخص میری ہدایت کو قبول کرے گا حق کے لئے تو خدا اس کو حق کی جزا عطا کرے گا اور جو میری ہدایت کو رد کرے گا تو صبر اختیار کروں گا اور میرے اور اس کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے گا وہ بہترین حکم اور فیصلہ کرنے والا ہے۔“

اس وصیّت نامہ کا ایک ایک لفظ جناب سید الشہدؑاء کے حقیقی زاویۂ نظر اور واقعی نصب العین کا آئینہ موجود ہے اس کو بنظر اعتبار دیکھنے والے اس میں شبہ ہرگز نہیں کر سکتے کہ حضرت کے سامنے جو مہم تھی وہ صرف یہ تھی کہ اسلامی دنیا کو سیرت نبویہ وعلویہ یعنی صحیح انسانیت اور حقیقی اسلام کی طرف دعوت دی جائے اور اس مطلب کے حاصل نہ ہو سکنے کی صورت میں نہ صرف شہادت بلکہ لاثانی مظلومیت وقوت صبر وبرداشت کا عدیم المثال مظاہرہ کیا جائے۔سیرت پیغمبرؐ وروح اسلام وجوہر انسانیت کا اثر دنیا میں باقی رکھنے کے لئے اپنی ساری بضاعت کی قربانی پیش کر دی جائے۔کمسن

بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی ایک مختصر فوج ترتیب دی جائے جس کا ہر سپاہی روح انسانیت کا پرستار اور شمع اسلام کا جانباز پروانہ ہو اور ان کی سرفروشیوں کے ذریعہ دین الٰہی کی بنیادی خصوصیات اس طرح عریاں کر دی جائیں کہ مصنوعی اسلام سے کبھی بھی مشتبہ نہ ہونے پائے اور حسینؑ نے اس مقصد میں جیسی کامیابی حاصل کی اس کی کوئی دوسری مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں ہے۔حسینؑ کا فخر مباہات سے یہ فرمانا کہ ”میرے ایسے اصحاب میرے جد عالی مقدار و پدر بزرگوار کو بھی نہیں ملے“، بالکل حق بجانب تھا۔حسینؑ ایک ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے تھے جس میں مادی وشیطانی جذبات کی حکومت مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں کی دنیا میں قائم ہو چلی تھی اصول خلافت سازی جن کو جوہر اسلامیت وجوہر انسانیت کا کچھ لگاؤ نہ تھا دینی اصول وقوانین کے ذیل میں جگہ پا چکے تھے۔جماعتی استبداد کو اجماع وشوریٰ کا خود ساختہ نام دے کر اسلام کا مقدس آئین قرار دے دیا گیا۔امراء وحکام کا ہر قول وفعل نبوی سیرت کے برابر بلکہ عملی طور پر اس سے زائد واجب الاتباع متصور ہوتا تھا۔اسلامی حریت واخوت ورحم دلی، ہمدردی کا مسلمانوں کے عملیات میں کوئی اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔قریش اور دیگر قبائل عرب کے وہ جتھے جو بانئ اسلام کے مقابلہ میں اسلام کی بیخ کنی سے عاجز رہ گئے تھے ظاہری اسلام کے بھیس میں اسلامی روحانیت اور حقیقی انسانیت پر غارت گری میں مصروف تھے۔جہل ونفاق جن مقاصد کو بدر واحد وخندق کی معرکہ آرائیوں میں حاصل نہ کر سکا تھا، وہ اسلام کے پردہ میں توقع سے زیادہ حاصل کئے جا رہے تھے۔حضرت رسالت مآبؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے خواہ ان کی صحبت نشینی کی نوعیت اور غایت وغرض کچھ بھی ہو دنیائے اسلام کے چپّہ چپّہ پر پھیلے ہوئے تھے نومسلم عوام خوش عقیدگی کے جوش میں ان کو پیغمبری سیرتوں کا حامل اور اسلامی دیانت کا علم بردار تصور کرتے تھے۔ان کا ہر قول وفعل اسوۂ حسنۂ پیغمبرؐ اور روح عدالت ودیانت سمجھا جاتا تھا۔نام نہاد خلافتیں اور ان کی پشت وپناہ اور وہ خلافتوں کی بنیادوں کو استوار ومستحکم بنانے والے تھے۔امراء کا طرز عمل خواہ کتنا ہی اسلام کش وانسانیت سوز کیوں نہ ہو صحابۂ نبی

کی اخلاقی وعملی ہمدردیاں بہرحال ان کو حاصل تھیں۔ان کا علانیہ ظلم وجور وفسق وفجور بھی ان علم بردار ان اصحابیت کے جذبۂ اسلامی میں اضطرابی کیفیت پیدا نہ کرسکتا تھا۔وہ بہرصورت ان کے وفاکش وذخیرااندیش تھے۔ ان کی عدالت وتقدس کی چتونوں پر کسی حالت میں بل آجانا دشوار تھا۔انجام کار یہی ہوا کہ جو جماعتیں اسلام کے ابتدائی دور میں فنا کرنے سے عاجز رہ گئیں تھیں وہ بعد جناب رسولؐ رفتہ رفتہ اس کی اصلی صورت اور بنیادی خصوصیات کو متغیر کرانے میں کامیاب ہوگئیں اور ان کی تمام کامرانیوں کی ذمہ دار دراصل صحابہ کی وہ کثیر تعداد تھی جس کو جاہل عوام کے عقائد وخیالات وجذبات پر پورا قابو حاصل تھا، وہ لوگ اپنی روش کو اسلامی اصول اور نبوی سیرت تسلیم کراسکتے تھے ۔حقیقی اسلام اور سچی انسانیت کی جگہ ان بدعتوں نے لے لی تھی جو نفسانی خواہشوں یا تعلیمات اسلام سے جہالت کی پیداوار تھیں۔جناب امیرؑ اپنے عہد تک کے قضاۃ وروّاۃ احادیث کے حالات بیان کرتے ہوئے آخر کلام میں فرماتے ہیں:

ترجمہ از عربی: ''خدا سے میں اول لوگوں کو شکوہ کرتا ہوں جو جیتے ہیں جہالت میں اور مرتے ہیں ضلالت وگمراہی میں۔کوئی جنس ان کے بازاروں میں کتاب خدا سے زیادہ ناقص وبے قدر نہیں ہے جب کہ وہ ٹھیک ٹھیک پڑھی جائے کوئی تحریف اس میں نہ کی جائے اور کوئی جنس ان کے نزدیک قابل خریداری اور گراں قیمت کتاب خدا سے زیادہ نہ ہوگی جب کہ اس کو حقیقی مواضع سے منحرف کردیا جائے اور معانی ومطالب حسب اغراض ذاتی بنائے جائیں۔اُن کے نزدیک نیکی سے زیادہ بری اور برائی سے زیادہ اچھی کوئی چیز نہیں ہے''۔

ترجمہ از عربی: ''دوسرا وہ شخص ہے جو عالم بنتا ہے مگر علم سے اس کو واسطہ نہیں۔کچھ جہالتیں جاہلوں سے اور کچھ گمراہ کن باتیں گمراہوں سے حاصل کرلی ہیں اور عوام الناس کے لئے دھوکے کی ٹٹی کھڑی کردی ہے اور فریب کا جال بچھا دیا ہے۔کتاب خدا کو اپنی رایوں پر محمول کرتا اور حق کو اپنی نفسانی خواہشوں کی طرف پھیرتا ہے۔کہتا تو یہ ہے کہ میں شبہات میں توقف کرتا ہوں حالانکہ

شبہات ہی میں پڑا ہوا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ میں بدعتوں سے دور رہتا ہوں حالانکہ بدعتوں ہی کا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہے صورت اس کی انسان کی مگر دل کمینوں کا ہے۔'' (نہج البلاغہ)

ناظرین ان ارشادات کو دیکھ کر اس کا اندازہ بآسانی کرسکیں گے کہ جب عہد جناب امیرؑ تک اسلامی دنیا میں وہ حالات پیدا ہوچکے تھے جن سے خالص اسلام کی ہستی خطرات میں مبتلا تھی تو اس کے بعد جبکہ امویہ کا تسلط انتہائی عروج پر پہنچ گیا تھا، اسلام کس دور انقلاب میں آگیا ہوگا؟ جناب سرورؐ عالم کی وفات حسرت آیات کے بعد جو انقلاب ورد عمل شروع ہوا اس نے رفتہ رفتہ ارتقائی منزلیں طے کرکے امویہ ویزید کی صورت اختیار کرلی، انسانیت روپوش ہوگئی بہیمیت، حیوانیت و شیطانیت کا تسلط قائم ہوگیا، روح دیانت اسلامیہ کچل دی گئی، دین کی آڑ اور مذہب کے پردہ میں حیوانی وشیطانی اغراض حاصل کی جانے لگیں۔امراء وخلفاء کے انسانیت سوز اسلام کش افعال کے خلاف کسی صدائے احتجاج کے بلند ہونے کا امکان باقی نہیں رہ گیا تھا کیوں کہ ان کی حکومتیں بھی انھیں اصول کے ماتحت قائم ہوئی تھیں جو بعد عہد رسالت ایجاد کئے گئے تھے اور وہی اجماع ساز وشوریٰ نواز وغلبہ پرست صحابہ کی جماعتیں جو ابتدائی دور خلافت سے حل وعقد کی ذمہ دار تھیں امویہ ویزید کی بنیادوں کو مستحکم کررہی تھیں۔نو مسلم عوام ظاہری شعائر اسلامیہ ومراسم دینیہ کے علاوہ حقیقت اسلام پر مطلع نہ ہوسکے تھے اور وہ ان اہل حل وعقد کی شہرت تقدس وعدالت سے مرعوب تھے۔ان کے مذہبی عقائد وجذبات کو اپنے موافق مقصد سانچوں میں ڈھالنے پر ان فرضی فضائل ومناقب کے مالک مقدسین وعادلین کو پوری قدر حاصل تھی اور عوام کو یہ باور کرادیا گیا تھا کہ امیر وقت پیغمبرؐ کا جانشین ہے، صاحب امر ہے جس کی اطاعت واجب ہے اس کی کسی روش پر نکتہ چینی اور کسی طرز عمل کے خلاف احتجاج بغاوت وخروج از اسلام ہے بہرصورت اس کے ہاتھوں متاع ایمان کو فروخت کردینا ہی حقیقی اسلام ہے۔یزید یہ جو امویہ کا آخری درجۂ کمال تھا اپنے پورے جاہ وجلال وہمہ گیر اقتدار کے ساتھ انسانیت سوزی اسلام کشی، شیطنیت وحیوانیت نوازی میں مشغول

تھی۔ دیگر بلاد اسلامیہ کے علاوہ کوفہ وشام میں صحابہ وتابعین کی نوآبادیاں قائم تھیں ان کی بڑی سے بڑی مقدس وعادل ہستیاں یزید وابن زیاد کے درباروں کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی میں اتنی حمیت نہ تھی کہ حاکم وقت کے خلاف عدم تعاون وترک موالات کرتا یا ہلکی سی صدائے احتجاج بلند کردیتا، اس عہد تاریک میں صرف حسینؑ کی ایک بلند ترین شخصیت ایسی تھی جس کی طرف روح اسلام وانسانیت مڑمڑ کر بنظر حسرت دیکھ رہی تھی۔ اگر یہ باحمیت وصاحب غیرت وعالی ہمت شخصیت بھی صحابہ وتابعین ہی کی حکمت عملی اختیار کرلیتی اور اس کا معیار ذہنیت بھی وہی ہوتا جو صحابہ وتابعین نے قبول کرلیا تھا، تو اسلام وانسانیت کا عالم سے استیصال کلی ہوجاتا اور اسلام ویزیدیہ میں تفرقہ وامتیاز کی کوئی صورت باقی نہ رہ جاتی۔ اسلام یزیدیہ ہی کا دوسرا نام قرار پاجاتا۔ ان تمام حقائق وواقعات کو بچشم بصیرت دیکھنے والوں کے لئے اس سوال کا جواب دشوار نہیں رہ سکتا کہ ''حسینؑ انسان کو کیا بتلا گئے''

حسینؑ نے اسلام اور انسانیت کا صحیح معیار بتلایا، مفاد نوعی واجتماعی پر مفاد شخصی کو قربان کرنے اور نفسانی خواہشوں پر رضائے خداوندی کو مقدم رکھنے کی لازوال مثال پیش کی۔ خالص بہیمی وشیطانی طاقتوں کی دہشت انگیزی وسفاکی وہیبت ناکی کے مقابلہ میں غیر متزلزل عزم وہمت کے ساتھ فداکاری نہ قربانی پیش کرنا اور ہر قربانی کے بعد رنگ رخ کے نکھرنے اور مسرت واطمینان کی لہروں کے تموج کا محیر العقول منظر دکھلایا کہ:

''رحم، ہمدردی، عفو وکرم، غیرت قومی، حمیت دینی، عزت نفس، حریت، ایثار، علو ہمت، تسلیم ورضا وغیرہ اخلاق اسلامی وقصائص انسانیت کی تعلیم دی ہو اور ہوس نفسانی کے تاریک گردابوں میں ڈوبتے ہوئے سفینۂ اسلام کو بچانے اور اسلام کا جاہلیت کے ہاتھوں دم توڑتی ہوئی انسانیت کو نئے سرے سے زندہ کرنے کا طریقہ سکھلایا اور اس حقیقت کو ناقابل اشتباہ بنادیا کہ اسلام حقیقت کا زاویۂ نظر رائج الوقت اسلام سے بالکل مختلف ہے۔ دین اسلام کو نفس پرستی وہوس رانی سے کچھ بھی

علاقہ نہیں اس کی عظمت وبرتری وحقانیت کا معیار اور عروج انسانی کا ذریعہ دہشت انگیز عسکریت، وسیع ملکی فتوحات، اموال غنیمت سے بھرے خزانے نہیں بلکہ اس کے اعلیٰ نظریات اور پاک اخلاق وعملیات ہیں۔ اسلام کی قوت اور شوکت کا راز نام نہاد مسلمانوں کی ہمدردی کثرت اور مادی اسباب کی فراوانی میں مضمر نہیں ہے بلکہ دلائل صحیح وبراہین کی قوت اس کی عظمت کا اصلی معیار ہیں۔ مادی اسباب کی طاقت سے بسیط ارض پر دنیوی جبروت وجلال کا سکہ بٹھا دینے کو معیار عروج انسانی وارتقائے اسلامی تصور کرنے والے کچھ بھی سمجھتے رہیں نگاہ عبرت کے سامنے ان کی خیالی ترقیاں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ بصیرت والے جب بھی متوجہ ہوتے ہیں تو ان کو وہی ترقیاں تنزل انسانیت کا آخری نقطہ اور انحطاط اسلام کا پست ترین درجہ، دیانت وروحانیت کا انتہائی مرتبہ نظر آتی ہیں اور ان کی نگاہوں میں یہ حقیقت عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلام کی عظمت وبرتری اور انسانیت کے عروج وسربلندی کا مکمل ترین نمونہ وہی تھا جو حقیقت اسلام وروح انسانیت حسینؑ اور اولاد حسینؑ نے پیش کیا اور انھیں کا اسوۂ حسنہ اسلام وانسانیت کا بلند ترین معیار ہوسکتا ہے اور بس۔

❁❁❁

حسینیت کیا ہے؟

علامہ جزائری آیۃ اللہ مفتی سید طیب آغا صاحب لکھنوی مدظلہ، ایران

کسی ذات کی طرف نسبت دینا قدیم زمانہ سے چلا آرہا ہے جس شخص میں کوئی خصوصیت وکمال ہو لوگ اس سے خود کو منسوب کرنا فخر سمجھتے ہیں جو بظاہر تین گروہ ہیں:

(۱) اس ذات باکمال کی اولاد۔

(۲) اس کے کمال سے متاثر ہونے والے۔

(۳) اس کی سیرت پر چلنے والے۔

ہم بھی اس کے مدعی ہیں کہ ہم حسینیت کے علمبردار ہیں! دیکھنا ہے کہ یہ دعویٰ کہاں تک درست ہے اگر ہم یہ دعویٰ اس لئے کرتے ہیں کہ ہم ان کی اولاد میں ہیں تو یہ صرف حسینی سادات تک حق بجانب ہے وہ بھی اس صورت میں جب کہ باپ بیٹے کے طرزعمل میں یگانگی ہو ورنہ اگر یہ صورت ہو کہ حسینؑ تو انسان کامل ہوں اور ان کی اولاد اپنے طرزعمل سے جانوروں تک کو شرمائے تو یقیناً ایسی اولاد سے مورث کو تکلیف ہوگی اور اس کا بایں گندگی اس طیب وطاہر ذات کی طرف خود کو منسوب کرنا ایک عظیم جسارت کا مترادف سمجھا جائے گا۔

اور اگر ہمارا دعوائے حسینیت دوسری وجہ سے ہے یعنی ہم حسینؑ کے کمال کے معترف اور ان کی جاں بازی سے متاثر ہیں لیکن یہ اعتراف وتاثر کسی جذبۂ عمل سے خالی ہے تو پھر معاف فرمائیے گا اس معنی سے بڑے حسینی شمر وحرملہ وابن سعد وابن زیاد و یزید قرار پاتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے حسینؑ کے بے مثال کارنامے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا حسینؑ کے کوہ عزم واستقلال سے خود ٹکرائے تھے لہٰذا ان سے بڑھ کر کمال وثبات حسینی کا اعتراف کس کو ہوگا اسی اعتراف وتاثر کا نتیجہ تھا

کہ یزید وپسر سعد کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلتے تھے۔ مگر یہ آنسو مگرمچھ کے تھے۔ اس لئے آج ان ظالموں کو کوئی بھی حسینی نہیں کہتا۔ حسینؑ کی شرافت سے خود شمر اتنا متاثر تھا کہ اس نے ابن سعد کے خیمہ میں اپنی ڈھال پر سر حسینؑ رکھ کر جب پیش کیا تو یہ شعر پڑھا ؎

اِمْلَأْ رِكَابِيْ فِضَّةً وَذَهَباً

فَاِنِّيْ قَتَلْتُ خَيْرَ النَّاسِ اُمّاً وَاَباً

میری سپر کو سونے چاندی سے بھر دے کیونکہ میں نے خیر الناس کو مارا ہے۔ لیکن اس کا یہ اقرار وتاثر کوئی قیمت رکھتا ہے؟ جب کہ اس نے حسینؑ کے گلے پر چھری چلادی۔

اب رہا تیسرا گروہ تو بے شک خود کو حسینی کہہ سکتا ہے وہ حسینیت کا علم اونچا کرسکتا ہے۔ وہ حسینیت کا تحفہ اپنے سینہ پر آویزاں کرسکتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ اس کے روئیں روئیں سے حسینیت کی کرنیں پھوٹ کر نکل رہی ہوں۔ اس کا ہر قول وفعل عاشور کی دوپہر میں چمکنے والے سورج کی شعاعوں سے تابکار ہو۔ کیونکہ عاشور کے چشمۂ آفتاب نے تو یہ دیکھا کہ کربلا کے حسینیوں نے ٹھیک دوپہر کو اپنے زخمی ہاتھوں سے خاک کربلا پر تیمم کیا اور شمشیروں کے سایہ میں زمین گرم کربلا پر اپنی پیشانی رکھ دی آفتاب تو اب بھی وہی ہے مگر آج کتنے حسینی ہیں جو وقت پر نماز پڑھ کر حسینؑ کے اسوہ کا نمونہ بنتے ہیں۔

عاشور کے سورج نے دیکھا کہ حسینؑ کے جاں باز حسینؑ کے آگے سینہ سپر تھے۔ تیر آ آ کے ان کے نازک سینوں کو چھلنی کررہے تھے مگر وہ مرتے دم تک حسینؑ کے آگے سے نہ ہٹے۔ آج حسینؑ تو ہمارے سامنے نہیں ہیں البتہ حسینیت ضرور موجود ہے یعنی وہ عظیم مقصد ہمارے سامنے ہے جس کے لئے حسینؑ نے یہ اپنی قربانی پیش کی۔ یہ مقصد آج بھی خطرہ میں ہے۔ اس پر تیر برسائے جارہے ہیں آج کے حسینیوں میں ہے کوئی جوان جو تیروں کے سامنے سینہ تان کر سعید وزہیر بن جائے۔ دنیا جانتی ہے کہ جنگ میں دشمن پر غالب آنے کے لئے دھوکا جائز ہے۔ اسلام نے بھی اس کی اجازت

دی ہے بلکہ جنگ نام ہی دھوکا دہی کا ہے (الحرب خدعۃ) لیکن کیا کبھی تم نے سنا کہ کربلا کے حسینیوں نے بھی اپنے دشمن کو دھوکا دیا انھوں نے اپنی قلت کے باوجود اپنے اس جائز حق کو استعمال نہیں کیا نہ دھوکا دیا نہ ان پر کوئی شبخوں مارا، دشمن ان کی گرفت میں آ آ کر نکل گیا۔ خود شمر زہیر کے نشانہ پر آ چکا تھا اور زہیر کے بازو کی ادنیٰ جنبش سے اس کا کام تمام تھا مگر امامؑ نے اجازت نہ دی کیونکہ کربلا کے حسینی بروز عاشورہ اپنے جائز حقوق کو کام میں لانے کے لئے نہیں اکٹھا ہوئے تھے بلکہ ان کا اہم مقصد تو یہ تھا کہ آج ہم سے واجب و مستحب کے علاوہ کوئی امر صادر ہی نہ ہوگا۔ لیکن آج جب کہ دھوکا دہی وغداری یقینا حرام ہے۔ سگا بھائی اپنے مانجائے کے دھوکے کا شکار ہے، کربلا کے حسینی مرنے میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ وہ ہنگام ستیز سے نکل جانے کے شائق تھے۔ بلکہ اس لئے کہ کہیں وہ اپنی آنکھوں سے اپنے ساتھیوں کا خون تازہ نہ دیکھیں۔ اور آج بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ کربلا کے حسینیوں نے تمام رات قرآن کی تلاوت میں گزاری اور جب صبح کو رن پڑا تو کتنے حافظان قرآن تھے جو شمشیروں کے سایہ میں جھوم جھوم کر تلاوت قرآن کرتے جاتے تھے اور جام شہادت نوش کرتے جاتے تھے اور آج قرآن پر یوں گرد جمی ہے جیسے کسی معصوم یتیم کا چہرہ گرد آلود ہو، کربلا کے حسینیوں نے امام کے ساتھ شب عاشور جو وعدہ کیا تھا اس کو اپنی جان کی بازی لگا کر پورا کیا اگر زبان سے یہ کہا کہ اے حسینؑ ہم آپ کے ساتھ ہیں تو پھر ساتھ رہے اور ایسا ساتھ رہے کہ حسینؑ کی کوئی مصیبت ایسی نہیں جس میں انھوں نے ساتھ نہ دیا ہو، اگر حسینؑ نے پانی نہ پیا تو انھوں نے بھی نہیں پیا۔ اگر حسینؑ بھوکے تھے تو وہ بھی گرسنہ رہے۔ اگر حسینؑ نے اپنی آنکھوں سے اپنی اولاد کو خون میں نہاتے دیکھا تو انھوں نے بھی اپنے بچوں کا سر سردار جوانان جنت کے قدموں پر نچھاور کیا، اگر حسینؑ کے گلوئے مبارک کے بوسے خنجر شمر نے لئے تو ان کی شہ رگ حیات بھی حسینؑ کی الفت میں کاٹی گئی۔ اگر حسینؑ کے اہل حرم بے پردہ ہوئے تو ان کی بی بیاں بھی سر برہنہ تشہیر ہوئیں اگر حسینؑ کا سر کوچہ بکوچہ اور دیار بدیار پھرایا گیا تو ان

کے سروں کا قافلہ بھی عقب میں رواں تھا۔ اور آج بھی سیکڑوں سال گذرنے کے بعد جس روضۂ اقدس میں سیدالشہداءؑ آرام کر رہے ہیں وہیں امامؑ کے پیروں سے لگے ہوئے کربلا کے حسینی بھی محوخواب ہیں اور کل جب عرصۂ محشر گرم ہوگا اس وقت بھی یہ تشنہ کام حسینؑ ابن علیؑ کے ساتھ ساتھ اپنی قبر سے کوثر تک اور کوثر سے جنت تک جائیں گے اپنا مکان بھی خلد بریں میں قصر حسینی کے پہلو بہ پہلو بنائیں گے ''حسینؑ ہم آپ کے ساتھ ہیں'' کتنا اٹل فیصلہ تھا جس کو نہ زمانہ کی برش کاٹ سکی نہ ظلم کے پہاڑ کچل سکے اس فیصلہ کی سختی نے طوفان بلا کے دھاروں کا رُخ پلٹ دیا۔ ظلم وستم کے پہاڑوں کو چکنا چور کر دیا اور اپنی بات نہ بدلی۔

اب آئیے ہم خود کو بھی حسینی کہتے ہیں۔ بلکہ جب زیارت کو جاتے ہیں تو ضریح حضرت سیدالشہداءؑ وابوالفضل العباسؑ کے سامنے یہ اقرار کرتے ہیں: ''اَلْمُقِرُّ بِالرِّقِّ وَالتَّارِكُ لِلْخِلَافِ عَلَيْكُمْ فَمَعَكُمْ مَعَكُمْ لَا مَعَ عَدُوِّكُمْ'' (میں اپنی غلامی کا اور آپ کی مخالفت سے روگردانی کا اقرار کرتا ہوں میں آپ کے ساتھ ہوں، آپ کے ساتھ ہوں نہ کہ آپ کے دشمنوں کے ساتھ) یہ تھا دعویٰ لیکن بوقت موازنۂ قول وعمل اگر یہ حسرت ناک تقابل سامنے آجائے کہ:

(۱) حسینؑ صرف اللہ سے ڈرتے تھے
اور ہم صرف خدا ہی سے نہ ڈریں اور سب سے ڈریں۔

(۲) حسینؑ نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کو شکست دی
اور ہم خلعت حیات کی دھجّیاں اڑا رہے ہیں تا کہ جلد از جلد ہلاکت ابدی سے ہمکنار ہو جائیں۔

(۳) حسینؑ نے اپنے عزم واستقلال سے باطل کی طاقتوں کو کچل کے رکھ دیا
اور ہم کو ہماری پست ہمتی کے باعث باطل کی طاقتیں کچل رہی ہیں۔

(۴) حسینؑ نے اپنے لہو سے شجر اسلام کو سینچا

اور ہم اس ہرے بھرے باغ کو پائمال کررہے ہیں۔

(۵) حسینؑ نے تادم آخر کسی امر واجب کو ترک نہ کیا

اور ہم نے واجبات کو تین طلاقیں دیں۔

(۶) حسینؑ نے ہمیشہ اول وقت نماز پڑھی

اور ہم آخر وقت پڑھنا اپنا شعار بنالیں۔

(۷) حسینؑ یاد معبود کو اپنے سینہ سے لگائے دنیا سے سدھارے

اور ہمارا سینہ ہمہ وقت شیطانی خیالات کی آماجگاہ۔

(۸) حسینؑ کے خیمہ میں تسبیح وتہلیل کی آوازیں ہوں

اور ہمارے کاشانوں میں نغمہ وسرور کی صدائیں۔

(۹) حسینؑ کے لب تادم آخر ذکر الٰہی میں تر رہیں

اور ہمارے لبوں پر فتنہ انگیز ترنم، کذب، غیبت۔

(۱۰) حسینؑ کی آنکھیں سطور قرآنی کا طواف کریں

اور ہماری آنکھیں جلوہ ہائے پر معصیت کی متلاشی۔

اگر آج کا حسینی ایسا ہے تو ------------- ع

فریاد بر غریبی و بے یاری حسینؑ

حضرت امام حسینؑ کی تقریریں

مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی

جدید ریڈیو کے ذریعہ تمام دنیا کی آوازیں، تقریریں، گانے، باجے ہر شخص اپنے گھر میں ریڈیو مشین میں سنا کرتا ہے۔ یہ آوازیں فضا کے اندر برقی لہروں میں پوشیدہ رہتی ہیں۔ اور برقی کشش سے تاروں کے ذریعہ ان کو مشین کے اندر کھینچ لیا جاتا ہے۔ مگر میں قدیمی وباطنی ریڈیو کے ذریعہ اپنی سماعت کو فضا کے اس انتہائی مقام پر لے جاتا ہوں۔ جہاں گزشتہ زمانہ کے پیغمبروں اوتاروں بادشاہوں، سپہ سالاروں اور بڑے بڑے مقرروں کی آوازیں اسی طرح قائم وموجود ہیں۔ جس طرح انسانی حلق کے باہر نکلی تھیں میں نے اپنی سماعت کے لئے ان سب آوازوں میں مظلوم کربلا حسینؑ ابن رسولؐ اللہ کی آواز کو تلاش کیا۔ اور وہ مجھے بڑی جستجو کے بعد مل گئی۔ اور میں نے حضرت کی عربی تقریروں کو بہت توجہ سے سنا اور اردو زبان میں ان کا ترجمہ کرکے یہاں لکھ دیا۔

پہلی تقریر:

یزید کی تخت نشینی کے بعد ایک رات کو حضرت امام حسینؑ نے بنی ہاشم اور دوسرے قبیلوں کے بڑے بڑے سرداروں کے سامنے ایک تقریر کی اور فرمایا: تم نے اور تمہارے بزرگوں نے چند سال کے اندر رومیوں اور ایرانیوں کی دو بڑی بڑی حکومتیں فتح کرلیں۔ حالانکہ تمہارے پاس اتنی بڑی بڑی سلطنتوں کو مغلوب کرنے کا سامان نہ تھا۔ مگر میرے نانا کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی مدد نے تم کو سب پر غالب کردیا۔ اور آج تم دنیا کے ایک بڑے حصہ کے حکمران ہو۔ مگر اب میں دیکھتا ہوں کہ تم سب عیش وآرام میں پڑ گئے ہو اور دولت کی محبت نے جو تمہارے پاس چاروں طرف کے

ملکوں سے کھنچی ہوئی چلی آتی ہے۔تم کو آرام طلب بنا دیا ہے اسی واسطے خدا نے تم پر ایک ایسے جابر اور احکام اسلام سے بے پرواہ آدمی کو حاکم بنا دیا ہے، جو کسی لحاظ سے بھی مسلمانوں کا بادشاہ بننے کا مستحق نہیں ہے۔اور علانیہ شراب پینے والا یزید ہے۔

آج میں تم کو جگاتا ہوں کہ تمہاری ارواح کو آسائش اور عیش کے اسباب نے خفتہ کر دیا ہے۔اگر تم اتنی جلدی سو گئے، تو میرے نانا کا دین اسلام دنیا میں پھیل نہ سکے گا۔اور انسانوں کی انسانیت ناقص رہ جائے گی۔پس تم کو بیدار ہونا چاہئے تاکہ میرے نانا کی امت قیامت تک بیدار رہ سکے۔ اور یزید کا حاکمانہ اثر ان کو اسلام کی اعلیٰ تعلیم سے بے پرواہ نہ کر دے۔

دوسری تقریر:

کوفہ جانے سے پہلے ایک جلسہ میں یہ تقریر فرمائی: میرے والد نے فرمایا تھا پہاڑوں کا توڑنا آسان ہے۔مگر ترقی کرنے والی طاقتور سلطنت کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔البتہ اگر اس سلطنت کا حاکم غیر مستحق اور ظالم ہو تو اللہ پر بھروسہ کرنے والے اور صبر کرنے پر بڑی اور مضبوط سلطنت کو مغلوب کر سکتے ہیں۔

اور یہ بھی فرمایا تھا کہ غیر مستحق اور ظالم کی حکومت کو قبول کرنے سے بہتر ہے کہ انسان مر جائے۔ اور یہ بھی فرمایا تھا کہ موت اس محکوم کے لئے سب سے بڑی راحت ہے۔جو ظالم اور غیر مستحق حاکم کی رعیت بننا نہ چاہتا ہو۔اور یہ بھی فرمایا تھا کہ جابر اور ظالم بادشاہوں کی حکومت کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔اور یہ بھی فرمایا تھا کہ چار چیزیں اگر تھوڑی بھی ہوں تب بھی وہ بہت ہیں۔آگ اور دشمنی اور بیماری اور مفلسی اور یہ بھی فرمایا تھا کہ غیر مستحق اور نالائق لوگوں کا بادشاہ بن جانا تمام ملک اور تمام رعایا کی تباہی اور بربادی کا باعث ہو جاتا ہے۔اور یہ بھی فرمایا تھا کہ جس نے اللہ سے خیانت کی اس نے ہر چیز سے خیانت کی۔پس میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ان سب باتوں پر غور کر کے یزید کی اطاعت کے بارے میں مجھے مشورہ دو۔

تیسری تقریر:

سفر کربلا سے پہلے ایک جلسہ میں یہ تقریر فرمائی: میں پہلے ایک موقعہ پر کہہ چکا ہوں کہ دولت کی کثرت نے مسلمانوں کو آرام طلب بنا دیا ہے۔اور ان کے دل اور ان کے ارادے اسلام کی ترقی کے جذبے سے غافل ہو گئے ہیں میں جانتا ہوں کہ میرے باپ کے ہاتھوں سے اسلام کے دشمن کے بہت سے سر کٹ چکے ہیں۔اور آج ان دشمنوں کی اولاد سلطنت پر قابض ہو گئی ہے۔اور میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔لیکن مجھ کو رسول اللہ نے اپنے کندھوں پر اٹھایا ہے۔اور میرے منہ میں اپنی زبان ڈالی ہے اس واسطے میں اپنے اندر آسمانی طاقت اور برکت پاتا ہوں۔اور اس برکت کا تقاضا ہے کہ میں باطل کے آگے سر نہ جھکاؤں۔اور اپنی اور اپنے ساتھیوں کی حق کی قربان گاہ میں قربانی دے دوں۔اور مسلمانوں سے موجودہ غفلت اور عیش پرستی دور ہو جائے۔میرا مرنا پوری امت کو قیامت تک کے لئے زندہ کر دے گا۔اس واسطے میں کوفہ جانا ضروری سمجھتا ہوں۔

سیاست حسینیہ کی اہم منزل

مولانا سید اکبر مہدی سلیم جرولی، بہرائچ

کربلا کے صحیح واقعات کو متقدمین نے خلاصہ کے طور پر سیر و اخبار میں جس طرح تحریر کیا ہے باعتبار حجم زیادہ ضخیم نہیں، لیکن اس واقعہ میں سب سے زیادہ عبرت ناک اور حیرت انگیز ہونے کے علاوہ یہ معجزہ حقانیت وصداقت ہے کہ تبصرہ کرنے والوں نے ہر زبان میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے، مجلدات ضخیم تالیف ہوگئیں پھر بھی واقعہ اپنے مقام پر تشنہ ہے اور قیامت تک اس کے انکشافات اہل قلم کو موقع دیتے رہیں گے، منجملہ حسینی کارناموں کے جو اہم بات نظر آتی ہے وہ بجائے خود ایک خاص باب ہے۔ جس کے متعلق نہ حضرات مولفین سیرت و تاریخ کو اس طرف رجحان ہوا نہ حضرات واعظین کرام و مقررین کو توجہ ہوئی۔ یادگار حسینی کے سلسلہ میں بکثرت تقریریں سنیں اور مضامین دیکھے۔ محرم نمبر کے مجلدات کا مطالعہ کیا ہر موضوع پر مختلف رنگ سے مضمون نگاری کی گئی اور اپنوں کا ذکر نہیں، اغیار نے حق ادا کیا، مگر یہ ناچیز جس مخصوص منزل سے گزرنا چاہتا ہے بلکہ صاحبان قلم اور اہل زبان کو توجہ دلانا چاہتا ہے وہ ابتدائی منزل کا اہم واقعہ ہے اور اپنی نوعیت میں وہ فرد ہے۔

عشرۂ محرم میں ہر سال کسی مجلس میں محض اس نظر سے کہ دردانگیز اور گریہ خیز ہونے کے اعتبار سے نہایت موثر ہے کبھی کوئی ذاکر پڑھ دیتا ہے اور سامعین تھوڑی دیر کے لئے آنسو بہا کر آوازیں بلند کر کے سبکدوش ہوجاتے ہیں، کبھی اس کی اہمیت کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

میں نے خوب جانچ لیا اور ہر پہلو پر غور کیا اور پے در پے تجربہ بھی حاصل ہوا کہ حقیقی معنوں میں نائب امام، سفیر شہید اعظمؑ، غریب کوفہ، اشجع بنی ہاشم، معتمد اہلبیت جناب مسلمؑ بن عقیلؑ کی ذات منتخب ذات تھی اور آپ کے واقعات کے سلسلہ میں جو اہمیت نظر آتی ہے وہ صرف رو دینے کی محتاج

نہیں، بلکہ مجمع حالات وصفات ذاتیہ ایک مستقل یادگار قائم کرنے کی مستحق ہے۔

افسوس نہ قوم کو توجہ دلائی گئی نہ اس کی ہمت پیدا ہوئی۔ ہم دیکھتے ہیں آج ہندوستان میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں شبیہ کربلا اور دیگر روضۂ مبارک کی نقلیں تعمیر ہوئیں، پسران مسلمؑ کا روضہ بعض مقامات پر موجود ہے، مگر جناب مسلمؑ کے نام سے کوئی روضہ ہندوستان میں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے کسی صاحب ہمت کے ہاتھوں سے اس کا وجود قائم ہو مگر وہ شاذ ہے۔ عراق میں جو اصل روضۂ منورہ ہے وہ بھی قوم کی بے اعتباری کا مرقعہ ہے۔ حضرت افضل الشہداء ابوالفضل العباسؑ کی وفا، علونفس، شجاعت مواسات نے دنیا میں اپنی یادگار قائم کرائی، نذر و نیاز، سبیل، ہر تعزیہ کے ساتھ ساتھ علم جزو عزائے سیدالشہداء سمجھا جاتا ہے، بیشک سقائے حرمؑ کے صفات اس سے بالاتر اظہار خلوص کے سزاوار ہیں مگر مظلوم کا سفیرؑ، صفات امامت کا نمائندہ منجانب اللہ ایسے جوہر لیکر خلق ہوا کہ خود امامؑ کے قلم سے ثقتی من اھلبیتی کا خطاب عطا ہوا۔

اس ذرہ بے مقدار کو اس درگاہ سے جو فیوض و برکات حاصل ہوئے وہ مجبور کرتے ہیں کہ قوم کے سامنے پیش کروں اور اپنے حق سے سبکدوش ہوں۔

ہر وہ شخص جو اولاد نرینہ سے محروم ہو، رجوع کر کے آزمالے انشاء اللہ اس معاوضہ میں کہ اس شیدائے حسینی نے عالم غربت میں سخت مصائب برداشت کر کے اپنی نسل کو امامؑ پر تصدق کر دیا۔ اس کے واسطے سے دعا کرنا اس امر خاص میں مقبول ایزدی ہے، قادر مطلق اس کو ضرور فرزند عطا فرمائے گا اور سلامت رہے گا۔ بخلوص خدا سے عہد کیجئے کہ اگر فرزند پیدا ہوگا تو مسلم نام رکھیں گے اور بحد امکان روز شہادت ۹ ذی الحجہ کو جناب مسلم کی مجلسیں برپا کریں گے اور مساکین و مومنین کو کھانا کھلائیں گے اور ہمیشہ اطعام کرتے رہیں گے جس کا جیسا امکان ہو اس طرح انجام دے، میرا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ کبھی یہ عمل خالی نہیں گیا، خلوص شرط ہے۔ سال گذشتہ کا ذکر ہے کہ مولوی میر وزیر علی صاحب محمود آبادی جناب مولانا سلطان علی صاحب واعظ کے بھائی نے یہ نذر کی آپ کے

چار بھائی تھے اوران میں کسی کے اولاد نرینہ نہیں ہوئے مگر الحمدللہ اس نذر کی برکت سے وزیر علی
صاحب کے یہاں فرزند پیدا ہوا، مسلم رضا نام رکھا اور اپنا عہد پورا کیا ماشاء اللہ تندرست و سالم
موجود ہے مجھے یہ کس نے بتایا۔ یہ معاملہ صیغہ راز میں ہے مگر اس کا ثبوت ماشاء اللہ محمد مسلم مہدی
سلمہٗ صحت یاب ہو کر میرے اعتقادات کی تائید کر رہا ہے۔

بہر حال یہ تو عقیدت ہے واقعہ مذکورہ پر تبصرہ اس قسط میں تمام نہیں ہو سکتا انشاء اللہ آئندہ اقساط
میں پیش کروں گا۔

پہلی قسط حضرت مسلمؑ کا انتخاب

واقعہ نگاری مقصود نہیں، اس کا محل ہے کہ اپنے موضوع کے ثبوت میں تفصیل پیش کروں لیکن
واقعہ کے متعلقہ حالات کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

اہل کوفہ کے نامہ و پیام کے بعد فرزند رسولؐ نے طے کر لیا کہ مسلم بن عقیل علیہ السلام میرے
چچازاد بھائی میرا خط لے کر بطور سفارت و نیابت کوفہ جائیں، خاندان بنی ہاشم بالخصوص اپنے
بھائیوں میں مسلمؑ کا انتخاب علم امامت کی حکیمانہ فراست ایک ایسا مسئلہ ہے کہ ایک طرف حسن
انتخاب سے شان امامت کا اندازہ ہوتا ہے، دوسری طرف مسلمؑ کی علو مرتبت کا پتہ چلتا ہے۔ قابل
توجہ یہ مسئلہ ہے کہ جناب مسلم محض نامہ بر نہیں تھے بلکہ صفات حسینیؑ اور کمالات امامت کے نمائندہ
بن کر اہم ذمہ داریوں کا بوجھ لے کر کوفہ جا رہے ہیں اور تنہا جا رہے ہیں۔ کوئی لشکر، کوئی معاون ساتھ
نہیں، خط میں جن الفاظ سے اہل کوفہ کو پہنچوایا گیا ان سے بلند کر دیا **انا باعث الیکم اخی
ثقتی من اھل بیتی مسلم بن عقیل**۔ (اہل کوفہ سے خطاب ہے) میں تمہاری طرف اپنے
بھائی، چچا کے فرزند اپنے اہلبیت میں معتمد مسلمؑ کو بھیجتا ہوں، اس عبارت کا لفظ لفظ جناب مسلمؑ کی
بندگی اور رفعت شان کی سند ہے۔ ابن عم کہنا کافی تھا، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ چچازاد بیٹا بھائی ہوا
کرتا ہے مگر اس کے بعد اخی کا اضافہ زور پیدا کرتا ہے جس سے حقوق برادری و مواسات کی ذمہ

داری دوبالا ہوگئی اس کے بعد ثقتی من اھل بیتی میں بھی صرف ثقتی کافی تھا امامؑ کا مؤثق و معتمد ہونا
کیا کم تھا، اس کے بعد من اھل بیتی غیر محدود فضیلت کی شرح ہے۔ جس کو اہل معرفت سمجھ سکتے
ہیں بقول مولوی نذیر احمد مترجم قرآن نہیں، جو اہلبیت کا ترجمہ گھر والے کرتے ہیں، بلکہ اہل بیت
ان معنوں میں جس کو صاحب تفسیر کشاف و درمنثور نے تسلیم کیا ہے، یعنی علیؑ و فاطمہؑ، حسنؑ و حسینؑ پر
اہلبیتؑ کا انحصار ہے۔

اس کے بعد احادیث معتبرہ نے اس دائرہ کو اور وسیع کیا، اور ذریت طاہرہؑ اہلبیت کا اطلاق ہوا
اس محل پر منصوص من اللہ امام جناب مسلمؑ کو اس مخصوص و محدود گروہ میں شامل فرما کر وہ سند عطا فرمایا
ہے جو آپ کے پدر بزرگوار عقیل کو بھی میسر نہ ہوئی۔

بہر حال یہ اسناد خطابات مخصوصہ پا کر مسلمؑ روانہ ہوتے ہیں، راہ میں صیاد کا آہو ذبحہ کرنا دیکھ کر
رسم و رواج بدشگنی سمجھ کے واپس ہوتے ہیں، ہر مؤرخ نے اس واقعہ کو لکھا ہے، مگر تشنہ چھوڑا ہے جس
سے فی الجملہ مسلمؑ کے دامن شجاعت پر بدنما داغ کا دھوکہ ہوتا ہے، معاذ اللہ مسلمؑ ایسا بہادر اپنی جان
کے خوف سے پلٹ آئے؟ محال ہے۔ جناب مسلمؑ نے خود امامؑ کی خدمت میں پہنچ کر اس کی توضیح
کر دی ہے، مولا! میں اپنی جان بچانے کے لئے نہیں بلکہ اس مقصد کے لئے فال بد سمجھتا جس پر
میں مامور ہوا ہوں فرمایا ہم اہلبیتؑ بدشگونی کا خیال نہیں کرتے۔ مطلب یہ تھا کہ تمہارا بھی اہلبیتؑ
میں شمار ہے یہ توہمات ترک کرو۔ یہ فرما کر سینہ سے لگا لیا اور پھر رخصت فرمایا، مسلمؑ کا سینہ گنجینہ الٰہیہ
سے مس ہونا تھا کہ دوسری شان پیدا ہوگئی۔

اس مرتبہ تاریخ کا سلسلہ بتلاتا ہے کہ آپ پہلے مدینہ تشریف لے گئے، حالانکہ براہ راست کوفہ
جانا ممکن تھا مگر مدینہ آنا لازم سمجھے، وطن پہنچ کر قبر رسولؐ کی زیارت کی اور دو بچوں کو ساتھ لیا، بچوں کو
بمقتضائے فطرت پدری محفوظ مقام پر چھوڑنا مناسب تھا مگر باوجود خطرات سفر و حالات کوفہ پیش نظر
ہونے کے مقصد اصلی کچھ اور بھی تھا۔ آپ کا یہ فعل اس بات کو بھی واضح کر رہا ہے کہ بدشگونی سمجھ کر راہ

سے پلٹنا خوف جان سے نہ تھا، ورنہ بچوں کو ہرگز جان بوجھ کر خطرہ میں نہ ڈالتے۔ اس مقام پر دامن تاریخ تاریک نظر آتا ہے لیکن واقعات کربلا کے محل پر مؤرخین کا اتفاق ہے کہ آپ کی زوجہ اور دو فرزند کربلا میں موجود تھے۔ یہ دونوں یتیم بچے کربلا میں امامؑ کی رفاقت میں شہید ہوئے۔ یہ سلسلہ دلیل ہے کہ جناب مسلمؑ نے زوجہ کو امامؑ کی خدمت میں روانہ کردیا کہ یہ بھی جناب زینب اور ام کلثوم کے ساتھ ہر مصیبت جھیلنے میں شریک رہیں اور شہدائے کربلا کی فہرست میں بھی بچوں کی وجہ سے میرا نام روشن رہے۔ اور میں اپنی نسل کو خدا کی راہ اور رفاقت امام میں قطع کرکے درگاہ رب العزت سے مستجاب الدعوات کا مرتبہ حاصل کروں۔

کوفہ میں بیعت امام علیہ السلام

تمام مورخین متفق ہیں کہ جناب مسلمؑ کے کوفہ پہنچنے کے بعد خلقت کا ہجوم ہوا، اور جناب مسلمؑ کے ہاتھ پر بیعت امام حسین علیہ السلام کا سلسلہ شروع ہوا یہاں تک اٹھارہ ہزار کوفیوں نے بیعت کی اس حیثیت سے نائب امامؑ کا خطاب صحیح معنوں میں جناب مسلمؑ کے لئے مخصوص ہے اور یہ شرف شہدائے کربلاؑ میں کسی کو حاصل نہ ہوا۔ سچ ہے: ہر کارے و ہر مردے۔

ان مخصوص مراتب جلیلہ حاصل ہونے کے بعد اگر کوئی مخصوص یادگار قائم نہ ہو تو ہماری بے حسی کا نمونہ ہے۔

شان امامت کی نمائندگی

جس طرح ہر رسولؐ کا وصی صفات نبوت کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح اس بزرگ نے ہر صفت کی سفارت و نیابت کا فرض ادا کیا۔ امامؑ میں غیرت وحمیت ایک ایسی صفت ہے کہ جزو عصمت سمجھی جاتی ہے۔ اس حد تک ان اوصاف کا منتہی ہونا درجۂ عصمت سے تعلق رکھتا ہے، مگر بحیثیت ایک نمونہ کے اس صفت میں جناب مسلمؑ فرد ہیں۔

ابن زیاد کے داخل کوفہ ہونے کے بعد کوفہ کی فضا مخالف ہوگئی۔ ذرہ ذرہ دشمن نظر آنے لگا۔ اور

ہانیؓ کے گھر میں جائے پناہ مفقود ہوگئی، اس دوران آپ نے غیرت امامؑ کی شان دکھلائی۔ مؤرخین لکھتے ہیں ابن زیاد نے ہانیؓ کو موافق بنانے کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ خود عیادت کے حیلے سے ہانیؓ کے یہاں آیا، پہلے سے خبر پا کر ہانیؓ نے یہ خبر جناب مسلمؑ کو دیا تھا کہ آپ پشت دروازہ مخفی ہو جائیں اور جب ابن زیاد یہاں بیٹھ کر مطمئن ہو جائے اس کو قتل کردیں، لیکن جب ابن زیاد آیا، آپ مخفی ہوئے مگر اس مشورہ پر عمل نہ فرمایا کہ آسانی سے دشمن خاندان رسالت کا خاتمہ کردیں۔ ابن زیاد کے چلے جانے کے بعد شریک بن اعور ہانیؓ کے ایک مہمان خاص نے تعجب سے کہا کہ اے مسلمؑ! تم نے یہ کیا غضب کیا کہ دشمن کو ہاتھ سے دے دیا۔ آپ نے جواب میں فرمایا: ایک تو ہانیؓ کے گھر کی بے حرمتی ہوتی، دوسرے تم نے یہ حدیث نہیں سنی ہے ’’کہ کسی کو دھوکہ دے کر اچانک مار ڈالنا اہل ایمان کا شیوا نہیں۔ ملاحظہ ہو یہ تھی غیرت ایمانی حضرت مسلمؑ کی!!

پھر دوسرا منظر مبادرانہ عبرت کا طوّعہ کا گھر ہے۔ جب صبح ہوتے ہوتے طوعہ کا گھر لشکر ابن زیاد سے گھر گیا، آپ نے صرف یہ آخری رات اس مومنہ کے یہاں بسر کی تھی۔ یہ معلوم ہوا کہ فوج گھر کو گھیرے ہوئے ہے خود بعد نماز مسلح ہو کر آمادہ مرگ ہوئے، طوعہ سے کہا دروازہ کھول دے میں باہر نکل جاؤں اور فوج سے سمجھ لوں۔

اس غریب نے کہا کہ لشکر گھر کو گھیرے ہے کہاں جائے گا، فرمایا میں تیرے گھر کی بے حرمتی نہیں چاہتا کہ فوج کے سپاہی میرے قتل کے لئے یہاں گھس آئیں۔ ملاحظہ ہو یہ دوسرا موقع حمیت وغیرت کا ہے۔ دنیا میں کوئی ہستی ہے جو ایسے نازک وقت میں محل حفاظت کو اس لئے چھوڑ دے کہ میزبان کے گھر کی بے حرمتی اور توہین ہوگی۔ تاریخی صفحات اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

شجاعت امامت کی سفارت

تن تنہا ایک غریب مسافر کی گرفتاری کے لئے محمد ابن اشعث کی سرداری میں تین سو جوان مسلح آئے مگر گرفتار نہ کرسکے، پھر پانچ سو اور آئے مگر وہ بھی کافی نہ ہو سکے اور سیکڑوں کو مار کر جناب مسلمؑ

نے لاشوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ محمد ابن اشعث نے ابن زیاد سے اور کمک طلب کی۔ اس نے کہلا بھیجا: شرم نہیں آتی، ایک متنفس کے مقابلہ میں اتنی سپاہ قابو نہ پاسکی؟ محمد بن اشعث نے جواب دیا کہہ دوابن زیاد سے کسی بقال سے مقابلہ نہیں ہے، یہ شیر بنی ہاشم کی جان ہے، پھر کچھ فوج اور آئی، جب ان کو دھوکہ دے کر غار میں گرا کر گرفتاری پر قادر ہوئے۔

ثبات قدم اور بیعت پر استقلال

واقعہ کربلا کی بنیاد فاسق وفاجر کی بیعت سے انکار ہے، اس غرض کی پوری نمائندگی اس غریب سفیر نے کی، دوران جنگ میں جب آپ پر کثرت سپاہ سے قابو نہ چلا تو سردار فوج ابن اشعث نے پکار کر کہا: ابن العقیل لك الامان آپ نے بگڑ کر فرمایا: باللہ لا یبایع فاسق حتی تذوق الموت۔ میں مرتے دم تک فاسق وفاجر کی بیعت نہ کروں گا۔ دراصل یہ حق سفارت تھا جس کے لئے حضرت نے جناب مسلمؑ کو سفیر بنا کے بھیجا تھا، اس کو اس شان سے جناب مسلم نے انجام دیا کہ قیامت تک صفحۂ ہستی پر حسینؑ کے سفیرؑ کا نام رہے گا۔

قدرت کی طرف سے بھی ایسا سامان مہیا ہوا کہ امامؑ کی متابعت پوری ہوگئی، زخمی ہونے کی حالت میں پیاس کا غلبہ ہوا، ایک شخص نے رحم کر کے پانی دیا ہے مگر لب ودندان کے خون سے جام آب لبریز ہوگیا، آپ نے پانی پھینک دیا اور تا دم مرگ پیاسے رہے۔ یہ تشنگی امامؑ کا مظاہرہ تھا، مرنے کے بعد تیسرے روز سفیرؑ کو قبر میسر ہوئی جس طرح امام حسینؑ کو تین روز کے بعد بنی اسد نے دفن کیا۔

یہ تھے جناب مسلمؑ کے منتخب خصوصیات، جس سے علو مرتبت اور ادائے مواسات وحقوق وفرائض کا پتہ چلتا ہے، ایسی مہتم بالشان ہستی پر فقط آنسوؤں سے رو لینا یا آہ سرد بھر کر فراموش کر دینا بڑی ناقدری ہے، جس قدر عظیم الشان یادگار آپ کی قائم ہو کم ہے، قوم پر بالعموم لازم ہے کہ شہید ضرب، معتمد اہلبیتؑ، حسین کے وفادار بھائی کا اسی طرح غم کے ساتھ مظاہرہ کرے جس طرح شہدائے کربلاؑ

کی عزاداری حسب مقدرت ادا کی جاتی ہے۔ شیعی اخبار ورسائل سے توقع ہے کہ اس کی ترویج میں سعی کریں گے۔

کاش کسی اہل دول کو اور صاحب ہمت ومعرفت کو توفیق عطا ہو کہ ایک شایان شان درگاہ بنوادے جس کی زیارت سے جناب مسلمؑ کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اور نہ جاننے والے معرفت حاصل کریں۔ تمہید میں کم ترین نے حصول اولاد کے لئے جو ترغیب دلائی ہے جس متمنی اولاد کی منت پوری ہو مجھے بذریعہ کارڈ اطلاع فرمائیں۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ، لکھنؤ، اکتوبر ونومبر ۱۹۴۴ء)

محرم اور امام حسینؑ

عاشق اہلبیتؑ مولانا عینی شاہ نظامی صاحب

محرم میں ہوا کیا؟

مجھے کیا کسی اور کو بھی باور نہ ہوگا کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی ایسا ہوگا جس کو محرم میں کیا ہوا معلوم نہ ہو۔ یہودی ہوں کہ عیسائی، مسلمان ہوں کہ ہندو، جین ہوں کہ پارسی، یورپی ہوں کہ ایشیائی، جانتے سب ہیں کہ محرم ایک حزنیہ مہینہ ہے۔ مگر کسی کو اس کے اسباب وعلل معلوم ہیں اور کسی کو نہیں، کوئی واقعات ونتائج سے واقف ہے اور کوئی نہیں، کوئی تفصیل سے آگاہ اور کوئی اجمال سے مطلع، کوئی اس حزنیہ کے سارے خط وخال ایک ایک کر کے گنوائے دیتا ہے اور کوئی اختصار کی حد تک جانتا ہے۔ خصوصاً ہندوستان بھر میں کم وبیش ہر قوم وملت کا فرد محرم سے آگاہ اور محرم میں کیا ہوا اس سے واقف ہے۔ ادھر ہلال محرم نظر آیا ادھر خنجر کربلا آنکھوں میں پھر گیا۔ بستی سونی ہوگئی، چہل پہل گئی گزری۔ شہروں پر اداسی چھا گئی، قصبوں پر بیکسی سی طاری ہوگئی۔ آبادیاں سنسان دکھائی دینے لگیں اور مسرتیں ماند پڑ گئیں۔ ہر وہ ہندوستانی انسان جس کے پہلو میں دل اور دل میں درد اور درد میں تاثیر ہو چاند کے دیکھتے دیکھتے محرم کو یاد کرتا ہے اور یاد کے ساتھ رو پڑتا ہے۔ اور چاند دیکھتا تو ہے مگر ڈبڈبائی آنکھوں سے۔ آخر یہ کیوں؟

ہندوستان جب تک مسلمانوں کا رہا اور مسلمان ہندوستان کے براجمان رہے، توپوں کی سلامیوں سے نقاروں کی گونج سے اور شہنائی کی مسرت بیز صداؤں سے بلکہ مبارک سلامت کی خوش آمدید سے ہر نئے چاند کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ مگر جہاں اسلامی سال نو کا چاند نظر آیا کہ اسلامی ہندوستان پر ایک عالمگیر غم والم کی گھٹا چھا گئی اور ہر طرف اداسی ہی اداسی پھیل گئی۔ توپیں سر ہوتی تو

تھیں مگر اظہار غم کے انداز میں، وقفہ وقفہ سے شہنائیاں بجتی تو تھیں مگر سوز کے سروں میں اور نقارے بجتے تو تھے مگر ماتمی رنگ میں بلکہ مبارک سلامت کے بجائے ''امام مدد'' کی صدائیں سنی جاتی تھیں۔

وہ گھر جہاں رونا دھونا نحس سمجھا جاتا تھا اس محرم کے چاند پر گریہ گھر بن گئے۔ وہ محل جہاں گریہ وزاری کو شگون بد سمجھا جاتا تھا، آج گریہ وزاری کے مرکز بنے ہوئے نظر آرہے ہیں، ان مکانوں میں جہاں رونے کو برا متصور کیا جاتا تھا آج اس چاند کی وجہ سے صف ماتم بچھائی جاتی ہے۔ ہنسی کی آواز پر ٹوکا جاتا ہے۔ مسرت کے اظہار کو ناگوار سمجھا جاتا ہے اور خوشی اور شادمانیوں کو ناجائز کہا جاتا ہے۔ جہاں کل تک پنج وقتہ نوبت بجا کرتی تھی آج ان ڈیوڑھیوں پر سوزخوانیاں سنی جاتی ہیں۔ امیر ہوں کہ فقیر، حاکم ہوں کہ محکوم، تاجر ہوں کہ اہل حرفہ مسلمان اگر ہیں اور اصلی مسلمان ہیں تو سب کے سب کسی کی یاد میں چشم نم اور کسی کے خیال میں مغموم نظر آتے ہیں۔ سچے فدائی بزم ماتم بچھائے اور مجالس عزا مل جائے، صبح ہو کہ شام، ہر وقت مصروف آہ وبکا رہتے اور ہر گھنٹہ ہائے وائے کیا کرتے ہیں۔ علماء مسجدوں میں امراء اپنے دیوان خانوں میں اور فقراء اپنی خانقاہوں میں کسی مظلوم کی یاد میں روتے رلاتے ہائے وائے کرتے محرم گزارا کرتے ہیں۔ مسلمان مسلمان اگر ہیں تو ان کے دل سوز وگداز، ان کی آنکھیں وقف گریہ اور ان کی زبانیں وقف ذکر اور وہ سرتاپا مغموم اور ملول۔ یہ ہیں مسلمان اور یہ ہے مسلمانوں کا محرم۔ آخر محرم میں ہوا کیا؟

محرم میں ہوا کیا؟ سننا ہو تو جگر تھام کے بیٹھو اور سنو۔ دنیا کے سب سے بڑے محسن، سب سے بڑے ہمدرد، سب سے بڑے پیشوا اور سب سے بڑے اللہ والے کا بھرا گھرا اجڑ گیا۔ ہرا بھرا باغ ویران ہوگیا۔ خاندان کا خاندان مٹا دیا گیا۔ خانماں برباد کر دیا گیا۔ کنبہ کا کنبہ تہہ تیغ کر دیا گیا۔ پرایوں نے نہیں اپنوں نے دعوت دی، ایک کنبہ والے کو بلوایا جنگل میں گھیر لیا۔ فاقوں سے رکھا۔ بوند پانی کو ترسایا۔ اس کنبے کے جوانوں کو نیزے سے گھائل کیا، بچوں اور شیر خواروں کو تیروں کا نشانہ بنایا۔ بوڑھوں اور بزرگوں کو قتل کیا۔ ان کی لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔ مٹی دینے کے بجائے

انہیں روند دیا۔ ان کے خیمے لوٹے، ان کے سامان چھینے، ان کے زیورات ار لئے، ان کی عورتوں کی چادریں چھینیں اور انہیں رسن بستہ کر کے در بدر پھرایا۔ شہر شہر لئے پھرے اور تین مہینے تک ان بیکسوں اور مظلوموں پر وہ ستم توڑے جو زمانے کے کان نے کبھی نہ سنے ہوں گے۔ یہ سب ظلم وستم ہوئے تو صحیح مگر ہوئے کس پر؟ یہ جفائیں کی گئیں تو کس پر؟ خیمے لوٹے تو کس کے؟ زیور اُتارے تو کن عورتوں کے؟ تیروں سے چھلنی کیا تو کس کو؟ تلواروں کے گھاٹ اتارا تو کن کو؟ پانی سے ترسایا تو کس کو؟ فاقے سے رکھا تھا تو کس کو؟ نوجوانوں کو تہہ تیغ کیا تھا تو کس کے؟ آخر وہ کون تھا جس پر اور جس کے خاندان پر اتنے ناگفتہ بہ مظالم کے پہاڑ توڑے گئے؟

سنو! یہ اسی ہستی کی داستان ہے جو اس زمین پر اور اس آسمان کے نیچے سب سے بڑا مظلوم، سب سے بڑا بیکس اور سب سے بڑھ کر بے خطا اور معصوم تھا۔ یہ اس ہستی کا مرثیہ ہے جو نہایت بے دردی اور نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ یہ اسی ہستی کا ماتم ہے جس پر ماتم کرنے کو مسلمان اپنا دھرم اور ایمان جانتا ہے۔ یہ اس شخص کا ماتم ہے جس کو آسمان جانتا ہے، زمین جانتی ہے، آسمان کا ہر ستارہ پہچانتا ہے، مہر و ماہ جانتے ہیں اور زمین کا ہر ذرہ جانتا ہے۔ یہ اس فرد کا ماتم ہے جو فرد فرید تھا، مرد وحید تھا، جس کو مشرق جانتا ہے اور جس کو مغرب پہچانتا ہے، جس کو مکہ جانتا ہے اور مدینہ جانتا ہے، جس کو بطحا جانتا ہے اور یثرب جانتا ہے۔ یہ اس کا غم ہے جس کو عرب جانتا ہے اور عجم پہچانتا ہے، ہند جانتا ہے اور چین جانتا ہے۔ یہ اس کا ماتم ہے جو مشرق میں مشہور اور مغرب میں معروف ہے۔

یہ اس کی صف ماتم ہے جو سراپا غم والم ہے۔ یہ اس کی عزاداری ہے جو تصویر عزا ہے۔ یہ اس کی عزاداری ہے جس کی عزاداری ہر ایمان والے کا فرض اور ہر اہل دل کا ایمان ہے۔ یہ اس کی بزم عزا ہے جو ایمان کا کعبہ، کعبہ کا کعبہ، قبلہ کا قبلہ بلکہ روح روان کعبہ وقبلہ ہے۔ یہ گریہ وزاری اس کے لئے ہوا کرتی ہے جس نے اپنی جان دے کر اسلام کو زندہ کیا، جس نے اپنا تن من نثار کر کے ایمان

تازہ کیا، جس نے اپنی آبرو نچھاور کر کے دین کی آبرو رکھی اور جس نے اپنا سر دے کر اسلام کا سر اونچا کر دیا۔ یہ اس کی عزاداری ہے جس کی عزاداری فطری ہے۔ یہ اس کا غم ہے جس کا غم پیغمبروں کو رہا، فرشتوں کو رہا، جنات کو رہا، ابرار کو رہا، علماء کو رہا، فقراء کو رہا، اپنوں کو رہا اور پرایوں کو رہا۔ یہ وہ مظلوم ہے جس پر زمانہ رویا، آسمان رویا، زمین روئی اور قیامت رو رہی ہے۔ رونے والے آج بھی اس پر رو رہے ہیں اور تا قیامت روتے رہیں گے بلکہ حشر میں بھی اس بیکس کو دیکھ کر رونے کا ایک حشر بپا ہوگا۔

بھائی! یہ اس کا ماتم ہے جو بہتر سے بہتر تھا، جو برتر سے برتر تھا، جو پاک سے پاک تھا، جو اشرف تھا، جو اطہر تھا، جو اعلیٰ تھا، جو اولیٰ تھا، اور جو امام تھا، مولیٰ تھا۔ یہ اس کا غم والم ہے جو مظلوم تھا، بے قصور تھا، بے عیب تھا، بے جرم تھا، بے مثل تھا، بے کس تھا، بے بس تھا، بے یار و مددگار تھا مگر محبوب پروردگار تھا۔ یہ اس کا شیون ہے جو مسافر تھا، بھوکا تھا، پیاسا تھا، مجروح تھا، زخمی تھا اور تنہا تھا۔ یہ اس کا دکھ ہے جس کے دکھ سے مسلمان متاثر، نامسلمان متاثر، ملائکہ متاثر، جنات متاثر، انبیاء متاثر، اولیاء متاثر، آسمان متاثر، زمین متاثر، چاند اور سورج متاثر ہیں۔ اس غم والم کا اثر انسان پر نہ ہو اور پھر وہ مسلمان بھی ہو!!!

یہ وہ عزاداری ہے جو چودہ صدیوں سے برابر جاری ہے۔ یہ وہ ماتم ہے جو آج تک چلا آرہا ہے۔ یہ وہ عزاداری ہے جو دبائے نہ دب سکی، جو مٹائے مٹ نہ سکی۔ بادشاہتیں اس کے مٹانے کی درپے ہوگئیں مگر خود مٹ گئیں۔ سلطنتوں نے اس کی بیخ کنی میں اپنی طاقتیں صرف کر دیں مگر ساری طاقتیں سلب ہوگئیں۔ بڑے بڑے بادشاہ اس کے پامال کرنے کو اٹھے مگر خود پامال ہو گئے۔ بڑے بڑے معاندا سے کچلنے کھڑے ہوئے مگر بالآخر اپنی قبروں میں چپ چاپ سو رہے۔ مگر یہ ماتم جوں کا توں سالہا سال سے برابر جاری ہے۔ بڑے بڑے سرکشوں نے اس کے خلاف سر اٹھائے، مگر سرنگوں ہو گئے، بڑے بڑے مجاہدوں نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کئے مگر ان کے

علم آخر کار جھک گئے ۔ بڑے بڑے اہل علم نے اس کی انسداد کی ترغیب وتحریص کی، ترہیب کے
سارے مدارج طے کردئے، بڑے بڑے فتوے نکالے، بڑی بڑی کتابیں اس کے خلاف لکھی
گئیں مگر سب کی سب ناکام رہیں اور یہ ماتم برابر جاری رہا۔ ہزاروں عزاداروں کو سولیاں دی گئیں،
ہزاروں ماتمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا مگر یہ ماتم بند نہ ہوا، اور یہ عزاداری بند نہ ہوئی
۔جتنا دبایا، وہ اتنی ہی ابھری ۔ جتنا مٹایا، وہ اور بڑھتی گئی ۔معلوم ہوا کہ اس میں صداقت ہے،
حقانیت ہے، اور اس میں للّٰہیت ہے ۔صداقت مٹ نہیں سکتی، حقانیت فنا ہو نہیں سکتی، للّٰہیت کا
استیصال محال ہے۔ یہ صداقت تا قیامت یوں ہی رہے گی اور مٹائے نہ مٹے گی۔

اس عزاداری کی صداقت ظاہر ہوگئی۔ اس ماتم کی حقانیت صاف ہوگئی مگر پھر بھی یہ نہ معلوم ہوا
کہ آخر وہ کون صداقت شعار ہے جس کا ماتم سالہا سال سے کیا جارہا ہے؟ وہ کون اللہ والا ہے جس کا
غم والم تازہ بتازہ ہے؟ وہ کون ہے جس کی یاد ایمان کو تازہ کئے دیتی ہے؟ وہ کون ہے جس کا نام
دلوں میں ولولہ پیدا کئے دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس کا ذکر قلوب کو متاثر کئے دیتا ہے؟ وہ کون ہے جس
کی یاد تڑپائے دیتی ہے؟ وہ کون ہے جس کا نام روحانی طاقت پیدا کردیتا ہے۔ وہ کون ہے جس کے
نام پر اپنے قربان اور پرائے نثار ہورہے ہیں؟ وہ کون ہے جس کے نام میں یہ اثر ہے کہ یار واغیار
کے آنسو نکل پڑتے ہیں؟

بتادوں وہ کون محسن عالم ہے؟ بتادوں وہ کون یگانہ زمانہ ہے؟ بتادوں وہ کون روح اسلام ہے؟
بتادوں وہ کون جان ایمان ہے؟ بتادوں وہ کون امام ملت ہے؟ بتادوں وہ کون محسن اسلام ہے؟
تو سنو اور کان کھول کر سنو! وہ محسن عالم ہے وہ محسن اسلام ہے، وہ محسن انسان ہے، وہ محسن ملت ہے
اور محسن قوم بھی ہے۔ وہ محسن قوم یوں ہے کہ اس نے اپنی قوم کو زندہ کردیا۔ وہ محسن ملت یوں ہے کہ
اس نے ملت کو ''بدملت'' کے ہاتھوں سے بچایا۔ وہ محسن انسان یوں ہے کہ اس نے انسان کو زندہ
رہنا بتایا۔ وہ محسن اسلام یوں ہے کہ اس نے اپنی جان دے کر اسلام کو زندہ کردیا۔ وہ محسن عالم یوں

ہے کہ اس نے عالم کو استبدادیت کے کچلنے کا سبق سکھایا۔ وہ اپنی قوم کا امام، اپنی ملت کا امام، اپنے
دین کا امام بلکہ عالم کا امام ہے۔ وہ اپنی قوم کا پیشوا بھی، اپنی ملت کا پیشوا بھی، انسان کا رہنما بھی اور
عالم کا رہنما بھی۔ وہ عملی انسان بھی اور بین الملی انسان بھی۔ وہ حامل کتاب بھی اور پابند کتاب بھی۔
وہ صامت بھی، وہ ناطق بھی، وہ انبیاء کا وارث بھی، وہ اولیاء کا پیشواء بھی، وہ خاتم کی نشانی بھی، وہ
نبوت کا نشان بھی، وہ عالم کا امام بھی، وہ محبوب قلوب بھی، وہ عزیز القلوب بھی، وہ غریب الغرباء بھی
وہ سید الشہدؑاء بھی، وہ بنائے لاالٰہ بھی اور وہ نوائے محمدؐ رسول اللہ بھی۔

اس پر بھی پوچھتے ہو کہ وہ کون ہے؟ تو سنو، ملک عرب کا نام تو سنا ہوگا۔ عرب ایک بڑا صحراوی
ملک ہے جو ایشیا کی مغربی سرحد پر واقع ہے اور جس کے ساحل پر دریائے احمر لہریں ماررہا ہے۔
عرب کے معنی ہیں صحرا کے اور سرزمین عرب اکثر وبیشتر صحرا ہی صحرا ہے۔ بانیٔ کعبہ حضرت ابراہیمؑ
کے فرزند اکبر حضرت اسمٰعیلؑ اور آپ کے بعد آپ کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور ظہور پیغمبرؐ
آخرالزماں کے وقت عرب کے اصلی باشندے صرف عدنانی اور قحطانی تھے۔ قحطانی قبیلہ کی تین
شاخیں، قضاعہ، کہلان اور ازدحمیر تھے اور بنی عدنان صرف دو خاندان یعنی بنی خندف اور بنی قیس پر
منقسم تھے۔

حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ فرزند تھے۔ ان میں سے قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی اور بہت
پھیلی، قیدار کی اولاد میں عدنان بہت مشہور ہیں اور ہمارے پیغمبر آخرالزماں انہی کی اولاد سے ہیں۔
عدنان سے حضرت اسمٰعیلؑ تک چالیس نام ہیں اور عدنان سے آنحضرتؐ روحی فداہ تک بیس نام
ہیں، یعنی آنحضرتؐ سے حضرت اسمٰعیلؑ تک ساٹھ نام ہیں۔ آنحضرت کا خاندان شرافت نسبی کے
لحاظ سے اباً عن جدٍ معزز اور ممتاز چلا آتا ہے مگر جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتا
زکیا، وہ نضر بن کنانہ تھے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے بڑی عزت اور بلندی
حاصل کی ۔قصی نے جلیل کی صاحبزادی حبّی سے شادی کی اور جلیل نے مرتے وقت کعبہ کی تولیت

قصیؑ کے سپرد کی اور اس روز سے یہ منصب ان کو حاصل ہوا۔

قصیؑ کے ۶ فرزندوں میں عبدمناف کو کعبہ کی تولیت اور قریش کی ریاست حاصل ہوئی اور انہیں کے سلسلے میں ختم نبوت کی عظمت بھی آنحضرت پر ختم ہوئی۔ عبدمناف کے ۶ فرزندوں میں ہاشم بڑے صاحب صولت اور باا ثر تھے۔ ہاشم نے بنی جار کی ایک حسین وجمیل دوشیزہ سے جس کا نام سلمٰی ہے عقد کیا اور ان سے ایک فرزند ہاشم کے بعد پیدا ہوئے، ان کا نام شیبہ رکھا گیا۔ ہاشم کے بعد ان کے بھائی مطلب مدینہ روانہ ہوئے اور اپنے بھتیجے شیبہ کو جو ۸ سال کی عمر میں تھے مکہ معظّمہ لے آئے اور وہ عبدالمطلب کے نام سے مشہور ہوئے۔

عبدالمطلبؑ کے دس بیٹوں میں سے حضرت عبداللہؑ جناب رسالتمآبؐ کے والد ماجد اور حضرت ابو طالبؑ جناب امیرؑ کے والد حقیقی برادران اور حضرت حمزہؑ وحضرت عباس وغیرہ حضرت عبداللہ کے علاقی برادران ہیں۔

حضرت عبداللہؑ کا عقد حضرت آمنہ خاتونؑ سے ہوا اور وہ جب حمل سے تھیں حضرت عبداللہؑ کا انتقال ہو گیا اور وہ دریتیم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی مقدس باپ اور اسی بزرگ ماں کے قرۃ العین ہیں۔

حضرت ابو طالبؑ کے عقد میں عبدالمطلبؑ کے بھائی اسد کی صاحبزادی فاطمہؑ آئیں اور ان سے طالبؑ، عقیلؑ، جعفرؑ، اور علیؑ پیدا ہوئے۔ اور حضرت علیؑ کو آنحضرتؐ نے اپنی آغوش میں لے رکھا اور اپنی ہی نگرانی میں ان کی تعلیم وتربیت فرمائی اور اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؑ کا عقد حضرت علیؑ کے ساتھ فرما دیا۔

حضرت علیؑ اور سیدۂ عالمؑ کے دو فرزند اور دو لڑکیاں ہوئیں۔ فرزندوں کے نام حسنؑ اور حسینؑ، او لڑکیوں کے زینبؑ اور ام کلثومؑ ہیں۔ حضرت فاطمہ زہراؑ کے یہ چاروں نور نظر آنحضرتؐ کی آغوش میں پلے۔ خصوصاً دونوں نواسوں کو آپ اپنے فرزندان خاص فرماتے اور انہیں بہت چاہتے

تھے۔ (اصابہ واستیعاب) نانا ان دونوں نواسوں کو اپنی جان سے عزیز اور اپنے کلیجہ سے لگائے رکھتے تھے اور بیحد پیار والفت فرماتے رہے، خدا کی عبادت تک میں بھی یہ نواسے دوش پیغمبرؐ سے الگ نہ ہوتے تھے۔ یہ پیار، یہ الفت، یہ محبت، یہ والہانہ مودّت تاریخ میں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ ان دونوں نواسوں میں بھی چھوٹے نواسے حسینؑ کی طرف حضرت کا رجحان زیادہ تھا۔ آخر کار ان کی ۶ سال کی عمر میں نانا کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور ان کی غمزدہ والدہ سیدۂ عالمیاں غم والم سہتی سہتی دو مہینے کے اندر جنت کو سدھاریں اور ان کے باپ بھی آخر کار ۴۰ھ میں بنی امیہ کی تیغ ستم سے بحالت نماز شہید کر دیے گئے۔

اب رہ گئے دو بھائی دو بہن، ہمارے پیغمبرؐ کی رہی سہی نشانیاں، مگر ان کے مٹانے کی بھی کلمہ گویوں کو فکریں ہونے لگیں، آخر ۵۰ھ میں اموی بادشاہ معاویہ بن ابی سفیان کے ایماء سے ہمارے پیغمبرؐ کے بڑے نواسے حسنؑ کو زہر دے کر سلا دیا گیا۔ اور ہمارے نبیؐ کی آخری یادگار اور واحد نشانی یعنی حسینؑ کو بھی ان ہی کلمہ گویوں نے یزید بن معاویہ کے حکم پر کربلا کے مقام پر ان کے بال بچوں سمیت بے آب ودانہ ۱۰ محرم ۶۱ھ کو شہید کیا۔ شہداء کی لاشوں کو پامال کیا۔ ان کی مخدرات عالیات کو بے پردہ اور رسن بستہ اونٹوں پر سوار کر کے کربلا سے کوفہ ودمشق لئے لئے پھرا گئے۔ یہی تھا جو محرم میں ہوا۔

اسی دلگداز سانحہ پر اہل ایمان سال کے سال روتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، ہر سال محرم میں مجالس عزا برپا کرتے اور گریہ وفغاں کرتے رہتے ہیں، حسینؑ نے تو بڑی ہنسی خوشی کے ساتھ اسلام کے لئے جان دے دی۔ مگر رسولؐ کو قبر میں رلا دیا۔ انبیاءؑ کو رلایا۔ فرشتوں کو رلایا۔ جنات اور اولیاء کو رلایا۔ بلکہ ساری دنیا کو رلایا اور آج بھی رلا رہے ہیں۔ حسینؑ کی محبت ہر دل میں، حسینؑ کا عشق ہر سینہ میں، حسینؑ کا سوز ہر جگر میں، حسینؑ کی یاد ہر سینہ میں، حسینؑ کا غم ہر من میں، حسینؑ کا ذکر ہر لب پر، حسینؑ کا نام ہر زباں پر اور حسینؑ کا تصور ہر دماغ میں ہے۔ ان کے لئے ہر شخص گریاں، ہر آنکھ

گریاں، ہر دل گریاں اور ہر زبان گریاں ہے۔ ہر وقت حسینؑ حسینؑ اور ہر لحظہ حسینؑ حسینؑ کی آواز۔ حسینؑ دوستوں ہی کے نہیں بلکہ دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ کیوں نہ ہوں۔ حسینؑ کل جگ کے دوست اور کل جگ حسینؑ کا دوست ہے۔

اب ذرا حسینؑ بن علی کے چند صفات، عادات، اطوار اور فضائل و مناقب بھی سنتے جائیں۔

حسینؑ کے باپ

حضرت علیؑ آنحضرتؐ کے حقیقی چچازاد برادر حضرت ابوطالبؑ کے چوتھے فرزند آنحضرتؐ کی پھوپھی فاطمہؑ بنت اسد کے قرۃ العین تھے۔ حضرت ابوطالبؑ اور ان کی بی بی فاطمہؑ بنت اسد نے آنحضرتؐ کی پرورش کس دل جوئی، محبت، خلوص اور ایثار نفسی سے فرمائی اس کی جھلک آنحضرتؐ کے فرمودہ الفاظ **امیؑ بعد امیؑ** سے نظر آجاتی ہے۔

حضرت علیؑ نے مہد سے تا وفات پیغمبر عالم رسولؐ کی گود میں، رسولؐ کی نگرانی میں، رسولؐ کی معیت میں، رسولؐ کی دن رات کی صحبت میں، رسولؐ کے گھر پر گذاری۔ اور اسی مبارک دور میں علیؑ کو جو کچھ ہونا تھا وہ سب کچھ ہو گئے اور جو بھی بننا تھا وہ بن چکے۔ ادھر فطرت پاکیزہ اور ادھر صحبت پاکیزہ، پھر تو علیؑ کا کیرکٹر وہ کیرکٹر بنا کہ آنحضرت کے بعد اعلیٰ و اولیٰ درخشاں اور تابندہ رہا اور آسمان عظمت پر آنحضرت خورشید درخشاں اور علیؑ ماہ تاباں نظر آرہے ہیں۔ اسی کیرکٹر اور فنا فی الرّسول ہونے پر پیغمبرؐ نے فرمایا بھی علیؑ نظیری اور اسی بلندی و رفعت مرتبت کے بنظر ارشاد فرمایا ما انزل اللہ یاایھا الذین اٰمنوا الا و علی امیرھا و اشرفھا (صواعق محرقہ صفحہ ۷۶)

حضرت علیؑ اپنے والد کی جانب سے بھی ہاشمی و قرشی اور اپنی والدہ کی طرف سے بھی ہاشمی و قرشی، آنحضرتؐ اور علیؑ دونوں مطلبی، دونوں ہاشمی اور قرشی، جس کی وجہ سے آنحضرتؐ نے فرمایا بھی انا و علیؑ من شجرۃ واحدۃ (مستدرک حاکم) اور نیز بہ لحاظ حقیقت بھی آنحضرتؐ اور علیؑ نور واحد ہیں جس کی شہادت احادیث مرویہ امام احمد بن حنبل، عبداللہ بن احمد بن حنبل، ابن مردویہ، خطیب ص ۱۲۹/

حافظ ابن عساکر تاریخ دمشق ص ۱۹۱/۳ و غیرہم سے عیاں ہے۔ حضرت علیؑ کو حق سبحانہ نے نص قرآن سے اور پیغمبرؐ نے اپنے ارشاد گرامی سے نفس پیغمبرؐ فرمایا اور اس کی تصدیق احادیث انفسنا محمد و علی ابنا ئنا الحسن والحسین و نسائنا فاطمۃ (صواعق صفحہ ۱۰۷) سے ہوتی ہے۔

حسین علیہ السلام کی والدہ

حسینؑ کی ماں کا نام فاطمہؑ اور القاب زہراؑ، سیدہؑ و بتولؑ ہیں۔ کمسنی کی عمر میں بے ماں کی ہو گئیں۔ باپ (حضرت رسولؐ خدا) نے سینہ پر رکھ کر پالا پوسا، سکھ پہنچایا آرام دیا اور بڑے چاؤ پیار سے پرورش فرمایا باپ بیٹی پر اور بیٹی باپ پر فدا تھیں۔

ہجرت کے پہلے سال علیؑ ابن ابی طالب سے بحکم خدا بیاہی گئیں اور اٹھارہ سال کی عمر میں راہی جنت ہو گئیں۔ پیغمبرؐ انہیں بہت چاہتے تھے۔ بہت پیار کرتے تھے اور یہ تھیں بھی ایسی ہی۔ ایسے باپ کی بیٹی ایسی ہی ہوتی ہے، ہوبہو باپ، باپ کی تصویر، باپ کی تنویر، باپ کی صورت، باپ کی سیرت، باپ کے اخلاق، باپ کے عادات۔ سب سے بڑی عارفہ، سب سے بڑی عابدہ، سب سے بڑی زاہدہ سب سے بڑی طاہرہ، سب سے بڑی معصومہؑ، اور سب کی سیدہؑ۔

پیغمبرؐ کا ارشاد گرامی ہے۔ میری بیٹی فاطمہؑ سیدہ نساء مومنین ہے۔ میری بیٹی فاطمہؑ سیدہ نساء اہل جنت ہے۔ اور میری بیٹی فاطمہؑ سیدۂ نساء عالمین ہے۔ اور فرمایا میری بیٹی فاطمہؑ، سید البشر کی دختر سیدا لعرب کی زوجہ اور سید شباب اہل جنت کی والدہ ہے۔ اور فرمایا میری بیٹی فاطمہؑ حور جنت ہے، ہر طرح منزہ ہے۔ اور فرمایا فاطمہؑ میر الخت جگر ہے جس نے اس کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا پہنچائی۔ اور فرمایا میں نے فاطمہؑ ان کا نام اس لئے رکھا کہ خدا نے ان پر اور ان کی اولاد پر تا قیامت آتش دوزخ حرام کر دی ہے اور فرمایا افضل النساء فاطمہؑ اور اس کی ماں خدیجہ ہے (ابوداؤد) اور فرمایا خیر النساء فاطمہ بنت محمدؐ ہے (حاکم) فرمایا، اے علیؑ! تم کو تین باتیں ایسی ملی ہیں جو مجھ کو بھی نہیں ملیں۔ تم کو مجھ جیسا خسر ملا اور مجھ کو نہ ملا۔ تم کو میری بیٹی جیسی صدیقہ کبریٰ زوجہ ملی اور مجھ کو نہ ملی۔ اور تم

کو حسنینؑ جیسے فرزند ملے اور مجھ کو نہ ملے۔ لیکن تم سب میرے ہی ہو اور میں تمہارا ہوں (بیہقی، طبرانی ودیلمی) اور فرمایا میری محبوب ترین اہلبیت میری پیاری بیٹی فاطمہؑ ہے (ترمذی وحاکم) اور فرمایا فاطمۃ بضعۃ منی فاطمہؑ میرا جزو ہے (ترمذی، حاکم) اور فرمایا فاطمہؑ تیرے غضب سے خدائے تعالیٰ کو غضب آتا ہے اور تیری مسرت سے خدا کو مسرت ہوتی ہے (طبرانی وحاکم) اور فرمایا میری بیٹی فاطمہؑ میری صورت اور میری سیرت دونوں رکھتی ہے (ابن عساکر) اور فرمایا میرے بعد سب سے پہلے داخل فردوس ہونے والے علیؑ وفاطمہؑ ہوں گے اور فرمایا میں میری بیٹی فاطمہؑ علیؑ اور حسنینؑ فردائے محشر ایک ہی مکان میں رہیں گے۔ (امام احمد بن حنبل) اور فرمایا میں نے اپنی بیٹی فاطمہؑ کو علیؑ بن ابی طالب سے بہ حکم خداوندی بیاہا ہے۔

جناب فاطمہ زہرا علیہا السلام نے آنحضرتؐ کی وفات کے ستر دن کے بعد وفات پائی عاشیت بعد النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سبعین یوماً (استیعاب)

اولاد جناب سیدہ و جناب امیرؑ

جناب امیرؑ کے جناب سیدہ سے دو صاحبزادے اور دو صاحبزادیاں، امام حسنؑ ۳ھ میں و امام حسینؑ ۴ھ میں، حضرت زینبؑ ۵ھ میں و حضرت ام کلثومؑ ۶ھ میں پیدا ہوئے، جوان ہوئے اور کہل بھی ہوئے۔ جناب امام حسنؑ امیر معاویہ کی زہر خورانی سے ۴۹ھ میں شہید ہوئے اور مدینہ میں مدفون ہوئے۔ جناب سید الشہداءؑ نے یزید بن معاویہ کے حکم کی تلوار سے عاشورائے محرم ۶۱ھ کو بمقام کربلا اپنے بھائیوں و برادرزادوں اور فرزندوں کے ساتھ جام شہادت نوش فرمایا۔ حضرت زینب زوجہ عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؑ آپ کے ہمراہ کربلا میں رہیں، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام اور شام سے پھر مدینہ لوٹیں اور مدینہ ہی میں بہ ایام امامت امام زین العابدین ۶۵ھ میں رخصت فرمائے عالم بالا ہوئیں۔ حضرت ام کلثومؑ محمد بن جعفر کے نکاح میں آئیں اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بھائی کے ساتھ کربلا تشریف لے گئیں اور کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام اور شام سے

مدینہ واپس لوٹیں۔ جب مدینہ کی دیواریں نظر آنے لگیں تو روئیں اور یہ اشعار پڑھے:۔

مدینۃ جدنا لا تقبلینا
فبالحسرات والاحزان جینا
خرجنا منك بالاهلین جمعا
رجعنا لارجال ولا بنینا

نیز روز عاشور آپ نے ہی جناب امام ہمام کو شہزادہ علی اصغرؑ کی پیاس دکھائی۔

قالت ام کلثوم یا اخی ان ولدك الاصغر ماذاق الماء منذ ثلاثة ایام فاطلب له من القوم (ینابیع المودۃ صفحہ ۳۴۶) ثم نادی الحسین یا ام کلثوم ویا زینب اختی ویا فاطمه وسکینة ابنتی ویارقیة وعاتكة والرباب ام لیلیٰ علیکن السلام ورحمة الله وبركاته (ینابیع المودۃ صفحہ ۳۴۶) وکان اهل الکوفة ینالوف الاطفال بعض التمر والخبز فقالت ام کلثوم ان الصدقة علینا حرام (ینابیع المودۃ صفحہ ۳۵۱) قالت ام کلثوم یزید ابن معاویة احزنی ان ارفع راس اخی واقبلة وابکی علیه فبکی الناس علیها (ینابیع المودۃ صفحہ ۳۵۴) وودی ام کلثوم بنت فاطمة بنت النبی صلی الله علیه وآله وسلم عن فاطمة علیها الصلوٰة والسلام قالت انسیتم قول رسول الله صلی الله علیه وآله وسلم یوم غدیر خم من کنت مولاه فعلی مولاه وقوله انت منی بمنزلت هارون من موسیٰ (اخرجه المحدث الشهیر ابو موسیٰ المدینی فی کتابه المسلسل بالاسماء)۔

ان روایات سے واضح ہوا کہ سیدہؑ عالمین کے یہ چاروں نور نظر عہد معدلت مہد جناب ختمی مرتبت میں تولد ہوئے۔ اہلبیت اور آل محمدؐ ہونے کے علاوہ شرف صحبت سے بھی ممتاز ہوئے اور

بوڑھے ہو کر عالم بالا کو تشریف لے گئے۔ نسل سادات کرام جناب امام حسینؑ سے بکثرت اور امام حسنؑ کے صاحبزادے حسنؑ سے اس سے کم تعداد میں آج تک دنیا میں رہی ہے اور نو ائمہ معصومین علیہم السلام جناب امام حسینؑ شہید کربلا کی نسل ہی میں ہوئے۔

حسین علیہ السلام

سلالۂ شرافت، خلاصۂ نجابت اور لب لباب سیادت ہیں، قریش کو ان پر ناز، عرب ان سے ممتاز۔ بنی ہاشم کے چشم و چراغ، بنی مطلب کے نورِ چشم، آل محمد کے جاہ و حشم، نانا ان کے خاتم المرسلین محمدؐ بن عبداللہ بن عبدالمطلب، دادا ان کے ابوطالب بن عبدالمطلب، باپ ان کے علی بن ابی طالبؑ اور ماں ان کی فاطمہؑ بنت محمد رسول اللہؐ۔

آنحضرت نے ان کی ولادت پر ان کا نام حسینؑ رکھا اور فرمایا ''ہارون کے فرزندوں کے نام شبیر و شبرؑ تھے اور میں نے اپنے بچوں کے حسنؑ و حسینؑ رکھے ہیں (بغوی از سلمان) اور یہ بھی فرمایا حسنؑ و حسینؑ بہشتی نام ہیں اور آج تک کوئی بھی ان ناموں سے واقف نہ ہوا۔ (ابن سعد در طبقات)

ملا حسین کاشفی صاحب تفسیر حسینی اپنی کتاب روضۃ الشہداء میں حضرت انس بن مالک سے راوی ہیں کہ حسینؑ کی ولادت پر جبرئیل امین آئے بارگاہ رسالت میں مبارکباد پیش کی، پھر حریر کا ایک ٹکڑا گزارا جس پر لفظ ''حسین'' لکھا تھا اور آخر میں تعزیت بھی ادا کی۔ سرکار نے دریافت کیا تعزیت کا کون موقعہ ہے۔ عرض کیا جب آپ نہ رہیں گے اور علیؑ و فاطمہؑ بھی نہ رہیں گے، کلمہ گویان امت حسینؑ کو بے آب و دانہ میدان کربلا میں شہید کر دیں گے۔ یہ سن کر حضرت ختمی مرتبتؐ آبدیدہ ہوئے اور پوچھا حسینؑ پر روئے گا کون؟ حامل وحی نے عرض کیا: سرکار کی امت سال کے سال حسینؑ پر ماتم کرے گی اور حسینؑ پر روئے گی۔

مگر اس روایت کو نقل کرنے کے بعد ایک اہل حدیث نے اس کو کذب محض ٹھہرایا۔ اس لئے مجھے بھی اس کے نقل کی اس وقت تک جرأت نہ ہوئی جب تک میں نے ملفوظات حضرت فریدالدین

گنج شکر مسمی بہ راحت القلوب کی مجلس بست و یکم میں اسی روایت کو دیکھ نہ لیا کہ حسینؑ کا ماتم آپ کی امت ہر سال کرتی رہے گی اور عاشورہ کے دن آہوان وحشی اپنے بچوں کو دودھ پلانے میں تردد کرتے رہیں گے وغیرہ۔

میری تشفی کے لئے حضرت بابا صاحب کی یہ توضیح کافی سے زیادہ تھی مگر اعجاز حسینی بھی دیکھئے کہ حدیث مرفوع بھی اچانک نظر پڑی۔

ولابن علی فی امالیہ عن زیادبن المنذر عن سعیدا بن جبیرعن ابن عباس انہ قال سأل علی ابن ابی طالب یوماً عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انک لتحب عقلاً قال ای واللہ انی لاحبہ جبین جبالہ وحبا لحب ابی طالب لہ وان ولدہ یا اباالحسن سیقتل فی حب ولدک الحسین الذی تدمع علیہ عیون المومنین تصلی علیہ الملائکۃ المقربون ثم بکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حتی جرت دموعہ علیٰ صدرہ۔

جناب امیر نے آنحضرتؐ سے دریافت فرمایا کہ آیا سرکار کو عقیل سے بھی محبت ہے فرمایا: ہاں، ایک تو ذاتی اور دوسرے بوجہ محبت ابوطالب اور تیسرے اس وجہ سے بھی کہ عقیل کا ایک لڑکا میرے فرزند حسینؑ پر سے قربان ہوگا جس کے غم میں مومن روتے رہیں گے، جس پر ملائک صلوات پڑھتے رہیں گے۔ پھر آنحضرت نے اتنا گریہ فرمایا کہ اشکہائے مبارک آپ کے سینۂ اقدس پر گرنے لگے۔

غالباً اب تو ''ماتم حسینؑ'' کے استمراری و دوامی ہونے پر معترضین کو کوئی معقول وجہ اعتراض نہ رہے گی۔

کنیت اور القاب

آنحضرت نے اپنی کمال محبت کی وجہ سے اپنے محبوب ترین فرزند کی کنیت ابوعبداللہ رکھی یعنی پیار سے حسینؑ کو اپنے والد ماجد حضرت عبداللہ کے نام سے مکنّٰی فرمایا۔ (یعنی میرے باپ کے باپ

فرمایا کرتے تھے جس طرح اپنی شہزادی حضرت فاطمہؑ کو ام محمدؐ یعنی محمدؐ کی ماں فرمایا کرتے تھے۔

آپ کے القاب بے شمار ہیں جن میں سید، امام، شبیر، سبط اصغر، قرۃ العین، ریحان، طیب، زکی، رشید، مبارک، راضی برضا، مظلوم، تابع مرضات اللہ، صابر، ابن سعد، طبرانی، وابن ابی شیبہ، سیدا لشہداء الطبرانی وضیاء مقدسی از حضرت جابر) دلیل ذات باری۔ (بغوی)

نسب

ابوعبداللہ الحسین بن علی بن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف، از جانب والد، اورحسین بن فاطمہؑ زہرا بنت سیدنا محمد رسول اللہ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف، از جانب مادر......آپ خیر الوریٰ کے نواسے خیر البشر کے فرزند (احمد از جابرؓ وحاکم از ابن مسعود) اور خیر النساء کے جگر گوشہ ہیں (ابویعلی وحاکم) آپ اباً وامّاً وجداً خیر الاخیار ہیں۔

(طبرانی از ابن عباس)

ولادت

بروایات فریقین ۳رشعبان ۴ھ بروز پنجشنبہ آپ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ آپ کی شہادت اورولادت کی تاریخ میں مابین الفریقین کوئی اختلاف نہیں۔

نویدولادت پر حضور تشریف فرما ہوئے، بیٹے کو گود میں اٹھایا، پیار کیا، داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منھ میں دی، ساتویں دن ختنہ کروایا اور دو بکروں کی قربانی کے ساتھ عقیقہ کیا گیا، بالوں کو چاندی کے ہم وزن فرمایا۔ چاندی خیرات کردی اور ایک گوسفند کی ران قابلہ (اسماء بنت عمیس) کو مرحمت فرمائی۔ (حاکم از سیدنا علی)

اوصاف جلیلہ

کان عالماً بالقرآن عاملاً علیہ زاھداً تقیاً نقیاً ورعاً جواداً فصیحاً بلیغاً عارفاً باللہ ودلیلاً علی ذاتہ تعالیٰ (ابن ابی شیبہ)

ذات ستودہ صفات، معدن حسنات، بے نظیر، بے عدیل اور بعید الصیت تھی۔ عارف ربانی، آیت صمدانی، بخدا فانی و بخدا باقی، مظہر نبوت، آئینہ رسالت، جو ہر محمدی، گوہر احمدی، آسمان امامت، مشرق شہادت اور مطلع ولایت تھے۔ اوصاف اوصاف احمدی، شمائل شمائل نبوی، اخلاق اخلاق ربانی، عادات عادات نورانی، زمین پر خلیفہ ربانی، آسمان پر مظہر صمدانی، اسلام کے مسیحا، ایمان کے ید بیضا، وارث رسول اللہؐ، نائب علی مرتضیٰ حقیقی معنوں میں تھے۔ امامت آپ پر نازاں، ولایت آپ سے درخشاں اورشہادت آپ پر قربان، اقطاب کے پیشوا، افراد کے خضر راہ اور اولیاء کے امام تھے، کان الحسین السبط آیہ من آیات اللہ (ابن عربی) حسین علیہ السلام آیت ربانی تھے۔

فضائل

ان کے فضائل کیا جو سراپا فضل تھے۔ ان کے فضائل قرآن وحدیث ہیں۔ ان کی ہرادا سرچشمۂ فضیلت، ان کا ہر شیوہ اک شعبہ فضیلت، ہر فعل ان کا ایک فضیلت، ہر عمل ان کا ایک فضیلت، ان کے خلق معیار فضیلت، ان کے شمائل اعتبار فضیلت۔ ہم ان کی فضیلت کیا بیان کریں جو جانتے نہیں فضیلت کیا ہے۔ وہ ہمارے مولیٰ ہم ان کے نام لیوا، وہ ہمارے پیشوا، ہم ان کے اتباع، ہم ان کے کلمہ گو، ہم ان کے سایہ جو، ہم ان کے متبع، ہم ان کے غلام ہیں، ان کے کفش بردار، بھلا ہم ان کے فضائل کیا بیان کرسکیں گے۔

وہ مجسم حسنات، نیکیوں کے سرچشمہ، محاسن کے معدن، فضائل کے خزانہ، شمائل نبوی کے آئینہ، یہ فضائل تقسیم کرنے والے، یہ حسنات بانٹنے والے اور یہ درجات بخشنے والے۔ یہ امام، ہم غلام، یہ حسینؑ اور ہم خاک نعلیں۔

آل محمد علیہم السلام

حسینؑ، حسینؑ کے بھائی حسنؑ، حسینؑ کے باپ علیؑ اور حسینؑ کی ماں فاطمہ زہراؑ جزو رسولؐ، روح رسولؐ، جان رسولؐ، نفس رسولؐ، جگر پارہ محمدؐ، سرشت محمدؐ، نور محمدؐ، اہلبیت محمدؐ، اور آل محمدؐ ہیں۔ نزول آیت

تطہیر پر اور آیت مباہلہ پر زبان وما ینطق عن الھوی نے انہیں چارتن کو الّٰھم ھٰولاء آل محمد فرمایا تھا۔ اوراس جملہ کو اپنی زندگی بھر میں کئی مواقع پر علی رؤس الاشہاد دہرایا بھی اور حاضرین کے ہروقت ذہن نشین کر دیا ہے کہ علیؑ وفاطمہؑ وحسنینؑ ہی آل محمدؐ ہیں۔

ترمذی، ابن جریر طبری، ابن منذر، حاکم، ابن مردویہ طحاوی، بیہقی اور طبرانی نے ام المومنین ام سلمہؓ سے روایت کی کہ جب آیت **انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا** نازل ہوئی تو آنحضرتؐ نے علیؑ وفاطمہؑ وحسنینؑ پر اپنی چادر اڑھائی اور فرمایا: خدایا یہی میری آلؑ اور میرے اہل بیتؑ ہیں۔

ابن ابی شیبہ، احمد بن حنبل، طحاوی، ابن منذر، ابن ابی حاتم، طبرانی، حاکم، بیہقی اور بن عساکر نے حضرت واثلہ بن اسقع سے یہی روایت کی اور اس میں الھم ھٰؤلاء آل محمد کا لفظ بھی ارشاد فرمانا مذکور ہے۔

الھم ھٰؤلاء الی اور الّٰھم ھٰؤلاء اھلبیتی وہ فرامین نبوی ہیں جن کی حافظ عبدالرزاق، شیخ بخاری نے ابن ابی شیبہ، شیخ مسلم نے۔ احمد بن حنبل، شیخ بخاری و مسلم نے ام المومنین حضرت عائشہ سے اور ابن مردویہ اور خطیب نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی ہے۔

ان حضرات قدس یعنی علیؑ وفاطمہؑ وحسنینؑ کو نہ صرف خداوند تعالیٰ نے بفحوائے آیہ فندع ابنائنا کے آل محمد میں شامل فرمادیا ہے بلکہ یہ حضرات حقیقی آل محمد تھے اس پر اضافہ یہ بھی ہوا کہ آنحضرت کے شرف صحبت دوامی سے اجلّ صحابہ میں ان کا شمار ہے۔ مزید براں اہلبیت محمدؐ میں بھی یہی محسوب فرمائے گئے ہیں، یعنی ان نفوس ذکیہ کی ہر فرد کو آل محمدؐ، اہلبیت محمد اور صحابی محمدؐ روحی فداہ ہونے کا سہ گونہ شرف حاصل ہے۔

احادیث فضائل

سنئے کہ آنحضرت روحی فداہ اپنے اس فرزند حسینؑ کی نسبت کیا فرماتے ہیں:۔

(۱) حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔

(طبرانی، ابن شاہین، شیرازی ابن عساکر از سیدنا علی وجابر و براء بن عازب)

(۲) محب حسینؑ محبوب خدا ہے۔ (امام احمد بن حنبل از یعلی بن مرّہ)

(۳) عرش کے دو گوشوارے حسنینؑ ہیں۔ (طبرانی از عقبہ بن عامر)

(۴) حسنینؑ بہشتی جوانوں کے سردار ہیں۔ (احمد وترمذی، طبرانی ونسائی وحاکم، حدیث مشہور)

(۵) جبریل نے بشارت دی کہ میرے دونوں فرزند حسینؑ وحسنؑ بہشتی جوانوں کے سید ہیں۔

(بخاری از حذیفہ، احمد ترمذی، نسائی وحاکم از حذیفہ)

(۶) حسنینؑ میرے دو ریحان ہیں۔ (بخاری ترمذی از ابن عمر ونسائی از انس)

(۷) یہ دونوں میرے لخت جگر اور میری دختر کے نور نظر ہیں، خداوندا یہ میرے پیارے ہیں انہیں اور ان کے چاہنے والوں کو دوست رکھ۔ (بخاری، ترمذی ابن ماجہ وحاکم از یعلی بن مرہ)

(۸) جس نے انہیں دوست رکھا وہ میرا دوست ہے، جس نے ان سے دشمنی کی وہ میرا دشمن ہے۔

(احمد بن حنبل ابن ماجہ وحاکم از ابی ہریرہ)

(۹) خداوندا یہ میرے پیارے ہیں، تو بھی ان کو محبوب رکھ ان کے دوستوں کو دوست اور ان کے دشمنوں کو دشمن رکھ۔ (ترمذی از براء بن عازب وطبرانی از ابی ہریرہ)

(۱۰) جس نے حسنین کو محبوب رکھا وہ میرا محبوب ہے اور میرا محبوب محبوب خدا ہے۔ جو محبوب خدا ہے وہ قطعی بہشتی ہے۔ جس نے حسنین سے دشمنی کی یا ان سے لڑائی کی وہ میرا دشمن ہے، میرا دشمن دشمن خدا ہے اور دشمن خدا کا ٹھکانا جہنم اور عذاب دوامی ہے۔ (حاکم وطبرانی از سلمان)

(۱۱) جنت کی زینت حسنؑ وحسینؑ ہیں۔ (طبرانی از عقبہ بن عامر)

(۱۲) حسنین اپنے باپ، اپنی ماں، اپنے نانا ونانی، اپنے چچا وپھوپھی اور ماموں وخالہ کے اعتبار سے بھی افضل امت ہیں۔ ان کے نانا محمدؐ ان کی نانی خدیجہ صدیقہ، ان کی ماں فاطمہ زہراؑ، ان

کے باپ علی ابن ابی طالبؑ، ان کے چچا جعفر طیار، ان کی عمّہ ام ہانی، ان کے ماموں قاسم بن محمد اوران کی خالہ زینب، ام کلثوم ورقیہ ہیں۔ان کے نانا جنتی ان کی نانی جنتی، ان کی ماں جنتی، ان کے باپ جنتی، ان کے چچا جنتی، ان کی عمّہ جنتی، ان کے ماموں جنتی اوران کی خالائیں جنتی اور یہ دونوں جنتی اوران کے چاہنے والے جنتی۔ (طبرانی، ابویعلی وابن عساکر از ابن عباس)

(۱۳) محب حسینؑ محب محمدؐ ہے۔ (طبرانی از سیدنا علی)

(۱۴) حسینؑ میرا محبوب ہے تو بھی اس کو محبوب رکھ۔ (حاکم از ابی ہریرہ)

(۱۵) میرے اہل بیت میں حسنؑ وحسینؑ مجھے زیادہ محبوب تر ہیں۔ (ترمذی از انس)

(۱۶) سیدنا علیؑ، سیدہ عالمؑ اور حسنینؑ سے مخاطب ہوکر فرمایا: تم سے لڑنے والوں سے میں لڑوں گا اور تمہارے چاہنے والوں کو دوست رکھوں گا۔ (ترمذی، ابن ماجہ طبرانی از زید بن ارقم)

(۱۷) حضرت عمر راوی ہیں حسنینؑ کو ایک دن راکب دوش پیغمبرؐ دیکھ کر میں نے کہا: سواری تو اعلیٰ ملی۔آنحضرتؐ نے فرمایا: عمر! سوار بھی اعلیٰ ہیں۔ (عبدالرزاق)

(۱۸) حضرت یعلی بن مرہ کہتے ہیں: صاحبزادوں کو دوش پر دیکھ کر میں نے کہا کیا خوب سواری ہے۔آنحضرتؐ نے فرمایا: سوار بھی تو خوب ہیں۔ (طبرانی از سلمان)

(۱۹) حضرت جابر نے حسنینؑ کو دوش اقدس پر دیکھ کر کہا سواری بہت ہی بہترین ہے، آنحضرتؐ نے فرمایا: سوار بھی تو بہترین ہیں۔ (ابن عساکر از حضرت جابر)

(۲۰) حضرت جابر نے آنحضرتؐ کو دیکھا کہ حسینؑ کو اپنی پشت پر بٹھائے ہوئے گھٹنوں اور ہاتھوں پر چل رہے ہیں اور فرماتے جارہے ہیں: حسینؑ تمہارا اونٹ بھی یکتا اور تم بھی یکتا ہو۔

(ابن عدی وابن عساکر)

(۲۱) حضرت ابی ہریرہ راوی ہیں کہ آنحضرت حسینؑ کا ہاتھ پکڑے فرمارہے تھے: میرے نورنظر! آؤ میرے سینہ پر بیٹھو۔ حسینؑ اپنے پاؤں آنحضرتؐ کے ساق اطہر پر ٹیک دیتے اور

آنحضرتؐ انہیں اٹھا کر اپنے سینہ مبارک پر بٹھا لیتے۔ (طبرانی)

(۲۲) عبداللہ بن زبیر راوی ہیں کہ آنحضرتؐ ایک دن سجدہ میں تھے اور حسینؑ آپ کی گردن مقدس پر بیٹھ گئے، آپ نے سجدہ سے سر اس وقت تک نہ اٹھایا جب تک حسینؑ اتر نہ گئے۔

(ابن جریر طبری)

(۲۳) ابن زبیر کہتے ہیں: میں نے بارہا دیکھا ہے کہ آنحضرت جب سجدہ میں ہوتے، حسینؑ آپ کی گردن مبارک پر بیٹھ جاتے تھے اور جب تک حسینؑ نہ اتریں آپ سجدے سے سر نہ اٹھاتے تھے۔ نیز بحالت رکوع حسینؑ آنحضرتؐ کے دونوں پاؤں کے درمیان کھڑے ہوجاتے اور آپؐ اپنے پاؤں اور کھول دیتے تھے۔ (ابن سعد در طبقات)

(۲۴) آنحضرتؐ نماز میں تھے حسینؑ کھیلتے کھیلتے مسجد میں آنکلے اور نانا کی گردن اقدس پر بحالت سجدہ سوار ہوگئے۔آنحضرتؐ نے سجدہ میں بڑی دیر لگائی۔صحابہ نے بعد نماز عرض کیا: شائد سجدہ میں کوئی وحی نازل ہوئی ہوگی۔فرمایا نہیں: بلکہ حسینؑ میری گردن پر تھے، ان کے اترنے کے بعد میں نے اپنا سر اٹھایا۔ (ابن ابی شیبہ، شیخ بخاری ومسلم از عبداللہ بن شداد)

(۲۵) حسینؑ مجھ سے ہے، میں حسینؑ سے ہوں، حسینؑ اسباط بنی اسرائیل کی طرح میرا سبط ہے۔جس نے اس کو محبوب رکھا وہ خدا کا محبوب ہوگا۔ (ترمذی از یعلی بن مرہ)

(۲۶) سرکار ختمی مرتبت سیدۂ عالمؑ کے حجرہ پر جب بھی رونق افروز ہوتے ارشاد فرماتے: میرے بیٹوں کو بلاؤ، وہ آتے تو انہیں اپنی گود میں لیتے، سینہ سے لگاتے پیار کرتے اور ان کی خوشبو سونگھتے۔ (ترمذی وطبرانی از حضرت انس)

(۲۷) سیدالاولین والآخرین حسینؑ کو اپنی زبان وحی ترجمان چوساتے اور خود حسینؑ کی زبان چوستے۔ (ابن سعد از حضرت عبدالرحمن بن عوف)

(۲۸) سرکار عرش منزلت حسینؑ کو اپنے پاس آتے دیکھتے تو فرماتے: میں نے تجھ پر سے اپنے

فرزند ابراہیمؑ کو نثار کر دیا۔ پھر انہیں اٹھا لیتے اور پیار کرتے۔ (ابن عباس)

(۲۹) آنحضرتؐ کو بار بار ارشاد فرماتے میں نے سنا کہ حسنؑ اور حسینؑ اور ان کی ذریت کے لئے تم تعظیماً اٹھا کرو۔ (ابن عساکر از حضرت انس)

نماز عصر کا ایک سجدہ آنحضرتؐ نے دیر تک کیا۔ میں نے سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر دیکھا کہ حسینؑ دوش اقدس پر ہیں۔ نماز کے بعد صحابہ نے عرض کیا: ایک سجدہ ذرا سا دراز ہوا۔ فرمایا: حسینؑ میری پشت پر تھا، اس کے اترنے تک میں نے سجدہ سے سر نہیں اٹھایا۔

(احمد بن حنبل از عبداللہ بن شداد، عبداللہ بن عمرو، ابوسعید خدری)

(۳۱) دونوں صاحبزادوں کی گردنوں میں دو تعویذ جناب جبرئیل کے پروں کے رووں کے ڈالے گئے تھے۔ (ابن حبان و خطیب و سیوطی از عبداللہ بن عمر)

مختصر یہ کہ بفحوائے حدیث صحیح نحن اهل البیت لایقاس بنا احداً۔

(طبرانی و ابن مردویہ از حضرت انس)

پنجتن پاک کی عظمت وجلالت رفعت وعلویت وفضیلت اور علوئے مرتبت عنداللہ وعندالرسول مسلم ومصرح، ان کی محبت ایمان، ان کی مودت مغفرت اور ان کی الفت خدا اور رسولؐ کی قربت ہے۔

من و دست و دامان آل رسولؐ

ہر مسلمان کا وظیفہ رہے۔

(اشاعت اولیٰ ۱۹۵۷ء سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ ۲۲۵)

حسینؑ اور ہندوستان کا سمبندھ

شاعرِ اہل بیتؑ علامہ نجم آفندی صاحب قبلہ

تیرہ سو برس کی بات ہے، عرب دیس اور کربلا کے ریتیلے میدان میں، فرات کی نہر کے کنارے ایک لڑائی ہوئی تھی جس میں ایک طرف بہتر ستونت سچائی کے طرفدار، جنتا کا دُکھ درد رکھنے والے، بھلائی کے پالن ہار، برائی سے دور رہنے والے اچھے کرموں کے اپدیشک، حسینؑ اور ان کے ساتھی مسافر تھے، دوسری طرف اس سمے کے بادشاہ یزید کی سینا کے کم سے کم تیس ہزار آدمی تھے، جو حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کو اس کارن قتل کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے، کہ حسینؑ نے اس پاپی حکومت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا، جو زبان سے کہنے کے لئے مسلمانوں کی حکومت تھی لیکن اس کا چلن مسلمانوں کے پیغمبر (حسینؑ کے ناناؐ) کے بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے طریقوں سے بالکل الگ تھا۔ غریب آدمی تلوار کی حکومت اور مایا کی طاقت چکی کے دو پاٹو کے بیچ میں بہت بری طرح پس رہے تھے، انیائے اور اپرادھ کے سوا نیائے اور دیا دھرم کا کہیں نام نہ تھا۔

حسینؑ غریب جنتا کی دکھ درد سے بھری چیخ پکار سن کر، ان کے بار بار کے بلاووں سے مجبور ہو کر، گھر سے نکلے تھے، اور گرمی اور دھوپ میں کئی مہینوں کا سفر کر کے کربلا تک پہنچے تھے اور فرات کے کنارے ڈیرے ڈال رہے تھے کہ یزید کے لشکر نے آ کر چاروں طرف سے گھیر لیا اور انھیں دریا کے کنارے اترنے سے روک دیا۔ حسینؑ لڑائی لڑنا اور خون بہانا نہیں چاہتے تھے، انھوں نے دریا سے دور ہٹ کر جلتی ہوئی ریت پر اپنے خیمے لگا لئے۔ حسینؑ کے ساتھ عورتیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے جن کے کارن حسینؑ کے سورما ساتھی لڑنے کے لئے آمادہ ہو گئے تھے، لیکن حسینؑ نے ان کو سمجھا بجھا کر باز رکھا، ورنہ جو لڑائی چھ سات دن کے بعد ہوئی، وہ اسی وقت پانی کے لئے شروع

ہو جاتی۔ اس چھ سات دن کے اندر یزیدی لشکر کے سینا پتی اور حسینؑ سے کئی مرتبہ بات چیت ہوئی، مگر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ یزید کا سندیسہ یہ تھا کہ حسینؑ یزید کی حکومت کو مان لیں، جنتا کی چیخ و پکار پر کان نہ دھریں، جو اپرادھ ہو رہا ہے اس کو ہونے دیں، تب ان کی جان بچ سکتی ہے۔ اگر حسینؑ اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جان بچانے کے لئے اس پر راضی ہو جاتے، تو حسینؑ کے نانا مسلمانوں کے رسولؐ نے اپنی ساری عمر جو بھلائی کا پرچار کیا تھا، آدمی کو سدھارنے کی جو انتھک کوششیں کی تھیں، دیا دھرم کا جو سبق دیا تھا، سب اکارت ہو جاتا اور آج مسلمانوں کو سنسار میں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہتی، دنیا والوں کو اندھیرے اُجالے کا فرق نہ معلوم ہوتا، اور مسلمانوں کے دھرم کا چراغ جو تھوڑی بہت روشنی دے رہا ہے، بالکل ہی بجھ کے رہ جاتا۔

حسینؑ جب گھر سے نکلے ہیں تو ان کے ساتھ بھی بہت آدمی تھے، لیکن ان کے بار بار یہ بات کہنے سے کہ ”میں حکومت کے لوبھ اور لالچ میں نہیں جا رہا ہوں، میرے ساتھ رہنے والوں کے لئے موت کا سامنا ہے۔“ لوگ ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور بہتر جیالے، اور سچی محبت کرنے والے رہ گئے، جن کو یہ دُھن لگی تھی کہ اس دھرماتما ایشور روپی منش کے ساتھ سچائی کے پرچار میں جان دے کر امر ہو جائیں۔

حسینؑ نے اپنے دشمنوں سے کہا کہ تم لوگوں میں بہت ایسے آدمی ہیں جنھوں نے مجھے چٹھیاں لکھ کر بلایا تھا، اور اب تم لوگ انجان ہو گئے ہو، تو مجھے مدینہ واپس جانے دو، میں لڑائی جھگڑا کرنا، اور خون بہانا نہیں چاہتا مگر جب کسی نے ان باتوں پر کان نہ دیئے اس وقت حسینؑ نے ایک آخری بات یہ کہی کہ ”اچھا مجھے راستہ دو کہ میں ہندوستان چلا جاؤں۔“

بھارت کے سپوتو! یہاں سے حسینؑ اور ہندوستان کا سمبندھ شروع ہوتا ہے کیسے میٹھے شبد ہیں، کیسے بھروسہ کی چھاؤں میں کہے گئے تھے، سارا سنسار پڑا ہوا تھا، عیسائیوں کے بہت سے ملک تھے، چین تھا، جاپان تھا، ابیسینیہ (حبش کا دیش) تھا، جہاں ان کے ناناؐ کے وقت میں مسلمان مکہ

سے جا کر مہمان رہ چکے تھے، مگر حسینؑ نے کسی طرف دھیان نہیں دیا۔ انھوں نے اپنے رہن سہن کے لئے ہندوستان کا چناؤ کیا تھا اور ہندوستان ہی کا نام ان کی زبان پر آیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کے رہنے والے برہمن، راجپوت، ویش کوئی جیو ہتیا کو پسند نہیں کرتا، یہ لوگ مہمانوں کا دکھ درد سمجھیں گے اور اُن کا آدر کریں گے (مجھے راستہ دے دو کہ میں ہندوستان چلا جاؤں) حسینؑ کی زبان سے نکلے ہوئے ان شبدوں کا ذکر کتابوں میں موجود ہے، ابھی ۱۶/مارچ ۱۹۵۸ء داؤد علی مرزا رکن پارلیمنٹ نے پارلیمنٹ کے اجلاس میں مسئلہ کشمیر پر جو تقریر کی ہے، اس میں اس بات کا حوالہ دیا ہے کہ حضرت امام حسینؑ ہندوستان آنا چاہتے تھے۔

(اخبار سیاست، ۱۷/مارچ ۱۹۵۸ء حیدر آباد دکن)

حسینؑ اور ہندوستان کا یہ سمبندھ دن بہ دن مضبوط ہوتا گیا، اور ایک دن وہ سمے آیا کہ جب بھارت دیس کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے والے گاندھی جی جیسے بڑے آدمی نے جب وہ پہلی دفعہ حکومت کا قانون توڑنے اُٹھے تھے، اور نمک بنانے جا رہے تھے، اپنی زبان سے یہ بات کہی کہ میں حضرت امام حسینؑ کے انوکرن میں اپنے ساتھ بہتر آدمی حکومت کے مقابلے کے لئے لے کر جا رہا ہوں۔ گاندھی جی کی عزت ہندوستان کے ہر آدمی کے دل میں اُتنی ہے کہ یہاں کا ہر بچہ جوان اور بوڑھا انھیں باپو کہہ کر پکارتا ہے اور وہ بھارت دیس کے باپ مانے گئے ہیں۔ گاندھی جی کے من میں حسینؑ کے نام اور کام کی اتنی عزت تھی کہ انھوں نے دیس کی بھلائی اور حکومت سے لڑائی کا کام حسینؑ کا نام لے کر شروع کیا۔ یہ ہے حسینؑ اور ہندوستان کا سمبندھ، ابھی ہمیں اس سمبندھ کے پرمان میں بہت سی باتیں کہنی ہیں مگر پہلے اس لڑائی کا سماچار تھوڑا بہت سنا دینا ضروری ہے۔

دشمنوں کے لشکر نے حسینؑ کی کوئی بات نہیں مانی، اور حسینؑ نے دشمنوں کی بات جس کے ماننے سے عزت، آبرو، دھرم اور جنتا کی سیوا کا مہا کاج، سب پر، پانی پھر جاتا، منظور نہیں کی اور لڑائی ٹھہر گئی۔

دشمنوں نے پہلا کام یہ کیا کہ جو کسی دھرم، اور کسی دیس کے آدمیوں نے نہیں کیا ہوگا کہ حسینؑ کے

خیموں اور نہر کے بیچ میں فوج کی ایک دیوار کھڑی کر دی، اور پانی لے جانے کا راستہ بند کر دیا۔ وہ پانی، جس کو پیدا کرنے والے نے اپنے سب بندوں کے لئے، وہ امیر ہوں، غریب ہوں، بادشاہ ہوں، فقیر ہوں، بغیر کسی مول تول کے، سنسار کی پیدائش کے پہلے دن سے عام کر رکھا ہے، اور جو کبھی جانوروں کے لئے بھی بند نہیں کیا جاتا۔ پانی نہ ملنے سے محرم کی دس تاریخ تک یہ حال ہو گیا کہ پیاس کے مارے سب کی زبانیں سوکھ کر تالوؤں سے چمٹ گئیں۔ بوڑھے اور جوان آدمیوں نے بڑے سنتوش اور دھیرج سے کام لیا، لیکن بچوں کی زبانوں میں 'پانی پانی' اور 'پیاس پیاس' کی آوازیں خیموں میں گونج کر حسینؑ کے ساتھی عورتوں اور مردوں کے دلوں کو تڑپا رہی تھیں۔

پچھلی رات کو حسینؑ نے اپنے بہتّر ساتھیوں کو ایک خیمہ میں اکٹھا کر کے وہ تقریر کی تھی، جو تیرہ سو برس سے آج تک ہر آدمی کو اچنبھے میں ڈال رہی ہے۔ حسینؑ نے کہا کہ میرے دوستو، بھائی، بیٹو، بھتیجو اور بھانجو! تم سب میرا ساتھ دینے سے ہاتھ اُٹھا لو، اور مجھے اکیلا چھوڑ کر جس طرف چاہے چلے جاؤ، میں تمہیں کھلے دل سے اجازت دیتا ہوں، مجھے تمہارے چلے جانے سے کوئی رنج نہیں ہوگا۔ یہ لوگ صرف میرے لہو کے پیاسے ہیں، انھیں تم سے کوئی سروکار نہیں ہے، یہ تم سے کچھ نہیں بولیں گے۔ انھوں نے میری سہائتا کو آنے والوں کا راستہ روکا ہے، مجھے چھوڑ کر جانے والوں سے یہ کوئی جھگڑا نہیں کریں گے۔ مگر کوئی اس بات پر راضی نہیں ہوا۔ اب حسینؑ نے وہ دِیا جو خیمہ میں جل رہا تھا، بُجھا دیا کہ جو آدمی اپنے من میں اپنی جان بچا کر چلے جانے کا بِچار کر رہا ہو، اور جسے سب کی آنکھوں دیکھتے جاتے ہوئے لاج آتی ہو، وہ اندھیرے میں چلا جائے، مگر ایسا نہیں ہوا، یہ لوگ اپنی دُھن کے پکے اور اپنے ارادے کے مضبوط رہے۔

اسی رات کو جب حسینؑ اپنے خیمے میں ساتھیوں کی جانیں بچانے کی کوشش کر رہے تھے، عورتوں کے خیموں میں، مائیں اپنے اپنے بچوں کو، بہنیں اپنے اپنے بھائیوں کو، باپ دادا کی بہادری کی کہانیاں سنا سنا کر دشمن سے لڑنے، اور حسینؑ کے ساتھ جان دینے کے لئے تیار کر رہی تھیں۔

صبح ہوتے ہی دشمن کی فوج نے میدان سے نکل کر اپنے پرے جما لئے۔ حسینؑ اور ان کے ساتھی بھی نماز پڑھ کر سامنے آ گئے، حسینؑ نے پھر ایک مرتبہ دشمن کی فوج کی طرف منہ کر کے اور ان کو پکار کے ایک اپدیش دیا۔ لڑائی سے باز آنے کے لئے سمجھایا اور اچھی طرح یہ بات ان کو سمجھا دی اور جتلا دی کہ میرا کوئی دوش نہیں ہے، میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا ہے اور سوائے بھلائی کے کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اس اپدیش کو سن کر چار آدمی دشمن کی فوج سے نکل کر حسینؑ کی طرف آ گئے۔ سنسار نے دیکھ لیا کہ سچائی میں کتنی طاقت، اور ست کی آواز میں کتنا کَس بل ہوتا ہے۔ یہ لوگ یہ سمجھ کر اور جان بوجھ کر اس طرف آئے تھے، جہاں سوائے بھوک، پیاس، اور موت کے اور کچھ نہیں تھا، جن پُستکوں میں اس لڑائی کا ذکر ہے، ان کی چھان بین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رات کے وقت بھی بیس آدمی یزید کے لشکر سے نکل کر حسینؑ کے ساتھیوں میں آ کر مل گئے تھے، یہ سماچار اس بات کا پرمان ہے، کہ حسینؑ کی طرف سچائی کی روشنی تھی اور ان کے دشمنوں کی طرف جھوٹ کا اندھیرا۔

لڑائی شروع ہوئی اور سورج ڈوبنے سے پہلے ختم ہو گئی، بہتر تین دن کے پیاسے آدمیوں کا تیس ہزار خون کے پیاسے آدمیوں سے مقابلہ، جو کٹورے بھر بھر کر پانی پی رہے تھے اور دھرتی پر لنڈھا رہے تھے مگر حسینؑ کے پیاسے ساتھی کیا بہادر تھے، ایک ایک مرنے والا پچاس پچاس، سو سو اور اس سے بھی زیادہ دشمنوں کو ٹھکانے لگا کر زمین پر گرا ہے۔ ہم پوری لڑائی اور ایک ایک حسینؑ کے ساونت ساتھی کا حال کہاں تک بیان کر سکتے ہیں۔ بہت سی باتیں کہنے کے قابل ہیں مگر اتنا وقت کہاں سے لائیں، پھر بھی دو ایک باتیں ضرور کہنی ہیں۔

دوپہر کے بعد جو نماز پڑھی جاتی ہے اور جسے ظہر کی نماز کہتے ہیں، لڑتے لڑتے اس کا وقت آ گیا۔ دشمن کے لشکر سے برابر تیر آ رہے تھے مگر یہ اللہ کو یاد رکھنے والے بندے نماز کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ حسینؑ امام تھے، وہ سب کے آگے، اور سب ان کے پیچھے، نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہو گئے، مگر حسینؑ کے دو منچلے ساتھیوں نے ایسا جیوٹ کا کام کیا ہے کہ جس کو سن کر بڑے بڑے

سورماؤں کے ہوش اُڑ جاتے ہیں۔ ان دو موت سے کھیلنے والے سپاہیوں نے نماز نہیں پڑھی، یہ دونوں حسینؑ کے سامنے کھڑے ہوگئے اور جتنے تیر آئے، اپنے سینوں پر لیتے رہے۔ نماز ختم ہوتے ہی ان میں کا ایک بہادر گرا اور ختم ہوگیا، اور پھر دوسرا لڑائی میں شریک ہوا، تلوار کھینچ کر دشمنوں پر جا پڑا اور بہت سے دشمنوں کو مار کر اپنی جان دے دی۔ ایسے موقعوں پر ہر بہادر آدمی کی یہ اِچھّا ہوتی ہے کہ دو چار دس پانچ کو مار کر مرے، لیکن ان دونوں نے اپنے دل پر کتنا بڑا پتھر رکھا ہوگا، جب یہ سمجھ کر حسینؑ کے سامنے کھڑے ہوئے تھے کہ ہمیں صرف تلوار کھانا ہے، تلوار چلانا نہیں ہے۔ بہادری کے ایسے نمونے، اور وفاداری کی ایسی مثالیں سنسار میں شاید ہی کبھی دیکھنے یا سننے میں آئی ہوں گی۔

حسینؑ کے ساتھیوں میں بارہ چودہ برس کے بچے بھی تھے، اور اٹھارہ برس کا جوان حسینؑ کا لاڈلا بیٹا بھی تھا، سب چھوٹے بڑے، خوب خوب لڑے، اٹھارہ برس والا جیالا دشمنوں کی صفوں میں گھس کر اور لڑ بھڑ کر پھر نکل آیا۔ باپ کو آ کر سلام کیا، اپنی پیاس کی تکلیف بیان کی، اور پھر واپس جا کر لڑا اور شہید ہوگیا۔ اب ہمیں ایک اڑتیس برس کے جوان، حسینؑ کے سوتیلے بھائی عباسؑ کا حال اور ایک حسینؑ کے چھ مہینے کے بچہ کا سماچار اور بیان کرنا ہے۔

عورتوں اور بچوں کو پیاس کی تکلیف مردوں سے کہیں زیادہ تھی۔ یہ دیکھ کر عباسؑ نے ایک سوکھی مشک بھی اپنے ساتھ رکھ لی تھی۔ یہ اس چھوٹی سی فوج کے افسر تھے۔ لشکر کا نشان بھی ان کے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ بھائی سے اجازت لی، اور دریا پر تیر کی طرح چلے، اور ایسی تلوار چلائی کہ بہت سے آدمیوں کو گرا کر، بھگا کر، اور لوہے کی صفوں کو توڑ کر کنارے پہنچ گئے۔ خود پانی نہیں پیا، مشک پانی سے بھر لی، اور اسی طرح تلواریں مارتے ہوئے واپس آ رہے تھے کہ کسی دشمن کے وار سے ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑا۔ فوراً ہی دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر راستہ صاف کرنے لگے۔ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے، کہ دوسرا ہاتھ بھی کٹ کر بے کار ہوگیا۔ اس حالت میں بھی

گھوڑے کو ایڑ دیتے ہوئے، مشک کے تسمہ کو دانتوں میں دبائے ہوئے، حسینؑ کے خیموں کی طرف بڑھے چلے جاتے تھے کہ اتنے میں مشک کے اوپر ایک تیر آ کر لگا، اور پانی بہنے لگا۔ اب جس مطلب سے ہاتھ کٹ جانے پر بھی مشک چھاتی سے لگائے بڑھے چلے جا رہے تھے، وہی پانی نہیں رہا، تو حوصلہ بھی ٹوٹ گیا۔ گھوڑے سے گرے، مشک اور نشان چھاتی سے لگائے ہوئے دنیا سے رخصت ہوگئے۔

اب چھ مہینے کے بچہ کی بات سنو۔ چھ مہینے کے بچہ میں کیا جان ہوتی ہے، ماں کا دودھ سوکھ گیا، پانی کا پتہ نہیں، عرب دیس کی گرمی، جلتی ہوئی دھوپ میں خیمے، بچہ کی حالت بہت بگڑ گئی۔ حسینؑ اب اکیلے تھے اور اس آخر وقت میں بیبیوں اور بچوں سے رخصت ہونے کے لئے، جن میں ایک چار برس کی لاڈلی بچی بھی تھی، حسینؑ خیمہ میں گئے، اور وہاں چھ مہینے کے بچہ علی اصغرؑ کو دیکھا کہ پیاس کی تکلیف سے ایسا نڈھال ہو رہا ہے کہ اس کے جینے کی آس باقی نہیں رہی ہے۔ حسینؑ نے سوچا کہ شائد یہ لوگ ترس کھا کر اس بچہ کو دو بوند پانی پلا دیں، اور اس کی جان بچ جائے۔ اس سوچ بچار کے بعد ماں کی گود سے لے کر میدان میں آ گئے۔ دشمنوں کو اس کی حالت دکھائی اور کہا کہ تم اپنے ہاتھ سے اسے پانی پلا دو۔ دشمن کے لشکر میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی تھی کہ سینا پتی کے حکم سے ایک پتھر دل والے آدمی نے تاک کر ایسا تیر بچہ کے گلے پر لگایا کہ وہ تڑپ کر باپ کے ہاتھوں پر تمام ہوگیا۔ اس سنسار میں ایسا اپرادھ کبھی نہ دیکھنے میں آیا تھا، نہ سننے میں۔ کربلا کے سماچار کا یہ ایسا دکھ بھرا قصہ ہے جس کو سن کر ہر آدمی کے آنسو نکل آتے ہیں، اور ہر دھرمی اور ادھرمی کا دل سینہ میں تڑپ جاتا ہے۔

اب دشمن حسینؑ کی جان لینے کے لئے بڑھے، اور چاروں طرف سے ہزاروں نے گھیر لیا۔ حسینؑ کوئی معمولی آدمی نہیں تھے، وہ بڑے سورما تھے، اور کمزوروں کی طرح بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے جان دینا گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمانوں کا دھرم یہ ہے کہ اپنی طرف سے پہل نہ کرو، مگر جب تم پر کوئی

ہاتھ اٹھائے تو پوری طاقت سے مقابلہ کرو، پھر تم پر کوئی دوش نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ایسا نہیں کیا وہ بادشاہ ہوں، یا فقیر مسلمانوں کو اور مسلمانوں کے دھرم کو بدنام کرنے والے ہیں۔ یہ دھرم حسینؑ کے نانا ہی کا تو پھیلایا ہوا تھا، حسینؑ سے زیادہ کون اسے سمجھ سکتا تھا، جو اپنی زبان اور اپنے کام سے اس کی سیوا اور اس کا پرچار کرتے رہے۔

حسینؑ تین روز کے بھوکے اور پیاسے تھے، زخموں سے چور چور ہو رہے تھے، سب بھائی، بیٹے بھتیجے، اور بچپن کے مِتر آنکھوں کے سامنے اپنی جانیں دے چکے تھے، ایک چھ مہینے کا بچہ تو ان کی گود ہی میں تیر سے ذبح کر دیا گیا تھا، ایسی حالت میں آدمی کے حواس باقی نہیں رہتے، مگر حسینؑ کے ساتھ ست کی شکتی، اور دھرم کی سہائتا تھی۔ پیدا کرنے والے کی طرف دھیان لگائے ہوئے اور یہ کہہ کر کہ مجھے خون بہاتے ہوئے افسوس ہوتا ہے، لیکن یہ لوگ مجھے اس پر مجبور کئے دیتے ہیں، تلوار کھینچ لی، اور ایسا ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ تین مرتبہ دشمن کے پورے لشکر کو پیچھے ہٹ جانا پڑا، اور کسی میں سامنے آنے کی (کا) ساہس باقی نہیں رہی (رہا)، اب دور سے تیروں کی بوچھار ہو رہی تھی اور پتھر پھینک پھینک کر زخمی کیا جا رہا تھا۔ کتابیں ہمیں بتاتی ہیں کہ کئی سو آدمی اس وقت حسینؑ کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ حسینؑ اب بھی کسی کے بس کے نہیں تھے، مگر اس نماز کا وقت آ گیا تھا، جو سورج کے ڈوبنے سے پہلے پڑھی جاتی ہے۔ تلوار نیام میں کر کے گھوڑے سے اُترے اور دونوں ہاتھوں سے کربلا کے میدان کی مٹی جمع کر کے سجدہ کرنے کی جگہ بنائی، اور پوری شانتی اور سنتوش کے ساتھ نماز شروع کر دی۔ جس وقت سجدہ میں گئے ہیں، یہ بھاگنے والے کائر سپاہی چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے، اور سجدہ کی حالت میں گردن کے پیچھے سے تلوار پھیر کر شہید کر دیا۔ قاتل نے سر اٹھا کر برچھی کی انی پر بڑے گھمنڈ کے ساتھ رکھا، اور اپنے اپرادھی ساتھیوں کو لڑائی ختم ہونے کی خبر دی۔ اس کے بعد بہت سے مہا کائر، دُشٹ اور پاپی مسلمان سامان لوٹنے کے لئے حسینؑ کے خیمے میں چلے گئے۔ سامان بھی لوٹا اور خیموں

میں آگ بھی لگا دی جس کے کارن بی بیوں اور بچوں کو باہر میدان میں نکلنا پڑا اور سیناپتی کے حکم سے ان سب بیبیوں اور بچوں کو رسی میں باندھا گیا۔ حسینؑ کے بیمار بیٹے کو اس کے بستر سے کھینچ کر، ہاتھوں میں رسی باندھ دی، اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی۔ یہ بیبیاں اور بچے جو کہیں آ نہ سکتے تھے، نہ جا سکتے تھے، اس لڑائی کے قیدی بنائے گئے اور دوسرے دن صبح کو اسی حالت سے، کہ ان کے سروں پر چادریں تک نہیں تھیں، ساتھ لے کر حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں جنگل میں بغیر گور گڑھے کے چھوڑ کر، کوفہ کی طرف چل پڑے، جہاں یزید کا گورنر ابن زیاد حکومت کر رہا تھا، جو حسینؑ کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ دکھ درد کی کہانی بہت بڑی ہے اور بہت سی باتیں وقت کی کمی کے کارن بیان کرنے سے رہی جاتی ہیں لیکن ہمیں حسینؑ سے بھارت کا سمبندھ بتانا اور سمجھانا ہے اور یہی اس لیکھتا کا ادھکار ہے۔

یہ قیدی کربلا سے کوفہ، اور کوفہ سے شام، یزید کی راجدھانی کو اس طرح لے جائے گئے کہ آگے آگے حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کے سر، برچھیوں کی انیوں سے بندھے ہوئے تھے، اور پیچھے پیچھے اونٹوں پر قیدی سوار تھے۔ راستے میں جن جن شہروں اور بازاروں سے گذر ہوا ہے، وہاں سے اس انیائے اور اپرادھ کی خبر سارے دیس میں آگ کی طرح پھیل گئی اور بہت سے مسلمان جن کے دلوں میں نیائے اور دھرم کا ذرا سا بھی خیال تھا، اپنے پیغمبرؐ کے نواسے حسینؑ کا سوگ منانے لگے، اور یہ سال کے سال سوگ منانے کی ریت مسلمانوں کے دھرم کا ایک کارج بن گئی۔ سوگ سارے ہی مسلمان مناتے ہیں مگر طریقے ذرا الگ الگ ہیں۔

اسی طرح سال کے سال گھروں کے اندر، گھروں کے باہر، میدانوں میں، بازاروں میں، سوگ منانے کا سب سے اتم پربھاؤ یہ ہے کہ ہر سال گیارہ مہینے بعد یہ سماچار یاد آ جاتا ہے اور سنسار کو یہ شِکشا ملتی ہے، کہ جنتا کی بھلائی اور سَت کا پالن کرنے کے لئے، جھوٹوں، اپرادھیوں، اور ادھرمیوں کے مقابلہ میں، اسی طرح ڈٹ جانا چاہئے، اور جان مال کسی چیز کی پرواہ نہیں کرنی چاہئے۔ حسینؑ

اوران کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا ہے، وہ صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں کیا ہے، بلکہ سارے سنسار کو سبق دیا ہے۔ اس شکشا میں کسی دھرم، کسی جاتی، کسی دیس کا سوال نہیں ہے؟ جو بھی اس سے فائدہ اُٹھائے، اسی کے لئے ہے۔

ہمارے بھارت دیس میں یہ سوگ ہر دیس اور ہر ملک سے زیادہ منایا جاتا ہے، اور مسلمانوں کے علاوہ، ہزاروں ہندو بھائی حسینؑ کو اس طرح مانتے ہیں اور اس طرح سوگ مناتے ہیں، جیسے حسینؑ اُن کے اپنے ہیں اور ان کی گنتی بڑے بڑے دیوتاؤں میں ہے۔ اتر پردیش ہو یا مدھیہ پردیش، پنجاب ہو یا بنگال، ہندوستان یا پاکستان، تبت سے راس کماری تک ہندو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ حسینؑ کا سوگ منانے میں شریک ہیں، تعزیہ رکھتے ہیں، علم سجاتے ہیں، روتے ہیں، ماتم کرتے ہیں، کویتائیں پڑھتے ہیں اور پھر یہ بات نہیں کہ اَن پڑھ ہندو ہی سوگ منانے والے ہیں، بڑے بڑے ودوان پڑھے لکھے ہندو حسینؑ کے گُن گاتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمارے دیس کے ہندو کوی جنھوں نے پردیسی حسینؑ کے لئے کویتائیں کہی ہیں، اگر ان کے نام لکھے جائیں تو ایک چھوٹی سی پُستک تیار ہو سکتی ہے۔ بھارت میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس میں حسینؑ کے لئے کویتا نہ ہو۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے ہندوؤں نے پُستکیں لکھی ہیں اور پریم چند تو ابھی حال میں ہمارے سامنے موجود تھے، جن کی پُستک ''کربلا'' اردو زبان میں چھپ چکی ہے، اُونچی ذات کے برہمنوں سے لے کر، گونڈ، بھیل اور لمباڑے تک حسینؑ کے چاہنے والوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

ہندوستان میں دت برہمنوں کی ایک شاخ ہے جو ''حسینی بامن'' کہلاتے ہیں۔ یہ گنگا، جمنا، سرجو، گھاگھرا کے میدانوں میں الٰہ آباد، گورکھپور کی بستیوں میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں دت، وید، چھیبر، بلی، لاؤ، موہار، بھونیوال کتنی ذاتیں ہیں۔ یہ لوگ ایرین قوم کے ہیں، سرخ وسفید اور مضبوط جسم والے ہوتے ہیں۔ مہاراجہ بنارس، بینا تہوا، ٹکاری، لال گولہ اور مہاراجہ صاحب

تمکوہی بھی اسی قوم سے ہیں۔ مہا بھارت سے بھی پہلے ان کی قوم کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے خاندانی خطاب مہتا، بخشی، رائے زادے، ملک اور رائے شاہی زمانے کے دیئے ہوئے ہیں۔ ان کا سلسلہ بہار، یو۔ پی۔ اور پنجاب میں دور تک پھیلا ہوا ہے۔ ان ساتوں ذاتوں میں دت بہت مشہور ہیں، یہ دت کا شبد سنسکرت کے شبد داتا سے نکلا ہے۔

یہ لوگ ایشیا کے بیچ کے حصوں، افغانستان، ایران، عرب میں بھی رہے بسے ہیں، اور اپنی تلوار کی دھاک بٹھا چکے ہیں۔ کہانیوں، کہاوتوں اور کبتوں میں ان کا ذکر آیا ہے۔ شاہ محمد نذیر ہاشمی کی کتاب شہادت عظمیٰ مرزا محمد عظیم بیگ کی رپورٹ بندوبست گجرات ۱۸۶۸ء اور جنگ نامہ صفحہ ۱۷۵ وصفحہ ۱۷۶ / احمد صاحب پنجابی کی لکھی ہوئی پُستک سے پتہ چلتا ہے کہ دت قوم کے بامنوں نے کربلا کی لڑائی میں حسینؑ کا ساتھ دیا، اور ان کے دشمنوں سے لڑے تھے، اور ایک پوربی زبان کے کبت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حسینؑ کی شہادت کے بعد امیر مختار کے ساتھ شریک ہو کر حسینؑ کے دشمنوں سے بدلہ لیا تھا۔

اس کبت کے بعض شعروں کا مطلب ہم بیان کررہے ہیں، ایک جگہ کہا ہے کہ ''بزدل سب بھاگ کر نظروں سے غائب ہو گئے۔ دت لوگوں نے حضرت امام حسینؑ کی پوری پوری مدد کی اور ایک قدم بھی میدان سے پیچھے نہ ہٹے۔''

دوسری جگہ لکھا ہے کہ ''جب انھوں نے میدان جنگ میں فتح پائی تو خوب خوشی اور فتح کے نقارے بجائے گئے۔ شور ہوا کہ قتل حسینؑ کا بدلہ لے لیا گیا۔''

پھر ایک جگہ لکھا ہے ''راہب کے سات لڑکوں نے حسینؑ کی رفاقت کا حق ادا کیا۔ انھوں نے مظلوم شہید پر اپنی جانیں قربان کردیں۔ اے حسینؑ کی سنتان (اولاد) اور حسینؑ کے نام لینے والو! تمہارا فرض ہے کہ تم دت لوگوں کو نہ بھلاؤ۔''

شاہ محمد نذیر ہاشمی کی کتاب اور ہماری کتاب حسینؑ اور ہندوستان میں یہ کبت موجود ہے۔ دت

لوگوں میں ایک کتاب ''حسینؑ پوتھی'' کے نام سے دیکھی گئی ہے جو کہیں کہیں خاص موقع پر پڑھی اور سنی جاتی تھی۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ:

''غازی پور میں رائے بہادر سالک رام اسی قوم سے تھے، اوران کے پاس کچھ کویتائیں اسی طرح کی تھیں۔ مجھے خود بھی ایک ڈاکٹر رام لال پانی پت میں ملے جو حسینی بامن تھے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کے کتنے ہی کبتوں میں ایسی پُستکیں اور کویتائیں کبت اور مثلیں مل سکتی ہیں، جن سے حسینؑ اور ہندوستان کے سمبندھ کا زیادہ حال معلوم ہوسکتا ہے۔

ہندوستان میں بیس بائیس ریاستیں ایسی تھیں جہاں ریاست کی طرف سے سال کے سال حسینؑ کا سوگ منایا جاتا تھا، جن میں گوالیار کی ریاست سب سے آگے تھی۔ اس کے راجاؤں نے محرم کے دنوں میں جب ان کا لشکر کسی لڑائی کے کارن شہر سے باہر پڑا تھا، جنگل میں بھی یہ سوگ منایا اور ایک چھولداری میں علم وغیرہ سجائے ہیں اور مجلس، ماتم ہوا ہے، یہ بات میں نے ایک انگریز کی رپورٹ ''Letters from Maratha Camp'' سے نقل کی ہے۔ گوالیار کے مہاراجہ حسینؑ کے نام پر فقیر بنتے تھے اور دس محرم کو تعزیہ کے ساتھ پیدل جاتے تھے۔

کوئی قوم ہندوستان کی ایسی نہیں ہے جس میں حسینؑ کا سوگ نہ منایا جاتا ہو۔ سنا ہے، لاہور میں سکھوں کی طرف سے بھی ایک تعزیہ اٹھایا جاتا تھا۔

حسینؑ کے ماننے والوں میں، برہمن بھی ملیں گے، اور ہریجن بھی۔ یہ ہے حسینؑ اور ہندوستان کا سمبندھ۔ مگر اس سمبندھ کا حال سارے بھارت باشیوں کو معلوم نہیں۔ بہت کم آدمی اس بات کو جانتے ہیں کہ حسینؑ نے بھارت کی طرف آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا، اور وہ ہر سال بھارت کے مہمان ہوتے ہیں۔ یہ بات نہ جاننے کی وجہ سے انگریز راج کے سمے کبھی کبھی ہندو مسلمانوں میں علم تعزیہ کے کارن جھگڑا ہو جاتا تھا۔ اگر یہ بھید سب ہندو بھائیوں کو معلوم ہوتا اور ان کو یہ بتا دیا جاتا کہ حسینؑ تو بھارت کے مہمان ہیں، اور تمہارا ان کا تیرہ سو برس کا سمبندھ ہے، تو ہمیں وشواس ہے کہ کبھی ایسے

لڑائی جھگڑے کی نوبت نہ آتی، اور سب ہندو بھائی تعزیہ کا آدر کرتے، اور حسینؑ کے سوگ میں مسلمانوں کا ساتھ دینا دھرم کی بات سمجھتے۔

حسینؑ کے سوگ منانے میں کسی قوم اور دھرم کے آدمی کو دکھ پہنچنے کا کوئی کارن ہی نہیں ہے۔ یہ لڑائی جو کربلا کے میدان میں ہوئی ہے کسی دوسری قوم سے نہیں ہوئی تھی، مسلمانوں کی آپس کی لڑائی تھی۔ ایک طرف سچے مسلمان تھے اور دوسری طرف نام کے مسلمان۔ ایسے سماچار میں کسی قوم کو حسینؑ کا سوگ منانے والوں سے کیا شکایت ہوسکتی ہے؟! بھارت کے رہنے والے مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی، کسی دھرم کے ماننے والے ہوں، سب سے حسینؑ کا سمبندھ ہے۔ بات اتنی ہے کہ کسی کو خبر ہے، اور کسی کو نہیں ہے۔ ہم نے اپنی کِوتیا کربل نگری میں بھی اس سمبندھ کا ذکر کیا ہے، اور اپنی پُستک ''حسینؑ اور ہندوستان'' میں پورا پورا حال لکھا ہے۔ ہم نے حسینؑ اور ہندوستان کے سمبندھ کا سہارا لے کر اپنے ہندی بھاشا کی کویتاؤں میں ہندو مسلم میل جول کی اپیل کی ہے جس کے بعض بعض شعر ہم لکھتے ہیں:

(۱)

اب جا کے ہمالہ پربت سے، لے ماتم کی ٹکراتی ہے
اس دیس کی نجمیؔ دور بلا، جس دیس پہ غم چھائے گیا

(۲)

جب آئے حسینی سیوا میں، سب ہندو مسلم ایک ہوئے
مل جائیں گے نجمیؔ دل بھی کبھی جب اُن کی نجر پر بات رہی

(۳)

اپنے کو جو چاہے نجمیؔ اس کو کون نہ چاہے
بھارت ماتا سوگ منا کر من ہر لیں ہمارا

(۴)

سوامی کتنی دورتے لگا پریمی بان
اٹھی لہر فرات سے پہنچی ہندوستان
بھومی رام کرشن کی کربل کا سندیس
آنسو تمرے سوگ کے اور گنگا جمنی دیس
دو جگ کے سہارے کیا کہنا
ست جگ کے ستارے کیا کہنا

(۵)

اس دیس کی آنکھیں بھی، نجمی پیاسی تھیں حسینی درشن کی
بھارت میں اجالا پہنچا ہے، کربل میں درس دکھلایا تھا

حسینؑ اور ہم

شاعر اہل بیتؑ علامہ نجم آفندی صاحب

کیا حسینؑ کی عظیم الشان شہادت کا راز چند رخساروں پر بہنے والے آنسوؤں میں مضمر ہے، کیا چالیس روز کی سینہ زنی اور ایک روز کی فاقہ کشی حسینؑ کی عدم المثال قربانی کا ماحصل ہوسکتی ہے۔

یا کربلا کے دل ہلا دینے والے تاثرات کی دنیا اس قدر محدود سمجھی جائے۔ کیا حسینؑ اور حسینؑ کے بچوں کا خون صرف اس مقصد کے لیئے پانی کی طرح بہا گیا تھا کہ ایک رونے والا گروہ تیار کیا جائے۔

برائے خدا یہ کون سا فلسفہ ہے کہ حسینؑ اس لیئے شہید کیئے جائیں کہ حسینؑ پر رونے والے پیدا ہوں۔

کیا ہماری سیہ کاریوں کے دفتر دھونے کے لیئے حسینؑ کے خون کی ضرورت تھی۔ کون ہے جو ان سوالوں کا جواب اثبات میں دے سکتا ہے۔

حسینؑ کو کیوں شہید کیا گیا؟ ـــــ حسینؑ دنیا سے کیا چاہتے تھے؟ ـــــ حسینؑ سے دنیا کیا چاہتی تھی؟ ـــــ حسینؑ نے یہ قربانیاں کیوں گوارا کیں؟

کیا صرف حسینؑ پر رونا حسینؑ کی محنت کا صحیح اعتراف ہے۔ حسینؑ کے کروڑوں ماتم داروں میں کتنے فرد ہیں جنھوں نے کبھی ان مسائل پر غور کرنے کی زحمت برداشت کی ہے۔ یہ دو چار سوال ہیں جن پر اس شہید اعظم کی یادگار میں قلم اٹھانے کی جرأت کر رہا ہوں۔ حسینؑ کو کیوں شہید کیا گیا؟ یہ کوئی راز نہیں ہے نہ کوئی ایسا پر پیچ مسئلہ ہے جس پر بڑی بڑی مبسوط کتابیں لکھنے کی ضرورت ہو۔ حسینؑ کے قبضے میں کوئی سلطنت نہ تھی جس کے لیئے کسی حکومت کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ نہ کوئی پوشیدہ ریشہ دوانی کی تھی۔ حسینؑ ایک اچھے آدمی ہو کر رہے۔

یہی ان کی شہادت کا قوی سبب تھا۔ اگر حسینؑ معاذ اللہ برے ہوسکتے، برے بنائے جاسکتے، تو

حکومت کی تلوار ان کی گردن سے دور رہتی۔ مجھے کوئی پیچدار بات کہنی نہیں ہے میں جو کچھ کہوں گا سادے لفظوں میں اور سامنے کی بات جس کے لیئے نہ قلم کی معرکہ آرائی درکار ہے نہ منطقی دلائل۔ حسینؑ دنیا سے کیا چاہتے تھے؟ حسینؑ دنیا سے اپنے لیئے کچھ نہیں چاہتے تھے۔ دنیا کے پاس حسینؑ کے قابل کچھ نہ تھا۔ حسینؑ کے پاس وہ سب کچھ تھا جو دنیا کے پاس نہ تھا اور جس کی دنیا کو ضرورت تھی۔ حسینؑ انسان کو صحیح معنے میں انسان دیکھنا چاہتے تھے۔ حسینؑ سے دنیا کیا چاہتی تھی۔ یہ کہ حسینؑ بھی ہم میں سے ایک فرد ہو جائیں۔ حسینؑ کی ہستی صرف قول سے ہی نہیں عمل سے بھی یہ بتاتی تھی کہ خدا ہے اور یہ خطرناک تھا ان لوگوں کے لیئے جن کی مصلحت یہ چاہتی تھی کہ خدا نہیں ہے۔ کہاں یہ جذبہ کہ ہمارے لیئے سب کچھ ہو، کہاں سے تعلیم کہ سب کے لیئے ہو خواہ تمہارے لیئے کچھ نہ ہو۔ حسینؑ شہ نشینوں کو محراب عبادت بنانا چاہتے تھے۔ لوگ تھے کہ محراب عبادت میں درجے قائم کر رہے تھے۔ مساوات کا لفظ بھی ان لوگوں کے لیئے تلخ تھا جن کی زبانوں کو چٹخارے لینے کی عادت تھی، جن کی گردنیں بلند تھیں، جن کے معدے بھرے ہوئے تھے، جن کا مقولہ تھا 'تم باغ لگاؤ ہم پھل کھائیں' حسینؑ ان کو گلے سے لگا کر جن کی نحیف گردنوں پر لوگ سوار تھے، اسلام کی اس تعلیم کو یاد دلاتے تھے جس کے بھلانے کی کوششوں میں پچاس برس کا طویل زمانہ صرف کیا گیا تھا۔

امن وامان کے شہزادے حسینؑ کی خاموش جد و جہد، خون کی بارش اور تلواروں کی جھنکاروں سے نہ بدلتی اگر حسینؑ سے یہ چاہا جاتا کہ تم بھی تصدیق کر دو جو کچھ ہم کر رہے ہیں وہ حق ہے۔

اور حسینؑ نے یہ قربانیاں کیوں گوارا کیں اس لیئے کہ کسی قوم کے احساسات جب مردہ ہو جاتے ہیں تو جان دے کر زندہ کیئے جاتے ہیں۔ تم محکوم بننے کے لیئے پیدا کئے گئے ہو جو ہم دیں وہ لے لو۔ غنیمت یہ ہے کہ ہم تم کو اس فضا میں سانس لینے دیتے ہیں جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، ہماری آنکھوں سے دیکھو، ہمارے کانوں سے سنو اور ہماری زبان سے بولو۔ اس ماحول اور آب و ہوا میں پرورش پائے ہوئے لوگوں کی اصلاح کوئی آسان کام نہ تھا۔ حسینؑ آنے والے خطرے

سے آگاہ تھے اور اگر مافوق العادت قوت سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو آثار و قرائن بتا رہے تھے کہ وہ ہونے والا ہے جو ہوا۔ حسینؑ کے پاس وقت بھی تھا اور راستے بھی کھلے ہوئے تھے صرف عراق کا راستہ نہ تھا۔ ممکن تھا کہ حسینؑ عرب کے حدود سے نکل جاتے۔

لیکن یہ حسینؑ نے نہیں کیا۔ حسینؑ اگر منجانب اللہ ہدایت خلق کے لیئے مامور نہ بھی ہوتے تب بھی دو بڑے سبب تھے کہ وہ اس قربانی کے لیئے اپنے آپ کو تیار کریں۔

قوم جو بگڑ رہی تھی وہ حسینؑ کے نانا کی بنائی ہوئی تھی۔ یہ بھی نہ ہوتا جب سقراط خلق اللہ کی خدمت کے لیئے زہر کا جام پی سکتا ہے تو حسینؑ تو پھر حسینؑ تھے۔'' مدینہ میں بیٹھ کر موت کا انتظار نہیں کیا بلکہ کربلا تک استقبال کیا یہ حسینؑ کا تدبر تھا کہ انھوں نے اپنی شہادت کے لیئے کربلا کو پسند کیا کچھ لوگوں نے ہمدردی سے حسینؑ کو روکا تھا کہ مدینہ نہ چھوڑیں لیکن حسینؑ جانتے تھے کہ بفرض محال رسولؐ کے روضہ کا احترام بھی کیا گیا (جس کے بظاہر کوئی آثار نہ تھے) تو زہر کا پیالہ تیار ہو سکتا تھا۔ مدینہ کی مسجد موجود تھی، کسی ابن ملجم کا مل جانا بھی ناممکن نہ تھا اور قطامہ بھی دستیاب ہو سکتی تھی۔ اور پھر تاریخ صرف دو لفظوں میں حسینؑ کی شہادت کا تذکرہ کر کے خاموش ہو جاتی اور حسینؑ اپنی شہادت سے جو کام لینا اور جو اثر پیدا کرنا چاہتے تھے وہ نہ ہوتا۔ اثر پیدا کرنا مقصود تھا صرف اتنا ہی نہیں کہ قوم یہ فیصلہ کر سکے کہ حسینؑ حق پر تھے اور یزید ناحق پر، عالمگیر اثر قائم کرنا تھا، ایک ایسی حکومت کے خلاف جو آزادوں کو غلام بنا رہی تھی، قوم کی تباہی اخلاق کے ذمہ دار اور اپنی مصلحتوں کے ماتحت اس تباہی و بربادی کے تکملہ کی کوششوں میں سرگرم تھی وہ جذبات جنھیں غیرت و حمیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور جو قوموں کو ابھارتے ہیں، بتدریج فنا ہوتے جا رہے تھے۔ لوگ بھول چکے تھے کہ آزادی ہمارا فطری حق ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اسلام نے یہی سکھایا تھا، حسینؑ کی شہادت نے یہ بتا دیا بلکہ ذہن نشین کر دیا کہ اسلام نے کیا سکھایا تھا۔ اب تم کتنی ہی تاریکی پھیلاؤ دیکھنے والے اسلام کو حسینؑ کی روشنی میں دیکھ لیں گے۔ کیا صرف حسینؑ پر رونا حسینؑ کی محنت کا صحیح اعتراف ہے۔

میرا اصل موضوع یہی ہے اور مجھے اسی کے متعلق کچھ کہنا ہے۔ اگر قوم ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کرے ''کیا صرف حسینؑ پر رونا حسینؑ کا صحیح اعتراف ہے'' تو بہت مشکل ہے کہ فیصلہ ''ہاں'' پر ہو سکے۔

ہم نے، (حسینؑ کی ماتمدار قوم نے) ''حسینؑ کے کیرکٹر سے کیا اثر لیا ہے''، ''گریہ''، حسینؑ کا نام سن کر رو دو لیکن حسینؑ کے عمل اور ان توقعات سے جو حسینؑ کے نام سے وابستہ ہیں کوئی سروکار نہ رکھو۔ مجلسوں کو شاعری کا میدان، دلچسپ شاعرانہ سلیس تقریروں کا مرکز، سوزخوانی اور نوحہ خوانی کا دنگل بنا دو۔ یہ حسینؑ کی قربانیوں کا ماحصل ہے۔ جس قوم میں اتنا بڑا اور اہم واقعہ ہو جائے جو ایک عالم کو دعوت عمل دے رہا ہو، تاریخ جس کی نظیر نہ پیش کر سکے، جس کا ہر پہلو سبق آموز اور درس عمل کی بہترین مثال ہے۔ جو ہر سال اس طرح تازہ کیا جاتا ہے گویا آج ہی کا واقعہ ہے، اس قوم سے کیا امید کرنی چاہیئے۔ صرف چند آنسو!! ذرا سے غور کی ضرورت ہے۔ کون سی قوم ہے جس کے ہیرو ایسی جوش پیدا کرنے والی مثال چھوڑ گئے ہیں۔ قوم بن جاتی اگر جوش سے کام لیا جاتا اور سینہ زنی تک محدود نہ رہتا۔ اس سے زیادہ کسی قوم وملت کی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ کربلا کا سا اہم واقعہ ایک مذہبی رسم بن جائے۔ میں مجلس وماتم، علم وضریح، ماتمی جلوس وغیرہ کا مخالف نہیں ہوں، خود عزادار ہوں۔ میرے گھر میں عزاداری ہوتی ہے، میرا عقیدہ ہے کہ یہ ماتمی جلوس قوموں کو حسینؑ اور حسینؑ کے ذریعہ سے اسلام کی طرف متوجہ کرنے کے لیئے بہترین چیزیں ہیں۔ مجھے تاریخ دانی کا دعویٰ نہیں، میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ مظاہرہ کا زبردست اصول ہم شیعوں کی ایجاد ہے مگر کم از کم ایسا یہ پر اثر وشاندار مظاہرہ کسی دوسری قوم میں نہیں دیکھا گیا۔ اس قوم کو کیا کچھ نہ ہونا چاہیئے تھا اور یہی قوم آج کچھ نہیں ہے۔

میں یہاں قوم کی اخلاقی حالت، آپس کے برتاؤ، رواداری، امراء وغرباء کے تعلقات، ان کی ذہنیت ان امور پر تبصرہ نہیں کروں گا اس کے لیئے ایک دفتر کی ضرورت ہے۔ مجھے صرف چند قومی مسائل کا ذکر کرنا ہے اور بس۔ حسینؑ مظلوم اور یزید کی جنگ حق اور ناحق کی جنگ تھی۔ ہم حق کے طرفدار ہیں اور حسینؑ کے اس لیئے مداح ہیں کہ وہ حق پر اڑ گئے اور حق کے لیئے اپنی ہی جان نہیں

بلکہ اپنی جان سے زیادہ عزیز جانیں بھی قربان کر دیں۔ لیکن عمل تو درکنار آج ہم میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں کہ حق بات منہ سے نکال سکیں۔ مصلحتیں عبا وقبا کی دامنگیر ہیں، حق گوئی کے ثمرہ کو جو دنیا سے ملا کرتا ہے فتنہ وفساد کا لقب دے کر فتنہ وفساد کے خوف کی آڑ لیئے بیٹھے ہیں۔

حسینؑ کی مجلس میں موٹے موٹے آنسوؤں سے رونے والوں اور دونوں ہاتھوں سے ماتم کرنے والوں کے سامنے مشہد مقدس کا واقعہ بھی ہوا، نجف اشرف کا بھی، جنت البقیع کی بربادی بھی دیکھ لی، انھیں ہاتھوں کو واقعات پر پردہ ڈالتے اور پالیٹکس کی آڑ اواڑ لگاتے بھی دیکھا گیا۔ حسینؑ کے انصار نے حسینؑ سے یہ عہد کیا تھا ''خواہ کچھ ہو جائے ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے'' آج اسی قوم کے افراد حسینؑ کے ''ماتم دار'' ''خواہ کچھ ہو جائے'' کے پرزور الفاظ کے ساتھ حکومت سے وفاداری کا عہد باندھتے ہیں۔ کیوں؟ آج حکومت و رعایا میں حق ناحق کی جنگ ہو رہی ہے او رہماری قوم ہمیشہ سے حق کی طرفدار رہی ہے۔

زمانہ سے پست اور روبہ تنزل قوم، جس میں نہ کوئی اسپرٹ ہے، نہ اخلاقی جرأت تو وہ اس وقت تک نہیں سنبھل سکتی جب تک حسینؑ کی عظیم المرتبت قربانی کے مقصد سے چشم پوشی کرتی رہے گی۔ حسینؑ کا خون تیری سیہ کاریوں کے دفتر دھونے کے لیئے نہیں بہایا گیا ہے۔ حسینؑ کی شہادت ہماری نجات کا ذریعہ بن گئی۔ عقیدہ کی صحت میں کلام نہیں لیکن اس طرح نہیں کہ چار آنسو بہائے اور جنت خرید لی۔ ایسے افراد بھی ہوں گے جنھوں نے حسینؑ کے حسن عمل کی روشنی میں صحیح راستہ معلوم کر لیا وہ حسینؑ کی شہادت کے مقصد کو سمجھ گئے، انھوں نے حسینؑ کے اخلاق کی پیروی کی اور حسینؑ کی شہادت ان کی نجات کا باعث ہو گئی۔ حسینؑ نے یہی چاہا تھا اب قوم جو کچھ سمجھے

نجم کہتے ہیں شہادت جس کو عرف عام میں
یہ حسینؑ ابن علیؑ کا قوم کو پیغام ہے

❁❁❁

انصارِ حسینؑ اور شوق شہادت

شاعرۂ آل محمد محترمہ تنظیم زہراء نقوی کنیز آکبر پوری

عاشور کی گھٹاٹوپ رات ہے۔ ہر طرف ہو کا عالم ہے، فضا غمگین ہے، ایسی نازک شب میں شمع امامت کے اردگرد ان کے عاشق واصحاب پروانہ وار چکر لگا رہے ہیں۔ اصحاب کی تکبیروں کی آواز ہے اہل حرم تسبیح و تحلیل الٰہی میں مصروف ہیں۔

امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو اکٹھا کیا صرف اس بات کی وضاحت کے لئے کہ امامت کا انتخاب اجباری نہیں ہونا چاہئے جنت وجہنم کے راستے کا انتخاب اختیاری ہے مذہب اسلام جبر کا قائل نہیں ہے بلکہ ہر انسان اپنی عقل وشعور اور اپنی تربیت روحانی کے اعتبار سے کسی بھی نظریئے کو اخذ کرنے کا حقدار ہے اور ایسی ہی صورت میں راہِ حق کی شناخت ہوسکتی ہے اور باطل کے چہرے سے نقاب ہٹائی جاسکتی ہے۔

لہٰذا امام عالی مقام نے اپنے دوستوں کو بلایا دل ہلا دینے والا خطبہ ارشاد فرمایا۔ حمد وشکر پروردگار بجالانے کے بعد فرماتے ہیں:

''میرے اصحاب کے جیسے باوفا اور بہتر صحابی کسی کو نہیں ملے اور نہ میرے جیسے اہلبیتؑ کسی کو ملے ہیں۔ خدا آپ لوگوں کو جزائے خیر دے۔ میرے عزیز دوستو! اہل کوفہ مجھ سے جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔ تم سب کو اختیار ہے چاہے جس طرف چلے جاؤ یہ قوم صرف میری تلاش میں ہے انھیں تم سے کوئی کام نہیں ہے۔'' مجمع میں عجیب سکون ہے۔ دل لرز رہے ہیں۔ جاں نثار اصحاب خاموش ہیں۔

پھر امام نے فرمایا: اگر تمہیں شرم محسوس ہورہی ہے تو میں چراغ کو خاموش کئے دیتا ہوں تم

چاہے جس طرف چلے جاؤ، اور اپنی جان بچالو، اس لئے کہ جو میرے ساتھ رہے گا اس کا خون ناحق بہادیا جائے گا۔

اب اصحاب باوفا اور فداکار انصار خاموش نہیں رہ سکے۔ صبر نے دم توڑ دیا بالآخر زبان بولنے پر مجبور ہوگئی۔ اور نہایت شجاعانہ اور ایمانانہ اندازی میں بول اٹھے:

یابن رسول اللہ! ہمیں موت کا خوف نہیں ہے۔ اگر آپ حکم فرمادیں تو ہم اپنی گردنوں پر خود تلواریں چلالیں اور سر تن سے جدا کرلیں ہم آپ سے الگ جینا نہیں چاہتے ہم آپ کی راہ کو ترک کرنا گوارہ نہیں کرسکتے۔ یابن فاطمہ! یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم آپ کو چھوڑ کر چلے جائیں اور آپ کے بغیر زندگی گذاریں۔ ہم روز محشر آپ کے نانا حضرت رسولؐ خدا اور آپ کے پدر بزرگوار حضرت علی بن ابی طالبؑ کو کیا منھ دکھائیں گے۔ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے کہ ہم آپ کو نرغۂ اعدا میں تنہا چھوڑ کر آرام سے بیٹھے رہیں۔

زہیرابن قین جو قبیلہ بن غزوہ سے تعلق رکھتے تھے اور آپ اپنے قبیلہ کے بزرگ افراد اور شرفاء میں شمار ہوتے تھے۔ ۶۰ھ میں جب حج سے واپس ہورہے تھے امام سید الشہداء کی خدمت میں حاضر ہوئے امام کے وفادار اصحاب میں سے تھے۔ شب عاشور امام نے جب اصحاب سے چلے جانے کو کہا تو زہیر ابن قین کھڑے ہوگئے اور فرمایا: ہم نے آپ کی باتوں کو سنا اے فرزند زہرا! یہ دنیا ہماری نگاہ میں کوئی قیمت نہیں رکھتی اگر دنیا پائیدار اور مستحکم ہوتی اور ہم جاوداں ہوتے پھر بھی ہم آپ کی راہ میں شہید ہوجانے کو ترجیح دیتے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ قتل ہو جاؤں پھر زندہ ہوجاؤں اور دوبارہ قتل کردیا جاؤں یہاں تک کہ اگر ہزار بار بھی قتل ہوکر زندہ ہو جاؤں پھر بھی اس عظیم شہادت اور شیریں موت سے خوف نہیں کھاسکتا اور اس سعادت مند درجہ کو ہرگز چھوڑ نہیں سکتا۔

مسلم بن عوسجہ آپ نے کوفے کی صعوبتیں بھی برداشت کی ہیں۔ اس کے بعد کربلا آئے امام کی

تقریر سن کر اٹھ کر کھڑے ہوئے اور فرمایا:

واللہ ہم ہرگز آپ سے الگ نہ ہوں گے یہاں تک کہ دشمنوں کو تہہ تیغ کریں اگر ہمیں اسلحے کے ذریعہ جنگ کی اجازت نہ ملی تو ہم پتھروں سے آپ کے دشمنوں پر حملہ کریں گے اور اگر ہمیں قتل کر دیا جائے یا زندہ جلا دیا جائے۔ اور ہمارے جسم کے حصوں کو راکھ کی شکل میں فضا میں منتشر کر دیا جائے اور یہ کام بھی ۷۰ رمرتبہ ہو پھر بھی ہم آپ کی نصرت سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ آپ کی راہ میں یہ شہادت جاودانہ کرامات اور ابدی سعادت کا ہمیں پیغام دے رہی ہے۔

ہلال بن نافع بجلی بھی کھڑے ہوئے اور کہا:

یابن رسول اللہ! خدا کی قسم ہم شہادت اور موت سے ہرگز ڈرتے نہیں ہیں آپ کے دوستوں سے محبت اور آپ کے دشمنوں سے عداوت ہمارا ایمان ہے۔

بریر بن خضیر کہنے لگے اے فرزند پیغمبر! خدا کی قسم آپ کا وجود ہم پر خدا کا فضل وکرم اور خاص احسان ہے حق تو یہی ہے کہ ہم آپ کی نصرت میں جنگ کریں اور ہمارے بدن آپ کی راہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں تا کہ اس کے عوض میں ہمیں آپ کے جد امجد رسولؐ خدا کی شفاعت نصیب ہو سکے۔

جناب بریر کے بارے میں ملتا ہے کہ شب عاشور عبدالرحمن بن عبد ربہ انصاری نے جب آپ کو بہت خوشحال دیکھا تو تعجب سے پوچھا اے بریر! تم اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہو آج تک تم کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا۔ بریر نے جواب دیا: ''ہمارے قبیلہ کا ہر شخص باقاعدہ اس بات سے آگاہ ہے کہ میں مزاح وشوخی سے کس قدر پرہیز کرتا ہوں آج کی میری خوشی صرف اس لئے ہے کہ مجھے شہادت کا عظیم درجہ نصیب ہونے والا ہے اور میں اپنے لئے اس کے علاوہ کوئی اور کامیابی نہیں دیکھ رہا ہوں۔''

سعد بن عبداللہ جب امام کی تقریر تمام ہوگئی تو سعد بن عبداللہ نے کہا: ''نہیں، ہرگز نہیں یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ دیں۔ ہم آپ پر اپنی جانیں قربان کر دیں گے تا کہ خدا شاہد

رہے کہ ہم نے رسول کی وصیت کو فراموش نہیں کیا ہے اور کیونکر آپ پر جان فدا نہ کریں جب کہ اس ایک موت کے بعد ہمیں دائمی اور ابدی عزت وسعادت ملنے والی ہے۔''

محمد بن بشیر حضرمی کربلا میں موجود تھے جب انھیں اس بات کی اطلاع ہوئی کہ ان کا بیٹا شہر رَی کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا ہے تو کہا: ''خدا کی قسم میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میں زندہ رہوں اور وہ شہید ہو جائے یا گرفتار کر لیا جائے۔'' جب امام کو ان کے بیٹے کی اسیری کے بارے میں معلوم ہوا تو امامؑ نے فرمایا: خدا تم پر رحمت نازل کرے تم جاؤ اور اپنے بیٹے کو اسیری سے نجات دلاؤ۔

محمد بن بشیر اس بات پر تڑپ گئے اور کہا: ''مجھے درندے کھا جائیں اور وہ مجھے اپنی غذا بنا لیں اگر میں آپ کی خدمت سے چلا جاؤں۔''

حبیب ابن مظاہر امام کے بچپن کے دوست تھے ضعیفی کے باوجود شجاعت میں ہرگز کمی نہ آئی آپ کو مال ودولت کی بہت لالچ دی گئی کہ امام کا ساتھ چھوڑ دیں مگر ہمیشہ یہی کہتے تھے کہ: ''ہم روز قیامت رسولؐ خدا سے کیا عذر پیش کریں گے اور کیسے ممکن ہے ہم زندہ رہیں اور حسینؑ رسولؐ کا نواسہ قتل ہو جائے۔''

آپ وہ تھے جنھوں نے اپنے سینے پر تیر روکے اور خود کو تلوار کی چھاؤں میں پیش کر دیا۔ ابن ابی الحدید کے مطابق عمر سعد نے کہا کہ: ''امام حسین -کے اصحاب ایسے تھے جو خود کو موت کے منھ میں ڈال رہے تھے انھیں نہ مال کی لالچ تھی نہ تو حکومت اور سلطنت کی آرزو ہم لوگ ان سے ایک لمحہ کے لئے غافل ہو جاتے تو وہ ہمارے پورے لشکر کو تباہ وبرباد کر ڈالتے۔

یقینا آپ کے اصحاب بے نظیر ہیں۔ شب عاشور ایک کے بعد دوسرے آتے رہے اور اپنے جذبات نصرت کا اظہار کرتے رہے۔ حضرت سب کے لئے دعائے خیر کرتے رہے اور ساتھ ہی بہشت کا یقین بھی دلاتے رہے جس کا سب نے مشاہدہ بھی کیا۔

امامؑ نے اس کے بعد اصحاب کے سامنے پیغمبر اسلام کی وہ حدیث بیان فرمائیں جس میں

رسولؐ خدا نے امام حسینؑ سے اس طرح خطاب فرمایا تھا: اے حسین! تمھیں اپنے وطن سے عراق بلایا جائے گا عراق کی اس سرزمین پر تمھیں دعوت دی جائے گی جہاں ہر خدا کے اوصیاء اور پیغمبروں نے ایک دوسرے کی زیارت کی ہے۔ اے حسین! اس زمین کو ''عمورا'' کہا جاتا ہے وہاں تم اپنے اصحاب کے ساتھ شہید کردیئے جاؤ گے جب کہ تمہاری جنگ سلامتی کی جنگ ہوگی۔''

امامؑ نے فرمایا: اے میرے اصحاب! بشارت ہو تم کو اگر ہمیں قتل کردیا جائے گا تو ہم پیغمبروں کے ساتھ محشور ہوں گے۔ اس کے بعد فرمایا: تم کریم زادہ ہو، اپنے ارادہ میں مستحکم ہو، موت تو ایک سیڑھی ہے جو سختیوں اور تنگیوں سے نکال کر وسیع بہشت اور اس کی نعمات تک پہنچا دینے والی ہے۔ اور وہاں کی نعمتیں جاوداں ہیں۔ یقیناً کوئی شخص تنگ و تاریک قید خانہ سے نکل کر روشن محل میں جانے سے تامل نہیں کرے گا۔ مومن کے لئے دنیا زندان ہے اور کافروں کے لئے بہشت ہے۔

غرض یہ کہ ہر ایک کو بہشت بریں کا یقین تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے نیزہ و شمشیر سے اصلاً خوف کا احساس نہیں کیا اور شہادت کا درجہ حاصل کرنے میں ایک دوسرے پر مقدم ہوجانے کے متمنی رہے اور ہر صحابی ایک دوسرے سے پہلے شہید ہوجانا چاہتا تھا۔

روز عاشورہ بنی ہاشم سے پہلے اصحاب ایک کے بعد ایک آتے رہے اور کہتے تھے: **السلام علیك یابن رسولؐ الله!** حضرت جواب میں فرماتے تھے: **وعلیك السلام**۔ اور جب زخموں سے چور چور اصحاب کے پاس امام آتے تھے تو مستقل اسی آیت کریمہ کی تلاوت فرماتے تھے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَّنْتَظِرُوْا وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلاً۔ (سورۂ احزاب: ۲۳)

یعنی مومنین میں سے بعض عظیم المرتبت مرد ایسے بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کئے ہوئے وعدہ کو سچ کر دکھایا ہے ان میں بعض اپنا وقت پورا کر چکے اور بعض اپنے وقت کا انتظار کررہے ہیں اور ان

لوگوں نے اپنی بات میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی ہے۔''

امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

''اصحاب امام حسینؑ کے یقین کا عالم یہ تھا کہ گویا وہ بہشت میں اپنی قیام گاہ کا مشاہدہ کررہے تھے وہ قربانی پیش کررہے تھے اور حوریں ان کا استقبال کررہی تھیں کیونکہ ان کی نگاہوں کے سامنے سے تمام حجابات ہٹا لئے گئے تھے۔''

❁❁❁

انصارِ حسینؑ اور شوقِ شہادت

سید مصطفیٰ حسین نقوی اسیفؔ جائسی

جنگ کیا تھی ایک تصویر نیاز وناز تھی
کربلا کی وہ شکست ظاہری اک راز تھی
آرہی تھی ہر طرف سے نغمۂ حق کی صدا
تھے بہتّر ساز لیکن ایک ہی آواز تھی

فرزند رسول حضرت امام حسین ابن علی علیہما السلام نے اپنی معصومانہ وحکیمانہ قوت انتخاب سے مختلف اللون مگر ایک ہی خوشبو رکھنے والے پھول مدرسۂ اسلام ومرکز تحفظ قرآن، کربلا کے گلدستہ شہادت میں سجائے تھے یا یوں کہوں کہ ہر ایک پھول میں گل زہراہی کی بوبسی ہوئی تھی۔ یہ گلہائے شہادت کون؟ وہی جنھیں ہم انصار حسینؑ کہہ کے یاد کرتے ہیں۔

قول وعمل، فکر ونظر، رفتار وگفتار اور جذبات واحساسات میں سب کے سب ایک، جہاں صغار وکبار اور شیوخ وشبان سب متحد الخیال، سبھی کے جذبۂ ایثار وقربانی کا مقصد حفاظتِ قرآن ونصرت اہل بیت کے لئے حسینؑ پر جان نچھاور کرکے حشر تک کے لئے ایک دن کے مقتل یعنی کربلا کو انسانیت کا دنیا کے لئے سب سے بڑا مدرسہ بنا دینا تھا۔

اصحاب حسینؑ سارے کے سارے عابد ومجاہد، اہل بصیرت ومعرفت، متقی، پرہیزگار رضائے پروردگار میں مگن اور دل وجان سے مشتاق شہادت تھے۔ سب ہی ایک جیسے تھے تبھی تو شب عاشور سبھی کی باتوں کا ایک ہی مقصد ومطلب نکل رہا تھا۔

شب عاشور امام عالی مقام شمع گل کر دیتے ہیں اور اصحاب باوفا سے فرماتے ہیں کہ میں تم پر سے

اپنی بیعت کو اٹھائے لیتا ہوں تاکہ تم سب مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ اس لئے کہ دشمنوں کو جو بھی غرض ہے وہ مجھ سے ہے تم سے ان کو کوئی سروکار نہیں۔

اس موقع کے لئے کسی شاعر کا مشہور شعر ہے کہ:

حسینؑ ابن علیؑ نے فطرتیں بدلی ہیں اک شب میں
بجھی ہے شمع اور محفل سے پروانے نہیں جاتے

مگر میں اس شعر سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتا اس لئے کہ وہ سب اس چراغ کے پروانے تھوڑی تھے بلکہ شمع امامت کے پروانے تھے وہ شمع امامت جسکی خورشید مزاج شعاعوں نے اپنے پروانوں کو ماہتاب صفت شمع بنا دیا تھا اس روحانی ماحول کے مدنظر میرے مشفق شفیقؔ بریلوی مرحوم کا بہت اچھا شعر ہے ؎

نہ جانے خیمے میں یہ کیسے لوگ بیٹھے ہیں
کہ شمع گل ہے اجالا دکھائی دیتا ہے

الغرض امام کی گفتگو کو سن کر سر ہتھیلی پر رکھ کر کربلا میں آنے والے مخاطبین بلک اٹھے تشنہ وگرسنہ کچھ فدائیوں نے خاموش رہ کر دل کی زبان سے اور بعضوں نے اپنے مچلتے اور تڑپتے ہوئے اشکوں کی زبانی اپنا مخلصانہ پیغام اپنے آقا اور مولا تک پہونچایا اور کچھ جانثاروں نے اپنے دل کی آواز کو زبان کے ذریعہ فرزند رسول کی بارگاہ میں اس طرح پیش کرنا شروع کیا مولا! ہم آپ پر احسان نہیں کررہے ہیں احسان تو آپ ہی کا ہم پر ہے کہ آپ ہم کو سعادت ابدی کا موقع دے رہے ہیں۔ دوسری آواز بلند ہوتی ہے مولا! اس دن کے لئے ہم زندہ نہیں رہنا چاہتے جس دن آپ کی بیعت کا طوق ہمارے گلے میں نہ رہے۔ تیسری آواز فضا میں گونجتی ہے آقا! ہم کو قدموں سے جدا نہ کیجئے ورنہ ہم زندہ نہ رہ پائیں گے۔ کوئی کہتا ہے اے سید وسردار! آپ کے بغیر ہم سے زندہ نہ رہا جائے گا۔ کسی کا بیان ہے ہم داستان مصیبت بیان کرنے کے لئے نہ جئیں گے ہم یہاں پر جان نثار

کرنے آئے ہیں، کوئی دردانگیز انداز میں کہتا ہے بیٹے کی گرفتاری کی کوئی فکر نہیں ہم آپ ہی کے ساتھ رہیں گے اور اسی ڈھنگ سے روز عاشور اذن جہاد نہ ملنے پر بلکہ تاخیر امر میں جانثار قدموں پر گر کر کہتا ہے فرزند رسولؐ! یہ کیسے ممکن ہے کہ راحت میں ساتھ رہوں اور مصیبت میں دور ہو جاؤں۔ میں سمجھ گیا آپ کو پسند نہیں کہ میرا کالا خون آپ کے نورانی خون میں ملے خدا کی قسم آپ سے کبھی جدا نہ ہوں گا۔

شب عاشور ہی کی بات ہے کہ کانپتی اور لرزتی جانکاہ وجانفرسا صداؤں کے درمیان ترجمان شہداء بوڑھا مجاہد ضعیفی کو نذر طاق نسیاں کر کے اپنے شوق شہادت کا اس طور سے مظاہرہ کرتا ہے۔ آقا! اگر میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں تو اپنے مالک حقیقی کو کیا جواب دوں گا۔ خدا کی قسم ایسا ممکن نہیں یہاں تک کہ دشمنوں کے سینوں میں اپنے نیزوں کو توڑ دوں جب تک تلوار میرے ہاتھ میں رہے گی ان پر وار کرتا رہوں گا اور آپ سے کبھی جدا نہ ہوں گا اگر میرے پاس جنگ کے لئے اسلحے نہ ہوں گے تو آپ کی نصرت میں دشمنوں کو پتھر ماروں گا یہاں تک کہ آپ ہی کے ساتھ رہ کر جام شہادت نوش کروں گا۔

صبح عاشور شمر کی بدکلامی پر مسلم ابن عوسجہ نے اپنے امام سے درخواست کی آقا اجازت دے دیجئے میں اسے ابھی تیر کا نشانہ بنا ڈالوں مگر امامؑ نے جواب میں فرمایا مسلم ہمیں جنگ میں سبقت منظور نہیں۔

لیکن ایک وہ وقت بھی آیا کہ جب وہ بوڑھا مجاہد جو صبح سے پہلے بوجہ ضعیفی کمان کی صورت تھا صبح عاشور کو شوق شہادت میں خود تیر بن گیا لیکن آخرکار پیاسے نے جام شہادت نوش ہی کر لیا۔ مقدر کی بلندی دیکھو مسلم کے جیتے جی حسینؑ سرہانے پہونچ گئے ارشاد فرمایا تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ مسلم ابن عوسجہ تم چلو، ہماری بھی شہادت کا وقت قریب ہے یعنی ''تم آگے چند گام تو ہم پیچھے کچھ قدم۔''

فرزند رسولؐ کی موجودگی میں عالم احتضار میں حبیب ابن مظاہر نے فرزند رسول پر جاں نثاری

کے لئے مسلم ابن عوسجہ کی خدمت میں مبارک باد پیش کی اور پھر مسلم نے بصد فرحت وسرور مبارک باد قبول کر کے حبیب کو دل سے دعا دی اور جاتے جاتے اپنے آقا کی طرف اشارہ کر کے حبیب کو وصیت بھی کر دی کہ آقا پر جان ضرور نثار کر دینا۔

مسلم نے صرف حبیب سے وصیت کی تھی مگر کربلا میں تو رفقاء حسینی کا یہ اٹل فیصلہ تھا کہ آج فرزند زہراؐ پر مر مٹنا ہے اور جاں نثاری کے نتیجے میں ابدی سعادت حاصل کر لینی ہے اور یقیناً اقرباء وانصار حسینی نے دنیا ومافیہا کی فکر کو بالکل فراموش کر کے حسینؑ کے قدموں پر نقد جان نچھاور کر کے بہ سرپرستی ونگرانی امامؑ کائنات کربلا کو مرجع خلائق بنا دیا۔ جی چاہتا ہے کہ فرزند رسولؐ وبتولؑ امام انام مظلوم کربلا سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ عالی جاہ میں یہ شعر پڑھ کر مضمون ختم کروں کہ ؎

جاں نثاروں نے ترے کر دیا جنگل آباد
خاک اڑتی تھی شہیدان وفا سے پہلے

❁❁❁

ذکرِ خدا اور عاشورہ

محترمہ بنت زہرا نقوی صاحبہ ندیٰ الہندی

ذکر اور یاد خدا تمام مراحل میں ایک پسندیدہ امر ہے جس کی اسلام میں بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔قرآنی آیات میں ''ذکر کثیر'' کے متعلق ملتا ہے کہ:

''اُذکروا اللہ ذکراً کثیراً''

''اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو'' (سورۂ احزاب:۴۱)

ذکر الٰہی عرفان کا بلند ترین درجہ ہے۔''ذکر'' یا ''یاد'' یعنی یہ کہ انسان دائماً خداوند عالم کو یاد رکھے اور اس کو حاضر و ناظر جانے اور تنہا ترین حالات میں بھی اس کی یاد سے غافل نہ رہے۔

مصیبت اور سختیوں میں، آرام و آسائش میں اس کی ربوبیت اور اس کی سرپرستی کو فراموش نہ کرے۔

اپنے دل میں خدا کی یادوں کے چراغ روشن کرنے سے انسان خود کو گناہوں سے بھی بچا سکتا ہے۔ نیز مصائب و آلام سے مقابلہ بھی کرسکتا ہے۔ اس طرح انسان غرور و تکبر، جیسے گناہ سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

یاد خدا روحی ترقیوں کی آمادگی ہے، اخلاق کی پاکیزگی، رذائل سے نیز خانۂ دل کو اغیار سے خالی بنا دیتی ہے۔

ذکر کے تین مرحلہ ہیں: ۱۔قلبی ۲۔زبانی ۳۔عملی

ذکر کامل یہ ہے کہ انسان کی زبان خدا کے نام اور صفات کی گویا رہے اور اس کی حمد و تسبیح بجالائے اور اس محبوب ترین کے نام کو مسلسل زبان پر جاری رکھے۔

ذکر لسانی کے ہمراہ اس کا دل بھی ذاتِ خداوندِ عالم کی طرف متوجہ رہے، اس کو نہ بھولے اور خدا کو اپنی تکیہ گاہ اور پناہ گاہ اور اس کو قدرت مند اور اپنی رفتار و گفتار کے لئے اس کو سمیع و بصیر قرار دے۔

ذکر عملی کے درجہ میں انسان اپنے آپ کو ہمیشہ خدا کے حضور حاضر جانے، اور پروردگار کو اپنے افکار و خیالات اور گفتار و کردار پر ناظر قرار دے کہ جس کا نتیجہ برائیوں سے پرہیز اور اعمال صالحہ بجالانا ہو۔

قرآن میں ''ذکر خدا'' کو نماز کا عنوان قرار دیا گیا ہے جیسا کہ آیہ کریمہ ہے: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ واللّٰہ یَعْلَمُ مَا تَصنَعُونَ۔ (سورۂ عنکبوت:۴۵)

''اور نماز (جو کہ خدا کی عظیم عبادت ہے) کو قائم رکھئے کہ نماز بیشک نمازیوں کو بے حیائی اور برائیوں سے روکتی ہے اور ذکر خدا (لوگوں کی سوچ سے بڑھ کر) عظیم ہے اور جو کچھ تم لوگ کرتے ہو خدا اسے جانتا ہے۔

عاشور، خدا کی یادوں کا بہترین اور روشن ترین مظہر ہے کہ جسے امام حسینؑ اور ان کے اصحاب وانصار کے حالات و رفتار و گفتار میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ کسی بھی صورت میں ''یاد الٰہی'' سے غافل نہیں رہتے۔

حضرت سید الشہدؑاء مشکل اور سخت ترین حالات میں رہ کر بھی ذکر خدا ہی کے ذریعہ سکون و اطمینان قلب حاصل کرتے رہے۔ اور اس اطمینان قلبی کو اپنے دوستوں اور گھرانے میں بھی منتقل کرتے رہے۔

کربلا کے میدان میں جب حجاج ابن مسروق جو بہشتیوں کا مؤذن تھا، ''اللہ اکبر'' کی صدائیں بلند کرتا ہوا لشکر کفار میں دھنس گیا اور ذکر الٰہی یعنی ''اشھد ان لا الہ الا اللہ'' کہہ کر دشمنان اسلام پر حملہ کیا اور ''اشھد ان محمد رسول اللہ'' کی شہادت دے کر دشمنان محمدؐ و آل محمدؐ

میں سے ۱۵ر نابکاروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔ "اشھد انّ امیر المومنین و امام المتقین علیاً حجۃ اللہ" کی آخری گواہی دیتے ہوئے تشنہ جگر نے شربت شہادت نوش کیا۔

امام حسینؑ کے بقیہ اصحاب بھی جب اپنی جان کو اپنے راہبر و پیشوا امام حسینؑ کی خدمت میں نچھاور کرنے کے لئے آگے بڑھے تو کہا:

"الحمد للّٰہ الّذی شرّفنا بالقتل معکَ"

"شکر ہے اس ذات الٰہی کا جس نے ہمیں آپ کے ساتھ شہید ہونے کی سعادت بخشی"

اس وقت امام سومؑ نے سب کو دعا دی اور بہشت بریں کی خوشخبری سنائی۔ جب امامؑ مظلومِ کربلا نے خطبہ دینا چاہا تو اس کا آغاز، حمد و ثناء پروردگار سے اس طرح کیا:

"اُثنی علی اللہ احسنَ الثّناء و احمدہُ السّرّاء و الضّرّاء"

"میں خدا کی بہترین ثنا کرتا ہوں، اور خوشی وغم میں اس کا شکر گزار ہوں"

ذکر الٰہی کا وہ عالم کہ صبح عاشور جب اعدائے دین امام کی طرف بڑھے تو فرماتے ہیں: "اللّٰھُمَّ اَنتَ ثقتی فی کُلِ کَرب"

"پروردگار! تو ہی ہر مصیبت و پریشانی میں میرا سہارا ہے۔"

امامؑ اور ان کے جانثاروں کی شبِ عاشور کی مہلت مانگنا صرف مالک کی بارگاہ میں تحفۂ عبدیت پیش کرنا تھا اور چشم تاریخ کبھی اس شب عبادت کو فراموش بھی نہیں کرسکتی جس کی صبح نمودار ہوئی بھی تو تلاوت قرآن، ذکر الٰہی اور راز و نیاز کے ماحول میں۔

امام حسینؑ روز عاشور جانفرسا مصیبتوں میں بھی اللہ کی یاد سے کسی وقت غافل نہ رہے۔ اور گویا اپنے کو خدا کی پناہ گاہِ مہر و محبت میں دیکھ رہے تھے۔ اور مسلسل اس محبوب کے نام کو زبان پر جاری کررہے تھے۔ اور اپنے وجود کے قطرہ کو دریائے الٰہی سے متصل کررہے تھے۔ اور امام حسینؑ دائماً خدا کو یاد کررہے تھے۔ اور اس جملہ کی تکرار کررہے تھے۔

"لاحول ولا قوۃ الّا باللہ العلیّ العظیم"

غرض کہ مشکلات وصعوبات کو برداشت کرنے کے لئے مسلسل ذکر الٰہی سے مستفید ہوتے رہے جب ننھے مجاہد علی اصغرؑ کو آپ کے دست مبارک پر نشانۂ ظلم بنا کر شہید کردیا گیا تو فرمایا:

"وہ چیز جو ان تمام مصیبتوں پر صبر دلاتی ہے یہ ہے کہ خداوند عالم کی نگاہوں کے سامنے سب کچھ ہے اور وہ ہی ہر امر کا گواہ ہے۔" "ھوّنَ علیَّ مَا نَزَلَ بی اَنّہُ بِعَینِ اللہ"

امام کا زندگی کے آخری لمحات میں اپنے معبود کے ساتھ عاشقانہ مناجات کرنا بھی اسی روحانی و عرفانی کیفیت کو بیان کرتا ہے۔

اور جب آپ کے تمام عزیز و رفیق شہید ہوگئے اور بارگاہ وحدت میں نذرانۂ سر پیش کرنے کا وقت آ ہی گیا تو آپ نے اپنے کو بھی قتل گاہ تک پہونچا ہی دیا۔ اور جب عرش زین سے فرش زمین پر تشریف لائے تب بھی سالک راہ تسلیم و رضا حسینؑ حمد و ثناء پروردگار میں تر زبان رہے اور خدا کی عظمت کی گواہی دے رہے تھے:

"اللّٰھم متعالی المکانِ عظیم الجبروت"

نیز اس جملہ کی بھی تکرار کررہے تھے:

"بسم اللہ وباللہ وعلیٰ ملّۃ رسول اللہ"

بہر حال عرفان، جہاد اور یاد خدا یہ تمام عاشور کے درس ہیں اور امامؑ کی بارگاہ تربیت میں جینے والے اس کے حامل تھے کہ جس کا ایک نمونہ "مسلم بن عقیل" ہیں کہ جب گرفتار ہوئے اور قتل کرنے کے لئے دار الامارہ پر لے جایا گیا تو ان کی زبان ذکر حق میں مصروف تھی اور ان کا دل خدا کی یاد میں مشغول تھا اور کہہ رہے تھے:

"الحمد للہ علی کلّ حال" اور "اللہ اکبر" کا ورد کررہے تھے۔ خداوند عالم سے مغفرت طلب کررہے تھے اور فرشتگان و فرستادگان الٰہی پر درود و سلام بھیج رہے تھے۔

ان سے قبل جب ہانی کو حضرت مسلم کے پناہ دینے کے جرم میں دستگیر کیا گیا اور شہادت کی دھمکی سنائی گئی تو موت کی خبر سن کر ہراساں نہ ہوئے اور فرمایا: ''بازگشت خداوند عالم کی طرف ہے، پروردگار تیری رحمت و رضایت کی طرف پرواز کر رہا ہوں۔''

جملۂ ''استرجاع'' ذکر کی شاخوں میں سے ایک ہے، یعنی انسان مصیبت و آلام میں اپنے کو خدا سے اور خدا کی طرف اور خدا کے لئے قرار دیتا ہے اور اس جملہ کو زبان پر جاری کرتا ہے: ''انّا للہ وانّا الیہ راجعون''

جیسا کہ امامؑ طول سفر میں اکثر اس جملہ کی تکرار کرتے رہے یہی نہیں بلکہ نیزے کی بلندی سے بھی ذکر الٰہی کی آواز آتی رہی کہ جس سے ظالم ہیبت زدہ تھے کہ امام علی بن الحسینؑ نے وقت کے اس سناٹے اور دلوں کے نرم ہونے کی کیفیت کو محسوس کیا اور بلند آواز سے اللہ رب العالمین کی حمد وثناء بیان کرنا شروع کی کہ سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

عزیزوں کے کٹے ہوئے سر، مخدرات عصمت وطہارت کے برہنہ سر، رسیوں میں جکڑے ہوئے پیاسے بچوں اور ذلت ومصیبت کے ان جانکاہ لمحات کے درمیان اپنے رب کی حمد وثناء کرنا اور شکریہ ادا کرنا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایسے حالات میں تو بندے اللہ کے وجود ہی کا انکار کر دیتے ہیں، ایسے ماحول میں امام علی بن الحسینؑ کو اپنے رب کا شکر ادا کرتے دیکھ کر لوگ سمجھ گئے کہ یہ شخص کوئی عام انسان نہیں ہے ایسے واقعات تو انھوں نے اللہ کے برگزیدہ نبیوں کے بارے میں ہی سنے تھے۔

لیکن خاندان عصمت وطہارت نے سخت ترین حالات میں اللہ کی یاد کو عملی جامہ پہنا کر بتا دیا کہ کسی بھی حال میں اللہ کی یاد کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

اختتام کلام میں خدا سے دعا ہے کہ ہماری معرفت میں اضافہ عنایت فرمائے۔ ''الٰہی آمین''

❀❀❀

ہم کو کیا ملا؟

علامہ نصیر اجتہادی صاحب پاکستان

کربلا کا خونی واقعہ اپنے دامن میں ہزار ہا عبرتوں کو، بے شمار نصیحتوں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ حکمتوں کا ایک دفتر، معارف کا ایک سمندر ہے جو نینوا کے ہر ذرہ میں موجزن ہے۔ اگر ایک طرف زُہرہ گداز شیون، جگر خواہش داستان ہے تو دوسری طرف فداکاری حق کا پُرنور جلال اور کامیابی حق کے مسرت بار احساسات کروٹیں لے رہے ہیں۔ کربلا کی تنگ دامن سطح لیکن بیکراں دست میں بزدلوں کے لئے ہمت، شہزوروں کے لئے حزم وشکیب، بچوں کے لئے جرأت، نوجوانوں کے لئے عزم، بوڑھوں کے لئے جوش وولولہ غرض کہ ہر فرد بنی نوع انسانی کے لئے اس میں زندگی کا ابلتا ہوا سوتا اور جوش مارتا ہوا کوثر حیات ملے گا۔ تلاش کے لئے پائے جستجو کی استقامت اور دیکھنے کے لئے دیدۂ حقیقت نگاہ چاہئے۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کربلا کے صفحہ پر اُبھرے ہوئے نقش ونگار، نکھرے ہوئے خدوخال ہمارے لئے کون سا نفع بخش سرمایہ، کون سا ساز گار حیات نقشہ پیش کرتے ہیں؟ ہم نے کربلا سے کیا حاصل کیا؟ خون چکاں فرات نے ہم کو کیا دیا؟ کیا صرف ''اشک افشانی''، ہمارا نصیب کیا محض گریہ، ہمارا حصہ اور رونا ہمارا جینا ہے۔ ہم کو حسینؑ نے صرف اشک دیئے اور دنیا کو صد ہزار نعمتیں، ہم کو آب چشم اور عالم کو آب حیات؟ زمانہ کو جواہر آبدار اور ہم کو طوفان سیل غم؟ آہ آہ کیا اپنے حسینؑ سے ہم یہی حاصل کر سکے۔ وہ حسینؑ جس نے ''شعلۂ عمل، شبنم گفتار کی گنگا جمنی نہریں بہا دیں، ہم بڑے بڑے طمطراق کے ساتھ شبنم کے قطروں کو دل صد برگ میں جانشین کیا۔ شعلۂ عمل دوسروں کی ملکیت بن چکا تھا۔ نازک افتاد قطروں سے حیات ملی۔ تعمیر ہو رہی تھی۔ غیروں کے تسخیرانہ قدم بڑھے شعلۂ عمل سے لو کے اُٹھے، ہماری حیات کے دیار جلنے

لگے۔ بام و در پر شعلے بھڑکنے لگے، بڑھتے ہوئے آتش فشاں کو شبنم کے قطروں سے گل کیا جا سکتا
تھا، نہ آتش زدہ زخمیوں کی پیاس ہی بجھائی جاسکتی تھی اُف ! اُف !

رونا فطری چیز ہے۔ ہر دل گداز افسانہ، ہر رعشہ بر اندام کر دینے والا منظر ظلم و ستم کا تصور، ہر بے
مددی کی حکایت انسان سے ''اشک ہائے آتشین'' کا خراج لے سکتی ہے۔ ہر روز ہر لمحہ نہ معلوم کتنی
بار آنسو آہیں، فغاں دہن و چشم سے نکلتے رہتے ہیں۔ دوستوں کا فراق، بے گناہوں کی اذیت،
اقبال کا زوال، عزت رفتہ، یاد گذشتگان، منظر شام غریباں، شہر خموشاں، غرض کہ ہزار ہا سامان ہیں۔
اس معمورۂ عالم میں جو افسردگی چشم کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن کیا حسینؑ کی قربانی بھی بس اتنی ہی وقعت
رکھتی ہے کہ ہم رولیں اور بس۔ لاریب گریہ بھی اس داستان کا جز اور اشک باری کی عزاداری اس
عزا کا اہم عنصر ہے۔ لیکن اس وقت تک جب تک کہ مقصد نہ بنے لیکن جب مقصد قربانی ''اشک
ارزاں'' بن جائے تو یہ توہین ہوگی حسینؑ کے باطل شکن عزم، حق پرور جوش، اسلام فشاں اقدام،
انسانیت نشان رفتار و کردار کی۔ لہٰذا تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ صرف اشک چکانی کے لئے حسین شہید
نہیں ہوئے ہیں۔ بے شک ؎

قومم اگر بگریہ میسر شدی وصال
صدباری می تو ان بہ تمنا گریستن

لیکن ایسا نہیں ہے تو ''جاں فشانی بھی ہو اشک افشانی کے ساتھ'' درحقیقت حسینؑ کی قربانی،
ایسے کردار ساز اور انسانیت نواز درسوں کا مجموعہ ہے جن کا ظہور حسینؑ سے پہلے اس مکمل ترین شکل
میں نہیں ہوا تھا۔

پردہ کشائی عالم سے لے کر اب تک ہزاروں واعظ، ناصح، خطیب، ذاکر، مصلح اور ریفارمر پیدا
ہوئے اور انھوں نے درس دیا۔ انسانیت کا سبق دیا، شرافت و تہذیب کا اعلان حق کیا، تبلیغ شریعت
کی، لیکن وہ نامکمل تھا۔ محدود ہونے کے سبب سے ہر دور، ہر زمانہ، ہر قوم سے ساز گار و ہم آواز نہیں

ہوسکتا تھا، لیکن حسینؑ کے کردار میں شعبۂ حیات کا ہر پہلو جگمگا رہا ہے کربلا میں بہتے ہوئے لہو پر ہر
رنگ نظر آئے گا۔ کیا کہنا حسینؑ تیرے ساز کا، زمانہ کے دہن سے جو آواز نکلے وہ تیرے ہی نعرۂ حق
کی صدائے بازگشت ہے۔

وہ کون سا راستہ تھا جو حسینؑ کے الہامی دماغ نے صلاح و فلاح عالم کے لئے نکالا تھا؟ وہ ''حق پر
مرنا اور باطل کو مٹانا''، حسینؑ یہ سبق دے رہے تھے کہ دیکھو جب اظہار حق اور ابطال باطل کا معاملہ
سامنے آجائے تو تم سر نہ جھکانا، بلکہ جنگ کرنا۔ قوموں کے عروج و زوال کا راز اس میں مضمر ہے اگر
حکومت کے باطل قانون کے صنم ایمائے سجدہ ریزی کریں تو ہمارا یہ فریضہ ہونا چاہئے کہ ان
خودساختہ بتوں کو توڑ ڈالیں اور الہٰ حق کے سامنے سر جھکا دیں۔ ''احقاق حق و ابطال باطل'' تو حسینؑ کا
مرکزی اور مستقل نظریہ ہے لیکن اس سلسلہ میں حسینؑ نے جو خدوخال عمل پیش کئے وہ بھی اک
''درس گاہ آفاقی'' ہے۔ زمانہ جس سے سبق لے سکتا ہے۔

خودداری: جب یہ وقت آجائے کہ ہمارا آئینہ خودداری چور چور ہونے لگے اور ہمارے وقار و
تمکنت کے قلعہ پر دوسروں کے اقبال کا جھنڈا لہرانے لگے۔ تو ہم بڑھیں اور اپنی خودداری کو باقی
رکھیں چاہے جان چلی جائے لیکن آن پر حرف نہ آئے۔ رخشِ عزم پر سوار، عمل کی تلوار برہنہ کئے
ہوئے طوفان کی طرح بڑھو۔ اَلْمَوْتُ اَوْلٰی مِنْ رُکُوبِ الْعَارِ۔ تمہارا نعرہ ہو ممکن ہے کہ تم کام
آجاؤ لیکن ناکام نہیں رہو گے۔

استقلال: مصائب کے ہمت شکن تھپیڑے، مخالفت کے رہزنِ قدم ہچکولے بڑھیں لیکن ہم
ایک انچ بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ ثابت قدمی کے ساتھ جوانمردانہ مقابلہ کرتے رہیں، چاہے سینہ چھلنی
ہوجائے، بدن پارہ پارہ ہوجائے، ہاتھ ٹوٹ جائیں، شیر سامنے دم توڑ دے، بے شیر خون اگلنے
لگے۔ لیکن قدم میں ارتعاش نہ ہو۔ تلواریں کند ہوجائیں، نیزے اچٹنے لگیں، تیر بہکنے لگیں لیکن جسم
ہمت کی سکت نہ مٹے، پیکرِ عزم کا دم نہ ٹوٹے، دیکھو حسینؑ زیرِ خنجر ہیں لیکن لبوں پر استقلال کی

مسکراہٹ اب تلک مٹی نہیں۔

ہمدردی ورواداری: حسینؑ نے سکھلایا کہ دشمن سے بھی ہمدردی کرو، دم توڑتے ہوئے لشکر دشمن کے ساتھ بھی ''فیض رواں'' رہو۔ حسینؑ سے بہتر عدم تشدد کے نظریہ کا صحیح نبّاض کون ہوگا۔ تباہ حال، ہلاکت سیدہ دشمن کو سیراب کر کے جہاں ہمدردی و بلند ظرفی کا مظاہرہ کیا وہاں عدم تشدد کا بھی برجستہ سبق دیا لیکن جب دشمن کے مجبور ہاتھ لجام پر پہنچے تو آبِ حیات پلانے والا حسینؑ تیور بدل کر بتلا دیتا ہے کہ دیکھو مقصد سے ٹکرانے والے ''عدم تشدد'' کو ٹھکرا دو۔ ہمدردی کرو مگر مقصد سے بے دردی نہ کرتے ہوئے رواداری ہو مگر مقصد کی خودداری کے ساتھ۔

اتحاد واتفاق: جس نے حسینؑ کے کارنامہ میں جان ڈال دی۔ جب تک مشن کی تکمیل کے لئے سرگرم اتحاد گروہ نہ ہو۔ باہم شیر وشکر جماعت کا وجود نہ ہو سکے۔ ہم آہنگ وہم آواز افراد نہ ہوں کامیابی مشکل ہے۔ ۶ لاکھ نہ ہو سوا سے ہوں، ۳۰ ہزار نہ ہوں، ۷۲ ہوں لیکن ان میں اتحاد واتفاق کی ایسی برقی رو ہو کہ خودی کا احساس ختم ہو جائے۔ سب بے خودی اتحاد میں مست ہوں۔ ہر فرد کی رفتار وحرکت ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ نظر آئے۔ انشقاق کی لکیر، نفاق کی درار تک نہ ہو، پھر یہ جماعت آگے بڑھے گی اور مقصد تک پہنچ جائے گی۔ دیکھو نا بہتّر تھے کربلا میں، مگر اختلاف کی جھلک تک نہ تھی۔ بچے سے بوڑھے تک، مردوں سے عورتوں تک سب ایک دوسرے سے متحد تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص نگینہ ہے خاتم عمل کا، خشت ہے عمارتِ مقصد کی، کامیابی ان کے ساتھ رہی اور ۷۲ نے لاکھوں کو زیر کر دیا۔

قربانی: کیا کہنا جب تمام مراحل طے ہو جائیں، مفاہمت کے حدود، سمجھوتہ کی صورتیں باقی نہ رہیں۔ دشمن یا سر چاہتا ہو یا بیعت، تو فرار پر پہرہ بٹھا دو۔ گذر کے راستے مسدود کر دو۔ بڑھو اور ہمت سے میدانِ اجل میں قدم رکھ دو۔ ایک مرتبہ زمین اپنا محور، فلک اپنا مرکز چھوڑ دے۔ لیکن تمہارے قدم نہ جھجھکیں۔ خدا کے ہاتھ بازار ''زر'' میں بکے ہوئے نفس سے پھر کسی کی بیعت نہ

کرنا، سر سے گزر جانا، تن، من، دھن سب قربان کر دینا مگر ضمیر فروشی و مقصد تلفی نہ کرنا، جب قوم وملت کے بے ہوش چہرہ پر انسان کے لہو کے چھینٹوں کی ضرورت ہو تو ہمت واستقلال سے قربان گاہ پر اپنا سر جھکا دو یہاں تک کہ قربانی کا ہر قطرہ آبِ حیات اور چشمۂ حیوان بن جائے۔ سامنے چمکتا ہوا خنجر ہو، شعلہ زن ریگستان پہلو بدل رہا ہو، خویشوں کے لاشے، بیگانوں کے پیکر خاک وخون میں آلودہ پڑے ہوں، ناموس کے لٹنے کا اندیشہ سامنے ہو لیکن پیشانی پر شکن نہ پڑے۔ استقلال کے ساتھ سر رکھ دو اور بالائے سر چمکتے ہوئے خنجر کو ہلال مقصد سمجھ کر عدم کے ہاتھوں سے حیات کا چہرہ چھپا لو۔ کامیابی تمہاری لاش کے قدم چومے گی اور جو مقصد جی کر حاصل نہ ہو سکا وہ مر کر حاصل کر لو گے۔

زندۂ جاوید

جسٹس پنڈت ویاس دیو مصرا، نئی دہلی

زمانہ فانی، زمانہ والے فانی، زمانے کی ہر شے فانی دنیا کی کسی چیز کو بقائے دائمی نہیں۔ چاہے وہ بیل بوٹے ہوں، گل و غنچہ ہوں دشت و چمن ہوں غریب و امیر ہوں۔ بادشاہ و فقیر ہوں سب فانی ہیں یہاں تک کہ تاریخیں اور واقعات بھی فنا ہو جاتے ہیں۔ کوئی بادشاہ یا کوئی لیڈر مرنے کے بعد چند سال تک زندہ رہتا ہے اور آہستہ آہستہ اس کا نام بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اگر اعمال نیک ہیں تو دنیا ذرا دیر تک یاد رکھتی ہے اور اگر چال چلن خراب ہیں تو یاد بھی دیر تک قائم نہیں رہتی تمام نظام دنیا اس قانون کے ماتحت ہے انسان اگر اسے بدلنا چاہے تو نہیں بدل سکتا۔ جب تک دنیا قائم ہے یہ تبدیلیاں ہوتی ہی رہیں گی اور اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی بدلتے جائیں گے۔ تاج و تخت بھی بدلیں گے۔ طبل و علم بھی تبدیل ہوں گے زمانہ بھی بدلے گا۔ زمانے والے بھی بدلیں گے۔ آج جہاں بڑے بڑے محل ہیں، بے شمار عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں شاید کل وہاں ویرانی کا دور دورہ ہو آج جہاں گلستان اندر گلستان ہیں اور فصل گل کی حکومت ہے۔ شاید کل صحرا ہی صحرا نظر آئے۔ انقلاب آتے دیر نہیں لگتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے بستیاں ویران ہو جاتی ہیں گھر برباد ہو جاتے ہیں، خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں جو گھر صبح کو بھائی، بھتیجوں، بال بچوں، چھوٹے بڑوں اور یار و احباب سے بھرا رہتا ہے دوپہر ہوتے ہوتے وہاں خاک اُڑنے لگتی ہے بھائی سے بہن چھوٹ جاتی ہے بچوں سے ماں کی گودیں خالی ہو جاتی ہیں، سر سے مالک کا سایہ اُٹھ جاتا ہے، سہاگنیں بیوہ ہو جاتی ہیں، لوگ مخالف ہو جاتے ہیں، مقدر برگشتہ ہو جاتا ہے زمانہ تاریک معلوم ہوتا ہے، تبسم گریہ میں تبدیل ہو جاتا ہے اور جس طرف آنکھ اٹھا کر دیکھئے بجز یاس و حرماں، رنج و غم اور

جور و ستم کے کچھ نہیں دکھائی دیتا۔

جو شے بن گئی وہ بگڑے گی ضرور۔ ایک چیز کا پیدا ہونا ہی اس کے فنا ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ درند، پرند، چرند سب فنا ہو جائیں گے مہر و ماہ مٹ جائیں گے۔ آسمان ستاروں سے خالی ہو جائے گا۔ آسمان کی کمر ٹوٹ جائے گی، سینہ گیتی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، موت کا فرشتہ ہر طرف دوڑتا ہوا نظر آئے گا اور ایک وقت ایسا بھی آئے گا جب موت کو بھی موت کا سامنا کرنا ہوگا۔ کہیں کوئی چیز نہ باقی رہے گی بجز اس ہستی کے جو ان تمام حوادث کو اٹھا چکی ہے جس کی ثابت قدمی سے عرش بھی کانپتا ہے، جس کے صبر و استقلال مشیت پر چھا گئے ہیں، جس کی ہمت اور جرأت سے انقلابات زمانہ انگشت بدنداں ہیں، جس کی تین دن کی بھوک اور پیاس دونوں عالم کو ہلا سکتی ہے۔ ایسی زندہ جاوید ہستی کون ہے، وہ خدا کا بھیجا ہوا امام، حبیب کبریاؐ کا نواسہ، یداللہ کا لختِ جگر، بنت رسول کا لال، حسن مجتبیٰ کا بھائی حسینؑ ہے وہ حسینؑ جو اہل اسلام کے لئے شمع ہدایت اور دیگر مذاہب کے لئے چراغ معرفت اور دنیا کے لئے کل ایمان بن کر آیا۔ کیوں نہ ہو زمانہ انتہائی پستی کی طرف مائل تھا لوگوں کے کردار جتنا گر سکتے تھے گر چکے تھے، میخواری جائز ہو چکی تھی جور و جفا، ستم و استبداد روا تھے، انسانیت خونخواری کا نام تھا، جو راہ راست پر چلنے کا ارادہ کرتا ذبح کر دیا جاتا۔ جو شراب خواری کے خلاف آواز بلند کرتا وہ جان سے جاتا۔ جو ذرا ابھرنے کی کوشش کرتا وہ اور اس کے اہل و عیال نذر تیغ کر دیئے جاتے۔ باطل اتنا مضبوطی سے دنیا پر غالب تھا کہ خدا کے نیک بندے بھی اس کے سائے میں پناہ لیتے تھے۔ ایسی مضبوط مہم کا مقابلہ کرنا معمولی انسان کا کام نہ تھا۔ اس مجسمۂ باطل حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے حسینؑ ابن علیؑ کل ایمان بن کر میدان عمل میں آیا۔ اکیلا نہیں آیا۔ ایمان کو بچانے کے لئے محض اپنی جان نہیں پیش کی بلکہ ایک کنبہ لے کر آیا، بھائی بھتیجے لے کر آیا لڑکے لڑکیاں لے کر آیا، چھوٹے چھوٹے بچے ہمراہ لایا، تمام اہل حرم ساتھ لایا، المختصر یہ کہ علیؑ و فاطمہؑ کی عمر بھر کی تمام کمائی نذر دینے کے لئے لایا۔ وہ دنیا کو بتا رہا تھا کہ جس چیز کو میں بچانے کے

لئے آیا ہوں وہ بہت قیمتی ہے۔ اس کے بچانے کے لئے لڑکے قربان ہوسکتے ہیں، بھائیوں کی جانیں جاسکتی ہیں، شیرخوار نذر ناوک ہوسکتا ہے۔ سیدانیاں بیوہ ہوسکتی ہیں، خیمے نذر آتش کئے جاسکتے ہیں، نبی زادیوں کی ردائیں چھن سکتی ہیں۔ مگر شمع ایمان نذر طوفان نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ شمع ہے جس کو رسولؐ خدا نے خانۂ خدا میں روشن کیا، جس نے ذوالفقار کے سائے میں پناہ لی، جس کو فاطمہؑ کی عصمت نے چار چاند لگائے، جس کو حسینؑ کی شہادت نے بجھنے نہ دیا، یہ رسولؐ کی امانت اب حسینؑ کے پاس پہنچی اور کس دور میں پہنچی جب کہ ہر طرف باطل کی سیاہ آندھیاں چل رہی تھیں، ظلمت کا دور تھا، وحشت کا زمانہ تھا، اکثریت اس کی خواہاں کہ یہ شمع ہدایت ہمیشہ کے لئے خاموش کردی جائے۔ حسینؑ کا منشاء کہ جان جاتی ہے تو جائے، بچے قربان ہوتے ہیں تو ہوں، خیمے لٹتے ہیں لٹیں، سیدانیاں مقید ہوں تو ہوں مگر شمع محمدیؐ بجھنے نہ پائے، نانا کا قول پیش نظر ''حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَاَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ''، حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں۔ قول کا نصف حصہ یعنی ''حسینؑ مجھ سے ہے'' ایک نمایاں حقیقت ہے مگر ''میں حسینؑ سے ہوں'' یہ ثابت ہونا باقی ہے۔ رسولؐ کا مقصد شاید یہی تھا کہ حسینؑ مجھے اور میرے نام کو زندہ کرے گا اور اسی لئے کہا تھا کہ ''میں حسینؑ سے ہوں'' اور یہی سبب تھا کہ حسینؑ اپنی تمام بضاعت لے کر میدان کربلا میں قربان کرنے کے لئے لائے تاکہ دنیا سمجھ لے کہ نواسۂ رسولؐ کا مقصد بہت بلند اور عین ایمان ہے۔ حامیان باطل کے مقابلہ میں حسینی سپاہ کی وہی نسبت تھی جو شاید روز حشر اہل جنت واہل دوزخ میں ہو۔ اور حسینؑ کی اس مختصر سی فوج میں حبیب ابن مظاہر جیسے ضعیف العمر اور علی اصغرؑ جیسے شیرخوار بھی شامل ہیں حسینؑ نے قاسمؑ جیسا بھتیجا، عباسؑ جیسا بھائی راہ حق میں قربان کردیا۔ مگر پھر بھی سنگدلی نہ پگھلی۔ یہ دیکھ کر کہ رسولؐ کا کلمہ پڑھنے والے ہیں رسولؐ کی شبیہ یعنی علی اکبرؑ کو میدان جنگ میں بھیجا کہ شاید گمراہوں کو رسول یاد آجائیں اور وہ راہ حق پر آجائیں یہ آخری نشانی تھی جس سے رسولؐ اللہ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔ مگر اللہ رے سنگدلی کہ زمانہ رسول اور رسالت کا اتنا مخالف ہوگیا تھا کہ رسولؐ کی شبیہ کا بھی پاس نہ کیا اور

علی اکبرؑ کا خون حسینؑ کی نظروں کے سامنے بہادیا۔ رسولؐ کے نواسہ کے سامنے رسول کی شبیہ مٹادی گئی اور اس پر ہی ختم نہیں کیا۔ بلکہ نواسۂ رسول کو بھی شہید کیا۔ خیموں میں آگ لگادی بچوں کے گوشوارے اتار لئے اور سیدانیوں کو اسیر کرلیا۔ حسینؑ نے چند گھنٹوں میں اپنا تمام گھر لٹادیا۔ راہ حق پر مٹنے کے لئے آئے تھے۔ شہید ہوگئے جس مقصد کے لئے نکلے تھے وہ پورا کیا دنیا کو دکھادیا کہ راہ حق پر چلنے والے اس طرح قربانیاں دیتے ہیں۔ آج کسی قوم میں ایسی مثال نہیں ملتی حسینؑ نے دنیا کے ہر فرقے اور ہر مذہب کو راہ حق پر مرنا سکھایا۔ حسینؑ کی شہادت اس نکتہ کو ظاہر کرتی ہے کہ اگر ایمان پختہ ہو تو مرنا آسان ہوجاتا ہے۔ اذیت محسوس نہیں ہوتی۔ ایک کربلا ہی کا محض سانحہ ہے جس نے اسلام کی تاریخ کو رنگین بنایا اور ایمان کی سب سے بڑی تبلیغ کی۔ مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ دنیا واقعہ کربلا سے سبق حاصل کرے گی اور ایک ایسا زمانہ یقیناً آجائے گا جب ''حسینیت'' ہی ہر شخص کا مذہب ہوگا اور دنیا کے بغض وعناد، جور وستم، فتنہ وفساد ہمیشہ کے لئے مٹ جائیں گے۔

حسینؑ اور امن

جسٹس پنڈت ویاس دیو مصرا، دہلی

رسول کریمؐ کو خدا نے دنیا میں رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا، اور یہ حقیقت ہے کہ رسولؐ نے اپنے اخلاق وعادات اور تہذیب وتمدن سے دنیا پر یہ ظاہر کر دیا کہ نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب کے لئے وہ رحمت تھے۔ بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں مگر پیشانی پر شکن نہ آئی ،غیروں کا تو کہنا ہی کیا، اپنوں نے بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا، مگر رسالت اپنا صحیح فرض ادا کرتی رہی، تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ رسولؐ نے کسی جنگ میں بھی پہل نہ کی، بلکہ امن وامان کا پیغام دیا۔ اگر امن وامان قائم رکھنے کے لئے جبراً جنگ بھی کرنی پڑی، تو خدا کے اس آخری پیغمبر نے ہارے ہوؤں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ دنیا قیامت تک اسے یاد رکھے گی۔

رسولؐ کے بعد علیؑ نے بھی وہی راستہ اختیار کیا، جس کی حفاظت کے لئے رسولؐ کو بڑے بڑے مصائب برداشت کرنا پڑے۔ وہ علیؑ جو شیر خدا تھا جس کا سکہ دنیا کے بڑے بڑے پہلوانوں اور سرکشوں کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا، جس نے ہر جنگ میں رسولؐ کو اور رسالت کو بچانے کے لئے اپنی جان پیش کی، جس کی ذوالفقار چند لمحات میں سارے عالم کو ختم کر سکتی تھی، رسولؐ کے بتائے ہوئے راستہ پر ثابت قدم رہا، اور امن وامان کا پیغام زمانے کو دیتا رہا۔ دنیا نے امن وامان کی راہ اس پر بند کر دی، مگر اس کے قدم صراط مستقیم سے نہ ڈگمگائے۔ مسجد، خدا کا گھر ہے، اور یہاں کافر کو بھی امن و امان ملتی ہے، مگر رسولؐ کے داماد اور جانشین کے لئے مسجد میں بھی اماں نہ ملی، اور حالت نماز میں بے رحمی سے شہید کر دیا گیا۔

علیؑ ضربت کے بعد دو روز زندہ رہے، حسنؑ وحسینؑ اور عباسؑ جیسے فرزند نظروں کے سامنے

تھے، اگر چاہتے تو قاتل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے، مگر رسولؐ کے گھرانے والے اپنا طرز عمل نہیں بدلتے، علیؑ کی نگاہ پیاسے قاتل کی طرف گئی، حسنؑ کو حکم دیا کہ شربت کا پیالہ قاتل کو پلا دیں۔ رحمت کا کام رحم وکرم کرنا ہے۔ رحمت اللعالمینؐ کے گدی نشین نے قاتل کو شربت پلا کر یہ ظاہر کر دیا کہ ہمارا کام امن وامان پھیلانا ہے، ہم قاتل سے بھی بدلہ نہیں لیتے۔

علیؑ نے جام شہادت پیا۔ اہلبیتؑ نے بجائے بدلہ لینے کے خاموشی اختیار کی۔ دنیا والے دنیا کی سوچتے رہے، مگر رسولؐ کے گھرانے والے ایک کے بعد ایک کا ماتم کرتے رہے۔ ناناؐ کو اچھی طرح رونے نہ پائے تھے کہ ماں کا سایہ سروں سے اٹھ گیا، شفقت پدری نے تسلی دی، اور اتنا ضرور ہوا کہ بچوں نے دل کھول کر نانا کا اور ماں کا غم مَنا لیا۔ اب تک یہ وقت نہ آیا تھا کہ جب رونا بھی منع ہو گیا ہو۔ ابھی ماں کو جی بھر کر نہ روئے تھے کہ باپ نے بھی داغ مفارقت دے دیا۔ دنیا نظروں میں تاریک ہوگئی، وقت زیادہ تر یادالٰہی میں گزرتا تھا یا رسولؐ، علیؑ اور فاطمہؑ کی قبروں پر گریہ وزاری میں۔ مگر کیا مجال کہ دل میں بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا ہو۔

حسنؑ کا زمانہ آیا، مشکلات پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئیں۔ جتنی اسلام کی تبلیغ ہوتی گئی، اتنا ہی دشمنان اہلبیت بڑھتے گئے۔ علیؑ کے اس فرزند نے دنیا کے جاہ وجلال کو ٹھکرا دیا، ظاہری حکومت کو بے معنی سمجھ کر اس کی طرف توجہ نہ کی، صلح کر کے امن وامان کو اس کی معراج تک پہنچا دیا اور خود گوشہ نشین ہو گئے۔ مگر دشمنان دین نے اس پر بھی آرام سے نہ رہنے دیا۔ رسولؐ کے اس جلیل القدر نواسے کو زہر دلوا دیا۔ کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکل گیا، زہر نے نبوت کے اس چراغ کو خاموش کر دیا۔

جنازہ اٹھا، جنازے پر تیر برسائے گئے، اعتراض یہ تھا کہ ناناؐ کے پہلو میں نواسہ دفن نہ ہو۔ دنیا کی تاریخ پڑھ ڈالئے، آپ کو کہیں ایسی مثال نہ ملے گی، جہاں جنازے سے بے ادبی کی گئی ہو، اور یہ تو رسولؐ کے نواسےؑ کا جنازہ تھا، مگر حسینؑ نے صبر وسکون سے کام لیا۔ موقع تھا کہ تیر کا بدلہ تیر سے، اور تلوار کا جواب تلوار سے دیتے، مگر رحمت اللعالمینؐ کا نواسہ ایسا کب کر سکتا تھا۔ اس حالت میں بھی

امن کو قائم رکھا۔ بھائی کو ماں کے پہلو میں دفن کر دیا۔

رسولؐ سے لے کر حسنؑ تک جو مناظر حسینؑ نے دیکھے، جو سلوک امت نے کئے ان سے اس درجہ مغموم و مضمحل ہو گئے کہ گوشہ نشینی کو بہتر خیال کیا، مگر ایمان کے دشمن کب آرام سے بیٹھنے دیتے تھے، مدینہ میں رہنا دشوار کر دیا۔ خون کے پیاسے مختلف بھیس اور لباس میں پھرنے لگے۔ ولید نے بیعت کا سوال کیا، یعنی قتل کا بہانہ نکالا، کیونکہ وہ سب جانتے تھے کہ حسینؑ بیعت نہ کریں گے۔ جب مدینہ میں رہنا دشوار ہوا تو اپنے بچوں، بیبیوں اور عزیزوں سمیت کربلا کا رُخ کیا، ناناؐ کی قبر سے لپٹ کر روئے، اور امت کی بدسلوکی کا شکوہ کیا۔ ماں اور بھائی کی قبر سے رخصت ہونے کو دل نہ چاہتا تھا، مگر دین و ایمان کی بہبودی اور فلاح کے لئے، ناچار ناچار، ماں اور بھائی کے مزاروں سے جدا ہوئے، ایک مدت تک صحرا بہ صحرا، دیار بہ دیار ہوتے ہوئے کربلا کی سرزمین پر پہنچے، محرم کا چاند تلوار کی شکل میں آسمان پر نمودار ہوا، بھرے گھر کی طرف نظر ڈالی، بیبیوں پر نظر پڑی، آیہ تطہیر کی تفسیر نظروں کے سامنے آ گئی، زمین خریدی، خیمے نصب کرائے، بیبیوں کے پردے کا خاص انتظام کیا بچوں کا آرام پیش نظر تھا، خیمے دریا کے کنارے نصب ہوئے، مگر فوج مخالف نے اس پر اعتراض کیا، لڑائی سے بچنے کے لئے دریا کے کنارے سے خیمے ہٹوا دیے۔

محرم کی ساتویں تاریخ آئی، اہل بیتؑ پر پانی بند کر دیا گیا، مصائب اپنے انتہا کو پہنچے، مگر رسولؐ کے نواسے نے صبر اور استقلال کی عنان ہاتھوں سے نہ چھوڑی، یہاں تک کہ نویں کا دن ڈھلا، سورج غروب ہوا، اور شام ہوئی، اور ادھر حسینؑ اور ان کے عزیز و انصار زمانے کی دشوار اور کٹھن منزلیں کاٹتے ہوئے اپنی زندگی کی شام تک پہنچے۔ مغرب کے شفق نے شہادت کا مژدہ سنایا، جاں نثاران امامؑ امامؑ پر مر مٹنے کے لئے بے چین ہو گئے۔ بیبیوں نے بچوں کو نصیحتیں کرنی شروع کیں، اور امامؑ پر قربان ہونے کی تلقین کی۔ ادھر امامؑ نے سب پر سے بیعت اٹھالی، ہر ممکن کوشش کی کہ ان کی جانیں بچ جائیں، مگر جن کے دلوں میں حیات جاودانی کی شمعیں فروزاں ہو چکی تھیں، وہ مرنے سے کیا

ڈرتے۔ انہیں تو موت کا بے چینی سے انتظار تھا، محض امامؑ سے اجازت چاہتے تھے۔

صبح عاشور نمودار ہوئی، علی اکبرؑ نے اذان دی، اور دین سے پھرے ہوؤں کو دعوت دی کہ یاد الٰہی میں مشغول ہوں اور نماز حق ادا کریں۔ امامؑ نماز کے لئے کھڑے ہوئے، تیر پر تیر آنے شروع ہوئے، مگر نمازیوں کی نماز میں فرق نہ آیا۔ شہادت بھی ہوئی، مگر حسینؑ نے پہل نہ کی اور صبر کی تلقین کی۔ وہ وقت بھی آیا جب نظروں کے سامنے اعزاء اور انصار کے لاشے ریگ گرم پر پڑے تھے، حسینؑ کی حسرت بھری نگاہیں ان پر بار بار پڑ رہی تھیں، اور کبھی خیمے کی طرف منہ پھیر کر دیکھتے تھے، تو بیبیوں اور بچوں کی گریہ وزاری کی صدائیں کانوں میں آتی تھیں، عجیب مصیبت کا وقت تھا۔

یہ حسینؑ کا دم تھا کہ اب بھی امن کی تلقین کر رہے تھے، یہاں تک کہ اپنا آخری استغاثہ بلند کیا۔ یہ نہیں کہا کہ تم نے میرے اعزاء کو کیوں قتل کیا؟ اس کا شکوہ نہ کیا، کہ تم نے اہل بیتؑ پر پانی کیوں بند کیا؟ یہ خواہش نہ کی کہ اہلبیتؑ پر میرے بعد ظلم نہ کرنا۔ ہاں ایک خواہش ضرور کی، اور وہ یہ کہ تم اپنے رسولؐ کے نواسے کو پہچانو، اور قرآن اور اسلام کی بے حرمتی نہ کرو، ہاں ایک بات اور تھی، اور شاید وہ آخری خواہش تھی، وہ اس وقت جب شمر سینے پر سوار ہوا، اور امامؑ نے اس سے کہا کہ اے شمر! اگر تو مجھے قتل ہی کرنا چاہتا ہے تو اتنی مہلت دے کہ نماز حق ادا کر لوں۔ افسوس کہ شمر نے اس کی مہلت بھی نہ دی۔ ابھی امامؑ نے سر سجدۂ خالق میں جھکایا ہی تھا کہ قفا سے سر اقدس جسم مبارک سے جدا کر دیا، امامت کے اس تیسرے چراغ کو جو راہ امن و امان میں روشن تھا، ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

اگرچہ حسینؑ کو شہید ہوئے تیرہ سو سال سے زیادہ ہو چکے ہیں، مگر آج بھی حسینؑ کا وہ سبق جو انہوں نے کربلا میں دیا تھا، دنیا کے لئے مشعل راہ ہے۔ اگر واقعی دنیا کی قومیں امن و امان قائم کرنا چاہتی ہیں، تو حسینؑ کی شہادت سے سبق لیں، یعنی دشمن کتنا ہی قوی کیوں نہ ہو، اور اس نے کتنا ہی ظلم کیوں نہ کیا ہو، مگر اپنی طرف سے جنگ کی پہل نہ کریں۔

❁❁❁

(ماخوذ از سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن لکھنؤ نمبر ۱۳۳، محرم ۱۳۸۰ھ)